فروری 2014
کرن
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

مستقل سلسلے

زر سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ----- 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 6000 روپے

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

فروری 2014
جلد 36 شمارہ 12
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔
پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

عائشہ بخش سے ملاقات

شاہین رشید

عائشہ بخش کا تعارف یہ ہے کہ یہ ایک نجی چینل کی بہت ہی اچھی نیوز کاسٹر ہیں۔ سادہ مزاج' سادہ لباس اور سادگی پسندی ان کی فطرت ہے۔ لہجہ میں مٹھاس ہے۔ آج ان سے ملاقات کیجیے۔

☼ "کیسی ہیں عائشہ اور آج کل نظر نہیں آرہیں اسکرین پہ؟"

★ "جی اللہ کا شکر ہے اور میرا ٹرانسفر لاہور ہو گیا ہے۔ نیوز کراچی سے ہوتی ہیں اس لیے نیوز میں نظر نہیں آرہی۔"

☼ "ماشاء اللہ کافی سالوں سے آپ کو خبریں پڑھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں یہ بتائیے کہ اب اتنے سال گزرنے کے بعد یہ سب کچھ کیسا لگتا ہے؟ اچھا لگتا ہے کیا؟"

★ "اچھا تو لگتا ہے..... مگر اب عادت بھی ہو گئی ہے اب میرے لیے میرا دفتر اور میرا کام گھر کی طرح ہی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ میرے لیے کچھ نیا ہے۔ ہاں جس دن کچھ نیا کام ہو رہا ہوتا ہے اس کی ایکسائٹمنٹ ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ کبھی اسٹوڈیو میں کچھ نیا ہو رہا ہو یا ملک میں کوئی تبدیلی آرہی ہو تو پھر اور بھی سب کچھ اچھا لگ رہا ہوتا ہے۔"

☼ "اپنے پروفیشن کی شروعات آپ نے نجی چینل سے کی پھر کراچی آئیں دبئی سے چینل جوائن کیا؟"

★ "میں نے موجودہ چینل کو بھی دبئی میں ہی جوائن کیا تھا اور جب پرویز مشرف کی حکومت ختم ہو رہی تھی تو میڈیا واپس آنا شروع ہو گیا تھا یہ چینل دبئی سے شروع ہوا تو میں دوسرے چینل میں وہیں دبئی سے ہی کام کر رہی تھی۔"

☼ "اے آر وائی کیوں چھوڑا تھا؟"

★ "کچھ پروفیشنل ریزن تھے۔ آرگنائزیشن وہ بھی اچھی تھی۔ میں نے جب اس چینل کو جوائن کیا تھا تو

میرے پاس کوئی تجربہ نہیں تھا۔ پروفیشنل ڈگری ضرور تھی میری لیکن میرے کام کا کوئی تجربہ نہیں تھا بے شک مجھے کام کرنے کا موقع وہاں سے ہی ملا مگر ایسے لوگ نہیں ملے جو پیشہ ورانہ طور پر مجھے گرینڈ کرتے بے شک مجھے وہاں کھلا ماحول ملا۔ میری بنیاد وہیں سے مضبوط ہوئی انہوں نے مجھے فری ہینڈ دیا جبکہ نئے آنے والے بندے کو فری ہینڈ نہیں ملتا اور میں نے بھی ثابت کیا کیونکہ وہ مجھ پر ذمہ داری ڈالتے گئے۔ مگر پھر بھی میری مثال ایک خود رو پودے کی سی تھی کہ جو کہیں بھی اگ سکتا ہے مگر تراش خراش کے بعد جو چیز سامنے آتی ہے وہ سب میں الگ ہی نظر آرہی ہوتی ہے۔"

☼ "آپ بتا رہی ہیں کہ پروفیشنل ڈگری تھی' ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کیا آپ نے؟"

★ "میں نے فاطمہ جناح یونیورسٹی راولپنڈی سے کمیونیکیشن سائنسز میں ماسٹرز ڈگری لی۔"

☼ "تو کیا بچپن سے ہی خبریں پڑھنے کا شوق تھا یا کسی کو دیکھ کر متاثر ہوئی تھیں؟"

★ "مجھے یاد ہے کہ جب میں چھوٹی تھی اور سکس کلاس میں پڑھتی تھی تو میں اپنے ابا کو اخبار کے آرٹیکل پڑھ کر سنایا کرتی تھی۔ کیونکہ ہمارے گھر میں اخبار بڑی باقاعدگی کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ تو جب میں ان کو آرٹیکل پڑھ کر سنایا کرتی تو وہ میری غلطیاں نکالا کرتے تھے کہ اس لفظ کو ایسے پڑھنا ہے اس لائن کو اس طرح پڑھنا ہے تو پڑھنے سے اور ان کی غلطیاں نکالنے سے میری زبان و بیان درست ہوئی اور میری اردو بہت اچھی ہو گئی۔ تو جب میں کراچی آئی تو سب مجھے اردو اسپیکنگ ہی سمجھتے تھے۔"

☼ "تو کیا آپ اردو اسپیکنگ نہیں ہیں؟"

★ "نہیں جی پنجاب کے شہر "پاک پتن" سے میرا تعلق ہے بلکہ یہ ایک چھوٹا سا ضلع ہے تو جناب کچھ لوگ مجھے بلوچی بھی سمجھتے تھے تو جب میں کہتی تھی کہ بھئی میں پنجابی ہوں تو کہتے تھے کہ لگتا نہیں ہے کہ آپ پنجابی ہیں شاید آپ کے گھر میں بہت زیادہ اردو بولی جاتی ہے تو میں کہتی تھی کہ ایسا نہیں ہے۔"

☼ "پاک پتن سے آپ کا تعلق ہے والدین کے بارے میں بتائیے کہ وہ کیا کرتے ہیں؟"

★ "میری والدہ تو ہاؤس وائف ہیں اور والد لاء گریجویٹ ہیں اور تھوڑا عرصہ ہی انہوں نے پریکٹس کی۔ بنیادی طور پر ہم زمیندار ہیں۔ لاء میرے والد نے اس لیے چھوڑ دی کہ ان کے خیال میں یہ سراسر جھوٹ ہے کسی کے حق میں بولیں یا کسی کے خلاف بولیں۔ جھوٹ ہی بولیں گے تو ذریعہ آمدنی ہماری زمینیں رہیں اور میرے والد سوشل بہت رہے لوگوں کی ویلفیئر کے لیے کام کرنا انہیں اچھا لگتا ہے۔"

☼ "بہن بھائی کتنے ہیں اور کیا وہ اس فیلڈ میں ہیں؟"

★ "ہم چار بہن بھائی ہیں۔ میں گھر میں بڑی ہوں' بہن کی شادی ہو گئی ہے اور ایک بھائی "دنیا نیوز" میں بحیثیت رپورٹر کے کام کرتا ہے۔"

☼ "2008 سے آپ نیوز سے وابستہ ہیں۔ اے آر وائی سے جیو میں آئیں پھر کہیں اور جانے کا موڈ ہوا؟"

★ "نہیں ایسا کچھ موڈ نہیں ہے۔۔۔ آپ کو پتا ہے کہ پنجاب سے میرا تعلق ہے۔ کراچی آنے سے پہلے

تقریباً" پونے تین سال میں نے دبئی میں گزارے، میرا پروفیشنل کیریئر دبئی سے شروع ہوا تھا اور میں ماشاءاللہ سے اتنی لکی ہوں کہ میں نے ایک ہی آڈیشن دیا اور کامیاب ہو گئی رب نے اتنی عزت دی کہ گھر کی کرسی سے میں اسٹوڈیو کی کرسی پہ گئی ہوں۔۔۔ ورنہ لوگوں کو اپنا مقام بنانے میں بہت مشکل پیش آتی ہے۔ کبھی اچھے لوگ نہیں ملتے کبھی کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

✻ "تو کس طرح سلیکشن ہوا' آڈیشن میں کس طرح کامیابی ہوئی؟؟"

★ "میں خود حیران ہوں' شاید میرے نصیب میں یہی فیلڈ لکھی تھی۔ جب میں آڈیشن کے لیے گئی تو کئی ہزار لوگوں میں سے سلیکشن ہوا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی اور زندگی میں پہلی بار کیمرہ فیس کر رہی تھی۔ مگر اتفاق دیکھیں کہ بلکہ الحمد للہ کہ پہلی بار کیمرے کے سامنے گئی اور پہلی ہی بار میں کیمرہ فیسنگ اتنی شاندار ہوئی کہ اسی وقت سلیکٹ ہو گئی اور اسی وقت انہوں نے میرے پاسپورٹ وغیرہ کے بارے میں بھی پوچھ لیا اور ایک ڈیڑھ مہینہ کے ضروری پروسس کے بعد میں "دبئی" میں تھی۔۔۔ بہت اچھا لگا مجھے اس ادارے میں کام کر کے مگر چھوڑنے کی وجہ میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں۔"

✻ "دوسرے چینلز سے آفر آتی ہیں؟؟"

★ "جی پہلے سال سے لے کر اب تک کوئی ادارہ ایسا نہیں ہے کہ جہاں سے مجھے آفر نہ آئی ہوں اور ابھی بھی یہی حال ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے اور اس کی وجوہات میں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پاکستان کا میڈیا بھی کچھ مختلف نہیں ہے کہ میں یہاں سے وہاں جاؤں۔ جب اس ادارے میں میری عزت ہے اور میں اچھے طریقے سے کام کر رہی ہوں تو مجھے کیا ضرورت ہے اِدھر اُدھر جانے کی اور چھوڑنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ لوگ اگر پروفیشنلی انداز میں ڈیل نہ کر رہے ہوں اور آپ کو آپ کی خواہش کے مطابق عزت نہ دی جا رہی ہو الحمد للہ جب سے میں اس چینل میں آئی ہوں مجھے پروفیشنلی گروم کرنے کے لیے بہت سے مواقع ملے ہیں اور دیگر بہت کچھ کرنے کے مواقع ملے ہیں اور مجھے اپنے ارد گرد اتنے اچھے لوگ ملے ہیں کہ مجھے ہمیشہ ان کے ذریعے سے رہنمائی ملی ہے۔"

✻ "گھر والوں کی طرف سے "دبئی" جانے کی اجازت مل گئی تھی کبھی سوچا تھا کہ میڈیا میں آجاؤں گی؟"

★ "میں بہت shy قسم کی لڑکی تھی اور ابھی بھی بہت shy ہوں اور ابھی بھی کیمرہ فیس کرنا میرے لیے مشکل ہوتا ہے۔ میں کرتی یہ ہوں کہ جب میں اسٹوڈیو میں اپنی سیٹ پہ خبریں پڑھنے کے لیے بیٹھتی ہوں تو یہ بھول جاتی ہوں کہ میرے سامنے کیمرہ بھی ہے اگر خیال بھی آجائے کہ میرے سامنے کیمرہ ہے تو مجھے تھوڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ جب میں میڈیا پڑھ رہی تھی تو سوچتی تھی کہ جب کبھی اس فیلڈ میں آؤں گی تو کیمرے کے پیچھے رہ کر کام کروں گی یا پھر میں بہ حیثیت رائٹر کے کچھ کر رہی ہوں گی اور ایک بات میں ضرور کہوں گی کہ جب میں یہ سوچ رہی ہوتی ہوں کہ میں ایسا نہیں کر سکتی یا ایسا نہیں ہو گا' ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ جب دبئی گئی تو والدین کی طرف سے اجازت مل گئی کیونکہ انہوں نے مجھے جو اعتماد دیا تھا اور جس انداز میں میری پرورش کی تھی وہ کام آئی۔"

✻ "سنا ہے کہ آپ سی ایس ایس بھی کرنا چاہتی تھیں۔۔۔ اور شادی کے خلاف تھیں؟؟"

★ "جی بالکل کرنا چاہتی تھی لیکن ماسٹرز کرنے کے ایک سال کے بعد جب میری جاب شروع ہو گئی تو پھر میں نے سارا دھیان اپنی جاب کی طرف لگا دیا مجھے کبھی یہ دھیان ہی نہیں آیا کہ میری تعلیم مکمل ہو گئی ہے اور میں جاب بھی کر رہی ہوں تو اب مجھے شادی کر لینی چاہیے۔ ایسا کچھ میرے ذہن میں نہیں تھا کیونکہ میرا اس بات پر یقین ہے کہ اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔"

✻ "عائشہ آپ بتا رہی تھیں کہ آپ نے سوچا تھا کہ کیمرے کے پیچھے رہ کر کام کروں گی یا پھر کچھ لکھوں گی تو لکھنے میں کس طرف رجحان ہے آپ کا؟؟"

★ "میرا رجحان سوشل افیئرز پر کچھ لکھنے کا ہے سوسائٹی میں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر کچھ لکھنا چاہتی ہوں اور میرے میاں کہتے ہیں کہ جب تم اتنا اچھا بول سکتی ہو تو لکھ بھی سکتی ہو۔ اس لیے لکھا کرو۔۔۔ مگر اب تو بیٹے کی وجہ سے ماشاءاللہ مصروفیات اتنی بڑھ گئی ہیں کہ لکھنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا۔ کیا کریں جی بیٹے کو بھی دنیا میں آنے کی جلدی تھی۔"

✻ "ہوں۔۔۔ سسرال والوں کے ساتھ رہتی ہیں؟؟"

★ "نہیں جی۔۔۔ اتفاق ایسا ہے کہ میرے ساس سسر نواب شاہ میں رہتے ہیں جیٹھ جیٹھانی دبئی میں ایک نند اسلام آباد میں اور دوسری حیدر آباد میں رہتی ہیں اور جب سے میرا بیٹا ہوا ہے مجھے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ جوائنٹ فیملی ہونی چاہیے بزرگوں کی بڑی بات ہوتی ہے۔"

✻ "مشکل ہوتی ہو گی؟؟"

★ "ہاں ہوتی ہے مگر یہ ہم دونوں کی ذمہ داری ہے اور ہم دونوں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہیں۔۔۔ میں تو اپنی ذمہ داریوں کو ضرورت سے زیادہ سر پر سوار کر لیتی ہوں۔ میں چیزوں کو آئیڈیلائز اور مینج کر کے چلنے کی عادی ہوں۔۔۔ ہم دونوں کو اس کا احساس اس لیے بھی ہے کہ میں نے اور عدنان نے بھی بہت عرصہ اکیلے رہ کر گزارہ ہے۔ میں اپنی ایجوکیشن کے لیے ہوسٹل میں رہی پھر جاب کے لیے دو سال گھر سے باہر رہی اور عدنان اپنی جاب کے لیے اپنی فیملی سے دور کراچی میں رہتے تھے کبھی دبئی تو کبھی ابوظہبی مطلب کہ گھر سے باہر رہے تو جو گھر سے باہر رہ کر زندگی گزارتے ہیں انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے۔"

✻ "گھر سے باہر رہنے والے کھانے پینے کے معاملے میں بھی بہت صابر و شاکر ہوتے ہیں لڑکیاں تو چونکہ خود پکاتی ہیں تو صابر و شاکر ہوتی ہیں۔ مگر لڑکوں میں بھی صبر آجاتا ہے۔۔۔ ایسا ہے؟؟"

★ "بالکل عدنان میں بہت صبر ہے کھانے کے معاملے میں بالکل بھی کریزی نہیں ہیں۔ کبھی شور نہیں کرتے۔۔۔ چونکہ ہم دونوں جاب کرتے ہیں اس لیے ایک دوسرے کی مشکلات کو سمجھتے ہیں۔ کبھی میں جب جاب پہ ہوتی ہوں اور یہ کہتے ہیں کہ مجھے بھوک لگ رہی ہے تو میں ان سے کہتی ہوں کہ تھوڑا صبر کریں میں آ ہی رہی ہوں تو کچھ نہیں کہتے پھر میں گھر آ کر خود روٹی پکاتی ہوں۔ کیونکہ مجھے یہ سب کچھ کرنا اچھا لگتا ہے۔"

✻ "اتنی شہرت ہے ماشاءاللہ سے فخر ہوتا ہے؟؟"

★ "فخر ہوتا ہے۔ میں ڈاؤن ٹو ارتھ ہوں۔ میں کبھی اپنے آپ کو کوئی بہت اعلا چیز نہیں سمجھتی کہ مجھے ہی سنا جائے مجھے ہی دیکھا جائے۔ پتا نہیں میں کیا ہوں۔۔۔ میں ایسی ہرگز نہیں ہوں میں تو سمجھتی ہوں کہ آج میں جو کچھ ہوں شاید میری اتنی اوقات بھی نہیں ہے۔ میں بس ہر وقت اپنے رب کی شکر گزار رہتی ہوں کہ اس نے مجھے بہت کچھ نوازا ہے۔ میرے بہن بھائی کہتے ہیں کہ لگتا نہیں ہے کہ تم کچھ ہو۔"

✻ "تقریبات میں جاتی ہیں؟؟"

★ "نہیں جاتی' تب ہی تو لوگ کہتے ہیں کہ تم اپنے آپ کو "وی آئی پی" سمجھتی ہو تو میں کہتی ہوں کہ اگر میں اپنے آپ کو وی آئی پی سمجھتی تو ہر جگہ جاتی کہ مجھے اپنا پروٹوکول مل رہا ہے ___ اصل میں میں بہت فیملی قسم کی بندی ہوں۔ مجھے یا تو اپنا گھر اچھا لگتا ہے یا پھر اپنا آفس۔ اچھے سے زیادہ آرام دہ لگتا ہے تیسری کوئی جگہ آرام دہ نہیں لگتی۔"

⁕ "5 فروری 2012ء کو آپ کی شادی ہوئی۔ 2008ء سے آپ جاب کر رہی ہیں اپنا جہیز خود بنایا تھا؟"

★ "نہیں ___ میرے والدین نے ہی بنایا تھا ارینج میرج تھی میری رخصتی کے ___ وقت بہت جذباتی تھی کیونکہ شادی کے وقت لڑکی کو وہ جگہ چھوڑنی پڑتی ہے جو اس کی زندگی ہوتی ہے چونکہ ارینج میرج تھی تو مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو گا' کیسا ماحول ہو گا مجھے عدنان کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا کہ کس مزاج کے ہوں گے۔ لوگ ٹھیک کہتے ہیں کہ شادی جوا ہوتی ہے۔"

⁕ "منگنی کتنا عرصہ رہی اور کیا ملاقات نہیں ہوئی تھی؟"

★ "منگنی چھ ماہ رہی تقریباً" جون 2011ء میں ہوئی تھی۔ لوگ شادی سے پہلے ملتے ہیں ایک دوسرے کے مزاجوں کو سمجھتے ہیں فون پہ باتیں ہوتی ہیں مگر میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا ___ ایک ہی ملاقات ہوئی تھی وہ بھی فیملی کے ساتھ ہوئی تھی۔ ہاں منگنی کے دوران عدنان کی والدہ سے' بہن ___ اور بھابھی سے کبھی کبھار بات ہو جاتی تھی۔ منگنی کے بعد عدنان دبئی گئے پھر جرمنی کا بھی ایک ٹرپ تھا ان کا۔"

⁕ "فضول خرچ ہیں آپ؟"

★ "میرا خیال ہے کہ میں فضول خرچ نہیں ہوں لیکن اگر میری ماں سے پوچھیں تو شاید وہ کہہ بھی دیں کہ عائشہ تھوڑی فضول خرچ ہے۔ ویسے میں بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرتی ہوں اور ہر چیز کو بیلنس کر کے چلتی ہوں اور میرے میاں بھی فضول خرچ نہیں ہیں۔ بلکہ یہ تو بہت ہی اچھے انسان ہیں پوزیٹو سوچ رکھنے والے اور عزت دینے والے انسان ہیں۔ بس ایک عادت تھوڑی سی بری لگتی ہے کہ پلان نہیں کرتے تو میں انہیں کہتی ہوں کہ پلاننگ ضرور کرنی چاہیے اور میں جتنی پریکٹیکل ہوں وہ اتنے پریکٹیکل نہیں ہیں۔"

⁕ "زرق برق کپڑے پسند ہیں یا سادہ لباس؟"

★ "مجھے زرق برق قسم کے کپڑے بالکل بھی پسند نہیں ہیں۔ جہیز اور بری کے بھاری کپڑے جب میں سسرال نواب شاہ گئی تھی تو میں نے پہنے تھے اس کے بعد نہیں پہنے تو میری امی کو بہت غصہ آیا کہ بیٹا اگر کپڑے نہیں پہننے تھے تو بنائے کیوں تھے اصل میں میرے بیٹے کو بھی جلدی تھی دنیا میں آنے کی پھر ہم کہیں گئے بھی نہیں۔ آفس بھی جلدی شروع ہو گیا تو شادی کے کپڑے پہننے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ویسے بھی میں بہت سادگی پسند ہوں۔"

⁕ "سسرال میں سب سے زیادہ پیار کس سے ملتا ہے؟"

★ "سب ماشاء اللہ بہت اچھے ہیں۔ بہت پیار کرنے والے بہت خیال رکھنے والے لیکن میرے سسر تو بالکل میرے والد کی طرح ہیں نہ صرف بہت محبت کرتے ہیں بلکہ میرا بہت خیال بھی کرتے ہیں۔"

⁕ "رسمیں ہوئی تھیں؟"

★ "نہیں کچھ خاص نہیں عدنان کی سائیڈ رسم رواج کو کچھ اتنا زیادہ دیکھا نہیں میں نے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے عائشہ بخش سے اجازت چاہی۔

☼ ☼

ماڈل ______	نازیہ علی
میک اپ ______	روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی ______	موسیٰ رضا

میری بھی سنیے

عیمہ ملک

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"عیمہ ملک۔"

2 "پیار کا نام؟"
"عیمو۔"

3 "جنم دن/ جنم سال/ جنم شہر؟"
"18 نومبر/ 1987ء/ کراچی۔"

4 "قد/ ستارہ؟"
"5 فٹ 6 انچ/ اسکارپیو۔"

5 "فیملی ممبرز/ میرا نمبر؟"
"والدین چار بہنیں' دو بھائی/ چوتھے نمبر پر ہوں۔"

6 "تعلیم؟"
"گریجویشن۔"

7 "فیلڈ میں آمد؟"
"ثاقب ملک کی بدولت۔"

8 "پہلا کمرشل/ پہلا ڈراما؟"
"فیر اینڈ لولی/ پیار کہانی۔"

9 "مجھے شہرت ملی؟"
"کسی کمرشل اور ڈرامے نے شہرت نہیں دی ___ البتہ "قبول" نے شہرت کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔"

10 "میں بے قابو ہو جاتی ہوں؟"
"جب مجھے غصہ آتا ہے' اپنی اس عادت سے

پریشان ہوں اور چھٹکارا چاہتی ہوں۔"

11 "غصے میں ری ایکشن؟"
"زور زور سے رونے کو دل چاہتا ہے کیونکہ مجھے اظہار کرنا نہیں آتا' مجھے بولنا نہیں آتا' یہی میری کمزور ہے۔"

12 "مردوں میں کون سے رنگ کا لباس اچھا لگتا ہے؟"
"کالے رنگ کا۔"

13 "شاپنگ کے لیے پسندیدہ جگہ؟"
"بنکاک اور لندن' جب جاتی ہوں ڈھیر ساری شاپنگ کرکے آتی ہوں۔"

14 "گھر میں کس سے ڈر لگتا ہے؟"
"اپنے بڑے بھائی سے۔"

15 "میرا کام جو میرے لیے فخر کا باعث بنا؟"
"فلم "بول" کبھی سوچا نہیں تھا کہ اتنا اچھا۔ رول ہوگا اور میں اتنا اچھا پرفارم کرلوں گی کہ یہ کام میرے لیے فخر کا باعث بن جائے گا۔"

16 "کبھی بھول نہیں سکتی؟"
"جب شعیب منصور نے مجھے بلا کر "بول" میں کام کرنے کی آفر دی۔"

17 "کیا کھانے کے لیے آدھی رات کو بھی باہر جانے کو تیار رہتی ہوں؟"
"آئس کریم۔"

18 "چہرے کے خدوخال میں کیا چیز ان فٹ لگتی ہے؟"
"ان فٹ تو نہیں لیکن پتا نہیں کیوں اپنی ناک ٹیڑھی لگتی ہے۔"

19 "کبھی سوچتی ہوں کہ؟"
"کاش میرے ہونٹ تھوڑے موٹے ہوتے' بہت ہی پتلے ہیں۔"

20 "جھوٹ کا سہارا کب لیتی ہوں؟"
"جب کسی بات سے ڈر جاتی ہوں۔"

21 "میں چھونا چاہتی ہوں؟"
"آسمان کے ستاروں کو' شہرت کی بلندیوں کو۔"

22 "میرا یقین ہے کہ؟"
"انسان اپنی قسمت خود بناتا ہے۔"

23 "شوبز میں آکر کیا کھویا کیا پایا؟"
"پایا تو ماشاء اللہ بہت کچھ ہے۔ کھویا تو کچھ نہیں بس اپنے والدین اور بہن بھائیوں کو ٹائم نہیں دے پاتی۔"

24 "کن چیزوں پہ بہت خرچ کرتی ہوں؟"
"جوتوں پر' بہت کریز ہے مجھے اچھے اچھے جوتوں کا اور گھر کو سجانے سنوارنے کا بہت شوق ہے ان پر بہت خرچ کرتی ہوں۔"

25 "اسمارٹ رہنے کے لیے کیا کرتی ہوں؟"
"کھانا کم کھاتی ہوں یوں سمجھیں کہ زندہ رہنے کے لیے کھاتی ہوں۔"

26 "اپنی شخصیت میں کیا پسند ہے؟"
"مجھے اپنی ہنسی اور اپنے دانت بہت پسند ہیں۔"

27 "میری سب سے مہنگی شاپنگ؟"
"میرے جوتوں پر ہی ہوتی ہے اور کئی کئی ہزار کا ایک جوڑی جوتا ہوتا ہے میرا۔"

28 "مجھے ڈر لگتا ہے؟"
"موت سے ڈر لگتا ہے اور بہت زیادہ لگتا ہے۔"

29 "گھر آتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"
"کہ بس گرما گرم چائے مل جائے۔"

30 "میری اچھی اور بری عادت؟"
"بری تو یہ کہ ہر ایک پہ جلدی اعتبار کرلیتی ہوں اور اچھی یہ ہے کہ سب سے پیار کرتی ہوں' سب کا خیال رکھتی ہوں۔"

31 "دن کا کون سا وقت اچھا لگتا ہے؟"
"عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت۔"

32 "اپنے آپ میں کیا تبدیلی چاہتی ہوں؟"
"میں بہت حساس ہوں ہر بات کو جلدی محسوس کرتی ہوں اور دل پہ لے لیتی ہوں پھر گھنٹوں اداس رہتی ہوں۔ میں اپنے آپ کو مضبوط بنانا چاہتی ہوں۔"

33 "چھوٹی تھی تو اپنے بارے میں کیا سوچتی تھی؟"
"کہ مجھے بڑے ہوکر ایک بہت اچھی آرٹسٹ بننا ہے ـــ آرٹسٹ ہی بننا ہے بس اور کچھ نہیں بننا اور میری یہ خواہش پوری ہوئی۔ شاید میرے نصیب میں یہی تھا اس لیے اللہ نے میرے دل میں اس پروفیشن کے لیے لگن ڈال دی۔"

34 "میک اپ میں کیا پسند ہے؟"
"کاجل' یہ تمام میک اپ کی کمی کو پورا کردیتا ہے۔"

35 "اداکاری کس سے سیکھی؟"
"کسی سے نہیں مجھ میں یہ خداداد صلاحیت ہے۔ چھوٹی تھی تو آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اداکاری کرتی اور خود ہی تنقید اور تعریف کیا کرتی تھی۔"

36 "گھر میں کون سا وقت پرسکون ہوتا ہے؟"
"رات کا ـــ جب میں اپنے بستر پہ ہوتی ہوں اور آرام کررہی ہوتی ہوں۔"

37 "کوئی لڑکا گھورے تو؟"
"جاکر پوچھوں گی کہ "بھائی" کیا پرابلم ہے۔ خود ہی بھاگ جائے گا۔"

38 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"جب ہمارے کام ہماری مرضی کے مطابق نہیں ہورہے ہوتے۔ کم سے کم میں تو بہت پریشان ہوجاتی ہوں۔"

39 "مذہب سے میری قربت؟"
"بہت زیادہ ہے۔ نماز روزہ شوق سے کرتی ہوں اور الحمدللہ میں نے عمرہ بھی کیا ہوا ہے اور حج کی سعادت بھی حاصل کرچکی ہوں۔"

40 "پاکستانی معاشرے کی بڑی برائی؟"
"کہ ہمارے ملک کی چھوٹی چھوٹی بچیاں روڈ پر پھٹے پرانے کپڑوں کے ساتھ اور گرمی سردی میں بغیر جوتوں کے بھیک مانگ رہی ہوتی ہیں یہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے حکومت کو اس طرف توجہ دینا چاہیے۔"

41 "کوئی پہلی بار ملے تو کیا دیکھتی ہوں؟"
"بے ارادہ میری نظر اس کے جوتوں پر جاتی ہے۔

یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔"

42 "بیرون ملک کس بات سے متاثر ہوتی ہوں؟"

"ہائے بہت ساری باتوں سے ' لوگ ایک دوسرے کو محبت و اپنائیت کے ساتھ دیکھتے بھی ہیں اور ملتے بھی ہیں۔ آلودگی نہیں ہوتی بارش ہو تو زمین پر کیچڑ نہیں ہوتا۔"

43 "صبح اٹھتے ہی کیا پینے کو دل چاہتا ہے چائے یا کافی؟"

"چائے.....ویسے کافی بھی اچھی لگتی ہے۔"

44 "کس شخص سے میں باآسانی لڑ سکتی ہوں؟"

"اپنی امی سے ماں ہی تو ہے جو اولاد کی ہر بات برداشت کرتی ہے۔ باقی تو اونچی آواز میں بولنے بھی نہ دیں۔"

45 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

"میرے خیال سے موبائل اور ٹی وی۔"

46 "محبت کا اظہار کس طرح کرتی ہوں؟"

"خاموش رہ کر۔ محبت لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی۔"

47 "مجھے شوق ہے؟"

"چیزیں جمع کرنے کا جن میں گولڈ کی جیولری اور بیڈ شیٹس شامل ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میرے بیڈ پہ بہت خوب صورت بیڈ شیٹ بچھی ہوئی ہو۔"

48 "مجھے یاد ہے اب تک؟"

"کہ جب میں ایک بار مڈ ٹرم امتحان میں فیل ہو گئی تھی اور میری امی میرے ساتھ رزلٹ لینے آئیں۔ جب انہیں پتا چلا تو وہ بے ساختہ رو پڑیں بتا نہیں سکتی کہ کتنا دکھ ہوا تھا پھر کبھی فیل نہیں ہوئی۔"

49 "کون سی چیزیں میرے بیگ میں لازمی ہوتی ہیں؟"

"شال ' موبائل فون ' ڈیوڈرنٹ اور پرفیوم۔"

50 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتی ہوں؟"

"پانی کی بوتل ' ایئر فریشنر اور اپنی تصویر۔"

51 "کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ؟"

"میرا فیوچر کیا ہوگا؟ مجھے اپنی زندگی کس طرح گزارنی ہے؟"

52 "کس قسم کی تقریبات پسند ہیں؟"

"مجھے تقریبات میں جانا اچھا لگتا ہے وہاں جہاں اپنے جاننے والے اور پیار کرنے والے موجود ہوں۔"

53 "چوٹ لگنے پر کون یاد آتا ہے؟"

"سوائے ماں کے اور خدا کے کوئی یاد نہیں آتا۔"

54 "گہری نیند سے اٹھنا کیسا لگتا ہے؟"

"برا تو لگتا ہے اگر ضروری کام ہو تب نہیں۔"

55 "میرا مخصوص جملہ؟"

"او یس ہی۔"

56 "کون سا ایوارڈ لینے کی خواہش ہے؟"

"مس ورلڈ یا مس یونیورس۔"

57 "اسکینڈل کے بارے میں میری رائے؟"

"کہ یہ بنتے نہیں بلکہ بنائے جاتے ہیں۔ آپ اچھے ہیں تو کیوں بنیں گے اسکینڈلز ' کچھ کیا بلکہ اکثریت کو اسکینڈلز کے ذریعے مشہور ہونے کا شوق ہوتا ہے۔"

58 "سیاست میں آنا چاہتی ہوں؟"

"تاکہ مظلوم خواتین اور بچیوں کے لیے کچھ کر سکوں۔"

59 "کس کو فون نمبر دے کر پچھتائی؟"

"اپنے ایک فین کو..... بہت تنگ کیا اس نے۔"

60 "ہر عروج کو زوال ہے تو؟"

"اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو پھر کچھ اور کر لوں گی شاید اس میں اللہ کی بہتری ہو۔"

☼ ☼

آواز کی دنیا سے

گلنار جاوید

شاہین رشید

آواز کی دنیا سے اس ماہ آپ کی ملاقات ریڈیو پاکستان ایف ایم 93 کی معروف آر جے گلنار جاوید سے کروا رہے ہیں۔ گلنار جاوید کافی زمانے سے ریڈیو سے وابستہ ہیں۔ یہ نہ صرف ریڈیو کی معروف آواز ہیں ' بلکہ آج کل ترکش ڈراموں میں بھی آپ کسی نہ کسی کردار میں ان کی آواز ضرور سنتے ہوں گے اور کسی کمرشل کے بیک گراؤنڈ میں بھی ان کی آواز کا جادو چل رہا ہوتا ہے۔

○ "جی گلنار صاحبہ کیسی ہیں اور کیا ہو رہا ہے؟"

☆ "میں کچن میں تھی اور عورت کے لیے تو کچن لازمی ہے اور میں اس وقت گوبھی گوشت پکا رہی تھی۔"

○ "ہوں گڈ۔ کہتے ہیں کہ جو خواتین جاب کرتی ہیں ان کو کوکنگ کا ٹائم ذرا کم ہی ملتا ہے یا پھر انہیں کوکنگ آتی ہی نہیں ہے۔"

☆ "کوکنگ کا ٹائم ملے نہ ملے کوکنگ تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ باقی کاموں کو آپ نظر انداز کر سکتی ہیں۔ مگر کھانا پکانے کو نہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ جاب کرنے والی خواتین زیادہ ذمہ داری کے ساتھ اور زیادہ اچھا کام کرتی ہیں۔ کیونکہ وہ بیک وقت کئی کام کر رہی ہوتی ہیں۔ بچوں کو ' میاں کو ' گھر کو سب کو برابر ٹائم دے رہی ہوتی ہیں۔"

○ "گویا ورکنگ وومن زیادہ ایکٹیو ہوتی ہیں ' خیر گھرداری کے علاوہ کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

☆ "آج کل تو ریڈیو چل رہا ہے اور ڈبنگ کا کام چل رہا ہے۔ جہاں سے بلاوا آجاتا ہے وہاں چلی جاتی ہوں۔ آج کل جو مختلف چینلز پر ترکش ڈرامے چل رہے ہیں ' ان کی ڈبنگ کرتی ہوں۔ ابھی حال ہی میں ترکش ڈرامہ "انتقام" کے ایک کردار کے لیے ڈبنگ کروائی ہے۔ اصل میں زیادہ کاموں میں ہاتھ ڈالتی نہیں ہوں ' کیونکہ سال میں دو ' تین بار میرا ملتان جانا ہوتا ہے ' تو لمبے کردار نہیں لے سکتی۔ کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے کسی کو پریشانی ہو۔"

○ "ملتان کس سلسلے میں جانا ہوتا ہے آپ کا؟"

☆ "ملتان تو میرا مرنا جینا سب کچھ ہے ' میکا ' سسرال سب وہیں ہے۔ مجھے آپ ملتانی مٹی سمجھ لیں۔ کراچی میں تو میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ہوں۔"

○ "آپ کی فیملی کی طرف بھی آتی ہوں۔ لیکن پہلے یہ بتائیں کہ "ڈبنگ" کرنا آسان کام ہے؟"

☆ "بہت مزے دار اور بہت دلچسپ اور آسان کام ہے۔ جو کردار ہوتے ہیں ان کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ ویسے آواز کو ایڈجسٹ کرنا کمپیوٹر کا کام ہوتا ہے اور ڈائریکٹر کا۔ اگر ڈائریکٹر اچھا ہو تو پھر کام کرنے کا اور بھی زیادہ مزا آتا ہے۔"

○ "معاوضہ اچھا ملتا ہے؟"

☆ "معاوضہ اتنا اچھا نہیں ملتا جتنا ملنا چاہیے اور میں نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ جو ٹی وی آرٹسٹ ہیں ان کو معاوضہ زیادہ ملتا ہے۔ جبکہ ڈرامہ ایک ہی ہے۔ کردار بھی ایک جیسے ہیں۔ ہم کریں تو تھوڑا معاوضہ ملتا ہے اور ٹی وی آرٹسٹ کریں تو زیادہ ملتا ہے۔"

○ "آپ لوگ بولتے نہیں ہیں؟"

☆ "کیا بولیں کہ یہاں تو فری میں کام کرنے والے بھی ہیں۔ تو چونکہ ہم تھوڑا شوق بھی رکھتے ہیں تو اس لیے نہیں بولتے کہ چلو جو کچھ مل رہا ہے قبول کرلو۔ جبکہ میں کہتی ہوں کہ معاوضہ فکس ہونا چاہیے۔ کیونکہ ہم ٹائم بھی ٹی وی آرٹسٹوں کی طرح ہی دیتے ہیں اور کام بھی ویسا ہی کر رہے ہوتے ہیں جیسا وہ کرتے ہیں.... آپ یقین کریں کہ ان کے معاوضے "لاکھ" سے بھی بڑھ جاتے ہیں، جبکہ ہم جیسے لوگوں کو دو ہزار، تین ہزار پر ٹرخا دیتے ہیں۔"

○ "ارے یہ تو بہت زیادتی ہے آپ لوگوں کے ساتھ۔۔۔ خیر۔ ٹی وی اسکرین پر کبھی اداکاری کی، یا شوق ہوا؟"

☆ "ریڈیو پہ تو صداکاری کرتی رہتی ہوں۔ لیکن ٹی وی کے اردو ڈراموں میں تو کام نہیں کیا۔ البتہ ایک بار سرائیکی چینل کے ایک ڈرامے میں ضرور پرفارم کیا تھا۔ مگر مجھے کچھ اچھا نہیں لگا کہ لوگوں کے سامنے اداکاری کروں۔ البتہ نیوز پڑھنے کا مجھے بہت زیادہ شوق رہا اور سرائیکی میں نیوز میں نے پڑھی بھی ہیں۔ دو مہینے میں نے پڑھیں۔ مگر جب انہوں نے پے نہیں دیا تو میں نے چینل چھوڑ دیا کہ کوئی کب تک فری میں کام کر سکتا ہے۔"

○ "ریڈیو پہ آمد کیسے ہوئی اور ریڈیو ہی آپ کی چوائس کیوں بنا؟"

☆ "ریڈیو کا شوق تو بچپن سے ہی تھا۔ جب میں کلاس سکس میں تھی تو میں نے ریڈیو پاکستان کو پہلا خط لکھا تھا۔ ریڈیو پاکستان ملتان کو اور مجھے ریڈیو سننے کا اتنا شوق ہوتا تھا کہ چاہے گھر میں مہمان ہوں یا کوئی اور مصروفیات میں نے ریڈیو سننا ہی سننا ہے اور ریڈیو

پروگراموں میں 30,30 صفحات کے خط لکھا کرتی تھی اور جب کبھی ایک آدھ ہفتہ میرا خط نہیں جاتا تھا تو مجھے ریڈیو پہ آن ایئر کہا جاتا تھا کہ آپ کہاں ہیں۔۔۔ ریڈیو ملتان میں ہمارے ایک کزن مجتبیٰ علوی ہوا کرتے تھے۔ (حال ہی میں ان کا انتقال ہوا ہے۔) تو وہ ہمیں کبھی اسکول کی طرف سے اور کبھی کالج کی طرف سے بلا لیا کرتے تھے۔ پھر ایک مرتبہ وہ ہمیں ریڈیو پاکستان ملتان کی سیر کرانے لے گئے تو اس وقت مجھے آفر ہوئی کہ آپ بچوں کے پروگرام کی باجی بن جائیں۔ کیونکہ خطوط کے حوالے سے اور مجتبیٰ علوی صاحب کے حوالے سے میری ایک پہچان تھی۔ جب آفر آئی تو میں نے اپنے والد صاحب کو بتایا تو انہوں نے اجازت نہیں دی۔ میں رو دھو کر گھر بیٹھ گئی۔ مگر ریڈیو کے لیے لکھنا جاری رہا۔ پڑھائی بھی جاری رہی ایم اے کرلیا۔ پھر شادی ہوگئی اور بچے بھی ہوگئے۔ ایک دن ایسے ہی بیٹھے بیٹھے اپنے میاں سے کہا کہ مجھے ریڈیو پہ کام کرنے کا شوق ہے تو کہنے لگے کہ جاؤ تمہیں کس نے منع کیا ہے۔ تب میرے میاں مجھے خود ہی ریڈیو ملتان لے گئے آڈیشن کے لیے اور الحمدللہ میں کامیاب بھی ہوگئی۔ پھر 3 سال میں نے ریڈیو ملتان میں کام کیا۔ یعنی 1994ء سے 97ء تک ابتدا میری ملتان سے ہوئی۔ اس وقت میں تین زبانوں میں پروگرام کیا کرتی تھی پنجابی، سرائیکی اور اردو۔ 1997ء تک پروگرام کرنے کے بعد 97ء میں ہی میں کراچی آگئی تھی اور تب سے اب تک ریڈیو پاکستان کراچی سے ہی وابستہ ہوں اور ابھی حال ہی میں مجھے ڈبل اے کیٹیگری اناؤنسرز میں شامل کیا گیا ہے۔"

○ "دوسرے ایف ایم سے آفرز آئیں جیسا کہ آج کل ہوتا ہے؟"

☆ "نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ کیونکہ ہمارے ریڈیو پاکستان کراچی کا ٹمپرامنٹ دیگر چینل سے بہت مختلف ہے۔ بہت سلو بہت سوبر، ایک چیز بھی بغیر اخلاقیات کے ہم آن ایئر نہیں دے سکتے، جبکہ پرائیویٹ چینلز

میں ایسا نہیں ہو رہا اور ان کو بھی پھر اچھلتے کودتے کمپیئر اچھے لگتے ہیں۔ ہمارا تو شروع سے جو ٹمپرامنٹ چل گیا یا بن گیا، ہم اسی پہ چل رہے ہیں اور کبھی خود سے بھی کوشش نہیں کی کہ کسی دوسرے چینل پر جانے کی۔ لیکن جب کبھی کہیں ڈبنگ کے لیے جاتی ہوں تو سب بہت تعریف اور حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔"

○ "کمرشل کے لیے بھی وائس اوور کرتی ہیں؟"

☆ "بالکل کرتی ہوں، سرائیکی اور پنجابی کمرشلز کے لیے بلاتے ہیں۔ اردو میں بھی کرتی ہوں۔ یہ کام تو ریڈیو کے ساتھ ساتھ چلتے ہی رہتے ہیں۔"

○ "ایف ایم 93 میں آپ کا پروگرام کب کب ہوتا ہے اور پروگرام کا فارمیٹ کیا ہوتا ہے؟"

☆ "ٹائمنگ تو ہماری چھ سے سات گھنٹے ہوتی ہے اور تین شفٹوں میں ہمارا کام ہوتا ہے میں زیادہ تر شام کی شفٹ کرتی ہوں ہفتے میں تین دن میں پروگرام کرتی ہوں اور چھ، سات گھنٹے ریڈیو پہ لگ ہی جاتے ہیں۔ اس دوران نیوز آجائے تو وہ بھی پڑھ لیتی ہوں۔ کوئی اناؤنسمنٹ آجائے تو وہ بھی کرلیتی ہوں اور کبھی کبھار بحیثیت "ڈی او" کے بھی مجھے بک کرلیا جاتا ہے۔ یعنی کوئی ایک کام نہیں ہوتا۔ دیگر کام بھی نکلتے ہی رہتے ہیں اور فارمیٹ تو تفریح ہی مہیا کرنا ہوتا ہے۔ مگر ساتھ ساتھ کرنٹ افیئرز کی باتیں بھی ہوتی

ہیں۔ دن کے حساب سے بھی ہوتا ہے کہ کوئی خاص دن آگیا تو اس کے مطابق پروگرام کرلیتے ہیں۔ کسی خاص شخصیت کا دن ہے تو اس پہ پروگرام کرلیتے ہیں۔ بس اسی طرح سے ہمارے پروگرام ہوتے ہیں۔"

○ "لائیو ہوتے ہیں پروگرام؟ عجیب کالز آتی ہیں؟"

☆ "جی جی بالکل۔۔۔ لائیو ہوتے ہیں سامعین سے بات ہوتی ہے۔ ان کے فرمائشی گانے بھی سنواتے ہیں۔ ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی ہے۔ بس کوئی خاص ٹاپک نہیں ہوتا۔ جب کالز آتی ہیں تو ہم پوچھ لیتے ہیں کہ آپ نے کیا بات کرنی ہے تو گزشتہ دنوں ایک صاحب کی کال آئی تو میں نے پوچھا کہ آپ نے کیا بات کرنی ہے تو کہنے لگا 'میں نے آپ سے اپنے دل کی باتیں کرنی ہیں' تو میں نے پھر وہ کال نہیں لی 'کیونکہ ہمارا چینل بولڈ نہیں ہے۔"

○ "آپ کے میاں صاحب پسند کرتے ہیں آپ کے پروگرام؟"

☆ "میرے میاں نہیں سنتے ریڈیو اور نہ ہی میرا پروگرام اور اس بات کا تو مجھے بہت افسوس ہے۔ لیکن نہیں آنا جانا ہو تو پھر لے بھی جاتے ہیں۔"

○ "موڈ کا یا خراب طبیعت کا اثر یا کبھی ڈیپریشن کا اثر پروگرام پر ہوتا ہے؟"

☆ "ہمارے اساتذہ نے ہمیں بتایا تھا کہ جب ایک آر جے یا اناؤنسر اپنی ڈیوٹی پہ آتا ہے تو اگر اس کے پیر پہ چوٹ بھی لگی ہے اور خون بھی بہہ رہا ہے تو سامعین پہ ظاہر نہ ہونے دے کہ میں تکلیف میں ہوں۔"

○ "یہ تو اپنی چوٹ ہے 'مگر جو چوٹ دل پہ دوسرے لگاتے ہیں یا گھر میں کوئی لڑائی جھگڑا ہو جاتا ہے تو پھر اس وقت پروگرام کرنے میں کوئی دشواری ہوتی ہے۔"

☆ "میں اپنے تمام مسائل 'جھگڑے اسٹوڈیو کے باہر رکھ کر مائیک کے آگے آتی ہوں۔ راستے بھر قرآنی آیات کا ورد کرتی ہوئی جاتی ہوں کہ میں جس کام کے لیے جارہی ہوں اللہ مجھے اس میں کامیاب کرے۔ بالکل ریلیکس ہو کے جاتی ہوں۔"

○ "جو لڑکیاں لڑکے اس فیلڈ میں آنا چاہتے ہیں 'ان کو آپ کیا مشورہ دیں گے؟"

☆ "جو اس فیلڈ میں آنا چاہے 'اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ حالات حاضرہ سے واقف ہو پراعتماد ہو۔ کیونکہ اگر آپ میں خود اعتمادی ہوگی تو آپ ایک پوائنٹ کو بھی بہت آگے تک لے جاسکیں گے۔"

○ "ریڈیو سننے والوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ آواز سے لوگ پہچان لیتے ہیں؟"

☆ "جی بالکل پہچان لیتے ہیں۔ میں ایک دن پرفیوم کی دکان پہ گئی تو وہاں مجھے دکاندار نے کہا کہ میڈم آپ کی آواز کچھ جانی پہچانی لگ رہی ہے۔ کیا آپ کا تعلق ریڈیو سے ہے؟ تو میں نے کہا۔ ہاں۔۔۔ تو کہنے لگا کہ میں ریڈیو بہت زیادہ سنتا ہوں 'مگر آپ کا نام ذہن میں نہیں آرہا 'پھر میں نے بتایا کہ ہاں میں ریڈیو پہ کام کرتی ہوں۔"

○ "آپ بتا رہی ہیں کہ آپ کے یعنی ریڈیو پاکستان کے پروگراموں میں دوسرے چینلز کی طرح ہلا گلا نہیں ہوتا۔ تو پھر کس عمر کے لوگ آپ کا پروگرام سنتے ہیں؟"

☆ "سچ بات تو یہ ہے کہ ہمارے چینل کے پروگراموں کو نوجوان نسل نہیں سنتی۔ اس لیے کہ ہم گانے بھی پاکستانی ہی لگاتے ہیں 'جبکہ نئی نسل انڈین گانے پسند کرتی ہے۔ ہمارے پروگرام مڈل ایج کے لوگ زیادہ شوق سے سنتے ہیں۔"

○ "اب تھوڑے سے نجی سوال ہو جائیں۔ اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتائیے؟"

☆ "میرا تعلق ملتان سے ہے۔ وہیں پلی بڑھی۔ تعلیم بھی ملتان سے حاصل کی۔ 18 ستمبر میری پیدائش کا دن ہے۔ والد صاحب کا بہت عرصہ پہلے انتقال ہوگیا تھا۔ والدہ حیات ہیں۔ اللہ انہیں زندگی دے۔ اپنے وقت میں وہ بہت ایکٹیو تھیں اور ابھی بھی ایکٹیو ہیں اور گھر میں ہی انہوں نے بوتیک کھولا ہوا ہے۔ خواتین آتی ہیں 'ان سے لین دین کرتی ہیں۔ بس اس میں وہ مصروف رہتی ہیں۔ میرے چار بھائی ہیں۔ میں اکیلی ہوں اور میں نے اسلامیات میں ایم اے کیا ہے۔"

○ "شادی کب ہوئی؟ اور بچے یا میاں صاحب اس فیلڈ میں ہیں؟"

☆ "میری شادی ماشاء اللہ 1988ء میں ہوئی اور ارینج میرج ہے اور میرے میاں کا ایرکنڈیشن کا بزنس ہے اور ماشاء اللہ دو بیٹے ہیں میری کوشش تھی کہ میرے بچے اس فیلڈ میں آئیں مگر وہ نہیں آئے۔ مجھے یاد ہے جب میں اپنے بڑے بیٹے کو جب وہ چھوٹا تھا تو میں بچوں کی دنیا میں لے جاتی تھی 'تو کچھ عرصے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں اسے زبردستی لے جارہی ہوں۔ اسے کوئی شوق نہیں ہے۔ پھر میں نے اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیا۔ بڑے بیٹے نے تو کہنا مان کر ایک آدھ پروگرام کرلیا۔ مگر چھوٹے بیٹے کو ایک مرتبہ میں زبردستی لے کر گئی تو اس نے تو مائیک پہ اپنا نام تک نہیں بتایا اور جب میں نے گھر آکر پوچھا تو کہنے لگا کہ جب میں نے آپ کو کہہ دیا تھا کہ مجھے مائیک پہ نہیں بولنا 'تو میں آپ کو کیوں جواب دیتا۔ بس ان کو شوق ہی نہیں ہے 'انہیں اپنے والد کی طرح بزنس کرنے کا شوق ہے۔"

○ "آپ نے اسلامیات میں ایم اے کیا کیا کام آتا ہے؟"

☆ "نہیں۔۔۔ بس ڈگری لینی تھی 'سو لے لی ہمیں نے سوچا کہ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے تو یہ سبجیکٹ مجھے آسان لگا تو میں نے اسے ہی لے لیا۔"

○ "ہنس مکھ ہیں یا سنجیدہ؟"

☆ "میرے خیال میں اچھی خاصی خوش مزاج ہوں 'لیکن چونکہ میں ایک نارمل انسان ہوں تو کبھی کبھار غصہ بھی آجاتا ہے اور میرا غصہ زیادہ تر بچوں پہ ہی نکلتا ہے۔"

○ "بچے کتنے بڑے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟"

☆ "بڑے بیٹے کا نام محمد جنید ہے جو کہ ماشاء اللہ سے 23 کا ہے اور دوسرا محمد ابوبکر ہے جو کہ 20 سال کا ہے۔"

○ "بچے دو ہی اچھے؟"

☆ "جی بچے دو ہی اچھے 'ورنہ بتانا پڑتا ہے کہ کون سے دو اچھے ہیں اور کون سے اچھے نہیں ہیں۔" (قہقہہ)

○ "آپ کی کمائی کہاں جاتی ہے؟"

☆ ہنستے ہوئے "میری کمائی میرے کپڑوں اور میری جیولری پہ ختم ہو جاتی ہے مجھے کپڑوں اور جیولری کا جنون کی حد تک شوق ہے۔

○ "زندگی کو کس انداز میں لیتی ہیں! کبھی کرائسس سے گزریں؟"

☆ "اس انداز میں کہ اللہ جتنے وسائل دے اسی کے اندر رہ کر انسان کو انجوائے کرنا چاہیے۔ اور زندگی کو رو کر گزارنے کی بجائے وسائل کے اندر رہ کر گزاریں۔ بہت زیادہ کرائسس سے گزری اور ہم میاں بیوی نے ایک دوسرے کا اتنا ساتھ دیا کہ ہم بھول گئے کہ ہمارے اوپر کچھ مشکلات ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آسانی سے نکال بھی دیا۔ اور میں رب کا شکر ہی ادا کرتی ہوں۔ شادی کے بعد کرائسس بھی دیکھا۔ انجوائے بھی بہت کیا۔ دوسرے ملکوں کی سیریں بھی کیں۔ زندگی کو ہر رنگ میں دیکھا ہے۔"

○ "سیاست 'کھیلوں اور ڈرامے کا شوق ہے؟"

☆ "سیاست سے تو بالکل لگاؤ نہیں ہے۔ کرکٹ کبھی کبھار دیکھ لیتی ہوں۔ ڈرامے شوق سے دیکھتی ہوں۔ ٹاک شو نہیں دیکھتی کہ سوائے لڑنے کے اور ہوتا ہی کیا ہے۔"

○ "اس فیلڈ میں کسی کے لیے کچھ کہیں گی؟"

☆ "جی بالکل 'مجھے کمپیئرنگ کرنا اور اسکرپٹ لکھنا جن دو شخصیات نے سکھایا میں ان کی شکر گزار ہوں۔ ایک نور حسن جعفری صاحب اور دوسری ربیعہ اکرم صاحبہ۔ انہوں نے میری بہت رہنمائی کی۔" اور اس کے ساتھ ہی ہم نے گلنار صاحبہ سے اجازت چاہی۔

☆ ☆

دلِ دھیان کی سیڑھیاں

ادارہ

نوشابہ منظور..... بھریا روڈ

1 ۔ (ہاہا) یہ کیا سوال پوچھ لیا' جتنی سستی کی ماری میں ہوں کہ سال کی شروعات میں جو پلان کروں گی وہ اس سال تو کیا اگلے سال میں بھی مکمل کرلوں تو بڑی بات ہے۔

2 ۔ صرف ہندسے کے بدل جانے سے زندگی پہ طاری جمود پہ کوئی فرق پڑتا ہے۔ اس معاملے میں میری رائے یہ ہے کہ جیسے ہر گزرا دن آنے والے دن سے مختلف ہوتا ہے' اسی طرح ہر سال بھی گزرے سال سے مختلف ہوتا ہے۔ کہیں نا کہیں کوئی ایسی بات' کسی شخصیت سے ملاقات ہو جاتی ہے جو یہ جمود ختم کر دیتی ہے' یہ میری اپنی رائے ہے۔

3 ۔ اس سال میں تو ایسی کوئی خاص خبر نہیں' جس نے متاثر کیا ہو' مگر گزرے سال ملالہ یوسف کے بارے میں بہت خبریں سننے کو ملیں' پہلے تو تمام قوم کی طرح ہماری ساری ہمدردیاں ملالہ بی بی کے لیے تھیں' مگر اب جب یہ پڑھا کہ ملالہ امریکہ کی ایجنٹ ہے تو بہت دکھ ہوا' اب حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے۔

4 ۔ واقعی ہی یہ زندگی کا اصول ہے' لوگ ملتے ہیں بچھڑ جاتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس سال کوئی اپنا نہیں بچھڑا۔ مگر جواب ہم میں نہیں وہ زندگی کی ہر خوشی' ہر غم میں یاد آئے اور ان کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ کس نے زندگی میں شامل ہو کر اس کی رعنائیوں کو مجھ پر منکشف کیا۔ اس سوال کا جواب پھر کبھی سہی۔ (ہاہا)

5 ۔ جنوری کے امیدوں بھرے موسم میں میرا زندگی سے بھرپور پیغام سب سے پہلے تو سحر میری کزن کے نام' جس کی فروری میں شادی ہے۔ خدا کرے کہ نیا سال اور اس کی زندگی کا نیا سفر اس کے لیے بہت سی خوشیاں لے کر آئے۔ اس کے بعد ناہید خالہ کے لیے کہ ایسا ہو جائے جس طرح کچھ سال پہلے تھا' ہر اسٹوری پڑھ کے اسے فون پہ ڈسکس کرنا اب وہ پہلے سے زیادہ مصروف ہو گئی ہیں۔ اس لیے یہ پیغام بھی ہے اور دعا بھی کہ آنے والے سال میں انہیں کچھ وقت میرے لیے بھی مل جائے۔ اب میری طرف سے ناہید' سحر' صبا' ندا' عروج اور تمام پڑھنے والوں کو نیا سال بہت بہت مبارک ہو' اب اجازت دیں' اللہ حافظ۔

پلوشہ گل..... کوٹ ادو

1 ۔ سال کے شروع میں یہ پلان کرتی ہوں کہ نیا سال بہت اچھا ثابت ہو۔ میری وجہ سے کسی کو کوئی تکلیف نہ ہو اور زیادہ سے زیادہ اپنی پڑھائی کو اچھے سے پورا کرنے کا سوچتی ہوں اور یہ کہ غریبوں کی جہاں تک ہو سکے مدد کر سکوں۔

2 ۔ میرے مطابق ہندسے بھی انسان کی زندگی میں اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ جیسے کہ ہندسے کے بدلنے سے تاریخ' ماہ' سال بدل جاتے ہیں' ویسے ہی ہندسے کے بدلنے سے زندگی پر طاری جمود پر بھی فرق پڑتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں انسان کے لیے ہندسے بھی غمی یا خوشی کا باعث بنتے ہیں۔

3 ۔ 15 اگست 2013ء میں پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد کو ایک مسلح شخص سکندر نے چھ' سات گھنٹے یرغمال بنائے رکھا۔ پورا پاکستان سنسناہٹ کا شکار تھا۔ کسی پارٹی' کسی سیکورٹی' کسی پولیس' کسی فوج' کسی حکمران سے اتنے گھنٹوں تک کوئی کارروائی نہ ہو سکی؟ اپنے اپنے گھروں میں صرف پاکستان کا تماشا بنتے دیکھتے رہے۔ صرف ایک مسلح شخص پورے پاکستان پر حاوی ہو گیا تھا؟ اس وقت ہمارے رہنما کہاں تھے؟ میں خود ایک جرنلزم کی اسٹوڈنٹ ہوں' اس وقت دل میں ایک بے چینی تھی کہ کاش میں کچھ کر سکتی وہاں جا کر' صرف ایک مسلح شخص کو گرفتار کرنا ہمارے حکمرانوں کے لیے مشکل بن گیا تھا؟ پاکستان کی بدنامی کس طرح کی جا رہی تھی' ایسے میں زمرد خان میدان میں اترا اور سکندر کو قابو کر لیا' اگر زمرد خان نے پاکستان کی لاج بچائی تو لاج بچانے والے کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا' یہ حالات ہیں ہمارے اپنے پاکستان کے۔

4 ۔ میری ایک پیاری دوست ناظمہ جنوری 2013 میں وفات پا گئی جس کی جدائی سے مجھے گہرا غم ملا' خدا اسے جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے (آمین) اور دسمبر 2013ء میں میرے ماموں کا چھوٹا سا چار سالہ بیٹا ایک ٹریفک حادثے میں خالق حقیقی سے جا ملا' اس کی وفات نے بھی بہت غم دیا' اس کی پیاری پیاری چھوٹی چھوٹی باتیں جب یاد آتی ہیں تو آنکھوں سے آنسو بہہ جاتے ہیں اور سال 2013ء میں میری ایک فرینڈ فروا اور منا ہل کی دوستی میرے لیے باعث خوشی ہے فروا نے مجھے بہت اچھی باتیں سکھائی ہیں اور اچھے برے میں فرق کی پہچان بھی سکھائی۔

5 ۔ جنوری کے امیدوں بھرے موسم میں میرا زندگی سے بھرپور پیغام میری ہونے والی بھابھی کلثوم کے لیے کہ وہ ہمارے گھر آئیں اور ہم سب کی زندگی میں شامل ہو کر خوشحالی کی طرف قدم بڑھائیں اور میری فرینڈ' فروا' سائرہ' ارم کے لیے یہ پیغام ہے کہ وہ ہمیشہ میرے ساتھ مخلص رہیں۔

حافظہ سمیرا..... 157 این بی

1 ۔ ہر نئے سال تو کیا میں تو ہر نئے دن کے آغاز پر یہی دعا اپنے رب سے کرتی ہوں کہ اللہ آج کچھ برا نہ ہو ہمیں اپنے رحمت کے سائے تلے جگہ اور سچی خوشیاں عطا فرما۔

2 ۔ کچھ لمحے گزارتے ہیں ہمیں' کچھ لمحوں سے ہم گزارہ کرتے ہیں کچھ زندگی گزارتی ہے ہمیں کچھ زندگی سے ہم گزارہ کرتے ہیں میں یہ کہوں گی کہ نجانے کتنے ہندسے بدل گئے لیکن زندگی ویسی کی ویسی ہی ہے۔ ہاں البتہ ہر سال گزرنے کے بعد ایک سال ہم بڑے ہو جاتے ہیں اور زندگی کا ایک سال کم ہو جاتا ہے۔

3 ۔ اس سوال سے میرے ذہن میں فوراً "سکندر" آتا ہے۔ جی ہاں! وہ شخص جس نے پورے پانچ گھنٹے اسلام آباد کو اپنی انگلی پہ نچائے رکھا کسی شخص کو اپنے قریب پھٹکنے تک نہیں دیا واہ! کیا ہمت تھی اس شخص کی کہ پاکستان کی فوج اور پولیس اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی۔

4 ۔ زندگی میں بہت سے لوگ ملے اور بچھڑ گئے کچھ پل بھر کو یاد رہے اور کچھ مہینوں' لوگ ملتے رہے اور بچھڑتے رہے لیکن زندگی کا سفر رکا نہیں۔ اس سال بھی بہت سے لوگ ملے اور بچھڑ گئے لیکن ایک شخص ایسا ہے جسے میں نے پہلی بار دیکھا تو زندگی کی خوبصورتی کا احساس ہوا اور میں نے اپنے رب سے شدت سے اس کے ملنے کی دعا مانگی۔ گزرے برس میں اس شخص کو میں نے دیکھا اور پھر کھو دیا۔

میں تم سے کچھ نہیں کہتی فقط اتنی گزارش ہے
کہ اتنی بار مل جاؤ' جتنا یاد آتے ہو

5 ۔ نئے سال کے موقع پر قارئین کے نام ایک چھوٹا سا پیغام' چند چھوٹی چھوٹی برائیاں جنہیں ہم نظر انداز کیے ہوئے ہیں لیکن حقیقت میں بہت بڑی ہیں ایسی ہی ایک برائی غیبت ہے پلیز اس سے بچیں کیونکہ ہم اپنے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی اس وقت کر رہے ہوتے ہیں جب ہم کسی کی غیبت کر رہے ہوتے ہیں ہم اپنی نیکیاں بن مانگے کسی اور جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔

ام ثمامہ..... جھڈو سندھ

1 ۔ اس سے پہلے کہ قلم صفحہ قرطاس پر اپنے رنگ

محبت کرنا بہت سی یادیں بہت سے چہرے بہت سے
لمحے آنکھوں کے آگے سے گزرے اور آنسوؤں کی صورت میں کاغذ بھگو گئے۔ میری کتاب زیست میں اس ماہ و سال کا حساب کتاب نہیں ہے۔ ہر آنے والی نئی تاریخ اداسی یادوں امیدوں اور دعاؤں کے حوالے ہے۔ ان دو سالوں میں ایک بات تو سیکھی ہے کہ پلان کرنے سے کچھ نہیں ہوتا کاتب تقدیر نے جو لکھا ہو وہ ہو جاتا ہے چاہے اس کے بارے میں خواب و خیال میں بھی نہ سوچا ہو۔ ہاں اپنے رب سے اپنوں کی صحت زندگی اور سلامتی مانگنی چاہیے' ہاں یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ گزشتہ سال ہم سے جانے انجانے میں جو غلطیاں ہوئیں آئندہ سال ہم وہ نہ کریں اور کسی گرتے کا ہاتھ تھام لیں' کسی روتے کے آنسو پونچھ دیں' کسی روٹھے کو منالیں' خاموشی سے کسی ضرورت مند کی مدد کردیں۔ اس طرح کی پلاننگ دنیا و آخرت دونوں میں کامیاب رہتی ہے۔

2 ۔ اگر صرف ہندسے بدل جانے سے زندگیاں بدل جاتیں تو ہر ڈوبنے والا سورج روتے ہوئے چہروں کو مسکراہٹ دے پاتا اور ہر ابھرنے والا چاند مسکراتے چہروں پر سے خوشیوں کے رنگ ماند نہ کر پاتا۔

زندگی پر طاری جمود تاریخیں بدلنے سے نہیں سوچ اور عمل بدلنے سے ٹوٹتا ہے۔ دلوں کے دروازوں پر اپنوں کے لیے قفل مت لگائیے ورنہ یہ جمود کبھی کبھی پوری زندگی پر محیط ہو جاتا ہے۔

3 ۔ اس سوال کا جواب یقیناً" ایک ہی ہے مصر کی تحریک اور محمد مرسی کس طرح وہاں حق کا بول بالا ہوا ـــــ ظلم و بربریت کی ایک داستان ہے جو خون سے رقم کی جارہی ہے۔ عالمی سطح پر ہر وہ عظیم شخص جو کشمیر' فلسطین' بوسنیا' شام' عراق' بنگلہ دیش' افغانستان میں اسلام کے بول بولے اور آزادی کے چراغ روشن کرنے کے لیے اپنے لہو کا آخری قطرہ بھی نچھاور کرنے کو تیار ہے قابل احترام ہے' حق کی راہ کٹھن ضرور ہے مگر یہ میرے رب کا وعدہ ہے کہ باطل مٹ جانے کے لیے ہیں اور حق چھا جانے کے لیے۔

4 ۔ یہ زندگی کا اصول ہے کہ موت اٹل حقیقت ہے مگر یہ حقیقت جانے والوں کے بعد اک ایسا خلا زندگی میں چھوڑ جاتی ہے جو کبھی پر نہیں ہوپاتا زندگی کا کارواں چلتا رہتا ہے مگر مسکراہٹوں اور روشنی کے رنگ ختم ہو جاتے ہیں۔ اس سال تو نہیں مگر پچھلے سال وہ شخص بچھڑ گیا جو میرا عشق ہے یعنی میرے مرحوم اور اکلوتے بھائی جان آفتاب خان لودھی اور پھر کچھ ایسے اپنے اور پیارے جن سے آخری سانسوں تک کے رشتے ہیں۔ وقت' غلط فہمیوں اور لوگوں کی بھیڑ میں ان کا ہاتھ بھی ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔

ہاں اس سال اک دوست کی طرف سے ملنے والا اک احساس خوش کن تھا کہ دوستی بڑی چیز ہوتی ہے اب بھی اچھے لوگ اور اچھائی دنیا میں موجود ہے کوئی ہے جو ہر وقت آپ کے ساتھ ہے۔

5 ۔ جو ابدی جدائی دے گئے ان کے لیے تو صرف دعائے مغفرت ہے مگر جو روٹھے ہوئے ہیں ان سے صرف ایک گزارش ہے کہ اس سے پہلے کہ زندگی کی کتاب ہمارے لیے بھی بند کردی جائے' اعمال کی سیاہی اور قلم سمیت لیے جائیں پلیز لوٹ آؤ قتل کے مجرم کو بھی سزا سنانے سے پہلے صفائی کا موقع ضرور دیتے ہیں۔ صائمہ آفتاب کے نام بہت مان پیار اور امید کے ساتھ!

محبت روٹھ جائے گی
آس بھی ٹوٹ جائے گی
میرے ہاتھوں کے دامن سے
دعا بھی چھوٹ جائے گی
جو خود ہی ٹوٹ جائے تو
انہیں توڑا نہیں کرتے
سنو! گھر چھوڑا نہیں کرتے

ظل ہما۔ فیصل آباد

1 ۔ میں کچھ زیادہ پلان تو نہیں کرتی تاہم تعلیم اور جاب کے حوالے سے ترجیحات ضرور طے کرلیتی ہوں۔ مجھے اس بات پہ مکمل یقین ہے کہ "میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے اللہ کو پہچانا۔" سو پلان نامکمل رہنے پہ دکھ تو ہوتا ہے مگر وقتی کیونکہ اس میں بھی میرے مالک کی مصلحت ہوتی ہوگی۔

ہم Sagitarious لوگوں کی بیماری ہے کہ ہم توقعات بہت رکھتے ہیں اور اسی عادت کے باعث دکھوں میں اکثر خود کفیل رہتے ہیں۔ ہمارے پلانز میں اکثر دوسروں سے توقعات بہت زیادہ ہوتی ہیں سو پلانز ٹوٹتے بھی اسی حساب سے ہیں۔

دل سے لٹ کر بھی سخاوت کی تمنا نہ گئی
کوئی اجڑا ہوا آئے تو دعا لے جائے؟

2 ۔ ایسا بھلا کہاں ہوتا ہے؟ ہندسے بدلنے سے کبھی زندگی نہیں بدلا کرتی۔ زندگی کو بدلنے کے لیے تو محنت کے ساتھ اچھی قسمت کی ضرورت ہوتی ہے اور سکہ رائج الوقت کی اور ہمارے قومی ٹرینڈ کی بات کیجیے تو قسمت بدلنے کو تعلقات' طاقت اور پیسہ سب سے اہم ٹھہرتا ہے۔

ہمارے دل میں اترتی تھیں آفتیں محسن
ازل سے شہر میں خالی مکان تھے ہم جیسے

2013 اگر مجھ میں کچھ تبدیلی لایا تو صرف چند ایک' میرا ایم فل کا پہلا سمسٹر مکمل ہوا' ایم اے انگلش پارٹ ٹو کی تیاری اسٹارٹ کی' انگلش ٹیچر کے طور پر جاب اسٹارٹ کی۔ بہت سے سبق آموز لوگوں سے واسطہ ہوا مگر ہم نے اپنی روش کہاں بدلنا؟ ہم دھوکہ کھا کے پھر انہی لوگوں کے ساتھ خلوص برتتے ہیں۔

کھنڈر ہے عہد گزشتہ' نہ چھو نہ چھیڑ اسے
کھلیں تو بند نہ ہوں اس کی کھڑکیاں محسن

3 ۔ میڈیا نے زندگی اگر آسان کی ہے تو اس سے کئی گنا زیادہ مشکل بھی کردی ہے۔ ایک پاکستانی کے طور پر الیکشن نتائج نے بہت متاثر کیا۔ صرف چہرے بدلے ورنہ عوام کے لیے فرق صرف آقاؤں کے بدلنے کا ہے۔ پولیٹیکل سائنس کی اسٹوڈنٹ کے طور پر ان وعدوں اور پالیسیز کی حقیقت بھی مجھ پر عیاں ہے اور مئی سے دسمبر تک کا وقت پوری قوم کے لیے ٹرائل پیریڈ کی طرح سب ظاہر کرچکا ہے جو کہ شاید چند سال لیے ہوں گے جو کہ عمران خان کے بقول حکومت کا ہنی مون پیریڈ تھا۔ مجھے سب سے زیادہ متاثر نیلسن منڈیلا اور عبد القادر ملا نے کیا۔ نیلسن منڈیلا جیسا لیڈر کاش ہمیں بھی مل جائے اور عبد القدر ملا کی بنگلہ دیش میں پھانسی کو کیا کہوں؟ اتنا ہی کافی ہوگا کہ ہم واقعی محسن کش قوم ہیں۔ سلطان ٹیپو کو ایک میر جعفر ملا تھا ہم پوری قوم ایسی ہیں کہ اس شخص کو پاکستان سے وفاداری کا صلہ پھانسی کی صورت ملا اور ہم کہتے ہیں یہ بنگلہ دیش کا اندرونی معاملہ ہے (یہ وزیر داخلہ کا بیان تھا) اور ہم قوم رہے بھی کہاں ہیں ہم تو ریوڑ ہیں جہاں چاہے کوئی ہنکا کر لے جائے۔ چھوڑیے یہ زخم بہت گہرے ہیں اور منیر نیازی بھی فرما گئے ہیں۔

آسان نہیں ہے کشش ذات کا سفر
آگہی کے بعد غم آگہی بہت

4 ۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بظاہر کچھ نہیں بدلتا مگر زندگی میں خزاں ڈیرا ڈال دیتی ہے۔ لوگ ساتھ چلتے ہیں مگر میلوں کے فاصلے پر نظر آتے ہیں۔ 18 اکتوبر 2013 وہ دن تھا جب ملن سے لے کر جدائی کی لکیر نے اپنی جھلک دکھلائی۔ وہ پندرہ منٹ دو سال کے تعلق اور رشتے کی حقیقت مجھ پر روشن کر گئے۔ تبھی وہ فیصلہ ہو گیا جو دو سال میں نہیں کرپائی تھی۔ یعنی راستے الگ کرنے کا فیصلہ! دل پر قدم رکھ کر آگے بڑھ جانا!

وہ شخص شہر کے لوگوں میں ڈھلتا جاتا ہے
کہ اس کی بات کا لہجہ بدلتا جاتا ہے!

البتہ ایک بات مجھے کبھی نہیں بھولے گی۔ اپنی پسندیدہ ہستی کو سامنے دیکھ کر دیکھتے چلے جانا' دیکھتے چلے جانا شاید زندگی کا سب سے پسندیدہ منظر ہوتا ہے اور وقت کے بہاؤ کا نہ ٹھہرنا سب سے برا دکھ۔

اب یہ سوچوں تو بھنور ذہن میں پڑ جاتے ہیں
کیسے چہرے ہیں جو ملتے ہی بچھڑ جاتے ہیں

یہ شعر خاص میری زندگی کی اس ہستی کے نام جس نے ہنسانے کا وعدہ کرکے ہمیشہ کے لیے میری آنکھوں

میں کمی بھر دی۔

وہ ریزہ ریزہ میرے بدن میں اتر رہا ہے!
میں قطرہ قطرہ اس کی آنکھوں کو پی رہا ہوں
حقیقت یہی ہے کہ زندگی کسی کے ہونے نہ ہونے سے نہیں رکتی اس کا کام چلتے جانا ہے اور ہم بھی آخر گزر جائیں گے۔

محسن تجھ کو یاد کرے کس ناتے سے؟
جانے والے کوئی خاص نشانی دے
5۔ میرا پیغام ۔ میری زندگی کے ہی نام ہوگا
اگرچہ میں ایک چٹان سا آدمی رہا ہوں
مگر ترے بعد حوصلہ ہے کہ جی رہا ہوں
ملا تو بیتے دنوں کا سچ اس کی آنکھ میں تھا
وہ آشنا جس سے مدتوں اجنبی رہا ہوں
بھلا دے مجھ کو کہ بے وفائی بجا ہے لیکن
گنوا نہ مجھ کو کہ میں تری زندگی رہا ہوں
کہاں ملے گی مثال میری ستم گری کی؟
کہ میں گلابوں کے زخم کانٹوں سے سی رہا ہوں
وہ اجنبی بن کے اب ملے بھی تو کیا ہے محسن
یہ ناز کم ہے کہ میں بھی اس کا کبھی رہا ہوں

صائمہ..... دگھ شریف

1۔ سال کے شروعات میں کبھی ایک کام بھی پلان نہیں کیا بس جو کام جب آجائے اسی وقت کرتی ہوں بس ہر سال ایک عہد کرتی ہوں کہ جو غلطیاں پچھلے سال کی ہیں وہ آنے والے سال نہیں کروں گی۔
2۔ بلاشبہ ہندسوں کا ہماری زندگی میں بہت زیادہ عمل دخل ہے ہندسوں کی روشنی میں ہی جو بھی تاریخ رقم ہوتی ہے درج کی جاتی ہے ہندسے زندگی کے ٹھہراؤ کو جمود کو پگھلا دیتے ہیں۔
3۔ پاکستان کی پلاسٹک سرجری عالمی سطح پر متاثر کن رہی۔ 2013 میں پاکستان میں بیس سے بائیس کروڑ کی پلاسٹک سرجری کی گئی اور یہ رقم ملائیشیا تھائی لینڈ میں ہونے والی پلاسٹک سرجری کے مقابلے میں انتہائی کم ہے ماہرین کے مطابق دوسرے ممالک سے پاکستان میں لوگ پلاسٹک سرجری کروانے کے لیے آتے ہیں جس کی وجہ ایک تو سستی ہے اور دوسرا اس کا رزلٹ بہت اچھا ہے۔
4۔ 2013 میں میرے ابو جی اس دنیا سے چلے گئے یہ غم ساری زندگی ختم نہیں ہوگا اللہ پاک انہیں جنت میں اعلا مقام عطا فرمائے آمین۔ گزرے سال میری زندگی میں کوئی شامل نہیں ہے۔
5۔ میرا زندگی سے بھرپور پیغام میری پیاری فیملی کے لیے ہے عبداللہ' اقراء تم ہمیشہ اپنے فیصلے ٹھیک کرنا اور اپنے کام پوری محنت اور لگن سے کرنا اور ہمیشہ

ثناء شہزاد... کراچی

1۔ جی نہیں میں کوئی پلاننگ نہیں کرتی کیونکہ میں نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ میں جب بھی کوئی پلان بناتی ہوں چاہے کسی بھی حوالے سے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا کبھی پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتا اور اس کے علاوہ ہم چاہے کتنے ہی پلان بنالیں ہوتا وہی ہے جو ہمارا رب چاہتا ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ آپ سب اس سے متفق ہوں یہ ضروری نہیں ہے۔
2۔ نہیں میں اس بات کو بھی نہیں مانتی کہ ہندسے بدلنے سے زندگی پر طاری جمود پر کوئی فرق پڑتا ہے۔ کیونکہ دیکھیں اگر آپ کا دل بالکل اداس ہے' غم زدہ ہے تو چاہے کتنے ہی سال آئیں جائیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں اگر آپ کا دل خوش ہے دل کا موسم اچھا ہے تو پھر تو ہر دن ہی اچھا لگے گا۔
3۔ بالکل نہیں' مجھے کسی عالمی خبر نے متاثر نہیں کیا۔
4۔ یہ بات بالکل حقیقت ہے کہ لوگ ملتے ہی بچھڑنے کے لیے ہیں مجھ سے بھی میری زندگی کی جو سب سے بڑی خوشی تھی' وہ بچھڑ گیا۔ میری منگنی ہوئی تھی' میرے پھوپھی زاد سے جو ـــــ ختم ہوگئی۔ وہ میری زندگی میں بالکل اچانک آئے تھے اور اسی طرح بالکل اچانک چلے بھی گئے۔ مجھے دکھ تو بہت ہوا ان کے

جانے کا مگر مجھے کوئی غم نہیں ہے کیونکہ جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے۔ پتا نہیں اس میں میرے لیے کیا بھلائی پوشیدہ تھی۔ میں ٹوٹ گئی تھی بالکل لیکن پھر میں نے اپنے پیرنٹس اور بھائیوں کی وجہ سے خود کو سنبھال لیا اور جہاں تک بات ہے کس نے آکر زندگی کی رعنائیوں کو منکشف کیا تو ایسا ابھی تک نہیں ہوا میرے ساتھ مگر مجھے امید ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا۔ اس سوال نے میرے زخموں کو تازہ کردیا۔
5۔ میرا پیغام ان سب کے لیے جو اپنی زندگی سے مایوس ہوگئے ہیں۔ کسی بھی وجہ سے زندہ رہنے کی امنگ چھوڑ دی ہے۔ پلیز آپ لوگ ایسا کچھ مت کریں جس کی وجہ سے آپ کے پیاروں کو تکلیف پہنچے۔ آپ خود کو سنبھالیں' اپنے لیے نہ سہی اپنے سے منسلک رشتوں کے لیے۔ ہر دم خوش رہیں' مسکراتے رہیں اور جن لوگوں نے آپ کا دل دکھایا ہے انہیں یہ باور کروادیں کہ ان کے ہونے یا نہ ہونے سے آپ کی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ میرا یہ پیغام سب کے لیے ہے کہ زندگی کو ہمیشہ زندہ دلی سے جئیں۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک بہت ہی خوب صورت نعمت ہے اور یہ ہمارے پاس اس کی امانت بھی ہے جو ہمیں واپس لوٹانی ہے۔ اس لیے زندگی میں چاہے کتنی ہی مشکلات کیوں نہ آئیں آپ حوصلے سے ان کا مقابلہ کریں۔

ثمینہ اکرم... کراچی

1۔ پہلے میں بہت سے اہم کاموں کو پلان کرلیا کرتی تھی۔ سوچا کرتی تھی نئے سال میں مجھے فلاں فلاں کام کرنا ہے۔ ان میں سے بہت سے کام مکمل کرپاتی اور کچھ مکمل نہ ہوپاتے اب سمجھ یہ آئی کہ انسان اپنے کاموں کی کتنی بھی پلاننگ کرلے مگر ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے اگلے پل کی خبر نہیں اور ہم مستقبل کی منصوبہ بندی کرلیتے ہیں۔ میں پچھلے سال اپنے گھر کی اوپری منزل بنانے کے لیے پلان کررہی تھی کہ معیز کی منگنی اور پھر شادی کا سلسلہ چلے گا۔ صرف ایک دن پہلے ہی میں اس کی منگنی (انگیج منٹ) کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ وہ ہوگیا جس بات کا تصور بھی میں نے نہ کیا تھا۔ اچانک جان لیوا حادثے میں میرا شہزادہ بیٹا مجھ سے جدا ہوگیا۔ تب اس بات پر ایمان پختہ ہوگیا کہ انسان کا سوچا کب پورا ہوا ہے۔ اس لیے اب سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیتی ہوں کاموں کو پلان نہیں کرتی۔ کیونکہ ہم اپنے کاموں کی پلاننگ کررہے ہوتے ہیں' جبکہ اللہ اپنی پلاننگ کرتا ہے۔ ہوتا وہی ہے جو رب کعبہ کی مرضی ہے۔
2۔ صرف ہندسے کے بدل جانے سے زندگی پر طاری جمود نہیں ٹوٹتا۔ دن' ہفتے' مہینے اور مہینے سال بنتے چلے جاتے ہیں۔ یوں زندگی کا سفر آہستہ آہستہ آخری منزل کی جانب گامزن ہے۔ دسمبر کے آخری چند دن بے پناہ اداسی لیے ہوتے ہیں۔ ایسے میں کسی بہت پیارے کی یاد دل کو مزید سوگوار کردیتی ہے۔ اب تو ذات پر چھایا جمود ٹوٹتا ہی نہیں' کوئی بات دل کی خوشی کا سبب نہیں بنتی۔ اتنی جلدی پھر نیا سال آگیا۔ جبکہ اب دنوں کی اہمیت میرے نزدیک ختم ہوکر رہ گئی ہے۔ سال کے آنے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہر شے گہری اداسی بھری دھند کی لپیٹ میں ہے۔
3۔ گزرے سال میں مسلم امہ ایسے خون آشام حالات میں گھر گئی کہ تذکرہ کرتے ہوئے قلم رکتا ہے ایسے ناقابل یقین' ناقابل دید مناظر اور دلدوز واقعات رونما ہوئے جن سے انسانیت بھی شرمائے۔ جس پر میڈیا کی مجرمانہ خاموشی اور بے حسی قابل مذمت ہے افراعنہ مصر کے جانشین مصر کے فوجی درندے اپنے ہی نہتے شہریوں پر مشین گنیں اور ٹینک لے کر چڑھ دوڑے' ضعیفوں' عورتوں' بچوں کی لاشوں کے ڈھیر لگا دیے۔ مصر کی فوجی حکومت نے اپنے عوام پر ہر اخلاقیات سے بالاتر ہوکر براہ راست فوجی اقدام کر ڈالا۔ یہ اکیسویں صدی کی مہذب دنیا اور اس کے حواریوں کے منہ پر کھلا طمانچہ ہے۔ فجر کی نماز کے دوران مسجد میں تقریباً" 100 نمازیوں کو شہید کردیا گیا۔ شام نے بھی اپنی نہتی عوام کو خاک و خون

بقیہ صفحہ نمبر 265

نبیلہ عزیز

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کردیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور بے روزگاری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باذ امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دلاور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دلاتی ہیں۔

۳۹
انتالیسویں قسط
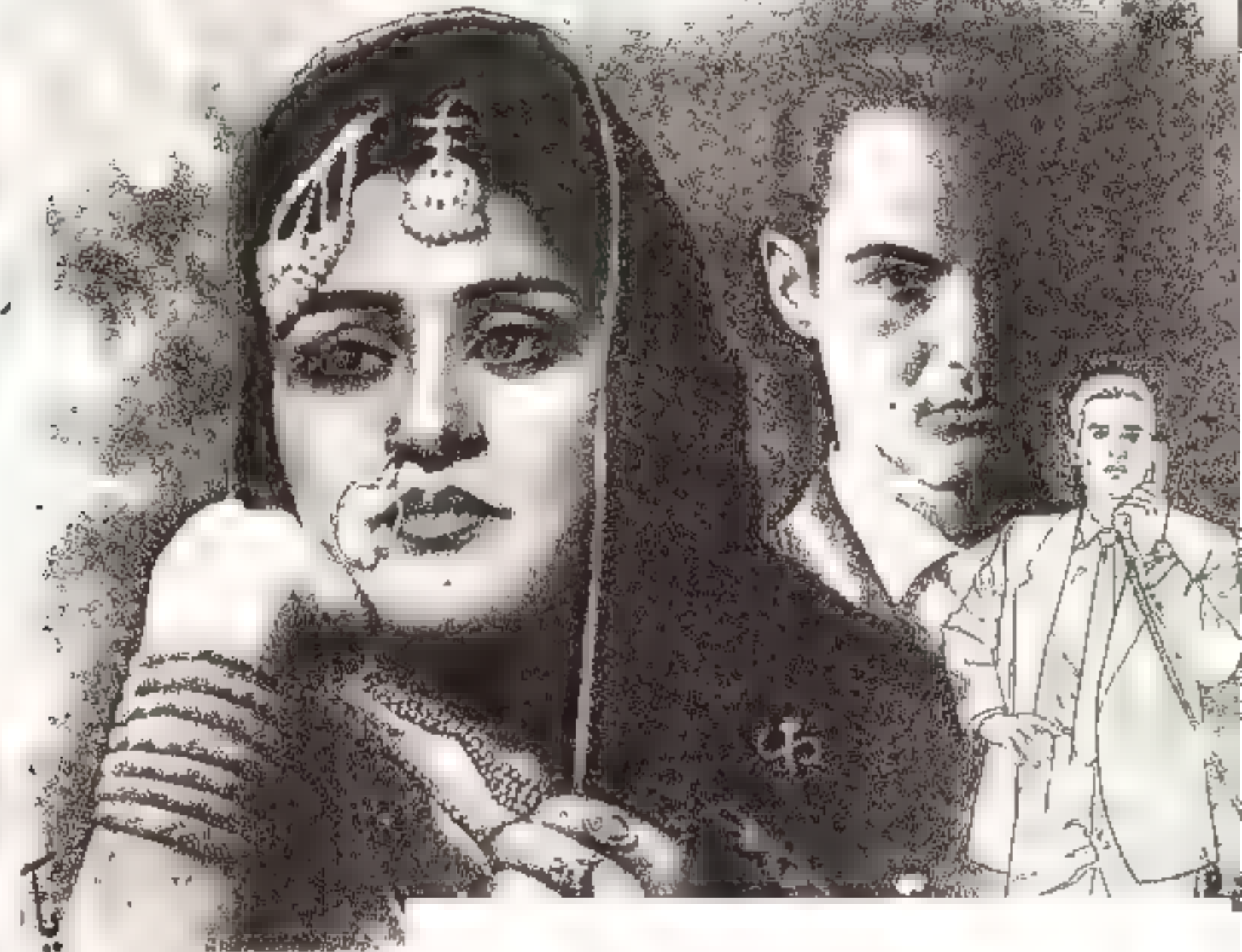
"بھابھی۔"
"ہوں۔"
"گھر چلیں۔" اس نے بڑی معصومیت سے اور بڑی حسرت سے پوچھا تھا۔
"کیوں؟ خیریت ہے؟" نگارش اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے پھیرتے رک گئی۔
"میں گھر جانا چاہتی ہوں بھابھی۔ مجھے گھر لے چلیں پلیز... مجھے گھر لے چلیں۔ میرا دم گھٹنے لگا ہے یہاں مجھے... مجھے وحشت ہونے لگی ہے اس کمرے سے... پلیز خدا کے لیے مجھے گھر لے چلیں۔ میں اب اور یہاں نہیں رہ سکتی میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں، مجھے یہاں سے لے چلیں۔"
زری التجائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے روہانسی سی ہو گئی تھی اور نگارش اس کی ایسی بے بس اور لاچار سی کیفیت پہ دنگ رہ گئی کہ زری اندر سے کتنی گھبرائی ہوئی اور ستائی ہوئی لگ رہی ہے۔ اتنی کہ وہ آخر رہ نہیں سکی اور اپنی بے بسی اور اذیت بیان کر ڈالی ہے۔
"بھابھی پلیز! مجھے گھر لے چلیں۔" اس نے بے چینی سے اور بے بسی سے کہتے ہوئے نگارش کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور نگارش اپنے تعجب کے حصار سے نکل آئی تھی۔
"اوکے اوکے۔ میں عبداللہ سے بات کرتی ہوں۔ وہ ڈاکٹر سے مشورہ کریں گے تو پھر ہم تمہیں گھر لے چلیں گے ڈونٹ وری میری جان ڈونٹ وری۔" نگارش نے اپنے دائیں ہاتھ سے اس کے سر کو تھپکتے ہوئے اس کی پیشانی پہ بوسہ دیا تھا۔
"نہیں بھابھی ڈاکٹر اگر اجازت نہ بھی دیں تو بھی مجھے یہاں سے لے جائیں ورنہ... ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا مر جاؤں گی میں۔" زری کا لہجہ گلوگیر ہو گیا تھا اور آنکھیں بھی پانیوں سے لبریز ہونے لگی تھیں۔
"او کے لے چلیں گے۔" نگارش نے اسے ایک بھرپور تسلی دی تھی اور اتنے میں ڈاکٹرز اور ان کے ساتھ دو نرسیں بھی وزٹ پہ آ گئیں اور ان کے پیچھے پیچھے عبداللہ بھی اندر چلا آیا تھا۔
"ہیلو مس زرین کیسی ہیں آپ؟" ڈاکٹر سلطان نے کافی نرم اور فریش انداز میں اسے مخاطب کیا تھا، لیکن وہ نظریں چرا گئی تھی۔
"ہیلو مس زرین! کیا ہوا؟ کیا ناراض ہو گئی ہیں ہم سے؟ جواب بھی نہیں دے رہیں۔" ڈاکٹر سلطان کافی خوش مزاج آدمی تھے اور زری جب سے ہوش میں آئی تھی وہ اس کے ساتھ بھی اسی طرح بہت فرینڈلی سے انداز میں پیش آتے تھے۔
"وہ آپ سے ناراض نہیں ہے، وہ اس ماحول سے اکتا چکی ہے، گھر جانا چاہتی ہے۔"
زری کے بجائے نگارش نے ان کو جواب دیا تھا اور ڈاکٹر سلطان نے کافی اچنبھے سے زری کی طرف دیکھا تھا۔
"اوہ! تو یہ بات ہے مس زرین گویا آپ ہم لوگوں سے اکتا چکی ہیں خیر کوئی بات نہیں اب ہم اتنے بھی برے نہیں ہیں کہ آپ کو زبردستی اس اسپتال کا مہمان بنائے رکھیں گے۔" ڈاکٹر سلطان نے مصنوعی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے زری کا بی پی چیک کرتی نرس کی رپورٹ کی طرف دیکھا تھا، بی پی نارمل تھا۔
"کیا مطلب؟" زری نے فوراً پوچھا۔
"مطلب یہ کہ آپ ناراض نہ ہوں آپ کے کچھ ٹیسٹ باقی ہیں وہ ہو جائیں تو پھر آپ کو جانے کی اجازت ہے، ہم آپ کو نہیں روکیں گے۔" ڈاکٹر سلطان نے جیسے زری کی ڈوبتی نبضوں کو روانی بخش دی تھی اس نے بے اختیار ان کے چہرے کی طرف دیکھا تھا لیکن بے یقین نظروں سے۔
"آپ سچ کہہ رہے ہیں ڈاکٹر؟" زری نے بہت ہی اشتیاق سے پوچھا تھا۔

"اللہ معاف کرے مس زرین میں جھوٹ کیوں بولوں گا بھلا۔" ڈاکٹر سلطان نے جب سے [illegible] زری ان کی طرف سے ایسے سچ اور ایسی تسلی ملنے پہ بے ساختہ مسکرا دی تھی۔
"ہوں! گڈ گرل بس اسی طرح ہنستی مسکراتی رہیں شاباش۔" ڈاکٹر سلطان نے اس کا سر تھپکتے ہوئے کہا۔ پھر اس کے چند ضروری ٹیسٹ لکھ کر دیے اور دوسرے ڈاکٹر کے ساتھ روم سے باہر نکل گئے تھے۔
"تھینک یو بھابھی! تھینک یو ویری مچ۔" زری نے ان کے جاتے ہی نگارش کا شکریہ ادا کیا اور اب کی بار نگارش مسکرائی تھی۔
"ارے اس کام کے لیے تھینکس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ کام تو میں نے اپنے بھلے کے لیے کیا ہے۔ میں بھی اس اسپتال سے اور اپنے خالی گھر سے اکتا چکی ہوں کیوں عبداللہ آپ کا کیا خیال ہے؟" نگارش نے اپنے قریب کھڑے عبداللہ کو بھی اپنی گفتگو میں گھسیٹا تھا۔
"بالکل جناب تم دونوں سے زیادہ تو میں اکتا چکا ہوں۔ جس کو دن رات بس یہی فکر ستائے رکھتی ہے کہ گھر جانا ہے... اسپتال جانا ہے... گھر جانا ہے... اسپتال جانا ہے۔"
عبداللہ کی بات پہ وہ دونوں ہی ہنس پڑی تھیں کیونکہ وہ بے چارا سچ ہی تو کہہ رہا تھا۔ اسی لیے زری کے ٹیسٹ کروانے میں عبداللہ نے سب سے زیادہ پھرتی دکھائی تھی۔

☼ ☼ ☼

نبیل مومنہ کو گھر چھوڑ کر دوبارہ اسپتال آیا تھا لیکن داخلی دروازہ عبور کرکے وہ راہداری کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے اسے اسپتال کے بڑے... اور کشادہ سے وزیٹنگ روم میں کسی کا شک گزرا تھا اسی لیے وہ الٹے قدموں پہ واپس پلٹا اور دوبارہ وزیٹنگ روم میں جھانک کر دیکھا اس کے ذہن سے گزرنے والا شک یقین میں ڈھل گیا تھا اور وہ اس یقین پہ دل ہی دل میں حیران ہوتا اندر آکر اس کے بالکل برابر بیٹھ گیا تھا۔
"خیریت؟ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟" نبیل نے گردن موڑتے ہوئے اپنے برابر سر جھکا کر چپ چاپ بیٹھے دل آور کو بڑی اپنائیت سے مخاطب کیا لیکن اس کی طرف سے جواب ندارد
"ہیلو! مسٹر دل آور شاہ میں آپ سے مخاطب ہوں۔" اس نے اس کا پورا نام لیتے ہوئے اپنی بات پہ زور دیا جس پہ خاموش بیٹھے دل آور کو اپنے تمام تاثرات کنٹرول کرتے ہوئے مجبوراً اس کی طرف متوجہ ہونا ہی پڑا۔
"کہو؟ کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" دل آور نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے پوچھا۔
"یہاں کیوں بیٹھے ہو؟" نبیل نے اپنا سوال ایک بار پھر دہرایا۔
"اکیلا تھا اس لیے یہاں آکر بیٹھ گیا۔" اس کا جواب بہت نارمل اور بہت نپا تلا سا تھا۔
"اکیلے کیوں تھے؟ علیزے بھابھی کہاں ہیں؟" نبیل کھٹک گیا۔
"اپنوں کے ساتھ!" اس کا دوسرا جواب پہلے سے بڑھ کے تھا۔
"تو پھر تم کیا ہو؟" اس وقت نبیل اسے ٹٹول رہا تھا۔
"ایک اجنبی!" دل آور کو خود بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کیا جواب دے رہا ہے۔
"میں تو سمجھا تھا کہ تم شوہر ہو؟" نبیل نے جان بوجھ کر اسے کریدا۔
"بیویوں کے لیے شوہر سے زیادہ اجنبی اور کوئی نہیں ہوتا۔" دل آور نے بڑے مضبوط لہجے میں اپنا تجزیہ بیان کیا تھا۔
"وہ کیسے؟" نبیل نے جاننا چاہا تھا۔

"وہ ایسے کہ بیویاں اپنے ماں باپ سے' اپنے بہن بھائیوں سے اور اپنی دوستوں سے دل کی ہر بات شیئر کر لیتی ہیں' اپنا دکھ رو لیتی ہیں' لیکن شوہر کے سامنے دل کی بات کو دل میں ہی رکھتی ہیں' شوہر چاہے جتنی بھی محبت کرے' بیوی خود بھی چاہے جتنی بھی محبت کرے مگر دل کی بات کو ہمیشہ دل کی بات ہی رکھتی ہے' شوہر تک نہیں جانے دیتی۔" دل آور کے لفظوں میں اس کا بہت گہرا مشاہدہ بول رہا تھا۔

"تو کیا بیوی کبھی بھی شوہر سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتی؟"

"کرتی ہے۔ ضرور کرتی ہے مگر اس اظہار کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کرتی۔"

"یار! عجیب بات ہے میرے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا اپنی دے' چھوڑو ان باتوں کو' آؤ علیزے بھابھی سے مل لو۔" نبیل نے اس کے کندھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"نہیں ابھی نہیں ابھی اسے اپنے گھر والوں سے مل لینے دو۔" دل آور نے انکار کر دیا۔

"ارے چھوڑو یار! مل چکے ہیں وہ لوگ بھی اور کتنا ملنا ہے بھلا؟ اٹھو اب تم ملو جا کر ویسے بھی تمہارا ملنا اور ہے اور گھر والوں کا ملنا اور۔۔۔" نبیل نے اسے وہاں سے اٹھانے کی کوشش کی۔

"نبیل! پلیز یار تنگ نہ کرو مل لوں گا بعد میں۔۔۔" دل آور جھنجلا گیا تھا۔

"کیا بھابھی کے ساتھ کوئی خفگی چل رہی ہے؟" نبیل مسکرایا۔

"ہوں! یہی سمجھ لو۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اوہ! تو یہ مسئلہ ہے اس لیے روٹھے روٹھے سرکار نظر آتے ہیں چلو کوئی بات نہیں ہم صلح صفائی کروا دیتے ہیں' تم آؤ تو سہی۔" نبیل نے پھر اس کا کندھا تھپکا۔

"نبیل! مجھے اکیلا چھوڑ دو جاؤ' عبداللہ کے پاس چلے جاؤ۔" دل آور نے خفگی اور جھنجلاہٹ سے کہا۔ نبیل اسے ہر طرح سے تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔

"نبیل ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ یار۔" دل آور نے اسے گھورا تھا۔

"انڈر اسٹینڈ کر رہا ہوں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں آؤ میرے ساتھ آؤ' علیزے بھابھی سے مل کر آتے ہیں۔" نبیل نے بھی اپنی بات کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا اور دل آور نہ چاہتے ہوئے بھی ضبط کر گیا۔

"بہت ذلیل ہو تم۔" دل آور بڑبڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور نبیل مسکرا دیا۔

"تھینک یو!" وہ اس نوازش پہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اٹھ کر اس کے ساتھ ہی باہر نکل آیا تھا۔

"ایکسکیوزمی! کیا ہمیں بھی تھوڑی فرصت مل سکتی ہے یا نہیں؟" نبیل نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دروازے پہ دستک دی تھی اور ان سب نے بے ساختہ چونک کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"پلیز! بس تھوڑی دیر۔" نبیل کا اشارہ ان سب کو یہاں سے بھیجنے کی طرف تھا۔ جس کو کوئی اور تو نہ سہی لیکن آسیہ آفندی ضرور سمجھ گئی تھیں۔

آخر ماں تھیں اور مائیں ہمیشہ ہر اونچ نیچ کو سب سے پہلے ہی سمجھ جایا کرتی ہیں وہ بھی دل آور کی خاموشی اور جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر بہت کچھ سمجھ گئی تھیں اسی لیے انہوں نے سب کو باہر جانے کا اشارہ کیا تھا۔

"دانیال بیٹا! آؤ ہم لوگ باہر چلتے ہیں' اتنی دیر میں وہ لوگ مل لیں۔" آسیہ آفندی کہتی ہوئی خود بھی پلٹ گئی تھیں۔

"مما!" علیزے نے نجانے کس خدشے کے تحت انہیں بے اختیار پکارا تھا۔

"ڈونٹ وری علیزے! ہم یہیں ہیں' ابھی تھوڑی دیر میں آجاتے ہیں۔" دانیال نے اسے تسلی دی اور آذر وغیرہ کے ساتھ باہر نکل گیا اس لیے اب کمرے میں صرف وہ تینوں ہی رہ گئے تھے جس پہ نبیل نے گلا کھنکارتے ہوئے

کمرے میں اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔

"السلام علیکم بھابھی! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" نبیل بیڈ کے قریب آتے ہوئے بولا۔

"ہوں! ٹھیک ہوں اب۔ آپ کیسے ہیں؟" علیزے پہلی بار کسی کے منہ سے "بھابھی" کا لفظ سن کر قدرے جھینپ گئی تھی لیکن پھر بھی اس نے محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔

"میں بھی اللہ کا شکر ہے کہ ٹھیک ہی ہوں' اور چاہتا ہوں کہ آپ بھی جلدی سے ٹھیک ہو جائیں اور پھر سے اپنی جنت بسا سکیں۔"

نبیل کی شرارت پر علیزے نے بلا ارادہ ہی دل آور کی طرف دیکھا تھا اور اتفاقاً دل آور نے بھی عین اسی لمحے علیزے کی طرف دیکھا تھا۔

"لیکن میرا خیال ہے کہ جنت بسانے سے پہلے آپ لوگوں کو تھوڑی دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دوں تو زیادہ بہتر ہو گا۔" نبیل مزید چھیڑنے والے انداز میں کہتا پلٹ گیا مگر دروازے کے قریب جا کر ایک بار پھر ٹھہرا تھا۔

"اور ہاں بھابھی! یہ نہ سمجھیے گا کہ یہ چپ ہے تو اسے آپ کی تکلیف پہ کوئی دکھ نہیں ہے یہ بہت گہرا آدمی ہے' سمندر سے بھی زیادہ گہرا۔ اس کو سمجھنا ہے تو گہرائی میں اترنا سیکھیں ورنہ اس نے آپ کی زندگی کے لیے اللہ سے جتنی دعائیں مانگی ہیں اور شکرانے کے جتنے بھی سجدے کیے ہیں وہ آپ کو کبھی بھی نظر نہیں آئیں گے اور کبھی بھی احساس نہیں ہو گا۔ اس لیے ایک بار پھر ایک بار میری بات پہ غور ضرور کیجیے گا۔۔۔" نبیل علیزے کو آگاہ کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور علیزے اس کی بات پر غور کرتی اس کے پیچھے دیکھتی رہ گئی تھی۔

لیکن چند سیکنڈ مسلسل خاموشی کے احساس نے اسے چونکا دیا تھا اور اس نے نظروں کا زاویہ بدلتے ہوئے دل آور کی سمت دیکھا' وہ نظر چرائے ہوئے کھڑا تھا۔

"کیسے ہو ڈرائیور؟" علیزے نے بڑے تحمل سے اس کا حال احوال پوچھا تھا جیسے ان کے تعلقات بڑے دوستانہ رہے ہوں۔ دل آور نے بے ساختہ سر اٹھا کر علیزے کے چہرے کی سمت دیکھا۔

"میں نے تم سے تمہارا حال پوچھا ہے۔" علیزے نے اپنے سوال پر زور دیا۔

"حال سے بے حال کر کے لوگ حال ہی پوچھا کرتے ہیں۔" دل آور ہلکے اور استہزائیہ انداز میں مسکرایا تھا۔

"حال سے بے حال تو میں ہو گئی ہوں' دیکھ نہیں رہے۔" علیزے بے حد آہستگی سے اور مدھم آواز میں بول رہی تھی حالانکہ ڈاکٹرز نے اسے زیادہ بات کرنے سے منع کیا مگر وہ آج سب اپنوں کو دیکھ کر تکلیف کے باوجود بھی چپ نہیں ہو پا رہی تھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بولتی رہے بولتی رہے اور دل کے سارے غبار نکال دے۔

"دیکھ بھی رہا ہوں اور محسوس بھی کر رہا ہوں کہ کاش یہ تکلیف مجھے آئی ہوتی' کاش یہ گولیاں مجھے لگی ہوتیں کاش اس بستر پہ میں ہوتا اور مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی تمہیں دیکھ کر ہو رہی ہے۔"

دل آور نے آگے بڑھ کے اس کے نازک سے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اپنے جذبات اور احساسات کی گرمی کا احساس دلایا تھا۔

"لیکن میں اپنی اس تکلیف پہ بھی بہت خوش ہوں ڈرائیور کیونکہ مجھے اس تکلیف کے عوض میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور سب سے بڑی دولت مل گئی ہے' میرے اپنے۔۔۔ میرے گھر والے۔" علیزے نے بڑے دل سے اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"تمہاری زندگی اور تمہاری خوشی کے لیے ہی تو یہ پیالہ پیا ہے ورنہ ان حالات میں میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ایسا ہرگز نہ کرتا کیونکہ ایسا کرنے کے لیے کسی کے پاس اتنا حوصلہ ہی نہیں ہو سکتا۔" دل آور نے تلخی سے کہتے ہوئے سر جھکا لیا تھا۔

"یہ سب کچھ کیا بھی تو تم نے تھا نا؟" علیزے شکوہ کناں لہجے میں بولی۔
"یہ سب کچھ کیوں کیا میں نے تم یہ نہیں جانتی نا جب جان جاؤ گی تو پھر تم سے پوچھوں گا کہ تم کیا کہتی ہو؟ اور تمہارا انصاف کیا کہتا ہے؟"
دل آور کا لہجہ دھیما اور تلخ ہو چکا تھا۔
"یہ تو بعد کی بات ہے نا لیکن فی الحال میں تمہاری بہت زیادہ شکر گزار ہوں اور تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ تم میری خاطر میرے گھر گئے اور میرے گھر والوں کو لے کر آئے ہو جس کی وجہ سے میں آج اپنی تکلیف بھی بھول گئی ہوں تھینک یو سو مچ ڈرائیور تھینک یو سو مچ"
علیزے نے اپنی طرف سے اس کے احسان کا شکریہ ادا کیا تھا مگر نجانے کیوں دل آور کو یوں لگا جیسے علیزے نے اسے اپنے آپ سے الگ کر دیا ہو' اسے کھڑے کھڑے اجنبی اور غیر بنا دیا ہو۔
"میں نے یہ سب تمہارے اس شکریے کے لیے نہیں کیا علیزے! بلکہ میں نے یہ سب تمہارے لیے کیا ہے' صرف تمہارے لیے" دل آور نے اس کی ذات کے لیے زور دیا تھا۔
"میں نے شکریہ بھی تو اسی لیے ادا کیا ہے نا کہ تم میری خاطر میرے گھر گئے ہو۔"
"اس وقت تمہاری خاطر میں کچھ بھی کر سکتا تھا علیزے...! کچھ بھی۔ چاہے مجھے تمہاری خاطر کسی کا قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑتا۔" دل آور کے اک اک لفظ میں شدت بول رہی تھی اور علیزے ٹھٹکنے اور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔
"کیوں؟ میری خاطر کیوں؟ ہمارے درمیان تو ایسا کوئی جذبہ نہیں ہے جس کے بل بوتے پہ تم کچھ بھی کر گزرو؟" علیزے نقطہ اٹھانے سے رہ نہیں سکی تھی۔
"کل تک میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ ہمارے درمیان کچھ بھی نہیں کوئی جذبہ ہی نہیں ہے۔ لیکن جیسے ہی تم سے جدا ہونے کا خیال گزرا سمجھ لو روح پہ ایک عذاب گزرا ہے۔ اک ایسا عذاب جس میں یہ جان لیوا ادراک ہوا کہ سارے جذبے ہمارے درمیان ہی تو ہیں باقی ساری دنیا میں تو کچھ ہے ہی نہیں ساری دنیا جذبات سے عاری ہے سوائے ہمارے۔"
دل آور کے گمبھیر لہجے میں سچ مچ اس کے بوجھل بھیگے اور مہکتے ہوئے جذبات مہک رہے تھے۔
"دو نفرت کرنے والوں کے درمیان ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" علیزے اس کے جذبات سے انکاری تھی۔
"کل میں تمہارے لیے تڑپا ہوں نا تو مجھ پہ میرے جذبات کا ادراک ہو گیا ہے اب جب تم میرے لیے تڑپو گی نا تو تم پہ بھی تمہارے جذبات کا ادراک ہو جائے گا بس اب دیکھنا یہ ہے کہ تم کب تڑپتی ہو میرے لیے کیوں کہ تڑپ میں انسان اپنے آپ میں نہیں رہتا کھل کے سامنے آ جاتا ہے۔ میں سب کے سامنے آ چکا ہوں اب تمہاری باری ہے۔"
دل آور نے چیلنج سے کہا اور تھوڑا سا علیزے کے اوپر جھک آیا جس پر علیزے قدرے سٹپٹا گئی۔
"ڈرائیور!" اس نے احتجاجاً اسے پکارا تھا کیونکہ ہاتھ پاؤں تو وہ ہلا ہی نہیں سکتی تھی۔
"آج تمہیں یہ بوسہ اس لیے دے رہا ہوں کہ آج میرا دل چاہ رہا ہے کہ تمہیں بوسہ دوں اور تمہیں اس سے احساس ہو کہ تم صرف میری ہو اور تم پہ صرف میرا حق ہے لیکن اس کے بعد اگلی بار یہ بوسہ تمہیں تب دوں گا کہ جب تمہارا دل چاہے گا کہ تمہارا ڈرائیور تمہیں بوسہ دے اور تمہیں احساس ہو کہ تم واقعی صرف میری ہو اور تم پہ صرف میرا حق ہے"
دل آور بہت بوجھل اور بھیگے سے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے چہرے پہ ذرا اور جھکا تھا اور علیزے مارے بے

بسی کے ہل بھی نہیں سکی۔
"ڈ... ڈرائیور!" اس کے ہونٹ کپکپائے مگر دل آور نے اس کے ہونٹوں کو کپکپانے کے لیے بھی مہلت نہیں دی اور علیزے کے پورے ہوش و حواس سمیت اپنے ہونٹوں کی ایک بھرپور استحقاق آمیز مہر ———— ———— ثبت کر دی تھی اور علیزے کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ وہ بے جان پڑی حق دق رہ گئی تھی کہ دل آور نے یہ کیا کر دیا ہے آخر۔
آج سے پہلے تو اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔
تو پھر آج کیوں؟
وہ بھی اس حالت میں۔
اور اس بے باکی سے۔
علیزے سوچ سوچ کر پاگل نہ ہوتی تو اور کیا کرتی لیکن دل آور پیچھے ہٹتے ہوئے بہت مسرور نظر آیا۔ مگر علیزے تو اب کچھ کہنے کے بھی قابل نہیں رہی تھی۔
"ایم سوری علیزے! میں زور زبردستی کا قائل نہیں ہوں مگر نجانے کیوں آج خود یہ حرکت کرنے پہ مجبور ہو گیا ہوں' شاید اس لیے کہ مجھے تمہارے دور چلے جانے کا وہم ستا رہا ہے اور میں ایسی ویسی حرکتیں کر کے تمہیں یہ جتا رہا ہوں کہ اب تم پہ صرف میرا حق ہے' تمہارے گھر والوں کا بھی نہیں' تم جہاں بھی ہو' جس حال میں بھی ہو' صرف میری ہو میری زندگی ہو' میری جان ہو۔" دل آور اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے اسے اپنے دل کے تمام اظہار بخش رہا تھا اور علیزے بڑے گم سم سے انداز میں سب سن رہی تھی اور سمجھ بھی رہی تھی لیکن اس پہ عمل بھی کرے گی یا نہیں یہ پتا نہیں تھا۔
"دیکھو علیزے! یہ تمہارے اور میرے رشتے کی آزمائش کا وقت ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں اس رشتے کی آزمائش پہ پورا اتریں تم میرا ساتھ دو اور میں تمہارا ساتھ دوں کیونکہ زندگی کے اس موڑ پہ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کی ہی تو ضرورت ہے تم نے میری عزت اور میرا بھرم رکھنا ہے اور میں نے تمہاری عزت اور تمہارا بھرم رکھنا ہے کیونکہ یہی ہمارے رشتے کا تقاضا ہے اور یہی آزمائش ہے ورنہ سب کی نظروں میں نہ تمہارا کوئی مقام رہے گا اور نہ میرا اس لیے اگر معتبر رہنا چاہتی ہو تو خود کو مجھ سے الگ مت کرنا اور کوئی بھی جذباتی سوچ سوچنے سے پہلے مجھے اور میری ذات کو ضرور سوچ لینا اور یہ بھی یاد رکھنا کہ ہم دو نہیں ہیں بلکہ ایک ہیں اور ہمیں ایک ہی رہنا چاہیے اور یہ بات میں تمہیں زندگی میں پہلی اور آخری بار سمجھا رہا ہوں۔ اس کے بعد کبھی کچھ بھی نہیں سمجھاؤں گا پھر بعد میں جو بھی سمجھنا ہو گا تمہیں خود ہی سمجھنا ہو گا بس یہ کوشش دوبارہ نہیں کروں گا کیونکہ میں واقعی زور و زبردستی کا قائل نہیں ہوں اس لیے زندگی کے اس نازک اور اہم موڑ پہ اب ہر فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔" دل آور اس کے چہرے کو چھوتے ہوئے کہہ رہا تھا اور علیزے اس کے چہرے کو دیکھتی اس کی باتوں پہ غور کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور ابھی ٹھیک سے غور بھی نہیں کر پائی تھی کہ دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی۔
"اوکے! میں ابھی چلتا ہوں تم اپنے گھر والوں سے ملو اور خوش رہو لیکن ان کے درمیان یہ بھی یاد رکھو کہ تم میری بیوی ہو۔"
دل آور اس کے بالوں کو سہلا رہا تھا اور علیزے نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"آئی مس یو... آئی ریئلی مس یو۔" دل آور کا علیزے کے پاس سے اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اور علیزے محض پلکیں جھکا کے رہ گئی۔

"مجھے تو شاید تم سے ملنے کا موقع ہی نہ ملتا اور نہ ہی میں خود کوشش کرتا مگر نبیل نے یہ کوشش کر کے مجھ پہ بہت بڑا احسان کیا ہے اب اس ملاقات کے بدلے اس کا شکریہ ادا کرنا پڑے گا۔" دل آور کہتے ہوئے آہستگی سے مسکرایا تھا اور اتنے میں دوبارہ دستک ہوئی اور دل آور اس کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

☼ ☼ ☼

"زری!" اسے سہارا دے کر ابھی وہیں چیئر پہ بٹھایا ہی گیا تھا کہ اتنے میں آسیہ آفندی دروازہ کھول کر اندر آگئی تھیں اور زری نے بڑی الجھی ہوئی نظروں سے ان کے چہرے کی سمت دیکھا مگر ذہن پہ زور ڈالنے کے باوجود بھی وہ اس آشنا سی صورت کو پہچان نہیں پائی تھی۔

"آسیہ پھوپھو!" عبداللہ نے آہستگی سے نام لیا اور زری کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ تو اسی لیے اس اسپتال سے ڈسچارج ہونا چاہ رہی تھی کہ اس کا کسی سے بھی ــــ سامنا نہ ہو اور وہ چپکے سے یہاں سے چلی جائے مگر آسیہ آفندی اچانک اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھیں۔

"زری! میری جان کیسی ہو؟ بیٹا۔ یہ کس تکلیف کو جھیل رہی ہو تم؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟" آسیہ آفندی نے آگے بڑھ کر زری کی پیشانی چومی تھی اور اس کے قریب جھکتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

"شاید کسی گناہ کی سزا جھیل رہی ہوں۔" زری استہزائیہ سا بولی۔

"ارے یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" آسیہ آفندی تڑپ گئی تھیں۔

"جو سچ ہے وہی کہہ رہی ہوں۔ کچھ گناہوں کی سزا انسان کو موت کے بعد ملتی ہے اور کچھ گناہوں کی سزا موت سے پہلے اس لیے یہی سمجھ لیں کہ میں موت سے پہلے گناہوں کی سزا جھیل رہی ہوں وہ بھی ایک ایسے گناہ کی سزا جس میں میں خدا کے علاوہ کسی کو خدا مان بیٹھی تھی سو مجھے سزا تو ملنی ہی تھی سنگین سزا۔" زری کا لہجہ انتہائی سخت ہو رہا تھا اور عبداللہ سر جھکا کر رہ گیا۔

"آنی وہ آپ سنائیں علیزے کیسی ہے کچھ بہتر ہوئی؟" زری نے سر جھکا کر بات کا رخ ہی بدل دیا تھا۔

"ہاں بیٹا! اللہ کا شکر ہے کہ وہ اب پہلے سے ٹھیک ہے کافی بہتر ہے اب ہم سب کو دیکھ کر تو وہ پہلے روز ہی ٹھیک ہو گئی تھی" آسیہ آفندی بیٹی کی محبت پہ مسکرائی تھیں۔

"اللہ اسے ہمیشہ ٹھیک رکھے' خوش رکھے' آباد رکھے' سدا سہاگن رہے آمین" زری نے علیزے کے لیے دعا کی تھی اور نگارش کا کلیجہ منہ کو آگیا اس نے چونک کر عبداللہ کی طرف دیکھا مگر عبداللہ لب بھینچ کر رخ موڑ گیا تھا۔

"ٹھیک ہے آنی ہم لوگ چلتے ہیں آج ہم گھر جا رہے ہیں' بہت عرصے بعد گھر میں قدم رکھنا نصیب ہو گا ان شاء اللہ آپ سے بعد میں بات ہو گی۔" ان دونوں کو گم سم دیکھ کر زری نے خود ہی بات سمیٹی تھی اور آسیہ آفندی سر ہلاتے ہوئے اک سائیڈ پہ ہو گئی تھیں۔

"ٹھیک ہے بیٹا! تم لوگ جاؤ اب تم سے ملاقات تمہارے گھر پہ ہی ہو گی ہم سب آئیں گے تم سے ملنے کے لیے۔" انہوں نے بہت نرمی اور شفقت سے اس کا سر تھپکا۔

"تھینک یو آنی!" زری نے سر جھکا لیا اور پھر عبداللہ اس کی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا اسپتال کے روم سے باہر نکل آیا اور زری اس روم سے نکلتے ہوئے دعا کر رہی تھی کہ کاش میرا کسی سے بھی سامنا نہ ہو مگر دعائیں کبھی کبھی مستجاب نہیں بھی ہوتیں۔

ابھی وہ سیکنڈ فلور سے گراؤنڈ فلور پہ آئے ہی تھے کہ سامنے سے آتے نبیل حیات اور دل آور شاہ کے قدم وہیں

کے وہیں جم گئے اور عبداللہ اور نگارش کے چہرے پہ بھی تاریکی کا اک سایہ سا گزرا تھا۔ لیکن پھر بھی عبداللہ نے وہاں سے گزر جانا چاہا تاکہ زری کی صحت پہ کوئی برا اثر نہ پڑے یا پھر دوبارہ وہ کسی صدمے کے حصار میں نہ آجائے لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اب ایسا نہیں ہوگا اب یہ زری وہ زری نہیں رہی اب وہ اس زری کو اس کے دل کو اور اس دل کی محبت کو اسپتال کے اسی بستر پر کوما میں چھوڑ کے جا رہی ہے جس بستر سے خود اٹھ کر آئی ہے۔ اب زندگی میں سب کے چہروں کے رنگ بدلیں گے صرف اس کے چہرے کا رنگ نہیں بدلے گا صرف ایک ہی رنگ رہے گا دون کا رنگ، صبر کا رنگ اور بے خبری کا رنگ۔ جیسے اس وقت رہا تھا اور اس نے عبداللہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔

"ٹھہریں بھائی! کہاں جا رہے ہیں آپ؟ ان سے نہیں ملیں گے؟" زری نے عبداللہ کو روکا۔

"زری! ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔" نگارش نے ایک کمزور سا بہانہ پیش کیا۔

"گھر میں کون سا میرے ماں باپ میرا انتظار کر رہے ہیں جس کی وجہ سے لیٹ ہونے کا ڈر ہوگا؟" زری نے نگارش کا بہانہ ٹال دیا اور نگارش جز بز سی ہو گئی تھی جبکہ زری ان دونوں کی طرف خود ہی متوجہ ہوئی تھی۔

"السلام علیکم! نبیل صاحب کیسے ہیں آپ؟ آپ کی بھابھی ٹھیک ہوئیں یا نہیں؟" زری نے بڑی برداشت اور بڑی بہادری کا ثبوت دیتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

"وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں اور اللہ کا احسان ہے کہ بھابھی بھی ٹھیک ہیں اور آپ کو بھی مبارک ہو اللہ نے آپ کو صحت بخشی ہے اور نئے سرے سے زندگی عطا کی ہے۔" نبیل نے بھی بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس طرح اچانک کمپوز کیا تھا کہ اسے اپنے آپ کو ہی داد دینے کو دل چاہا تھا۔

"تھینک یو نبیل صاحب! تھینک یو ویری مچ۔ آپ سب کی دعاؤں سے ہی تو ٹھیک ہوئی ہوں میں۔" زری نے آج سچ مچ اپنے آپ کو پتھر بنانے کی انتہا کر ڈالی تھی اور آج سب کے سامنے ثبوت بھی دے دیا تھا۔

"اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے بھلا؟" نبیل نے کندھے اچکائے تھے۔

"خیر! آپ سنائیں مسٹر دل آور شاہ؟ آپ کی مسز کیسی ہیں؟ وہ کب ڈسچارج ہو رہی ہیں اسپتال سے؟" زری کا رخ اب دل آور کی طرف تھا اور دل آور جو ہمیشہ زری کے سامنے اپنا سر اور اپنی نظریں جھکا کر بات کرتا تھا آج علیزے کے ذکر پہ سر اٹھا کر بات کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

کیونکہ آج زری کے سامنے علیزے کا ذکر یوں سر جھکا کر کرتا تو شاید علیزے کبھی بھی یوں معتبر نہ ہو پاتی جیسے اس کے سر اٹھا کر بات کرنے سے ہو گئی تھی۔

"الحمد للہ! میری مسز اب کافی بہتر ہیں اور ان شاء اللہ بہت جلد اسپتال سے ڈسچارج بھی ہو جائیں گی بس آپ سب کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔" دل آور کا لہجہ انتہائی مضبوط تھا گویا وہ سب ہی اپنی اپنی جگہ پہ "وہ" نہیں رہے تھے جو وہ "پہلے" تھے۔

"ہاں کیوں نہیں بس اک دعا کا رشتہ ہی تو ہے جو سب کے دلوں کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور مردہ نہیں ہونے دیتا۔" زری نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"تھینک یو" دل آور نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا اور زری نے اپنے قریب کھڑی نگارش کی طرف دیکھا۔

"چلیں بھابھی! ہم لیٹ ہو رہے ہیں" زری پھر بات کو وہیں پہ لے گئی تھی اور عبداللہ اس کی بات پہ چپ چاپ وہیل چیئر دھکیلتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا لیکن نبیل حیات اور دل آور شاہ وہیں کھڑے وہیل چیئر پر بیٹھی زری کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

کیونکہ اب حقیقتاً" ان تینوں کے دل کچھ اور ہو چکے تھے اور دلوں کے دھڑکنے کی طرز بھی کچھ اور ہو چکی تھی

آج وہ اک دوسرے کے پاس سے گزر گئے تھے اور احساس تک نہیں ہوا تھا۔ آخر یہ بھی تو زندگی کا ایک حیران کن مقام تھا!

"چلو! علیزے کے چیک اپ کا ٹائم ہو رہا ہے ڈاکٹرز آ چکے ہوں گے۔" دل آور گھڑی دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا اور اس کے پیچھے نبیل حیات بھی۔

☆ ☆ ☆

اس کی بائیک انتہائی فل اسپیڈ پہ جا رہی تھی جب اس کے سیل فون کی رنگ بجنا شروع ہوئی تھی اور مجبوراً" اسے بائیک روک کر سیل فون جیب سے نکالنا پڑا تھا۔ نمبر وکی کا تھا۔

"ہیلو؟" اس نے اپنے مخصوص اسٹائل میں ہیلو کہا۔

"سائم کے فلیٹ پہ پہنچو۔" وکی نے اتنا سا پیغام دے کر فون بند کر دیا اور جودت فون کو گھورتا رہ گیا تھا۔

"سائم کے فلیٹ پہ پہنچو یہ بھی کوئی طریقہ ہے بھلا؟ پوری بات بھی نہیں بتائی۔" جودت بے زاری سے کہتے ہوئے بڑبڑایا تھا کیونکہ وہ علیزے سے ملنے اسپتال جا رہا تھا اس لیے اب اسے علیزے سے ملنے کا ارادہ بدلنا پڑ گیا تھا۔

اور وہ بائیک کو دوبارہ سے اسٹارٹ کرتا ہوا ہو گیا تھا اور ٹھیک دس منٹ میں سائم کے فلیٹ پہ پہنچ گیا تھا۔

"ہاں بولو! کیا بات ہے؟ اتنی ایمرجنسی میں کیوں بلایا ہے؟" جودت آتے ہی شروع ہو گیا تھا۔ "بیٹھو" وکی نے بڑے موڈ سے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"او کے بیٹھ گیا اب بولو۔" جودت نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے دوبارہ سوال داغا۔

"تمہارے سالے کا پتا لگا لیا ہے ہم نے۔" وکی نے بڑی خباثت سے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔ "سالے کا؟ مطلب؟ میرے تو اس شہر میں بہت سے سالے ہوں گے۔ تم کس کی بات کر رہے ہو؟" جواباً" اس نے خود بھی حد کر ڈالی تھی۔

"جو تمہیں آج کل مطلوب ہے اور جس کی بہن کے تم دیوانے ہوئے پھر رہے ہو مگر وہ تمہارے ہاتھ نہیں آ رہی۔" وکی نے اگلا شوشا چھوڑا۔

"کون؟" جودت ٹھٹکا۔ "دیوانے کس کے ہو؟" کامی نے بھی مداخلت کی تھی۔ "مریم!" اس نے جھٹ سے پوچھا۔ "اور وہ ٹھہرا مریم فاروق نیازی کا بھائی عدیل عمر نیازی۔" وکی نے انتہائی حیران کن انکشاف کیا تھا اور جودت صوفے سے دو فٹ اوپر اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ "کیا؟ عدیل، مریم کا بھائی ہے؟" جودت کو جیسے بہت بڑا جھٹکا لگا تھا۔

"جی جناب! عدیل عمر نیازی آپ کی مریم کا اکلوتا بھائی ہے اور تمہارے تو دونوں بہن بھائی کی طرف ہی بڑے حساب نکلتے ہیں؟" وکی نے جودت کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھا۔

"حساب تو واقعی بڑے نکلتے ہیں یار! میں نے اس سے بڑی شرافت سے اور بڑے شریفانہ انداز میں ایک بات پوچھی تھی مگر اس نے نہیں بتائی بلکہ میرے سامنے جھوٹ بول دیا اب اسے اس جھوٹ کا حساب بھی دینا ہوگا۔" جودت کو اس وقت مریم کا وہ جھوٹ بھی یاد آ گیا تھا جو وہ دل آور شاہ کی خاطر بول گئی تھی۔

"کیسی بات؟ اور کیسا جھوٹ؟ کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ؟" کامی نے تجسس کے مارے اسے کریدا تھا۔

"یار کیا بتاؤں؟ مجھے ایک آدمی کے بارے میں پوچھنا تھا لیکن اس نے نہیں بتایا۔"

"کون آدمی؟" کامی اور وکی بات کا پیچھا کب چھوڑتے بھلا۔

"یہ ایک آدمی' دل آور شاہ نام ہے اس کا۔ اس کے متعلق پوچھا تھا مگر وہ صاف مکر گئی تھی۔" جودت کو تاؤ آرہے تھے کیونکہ وہ اب تک دل آور شاہ کو منصور حسین ہی سمجھ رہا تھا اور مریم نے پوچھنے کے باوجود بھی اس کی غلط فہمی دور نہیں کی تھی۔

"ارے! اسی دل آور شاہ کے شوروم میں ہی تو عدیل عمر نیازی بطور منیجر کام کررہا ہے۔" وکی نے ایک اور بم پھوڑا اور جودت کو ایک اور کرنٹ چھو گیا تھا۔

"واٹ؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"ارے! تو اور کیا؟ ساری معلومات کس لیے حاصل کی ہیں بھلا۔"

"اوہ مائی گڈنیس! تو یہ چکر ہے یعنی وہ واقعی اسے جانتی تھی۔" جودت کا یقین اب اور بھی پکا ہو گیا تھا۔

"ہنڈرڈ پرسینٹ جانتی تھی" وکی نے جلتی پہ تیل پھینکا۔

"ہوں! وہ اسے جانتی تھی مگر وہ مجھے نہیں جانتی۔" جودت نے بڑے پرسوچ سے لہجے میں کہا تھا۔

"جب تک کسی کو اپنی پہچان نہ کرواؤ کوئی ہمیں نہیں جانتا۔ اس لیے اپنی پہچان خود کروانی پڑتی ہے۔" کامی نے بھی لگے ہاتھوں مشورے سے نوازا تھا۔

"ہاں کرواؤں گا پہچان' اب اسے پہچان ہی تو کرواؤں گا میں نے اس کے ساتھ بہت نرمی اور بہت رعایت برتنے کی کوشش کی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا کچھ حاصل نہیں ہوا لیکن اب فائدہ بھی ہو گا اور حاصل بھی بہت کچھ ہو گا۔ اب اور کوئی چھوٹ نہیں رہی اس کے لیے اور اس کے بھائی کو بھی پتا چلے گا کہ اس نے غیرت اور بے غیرتی کا طعنہ کس کو دیا تھا اور گالی کس کو دی تھی؟" جودت نے جیسے دل ہی دل میں کوئی خطرناک عزائم باندھ لیے تھے۔

"کیا ارادہ ہے پھر؟" وکی اور کامی نے ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ دیتے ہوئے جودت سے استفسار کیا تھا۔

"تم کیا کہتے ہو؟" جودت نے الٹا ان دونوں سے پوچھا۔

"وہی ایک دو رات کا سبق ہی کافی ہے۔" وکی نے خباثت سے مشورہ دیا۔

"ایک دو رات کا نہیں' پورے ایک ہفتے کے لیے سبق دوں گا۔ ایک دو رات میں میرا دل ٹھنڈا ہونے والا نہیں ہے۔" جودت دانت پیستے ہوئے بول رہا تھا۔

"تو پھر اتنے دن رکھو گے کہاں؟" کامی کو حیرت ہوئی۔

"یہیں۔ اسی فلیٹ میں۔ اس سے اچھی اور بہتر جگہ تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"لیکن پروگرام کب کا ہے؟" وکی نے سب کچھ فائنلی پوچھ لینا چاہا تھا۔

"سب حالات دیکھ کر بتاتا ہوں کہ پروگرام کب کا رکھیں کیونکہ گھر میں آذر اور دانیال بھائی کی شادی کے ہنگامے بھی چل رہے ہیں اور میری کزن بھی اسپتال میں ایڈمٹ ہے اس لیے احتیاطاً" سوچ رہا ہوں کہ کہیں کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔" جودت نے وجہ بتائی تھی۔

"ارے! یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ تمہارے گھر میں شادی کے ہنگامے چل رہے ہیں اس طرح مصروفیت میں تمہارے گھر والوں کو تمہاری باہر کی ایکٹیویٹیز کا پتا بھی نہیں چلے گا اور تمہارا کام بھی ہو جائے گا۔" وکی نے اسے ایک اور مفید مشورے سے نوازا تھا۔

"چلو ٹھیک ہے پھر دیکھتا ہوں کہ کب ہوتا ہے" جودت ذرا جلدی میں تھا۔

"لیکن اس کے لیے سارا انتظام کون کرے گا؟" کامی نے پھر جودت کو روکا۔

"تو تم لوگ کس مرض کی دوا ہو؟" جودت اس کی طرف پلٹا۔

"مگر کچھ پلاننگ بھی تو ہو؟ کچھ ٹائمنگ کا تو پتا چلے؟ تم ہو کہ ادھر آئے ہو اور ادھر کوچ کو تیار کیا ایسے کام اس طرح ہوتے ہیں؟" وکی نے جودت کو خفگی سے گھورا تھا۔

"تو کس طرح ہوتے ہیں؟ کیا دن رات سر جوڑ کر بیٹھے رہیں اور پلاننگ کرتے رہیں تو تب ہی ایسے کام ہو سکتے ہیں؟ نارمل طریقے سے بات کرلینے سے کچھ نہیں ہوتا؟" جودت ان پہ خفا ہو رہا تھا۔

"یار! ہم نے ایسا کب کہا ہے کہ ایسے کام نہیں ہو سکتے مگر یار سوچ بچار اور پلاننگ بھی کوئی چیز ہوتی ہے آخر ایسے معاملوں میں ایک دوسرے سے پوچھ کر ہی قدم اٹھانا چاہیے اس طرح معاملہ بگڑتا نہیں ہے۔" کامی نے اب ذرا تحمل سے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"اوکے! آئی انڈر اسٹینڈ لیکن تم بس اتنا کرو کہ اس فلیٹ کے سب کھڑکیاں دروازے اور ان کے لاک وغیرہ اچھے سے چیک کر لو اور گاڑی کا انتظام بھی کر رکھو اس کو شکار کرنے کے بس دو ہی ٹائم ہیں ایک جب وہ اکیڈمی جاتی ہے اور دوسرا جب اکیڈمی سے واپس آرہی ہوتی ہے اور اس کام کے لیے اور بھی جن چھوٹی موٹی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ بھی لے آؤ باقی سب کچھ فون پہ سمجھا دوں گا۔ تم لوگ یہ پیسے رکھو جو چیزیں خریدنے میں کام آئیں گے" جودت نے جاتے جاتے پانچ پانچ ہزار کے چند نوٹ نکال کر کامی کی طرف بڑھائے اور ان کو ہاتھ ہلاتا ہوا باہر نکل آیا تھا۔

اور پیچھے وہ دونوں خباثت سے قہقہہ لگا کر ہنسے تھے کیونکہ ان کے تو ہر طرح سے مزے ہی مزے تھے۔

✡ ✡ ✡

اگر تو وجہ نہ پوچھے تو اک بات کہوں؟
بن تیرے اب مجھ سے بھی جیا نہیں جاتا

آج ٹھیک بارہ دن بعد ڈاکٹرز نے علیزے کو ڈسچارج کرنے کا فیصلہ سنا دیا تھا۔ اور یہ فیصلہ سن کر دل آور بہت خوش ہوا تھا کہ چلو شکر ہے کہ علیزے اب گھر جائے گی مگر علیزے کے گھر جانے کی خوشی میں سرشار اور مسرور ہوتے دل آور شاہ کے قدم اسپتال کے پرائیویٹ روم میں داخل ہوتے ہی رک گئے تھے۔

"آپ اس کی تمام چیزیں پیک کرلیں میں گاڑی نکالتا ہوں" آذر آسیہ آفندی سے کہتا ہوا پلٹا مگر دل آور کو دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے دیکھ کر ذرا دیر کے لیے رک گیا کیونکہ وہ دل آور کے چہرے کا رنگ بھانپ گیا تھا۔

"علیزے اپنے گھر جائے گی" اس نے اپنے تمام تاثرات کنٹرول کرتے ہوئے ان سب کو اپنا فیصلہ سنایا تھا اور اس کے اس باآواز بلند فیصلے پہ وہاں موجود تمام افراد نے بے اختیار چونک کر دیکھا مگر اسے جواب کسی نے بھی نہیں دیا تھا کیونکہ اس کے مقابل آذر کھڑا تھا۔

"علیزے اپنے گھر ہی جارہی ہے۔" آذر کا جواب چبھن لیے ہوئے تھا۔

"میں اپنے گھر کی بات کررہا ہوں جو میرا اور علیزے کا ہے" دل آور نے اپنے گھر پہ زور دیا تھا۔

"مگر میں اس گھر کی بات کررہا ہوں جو صرف علیزے کا ہے۔" آذر بھی اپنی بات پہ اڑ چکا تھا۔

"اس کا فیصلہ علیزے خود کرے گی کہ اس کا گھر کون سا ہے؟ اور اس نے کہاں جانا ہے؟" دل آور نے فیصلہ علیزے پہ چھوڑ دیا تھا اور علیزے اس کے اس سوال پہ بری طرح سٹپٹا گئی تھی۔

"بس میں نے کہہ دیا علیزے اپنے گھر جارہی ہے اور اس چیز کے لیے ہمیں تم سے یا علیزے سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اب وہی ہو گا جو ہمارا فیصلہ ہو گا اور مجھے امید ہے کہ علیزے بھی اس سے انکار نہیں

کرے گی وہ بھی ہمارے ساتھ حویلی ہی جانا پسند کرے گی کیوں علیزے؟ تم کیا کہتی ہو؟ کہاں جانا ہے تم نے؟ حویلی یا بیرسٹر دل آور شاہ کے گھر؟"

آذر نے انتہائی تلخ اور طنزیہ سے انداز میں کہتے ہوئے علیزے کی سمت دیکھا تھا اور علیزے سب کے سامنے بے ساختہ نظریں جھکانے پر مجبور ہو گئی تھی کیونکہ اب سب کی نظروں کا مرکز وہی تھی۔ سب اس کے جواب کے منتظر ہو گئے تھے مگر آذر کے سوال کا جواب دینا بہت مشکل تھا خصوصاً "اس وقت۔

"علیزے! میں تم سے پوچھنا نہیں چاہتا تھا مگر بیرسٹر صاحب کی غلط فہمی دور کرنے کی خاطر پھر بھی تم سے پوچھ لیا ہے تاکہ سب کے سامنے تم خود بتاؤ کہ تم کہاں جانا چاہتی ہو؟ حویلی یا اس کے گھر؟ ہمارے ساتھ یا اس کے ساتھ؟ اپنے ڈیڈ کے پاس یا اس کے پاس؟ بولو بتاؤ اب؟" آذر اک اک لفظ چبا چبا کر ادا کر رہا تھا اور علیزے چپ چاپ سر جھکائے سب سن رہی تھی۔ اس نے جواباً "ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا مگر اس وقت اس کی چپ سے کام نہیں چل سکتا تھا۔

"علیزے! فیصلہ کرو اور بات ختم کرو ٹائم کم ہے کمرہ خالی کرنا ہے۔" آذر ذرا غصے سے بولا تھا اور مجبوراً" علیزے کو سر اٹھا کر ان سب کی طرف دیکھنا پڑا تھا۔

اور اس کی پہلی نظر آسیہ آفندی پر پڑی تھی ان کے چہرے پہ بھی یہی تحریر رقم تھی کہ وہ حویلی چلے

اور اسے سب کے چہروں

پہ یہی لکھا نظر آیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ حویلی جائے۔ اور حویلی والوں کے چہروں کی تحریر پڑھ کر علیزے "اپنے گھر والے" کے چہرے کا لفظ پڑھنا بھول گئی وہ لفظ جو "محبت" تھا' وہ لفظ جو "مان" تھا وہ لفظ جو "محرم" تھا اس نے نہیں پڑھا اس نے نہیں دیکھا اس نے نہیں سوچا۔ اور بس ایک نظر آخری نظر اور اجنبیت کی نظر سے سامنے کھڑے بڑے مان اور بڑی محبت سے دیکھتے اپنے "ڈرائیور" کو دیکھا اور پھر نظر چرا لی جھکا لی اور شاید چھپا بھی لی تھی۔ اور اس کے اس طرح نظریں چرانے اور نظریں جھکانے پہ ہی دل آور کے قدموں تلے زمین ایک بار سرکی ضرور تھی مگر پھر بھی وہ اپنے قدموں پہ جم کے اور ڈٹ کر کھڑا رہا کیونکہ اسے اب بھی امید تھی کہ وہ اس کی امید نہیں توڑے گی لیکن علیزے کے جواب پہ امید تو بھلا کیا ٹوٹی وہ خود ٹوٹ گیا تھا۔

"میں حویلی جانا چاہتی ہوں آپ کے ساتھ اپنے پاپا کے پاس۔"

علیزے نے جو کہنا تھا کہہ دیا مگر دل آور کو یوں لگا تھا کہ علیزے نے اس کی شہ رگ کاٹ دی ہو اور اس کا دل اپنے پاؤں تلے مسل دیا ہو اور اسے بیچ چوراہے میں کھڑا کر کے اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا ہو۔

اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے کسی نے اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا ہو اور وہ بالکل بے جان اور لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا لیکن پھر اس نے کہا کچھ نہیں اور خاموشی سے دروازے کے سامنے سے اک سائیڈ پہ ہٹ گیا۔

کیونکہ اب اس کا آذر کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں تھا کوئی بحث نہیں تھی کوئی جھگڑا نہیں تھا۔

ہاں ایک دل تھا جو یقین' امید' بھروسے اور مان کی بلندیوں سے گرا اور کرچیوں میں تقسیم ہو گیا اور دل کی اس تقسیم پہ اور دھڑکنوں کی اس تباہی پہ دل آور کا دل چاہا کہ وہ زانو فرش پر گرے اور زمین میں ہی اتر جائے۔ کیونکہ اس کے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔ اب تو وہ صرف دیکھ رہا تھا کسی روبوٹ کی مانند۔

علیزے کا سامان سمیٹا گیا گاڑی نکالی گئی علیزے کو تیار کروایا گیا اور پھر سب کی سہارے سے چلتی ہوئی وہ ایک سرسری سی نظر دل آور پہ ڈالتی ہوئی اس کے سامنے' اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے گھر والوں کے ساتھ اسپتال کے اس پرائیویٹ روم کی دہلیز عبور کر گئی تھی اور دل آور اس دہلیز پر کھڑا کوریڈور سے مرکزی دروازے کی

سمت جاتے ہجوم کو دیکھتا رہ گیا لیکن خود واپسی کے لیے قدم آگے نہیں بڑھا سکا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کے قدم شکستہ تھے۔ کہتے ہیں کہ انسان کی اندرونی کیفیات صرف چہرے سے ہی نہیں اس کے قدموں سے بھی عیاں ہوتی ہیں جیسے انسان کے چہرے کے تاثرات' آنکھیں' اور زبان بولتی ہیں بالکل اسی طرح انسان کے قدم بھی بولتے ہیں۔ اپنے جذبات اپنی کیفیات ظاہر کرتے ہیں جیسے کہ انسان خوش ہو تو سرشار قدم' غم زدہ ہو تو بوجھل قدم' بیمار ہو تو نڈھال قدم' عجلت میں ہو تو تیز قدم' نشے میں ہو تو بہکے قدم' ناکام ہو تو مایوس قدم' بچہ ہو تو لڑکھڑاتے قدم' جوان ہو تو مضبوط قدم' بوڑھا ہو تو کمزور قدم' پرعزم ہو تو ثابت قدم اور زندگی کے کسی اہم مقام پہ آکر ہارا ہوا ہو تو "شکستہ قدم" اور آج وہ بھی ایک ہارا ہوا انسان تھا آج اس کے قدم بھی شکستہ تھے۔

آج سے پہلے زندگی میں اس کے قدموں نے بھی ہزاروں ذائقے چکھے تھے۔ کئی بار سرشار ہوئے تھے تو کئی بار بوجھل اور کئی بار نڈھال ہوئے تھے' اور کئی بار بہکے بھی تھے لیکن شکستہ پہلی بار ہوئے تھے کیونکہ وہ ہارا پہلی بار تھا۔ وہ اس وقت پوری طرح سے ہارا ہوا ایک شکست خوردہ انسان لگ رہا تھا اور اس وقت وہ کچھ کہنے اور کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہرگز نہیں تھا اس وقت وہ صرف سوچ سکتا تھا کیونکہ اس وقت سوچنے کے علاوہ اس میں اور کوئی سکت نہیں تھی اس کی ہمت و حوصلہ ڈوب چکا تھا شکست کی کسی اتھاہ گہرائی میں۔

وہ اپنے بے دم شکستہ قدموں پہ اپنی غم زدہ بوجھل ذات کا بوجھ بمشکل اٹھا کر اسپتال کے پرائیویٹ روم کی چوکھٹ میں آکھڑا ہوا تھا اور دور تک پھیلی کشادہ اور طویل راہداری میں دیکھنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش کے بعد وہ مضبوط انسان دھواں دھواں ہو کے رہ گیا تھا اور اس دھوئیں کی تاریکی اسے سرتاپا اپنے حصار میں گھیرنے لگی تھی وہ اس چوکھٹ میں یوں کھڑا تھا جیسے اس کی دنیا یہیں پہ ختم ہو گئی ہو اور اس چوکھٹ سے باہر اس کے لیے کچھ بھی نہ بچا ہو۔

حالانکہ اب سے تھوڑی دیر پہلے ـــ وہ کافی حد تک مطمئن اور خوش تھا شاید اس لیے کہ اس کے دل میں کہیں نہ کہیں ایک چھوٹی سی ایک مدھم سی "امید" سانسیں لے رہی تھی اسے جانے والے۔ بہت زیادہ نہ سہی تھوڑا بہت "مان" ضرور تھا۔ لیکن اسے تھوڑی دیر پہلے تک یہ خیال چھو کے بھی نہیں گزرا تھا کہ مان "اکثر" ٹوٹ جایا کرتے ہیں اور امیدیں ہمیشہ دم توڑنے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ اگر اس چیز کا خیال اسے ذرا سا پہلے ہو جاتا تو وہ یقیناً" کبھی بھی اس پہ مان نہ کرتا مگر اب۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟ اب تو وہ بہت پیچھے رہ گیا تھا بہت تنہا ہو گیا تھا۔ آج اس کی امید نے ہی دم نہیں توڑا تھا بلکہ اس کا مان بھی ختم ہو گیا تھا۔ اس کی موہوم سی خوشی بھی بجھ کر راکھ ہو گئی تھی وہ اس پرائیویٹ روم کی چوکھٹ میں کھڑا ابھی تک کشادہ راہداری کو دیکھ رہا تھا جو تھوڑی دیر پہلے اتنے زیادہ لوگوں کی بدولت تنگ پڑ رہی تھی اور اب بالکل خالی اور ویران نظر آ رہی تھی بالکل اس کی ذات کی طرح!

☼ ☼ ☼

"سر کیا میں یہ روم صاف کر سکتی ہوں؟" اسپتال کی ملازمہ مریض کے ڈسچارج ہوتے ہی روم کی صفائی ستھرائی کے لیے فوراً" حاضر ہو گئی تھی شاید اب اس روم میں کسی نئے مریض کو شفٹ کرنے کی تیاری ہو رہی تھی اس لیے ان کو یہ روم از سر نو صاف کرنے کی جلدی تھی اور وہ جواباً" کچھ بھی کہے بغیر چوکھٹ پہ رکھا اپنا ہاتھ ہٹا کر خود بھی وہاں سے ہٹ گیا تھا لیکن اس کے قدم اس کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے وہ اپنے شکست خوردہ قدموں سے چل کر بمشکل اسپتال سے باہر پارکنگ تک آیا تھا۔ پارکنگ میں تھوڑی دیر پہلے اس کی گاڑی کے علاوہ اور بھی چند گاڑیاں کھڑی تھیں مگر اس وقت صرف اس کی پراڈو موجود تھی۔

اپنی گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اسے اپنے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش محسوس ہوئی تھی شاید تنہا واپسی کے احساس نے اس کی تھکن 'اس کی تنہائی' اس کی شکستگی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا' تھکے تھکے انداز سے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس کی نظر پچھلی سیٹ کی سمت اٹھی تھی جس پر سرخ خون کے دھبے اب سیاہی مائل ہونے لگے تھے اس کے ذہن میں وہ منظر' وہ لمحہ' وہ وقت آج بھی پہلے دن کی طرح تازہ ہوا تھا اس کی سماعتوں میں اس کی دردناک چیخ آج بھی محفوظ تھی اور وہ اس کی تکلیف سوچ کر آج بھی تڑپ اٹھتا تھا آج بھی اس کا دل کسی انہونی کے خیال سے جیسے مٹھی میں آجاتا تھا وہ نجانے اور کتنی دیر یونہی گردن موڑے پچھلی سیٹ کو دیکھتا رہتا کہ اچانک اس کے سیل فون پہ ہونے والی وائبریشن نے اسے چونکا دیا تھا مگر چونکنے کے بعد بھی اس نے سیل فون نکال کر دیکھنے یا کال ریسیو کرنے کی زحمت نہیں کی تھی بلکہ سب بھینچ کر سر جھٹکتے ہوئے اسٹیرنگ تھام لیا تھا اور اگلے ہی لمحے گاڑی آگے بڑھالی۔

اسپتال سے گھر کے گیٹ تک آکر بھی اس کی کیفیت میں رتی برابر فرق نہیں آیا تھا وہ اک ٹرانس کی سی کیفیت میں گھر تک پہنچا اور ایسی حالت میں کسی اور چیز کی طرف دھیان دینا ہرگز ممکن نہیں تھا۔

"سلام صاحب" چوکیدار نے اس کی گاڑی دیکھ کر فوراً" ہی گیٹ کھول دیا تھا جبکہ وہ اس کے سلام کا جواب تک نہ دے سکا تھا اور خاموشی سے گاڑی اندر بڑھالے گیا تھا حالانکہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنے کسی ملازم کے سلام کا جواب نہ دیتا وہ اگر کبھی غصے یا پھر غم کی حالت میں بھی ہوتا تو ہاتھ کے اشارے سے یا پھر سر کے اشارے سے ہی مگر جواب ضرور دیتا تھا لیکن نظرانداز نہیں کرتا تھا۔

شاید اسی لیے آج اس کے چوکیدار کو اس کی گہری چپ سے کسی سنگین مسئلے کا احساس ہو گیا تھا جب تک چوکیدار نے گیٹ بند کیا تب تک وہ گاڑی سے اتر کر اندر چلا گیا تھا اور آگے پیچھے کچھ بھی دیکھے بنا ڈرائنگ روم کے صوفے پر آکر ڈھے گیا تھا۔

"سلام صاحب جی" اس کی ملازمہ ڈرائنگ روم کے صوفوں پر رکھے کشن ترتیب دے رکھ رہی تھی۔ اچانک اسے آتے دیکھ کر الرٹ ہو گئی تھی مگر وہ بہت نڈھال نظر آرہا تھا ملازمہ اسے اس طرح شکستہ حال میں دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی چوکیدار کی طرح اسے بھی اپنے مالک کی کیفیت کا فوراً" ہی اندازہ ہو گیا تھا کیونکہ اس پہ چھائی مایوسی اور شکستگی اس کے انگ انگ سے جھلک رہی تھی وہ آج حقیقتاً" دیکھنے والوں کو بھی "تنہا" لگ رہا تھا اپنی کنپٹیوں کو مسلتے ہوئے اس نے ملازمہ کو بیڈ روم سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائیٹر لانے کا کہا تھا اور پھر چند سیکنڈز میں ہی اس نے سگریٹ کو اپنے تیکھے کٹاؤ دار عنابی ہونٹوں میں دبا کر لائیٹر سے شعلہ دکھا دیا تھا اور ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑ دیا تھا۔ اور پھر رفتہ رفتہ سگریٹ کا دھواں ڈرائنگ روم میں ہی نہیں اس کی ذات میں بھی بھرنے لگا تھا۔ ہر سو دھوئیں کے مرغولے پھیلتے جارہے تھے اور ہر سو اس کی تنہائی رقص کرنے لگی تھی۔ ایک کے بعد ایک سگریٹ سلگتا رہا اور دھواں بڑھتا رہا۔

گزشتہ چند دنوں سے وہ اسموکنگ سے کافی حد تک گریز کررہا تھا وہ اپنی عادت اپنی طلب پہ کنٹرول کرنا سیکھ رہا تھا مگر آج اچانک۔ سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ اس کی سوچیں اور وہی عادتیں عود کے سامنے آنے کو بے تاب ہو گئی تھیں آج پھر سگریٹ اس کی شکستہ ذات کو اپنے دھوئیں کی چادر میں لپیٹ رہے تھے اور وہ پور پور دھوئیں میں ڈوب رہا تھا ڈرائنگ روم کا فریش ماحول دیکھتے ہی دیکھتے حبس زدہ ہو گیا اور اس کے ملازم اسے اس حال میں دیکھ کر بہت پریشان ہو رہے تھے کیونکہ وہ اپنے مالک سے بہت پُجے تھے اس کا اچھا برا انہیں بھی متفکر کردیتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ نہ تو آگے بڑھ کے اسے روک سکتے تھے اور نہ ہی پوچھ سکتے تھے کیونکہ وہ اس وقت اپنی ہی ذات کے نہاں خانوں میں اترا ہوا تھا اور فی الحال اسے ڈسٹرب کرنا ہرگز مناسب نہیں تھا البتہ اس کے حال پہ وہ اندر ہی اندر

جلتے کڑھتے رہے تھے۔ وہ شام سے ڈرائنگ روم کے صوفے پہ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھا ہوا تھا اور مسلسل سگریٹ پھونکتے ہوئے اذیت ناکی کا یہ کھیل بھی جاری تھا۔

شام سے مسلسل اس کے قریب پڑی کرسٹل ٹیبل پہ رکھا موبائل لگاتار ہونے والی وائبریشن سے تھرک رہا تھا یوں جیسے کال کرنے والا اس کے لیے تڑپ رہا ہو اور وہ موبائل اسکرین دیکھے بنا بھی جانتا تھا کہ یہ "تڑپ" اور یہ کال کس کی ہے؟ لیکن اس وقت وہ اپنے لیے تڑپنے والے سے بھی بات نہیں کرنا چاہتا تھا اس وقت وہ صرف اپنے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی تنہائی' اپنی شکستگی کی حد دیکھنا چاہتا تھا اپنے آپ کو آزمانا چاہتا تھا اور اسی لیے اس نے متواتر بجتے والی کال ریسیو نہیں کی تھی اور ایک بار پھر سر جھٹک کر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر دوبارہ سگریٹ سلگا لیا تھا۔ آج نہ تو اس کے ذہن پہ سوار بوجھ کم ہو رہا تھا اور نہ ہی رات آگے سرک رہی تھی۔ ہر چیز پہ ایک جمود سا طاری تھا' سب کچھ جیسے معطر سا گیا تھا' لمحات ساکت ہوئے لگ رہے تھے!

صبح کا سورج ابھی پوری طرح سے طلوع بھی نہیں ہوا تھا کہ نبیل حیات کی گاڑی سیدھی اس کے گھر کے گیٹ پر آرکی تھی اور اسے دیکھ کر گلاب خان نے فوراً" گیٹ وا کر دیا تھا۔

"تمہارے صاحب کہاں ہیں؟" نبیل نے گاڑی سے اترتے ہی استفسار کیا تھا۔

"اندر ہیں مگر بہت برے حال میں ہیں" گلاب خان نبیل سے بھی زیادہ پریشان نظر آرہا تھا اور نبیل اس کی بات سن کر ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر کیے بغیر اندر کی سمت بھاگا اور ڈرائنگ روم کے بیچوں بیچ صوفے پہ نڈھال اور بے سدھ پڑے دل آور کو دیکھ کر یکدم قدم ٹھٹک گئے تھے اور وہ بے ساختہ لپک کے اس کے قریب آیا تھا۔

"دل آورے! دل آورے آنکھیں کھولو ادھر میری طرف دیکھو۔" نبیل نے اس کے قریب جھکتے ہوئے اسے جھنجھوڑا تھا۔ اور دل آور نے اپنے درد سے پھٹتے سر کو بمشکل حرکت دیتے ہوئے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تھی۔

"دل آور کیا ہو گیا ہے تمہیں' کیا حال بنا لیا ہے تم نے؟ اٹھو آنکھیں کھولو۔" نبیل کا دل اسے دیکھ کر جیسے مٹھی میں آگیا تھا کیونکہ اس کی حالت ہی ایسی ہو رہی تھی کہ نبیل سے بھی برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

اور دل آور نے نبیل کے بازو کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور ذرا دیر یونہی سر جھکائے بیٹھا رہا تھا۔

"دل آورے....." نبیل نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔

"زندہ ہوں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے تلخی سے کہہ کر وہاں سے اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر وہ وہاں سے اٹھ نہیں سکا تھا اور اسے یوں لڑکھڑاتے دیکھ کر نبیل نے فوراً" اسے تھام کر اسے سہارا دیا تھا۔

"لیکن یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا بھابھی کہاں ہیں وہ گھر کیوں نہیں آئیں؟" نبیل رات سے پریشان ہو ہو کر تھک چکا تھا۔

"وہ حویلی چلی گئی ہے..... اپنے گھر والوں کے پاس....." دل آور نے کسی روبوٹ کی طرح جواب دیا تھا۔

"مگر کیوں... ؟ وہ اپنے گھر کیوں نہیں آئیں؟ تمہارے ساتھ تمہارے پاس۔"

"کیونکہ اسے یہ گھر پسند نہیں ہے کیونکہ اسے مجھ سے محبت نہیں ہے کیونکہ وہ... وہ..... یہاں۔" دل آور کہتے کہتے بے اختیار رک گیا تھا اور اس نے بے بسی سے لب بھینچ لیے تھے۔

"بس کرو نبیل' بس کرو..... مجھ سے اور کچھ مت پوچھو میرے پاس کچھ نہیں بچا میں اب کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں' اس لیے بہتر ہے کہ مجھے چپ رہنے دو پلیز مجھے چپ رہنے دو نبیل مجھے چپ رہنے دو۔" دل آور بے بسی اور شکستگی کی انتہا پہ تھا۔

"کیوں دل آورے کیوں؟ کیوں چپ رہنے دیں تمہیں؟ تم چپ کیوں رہنا چاہتے ہو؟ جو تمہارے دل میں ہے تم کہتے کیوں نہیں ہو کہو جو بھی دل میں ہے کہو میں سن رہا ہوں..... تمہاری ہر بات سنوں گا اور سمجھوں گا بھی۔" نبیل نے اسے بولنے پہ اکسایا تھا لیکن دل آور کیسے بولتا؟ کیسے کچھ کہتا.....؟ اس کے پاس واقعی اب خاموشی اور چپ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

"کیا کہوں..... کیا کہوں آخر؟ یہی نا کہ میں "ہار" چکا ہوں میں صرف علیزے کے چلے جانے سے ہی ہار چکا ہوں..... تو سنو..... ہاں میں واقعی ہار چکا ہوں..... ہار چکا ہوں میں..... اور مجھے ہرانے والی اور مجھے شکست دینے والی کوئی اور نہیں میری بیوی ہے میری اپنی بیوی' وہ بیوی جس کی خاطر میں نے وہ کام بھی کیے ہیں جو یقیناً" میں مر بھی جاتا تو نہ کرتا۔" دل آور کا لہجہ کہتے کہتے مزید گمبھیر ہو گیا تھا۔

"انہوں نے ایسا کیوں کیا ہے؟ تم تو کہتے تھے کہ علیزے بھابھی کو تم سے محبت ہے' لو میرج کی ہے تم لوگوں نے..... پھر یہ..... یہ سب کیا ہے؟ کہاں ہے محبت اور کہاں ہے لو میرج.....؟" نبیل دل آور کے تسلی اور دلاسوں سے تھک چکا تھا' تنگ آگیا تھا' آج کی پوری رات اس نے بھی بالکل اس طرح جاگ کر گزاری تھی جیسے کہ دل آور نے جاگ کر گزاری تھی۔ وہ بھی اس کے لیے اتنا ہی تڑپا تھا جتنا وہ علیزے کے لیے تڑپا تھا۔

"دل آورے! بتاؤ نا کیا کہا تھا تم نے؟ اور کیا ہو رہا ہے آج؟"

"نبیل! میں نے جو کچھ بھی کہا تھا سب غلط کہا تھا۔" دل آور کا لہجہ پتھریلا ہو گیا تھا۔

"ہم جانتے ہیں کہ تم نے جو بھی کہا تھا سب غلط کہا تھا مگر ہم منتظر تھے کہ تم کبھی سچ بھی کہو گے۔" عبداللہ کی آواز پہ نبیل اور دل آور دونوں نے ہی یکدم چونک کر ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی طرف دیکھا تھا جہاں عبداللہ بڑے اطمینان سے کھڑا تھا۔

"عبداللہ! تم یہاں اس وقت؟" نبیل کو حیرت ہوئی تھی۔

"تم دونوں کیا سمجھتے ہو کہ تم دونوں رات بھر پریشانی اور اذیت میں تڑپ کر گزارتے ہو اور میں اپنے بیڈ روم میں سکون کی نیند سوتا ہوں.....؟ مجھے تم دونوں کی خبر نہیں ہوتی..... یا مجھے تم دونوں کا احساس نہیں ہوتا؟" عبداللہ کے سوال پہ وہ دونوں ہی چپ رہ گئے تھے۔

"نہیں نبیل حیات..... ! میں بھی سو نہیں پاتا' میں بھی رات جاگ کر ہی گزارتا ہوں۔" عبداللہ تلخی سے کہتا ڈرائنگ روم کے اندر آگیا تھا اور دل آور کے بالکل سامنے والے صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔

"مگر تمہیں کیسے پتا چلا کہ....." نبیل کا اشارہ علیزے کی طرف تھا۔

"مجھے بڑی حویلی سے کال آئی تھی۔" عبداللہ نے دل آور کو نظروں میں تولتے ہوئے بتایا مگر دل آور نے کوئی رسپانس نہیں دیا تھا۔

"کس کی؟" سوال جواب وہ دونوں ہی کر رہے تھے دل آور صرف سن رہا تھا۔

"دانیال کی....." عبداللہ کا انداز بہت پرسوچ اور عجیب سا ہو رہا تھا۔

"پھر کیا کہا اس نے....." نبیل نے جاننا چاہا۔

"اس نے کہا ہے کہ دل آور شاہ کے سسرال والے عنقریب طلاق کا مطالبہ کرنے والے ہیں۔" عبداللہ نے نبیل کے سر پہ بم پھوڑ دیا تھا لیکن دل آور یکدم لب بھینچ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"اوکے..... ! دے دوں گا طلاق..... ان سے کہو مطالبہ ذرا جلدی کریں میں خود یہ ملک چھوڑ کر جا رہا ہوں۔" دل آور نے بہت ہی مضبوط اور اٹل انداز میں کہتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ اور وہ دونوں گنگ رہ گئے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

رخشندہ کوکب
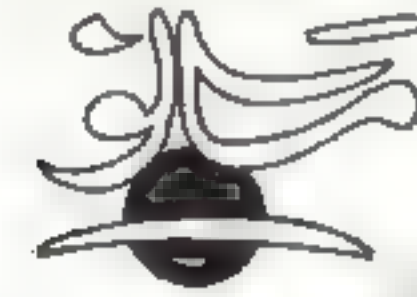
"صائم میرے پاس آکر بیٹھو' مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" ماں نے پاس سے گزرتے ہوئے اپنے چھوٹے بیٹے کو آواز دیتے ہوئے کہا۔

"بندہ حکم کا غلام ہے' فرمائیے' صائم نے کرسی کھینچ کرماں کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اب جو بات تم سے کرنے لگی ہوں اسے دھیان سے سننا اور ذمہ داری سے پتا کرانا۔" ماں نے کہا۔

"لیکن ماں بھارت تو خود ہی میزائل چھوڑنے کا اعلان کرتا ہے اور ناکامی بھی قبول کرلیتا ہے۔ ہمیں کیا ضرورت ہے ان کے بارے میں جاسوسی کرنے کی۔" صائم نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

"تمہاری یہ ہی بات بری لگتی ہے کہ تم کسی چیز کو سیریس نہیں لیتے۔ ماہ نور کا رشتہ آیا ہے' تم نے اس بندے کے متعلق پتا کروانا ہے۔"

"کیا کہا۔ بھابھی کا رشتہ۔"

"ایسے کیوں چونک پڑے ہو جب تک دائم زندہ تھا ہمارے گھر کی بہو تھی اب بیٹا اس دنیا میں نہیں رہا تو وہ ہماری بیٹی بن گئی ہے' بیٹیوں کی شادی کرنا ہر والدین کا فرض ہے۔"

"اور وہ جو دو چھوٹے بچے ہیں ان کا کیا قصور ہے باپ تو حادثے میں گیا' ماں سے دادی الگ کررہی ہے۔"

"کیسی باتیں کررہے ہو میں کیوں الگ کرنے لگی۔ ماہ نور ساری زندگی تو بیوہ بن کر ——— نہیں گزار سکتی' ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے' بمشکل تیس کی ہوگی۔ والدین اس کے نہیں ہیں' بہن بھائی اپنے گھروں میں مست ہیں' اب ہم ہی اس کے سب کچھ ہیں۔ جانے دائم کو کیا جلدی تھی' میں نے نام ہی غلط رکھا تھا۔" ماں نے ڈوپٹے سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

"دائم بھائی ہم سب کو ساری زندگی کا دکھ دے گئے ہیں ایک سال ہونے کو آیا ہے مگر لگتا ہے کہ ابھی کسی کمرے سے نکل آئیں گے۔ میں بھابی کی شادی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"دل تو میرا بھی بہت دکھتا ہے اس کی شادی کا سوچ کر' مگر میں خود غرض نہیں بننا چاہتی' اس نے مجھے بیٹیوں سے بڑھ کر سکھ دیا ہے۔ مجھے تو اب یہ بھی یاد نہیں کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے' ہر پل اسے آوازیں دیتی رہتی ہوں اور وہ خدا کی بندی بھی میری ایک آواز پر دوڑی چلی آتی ہے اور بار بار بلانے پر برا نہیں مانتی۔ میں بھی اس کی شادی مجبوری میں کررہی ہوں۔"

"ماں مانو ہمارے گھر کی فرد ہے وہ یہاں سے نہیں جاسکتی۔"

"ایسا سوچنا تو مجھے بھی دکھ دیتا ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ اس کی شادی ضروری ہے ابھی مجھے کل کی بات لگتی ہے کہ جب دائم نے اس کا نام ماہ نور سے مانور رکھا تھا اور پھر ہم سب اس کا اصل نام بھول گئے تھے اور مانو بلانا شروع کردیا۔ میں نے تو دائم کے جانے کے بعد مانو کو مانو کہنا ہی چھوڑ دیا ہے اسے اب پورے نام ماہ نور سے بلاتی ہوں۔"

"مجھے اپنے دوست کی طرف جانا ہے' ابھی تو وہاں جارہا ہوں۔ پھر اس بندے کے بارے میں معلومات لوں گا۔"

☼ ☼ ☼

صائم بادل ناخواستہ ماہ نور کے لیے آئے پرپوزل والے ایڈریس پر پہنچ گیا' باہر سے چھوٹی سی دکان لگتی تھی اندر داخل ہوا تو بہت بڑا سینٹری کا اسٹور تھا تین چار لڑکے مختلف کسٹمرز کو چیزیں دکھا رہے تھے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ کون اسٹور کا مالک ہے ایک بھاری آواز پر چونک پڑا۔

"باؤ جی کس چیز کی تلاش میں ہیں۔"

صائم نے مڑ کر دیکھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کاؤنٹر کے پیچھے ایک گوشت کا پہاڑ بیٹھا تھا' پیٹ اس کا گھٹنوں کو چھو رہا تھا۔

"ابا جی اب تو مجھے گھر جانے دیں۔ اسکول کا ہوم ورک بھی کرنا ہے اور ٹیسٹ کی تیاری بھی۔" ایک پندرہ سولہ سال کے لڑکے نے پوچھا۔

"کتنی بار تجھے سمجھایا ہے کہ پڑھنے میں وقت ضائع نہ کر' میرے ساتھ دکان پر بیٹھا کر' کاروبار کرنا سیکھ لے

تو زندگی بھر کام آئے گا' دس سال کی عمر سے دکان چلا رہا ہوں' مارکیٹ میں اتنا اثر ورسوخ ہے کہ ایک فون کال پر لاکھوں کا مال پہنچا دیتے ہیں' سر کے بال یونہی سفید نہیں ہو گئے۔" موٹے شخص نے کہا۔

صائم نے اس کے سر پر دیکھا تو سر پر بالوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اس نے بہت غور کیا تو چند ایک بالوں سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کبھی بال ہوا کرتے تھے۔ اسے زیادہ تشویش بڑھے ہوئے پیٹ کی تھی' پتا نہیں یہ کھڑا بھی ہو سکتا ہے یا پیٹ راستے میں آجاتا ہے۔

"ابا مجھے پڑھنے کا شوق ہے مجھے کاروبار نہیں کرنا۔" لڑکے نے ضد کی۔

"باؤ جی اسے سمجھائیں کہ پڑھائی میں کیا رکھا ہے۔ جتنا ایک دن میں اس دکان سے میں کما لیتا ہوں اتنا یہ بی اے ایم اے کر کے بھی ایک سال میں نہیں کما سکتا۔"

"ابا میں جا رہا ہوں۔" بچے نے ضدی لہجے میں کہا اور باہر نکل گیا۔

"بس یہی ایک بیٹا ہے۔" صائم نے پوچھا۔

"ایک اس سے بڑا ہے۔ خیر آپ کو کیا لینا ہے۔"

"جی مجھے کیا لینا ہے؟ کچن کے لیے ٹائلز لینے ہیں۔" صائم نے چونک کر کہا۔

"باؤ جی آپ پڑھے لکھے لگتے ہیں' نوکری تو کرتے ہوں گے مہینے کا کتنا کما لیتے ہیں۔"

"اتنا کما لیتا ہوں کہ دن میں لاکھوں کمانے والے کو باؤ جی نہیں کہنا پڑتا۔" صائم نے بے ساختہ کہا۔ وہ اسے حیران ہو کر دیکھتا رہا۔

"میں چلتا ہوں پھر چکر لگاؤں گا۔" صائم اسے حیران پریشان چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

"امی مجھے بازار جانا ہے ضرورت کی کئی چیزیں ختم ہو گئی ہیں۔" مانو نے اپنی ساس کے کمرے میں آکر کہا۔

"مگر بیٹا ابھی تو رشتے کرانے والی آنٹی آنے والی ہیں۔" ان کے منہ سے نکل گیا۔

"رشتے کرانے والی آنٹی؟ مگر ہمارے گھر میں تو کسی کی شادی نہیں ہونے والی۔ صائم کی بات تو زارا سے پکی ہے اب آپ کا پوتا جگنو تو صرف پانچ سال کا ہے پھر کیوں بلایا اسے" مانو نے حیرت سے پوچھا۔

"میری جوان بیٹی بھی ہے۔ اپنے آپ کو بھول رہی ہو۔" ماں نے بات سنبھالی۔

"ماں نہ میں جوان ہوں اور نہ غیر شادی شدہ۔ دو بچوں کی ماں اور بیوہ ہوں اور آپ جانتی ہیں کہ بیوہ کے کیسے رشتے ایسی آنٹیاں لاتی ہیں اور احسان جتانے والے انداز سے بات کرتی ہیں' مجھے کہیں نہیں جانا اس گھر سے۔ بس ایک بار دائم کی دلہن بن کر اس گھر میں آگئی ہوں' اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ کسی اور کی دلہن بن جاؤں' مجھے بس یہیں پڑا رہنے دیں' زندگی بھر آپ اور ابا جی کی خدمت میں گزار دوں گی۔" مانو نے اداسی سے کہا۔

"تمہارے تو چلنے پھرنے کے دن ہیں اور تمہارے بچے بڑے ہونے میں پندرہ بیس سال پڑے ہیں' کیا ان بچوں کی خاطر عمر گزار دو گی۔" ماں نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"زندگی کا کیا بھروسا ہے کہ کوئی کب چلا جائے' موت کا تعلق عمر سے نہیں ہوتا' کیا دائم کے جانے کے دن تھے وہ چلے گئے بغیر بتائے' اب میرا زندگی سے بھروسا اٹھ گیا ہے' مجھے نہ شادی کرنی ہے نہ آپ کو چھوڑ کر جانا ہے۔" مانو کی آنکھیں بھر آئیں۔

"لیکن بیٹے جب تک زندگی ہے دنیا داری نبھانی پڑتی ہے لوگ کیا کہیں گے اپنے بڑھاپے کے لیے بہو کی شادی نہیں کر رہے۔ ہمارا کب دل چاہتا ہے کہ تم یہاں سے جاؤ مگر ہماری مجبوری ہے ساتھی کے بغیر تو بڑھاپا نہیں گزرتا جوانی تو بہت مشکل ہے۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا میں نے جب پہلی بار تمہاری شادی کا سوچا تھا تو کلیجہ منہ کو آتا تھا مگر جب تمہارے ابا جی نے مجھے سمجھایا کہ زندگی کی حقیقتوں کو قبول کر لینا چاہیے تو

میں نے آہستہ آہستہ دل کو سمجھانا شروع کر دیا اب کہیں جا کر تمہاری شادی کی بات کرتی ہوں۔" ماں نے کہا۔

"آپ کی کسی بات سے مجھے اختلاف نہیں ہے مگر میں نے ابھی تک اپنی شادی کا نہیں سوچا۔ مجھے تو ابھی یہ یقین نہیں آیا کہ دائم اب اس دنیا میں نہیں رہے ایک سال گزر گیا ہے اور آج بھی دائم کی آواز میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔ کیسے کسی اور کے لیے دل کو راضی کر لوں؟ دل تو کسی کے قابو میں نہیں ہوتا۔" مانو نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"اچھا چھوڑو پھر بات کریں لو دیکھو وہ بھی آگئی ہیں تم اپنا موڈ درست کرو آدھے گھنٹے میں اسے رخصت کرتی ہوں پھر چلتے ہیں بازار۔" ماں نے کہا۔

ابھی آنٹی بیٹھی ہی تھیں کہ صائم بھی کمرے سے نکل آیا اور ان سے مخاطب ہوا۔

"آنٹی آپ برا نہ مانیں تو بتا سکتی ہیں کہ کتنا عرصہ ہو گیا ہے آپ کو رشتے کراتے؟"

"تم کیوں پوچھ رہے تمہاری بات تو پکی ہے ورنہ ایسی امیر خوبصورت لڑکی سے تمہارا رشتہ کراتی کہ ہمیشہ یاد رکھتے۔"

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"کیا جواب دوں میری ماں بھی یہی کام کرتی تھیں اور میں نے دس سال کی عمر سے ان کے ساتھ جانا شروع کر دیا تھا۔ پہلا رشتہ میں خود کنواری تھی صرف اٹھارہ سال کی تھی تو کرایا تھا۔"

"آپ جب کسی لڑکی اور لڑکے کی بات جوڑنے کا سوچتی ہیں تو ان کی عمر' قد کاٹھ' تعلیم اور خاندان آپس میں میل کرتے ہیں تو بات آگے بڑھاتی ہیں۔" صائم نے مانو کو اشارے سے کمرے میں جانے کا کہا۔

"ظاہر ہے یہ تو بنیادی باتیں ہیں۔" آنٹی نے کہا۔

"پھر بھائی اور اس گوشت کے پہاڑ میں کیا مناسبت دیکھی تھی" صائم نے پوچھا۔

"کیا تم اس کو دیکھ آئے ہو مجھے تو نہیں بتایا۔" ماں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ابھی آنٹی سے بات کر لوں پھر آپ کو بتاتا ہوں۔" صائم نے کہا۔

"ایک بیوہ اور دو بچوں کی ماں کے لیے مناسبت کی بات نہیں سوچی جاتی اس کے لیے جو بھی رشتہ ہوتا ہے بات چلا دی جاتی ہے۔" آنٹی نے کہا۔

"گویا آپ بیوہ اور طلاق یافتہ عورت کو انسان ہی نہیں سمجھتیں جہاں چاہے باندھ دیا جائے؟ جانے آپ کی اس سوچ کی وجہ سے کتنی زندگیاں برباد ہوئی ہوں گی آنٹی اس قسم کے بے جوڑ رشتے کرانے پر خدا سے معافی مانگیں اور خدا کو حاضر ناظر جان کر خود سے وعدہ کریں کہ آئندہ ایسے بے جوڑ رشتوں کا آپ سوچیں گی بھی نہیں اس گوشت کے پہاڑ کا کہیں رشتہ نہ کرائیں جو اپنے بیٹے کو پڑھنے سے روک رہا ہے وہ پڑھی لکھی لڑکی کا کیا حال کرے گا۔" صائم نے نرمی سے کہا۔

"آمنہ آپا اگر آپ نے میری بے عزتی ہی کرانی تھی تو مجھے گھر کیوں بلایا تھا۔" آنٹی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"عذرا میں نے مناسب رشتے کی بات کی تھی بے جوڑ کی نہیں۔ ماہ نور مجھے بیٹیوں سے بڑھ کر عزیز ہے۔" ماں نے کہا۔

"اتنی ہی عزیز ہے تو صائم سے شادی کر دو چار پانچ سال کا ہی تو فرق ہے۔ اور صائم کی ابھی بات ہی تو پکی ہوئی ہے نکاح تو نہیں ہوا۔" آنٹی نے غصے سے کہا۔

ماں اور صائم ایک دوسرے کے منہ دیکھنے لگے۔ آنٹی نے چادر اوڑھی اور نکل گئیں صائم خاموشی سے کمرے میں چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

"امی آج شاپنگ کے لیے چلیں کچھ ضروری چیزیں خریدنی ہیں۔" مانو نے کمرے میں آکر کہا۔

"میں تو کئی دنوں سے کہہ رہی تھی' چلو تیار ہو جاؤ۔ بچے صائم کے پاس چھوڑ جاتے ہیں وہ اس وقت گھر پر ہے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے آپ صائم کو بتائیں اور میں لسٹ لے کر آتی ہوں۔"

"تمہاری لسٹ بنانے کی عادت نہیں گئی۔" ماں نے ہنس کر کہا۔

"لسٹ ساتھ ہو تو وقت بھی بچتا ہے اور تمام چیزیں بھی یاد رہتی ہیں۔ گھر آکر خود کو کوسنا نہیں پڑتا کہ فلاں چیز رہ گئی ہے مجھے بار بار بازار جانا پسند نہیں ہے۔" مانو نے کہا۔

"تم عمر سے بڑھ کر سوچتی ہو جلد بوڑھی ہو جاؤ گی۔ ابھی کھاؤ گھومو پھرو۔" ماں نے ہنس کر کہا۔

"جس کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی وہ تو راستے میں چھوڑ کر چلا گیا' اب مجھے جلد بوڑھا ہو جانا چاہیے۔" مانو نے کہا۔

"کتنی بار تمہیں سمجھایا ہے کہ جانے والے کے ساتھ جایا نہیں جاتا نہ جوگ لیا جاتا ہے زندگی گزارنی پڑتی ہے مجھے دیکھو جوان بیٹے کی موت کا دکھ دل میں بسا کر دنیاداری نباہ رہی ہوں مر تو نہیں گئی' تم بھی جینا سیکھو۔" ماں نے کہا۔

"جی ایسا ہی کر رہی ہوں۔" مانو تیزی سے کمرے کی طرف مڑ گئی۔

"کہاں کی تیاری ہے ماں؟" صائم نے کمرے میں آکر کہا۔

"مانو کے ساتھ بازار جا رہی ہوں تم ذرا بچوں کا خیال رکھنا۔"

"بچوں کو بھی ساتھ لے چلتے ہیں مانو ایک سال بعد گھر سے باہر نکل رہی ہے آئس کریم اور کھانا باہر ہی کھائیں گے۔" صائم نے کہا۔

"چلیں امی میں تیار ہوں۔" مانو چادر اوڑھ کر آگئی۔

"ویسے آپ کا یہ حلیہ بازار جانے والا نہیں ہے خیر لیے چلتے ہیں سامان بھی تو کسی نے اٹھانا ہے۔ لوگ یہی سمجھیں گے خود تو اتنے تیار ہو کر باہر نکلے ہیں کام والی کو ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں لے کر دیئے۔ آپ نے ہمیں ظالم ظاہر کرنا تو ہم تیار ہیں۔" صائم نے اس کا حلیہ دیکھ کر کہا۔

"میرا تیار ہونے کو دل نہیں چاہتا۔" مانو نے بےزاری سے کہا۔

"پہلے بتایا ہوتا' ہم گھر پر پارلر والی کو بلا لیتے' خیر اب بازار جا رہی ہیں تو کسی اچھے سے پارلر سے مساج وغیرہ بھی کروا لینا۔ زارا کو دیکھا ہے کیسی تیار رہتی ہے۔" صائم نے دبی مسکراہٹ سے کہا۔

"مجھے اس سے مقابلہ نہیں کرنا اسے تیار رہنا سجتا ہے۔" مانو نے کہا۔

"تم دونوں میں نوک جھوک کیوں چلتی رہتی ہے تم کیوں اس کی باتوں کو سیریس لیتی ہو۔ چلو اب خاموشی سے بازار چلو راستے میں کوئی ایک دوسرے کو تنگ نہیں کرے گا خاص کر صائم تم کان کھول کر سن لو۔" ماں نے ڈانٹا۔

"مجھے دس منٹ دیں ابھی آتی ہوں۔" مانو بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کمرے میں آتے ہی اس نے وارڈروب کھولی کلیوں والا بلیک کلر کا فراک نکال کر پہن لیا ساتھ چوڑی دار پاجامہ اور چنری والا پرنٹڈ دوپٹہ لیا۔ آنکھوں میں کاجل لگایا اسکن کلر کی لپ اسٹک لگا کر پانچ منٹ میں باہر آگئی۔ ماں اور صائم ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"شکریہ ماہ نور بھابھی یہ ہے آپ کا اصل روپ خوش کر دیا آپ نے۔" صائم نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس ایسے ہی رہا کرو۔" ماں بھی خوش ہو گئیں۔

بچوں کے ساتھ مارکیٹ پہنچے تو صائم بچوں کے ساتھ پلے لینڈ چلا گیا۔ ماں اور مانو کپڑوں کی دکان میں چلی گئی گھنٹے بعد ماں واپس آگئی' صائم بچوں کے ساتھ آئس کریم کھا رہا تھا۔

"صائم اب تم مانو کے ساتھ چلے جاؤ میں تھک گئی ہوں۔" ماں نے کہا۔

"ٹھیک ہے آپ بیٹھیے میں چلا جاتا ہوں۔ کس اسٹور میں ہیں۔" صائم نے ماں کے ہاتھ سے شاپرز پکڑ کر کرسی کے قریب رکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہی بڑا سا جو اسٹور ہے۔" ماں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھ گیا۔" صائم نے کہا۔

"یہ سفید والا نہیں' فروزی اور پنک والا دکھائیں۔" صائم نے جاتے ہی کہا۔

"تم کہاں سے آگئے۔"

"میں نے تو آنا ہی تھا ہاں یہ کلر ٹھیک ہے دوسرا وہ پرپل کلر ٹھیک رہے گا بھائی صاحب وہ نکال دیں اور تیسرا بلیک کلر دے دیں۔" صائم نے مانو سے پوچھے بغیر کہا۔

"شکر ہے بھائی صاحب آپ آگئے ورنہ باجی تو بہت ہلکے رنگ پسند کر رہی تھیں۔ اب اس عمر میں تو ایسے رنگ کوئی نہیں پہنتا۔" دکان دار نے پہلے کے تمام کپڑے ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔

"ان کو ہلکے کلر پسند تو ہیں مگر ان پر سجتے نہیں۔" صائم نے مانو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"باجی آپ کو اپنے گھر والے کی بات سننی چاہیے۔" دکان دار نے اپنی طرف سے مشورہ دیتے ہوئے کہا مانو منہ کھولنے ہی لگی تھی کہ صائم نے اس کا بازو دباتے ہوئے کہا۔

"وضاحت مت کرنے بیٹھ جانا کہ ہمارا کیا رشتہ ہے۔" صائم نے کان میں کہا۔

"بس جو کچھ خرید لیا ہے کافی ہے اب چلتے ہیں۔" مانو نے گھبرا کر کہا۔

"ابھی کہاں باجی' میں نے اصل مال تو ابھی دکھایا نہیں۔" دکان دار نے فوراً" بندھا ہوا بیگ کھول دیا۔ اس میں اعلا کپڑوں کی اتنی ورائٹی تھی کہ صائم بول اٹھا۔

"اتنے خوبصورت کلرز ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ سارے رنگ خرید لوں۔"

"خرید لو زارا کے لیے۔" مانو نے ہاتھ میں کپڑا لیتے ہوئے کہا۔

"اس کے لیے بعد میں سوچوں گا پہلے آپ کے لیے تو لے لیں۔" صائم نے کہا۔

مانو نے کچھ ماں کے لیے اور کچھ زارا کے لیے پسند کیے اور اسٹور سے باہر آگئے۔ ابھی دونوں کسی اور شاپ میں جانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ سامنے زارا نظر آگئی۔

"یہ کہاں آگئی ہے۔" صائم نے کہا۔

"چلو اچھا ہوا کہ زارا آگئی ہے اس کے ساتھ باقی چیزیں خریدوں گی۔" مانو نے کہا۔

"تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو؟" زارا نے آتے ہی پوچھا۔

"نہ دعا نہ سلام مارکیٹ میں لوگ کیا کرنے آتے ہیں۔" صائم نے کہا۔

"یہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو" زارا نے مانو پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ وضاحت کریں گی کہ "تم دونوں" سے کیا مطلب ہے؟"

"کتنی دیر سے شاپنگ کر رہے ہو؟" زارا نے ایک اور احمقانہ سوال کیا۔

"لگتا ہے کہ تم کھائے پیے بغیر گھر سے نکل آئی ہو اس لیے تمہارا دماغ کام نہیں کر رہا اور الٹے سیدھے سوال کر رہی ہو۔" صائم نے ہنس کر کہا۔

"میرے سوال الٹے سیدھے نہیں ہیں تم مجھے اچانک دیکھ کر پریشان ہو گئے ہو اس لیے کوئی جواب نہیں بن رہا۔" زارا نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

"مانا تم خوبصورت نہیں ہو مگر اتنی بھی خوفناک نہیں ہو کہ تمہیں دیکھ کر ہم گھبرا جائیں۔" صائم کہاں چپ رہنے والا تھا۔

"بھابی آپ کیوں خاموش ہیں؟" زارا نے کہا۔

"تم دونوں کی نوک جھوک ختم ہو تو میں بھی کچھ کہوں۔ میں تو تمہیں دیکھ کر خوش ہو گئی تھی کہ باقی شاپنگ تمہارے ساتھ کروں گی تم تو جانتی ہو کہ صائم کے ساتھ کچھ خریدنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔" مانو نے مسکرا کر کہا۔

"میں کہاں جانتی ہوں مجھے تو کبھی اس نے شاپنگ

کرائی نہیں۔" زارا نے فوراً کہا۔

"میں نامحرم کے ساتھ نہیں گھومتا۔" صائم نے دبی مسکراہٹ سے کہا۔

"بھابی تو جیسے محرم ہیں۔" زارا نے فوراً کہا۔

"منہ سے الفاظ نکالنے سے پہلے سوچ لینا چاہیے بزرگوں کی یہی نصیحت ہے۔" صائم نے سنجیدگی سے کہا۔

"سچی بات کہنے کے لیے سوچا نہیں جاتا۔ اب میں چلتی ہوں کباب میں ہڈی نہیں بننا چاہتی۔" زارا نے کہا اور چلی گئی۔

"اب آپ اس کی باتوں پر موڈ آف نہ کریں میں ہمیشہ سے یہی کہتا آرہا ہوں کہ زارا خاموش ہو تو قبول صورت لگتی ہے بول پڑے تو احمق نظر آنے لگتی ہے۔ جانے آپ اور ماں نے کیا سوچ کے اسے میرے لیے پسند کیا ہے ابھی بھی وقت ہے آپ دونوں اپنے فیصلے پر نظرثانی کرلیں۔" صائم نے مانو کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ کر کہا۔

"چلو گھر چلتے ہیں۔" مانو نے کہا۔

"کیوں چلیں آپ ایک سال بعد گھر سے نکلی ہیں ابھی بچوں کے بھی کپڑے خریدنے ہیں۔" صائم نے کہا۔

"پھر آجائیں گے میں اور امی تھک گئی ہیں۔" مانو نے بےزاری سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" صائم بھی اس کا آف موڈ دیکھ کر مان گیا تھا لہٰذا وہ لوگ جلد ہی واپسی کے سفر پر تھے۔

☼ ☼ ☼

"آپا کیا زارا اور صائم کی لڑائی ہوئی ہے؟" ناظمہ نے فون کرتے ہی پوچھا۔

"زارا تو ہماری طرف آئی نہیں اور صائم تو تمہاری طرف میرے ساتھ ہی آتا ہے پھر لڑائی کہاں ہوئی۔" ماں نے کہا۔

"زارا بتا رہی تھی کہ صائم ماہ نور کے ساتھ گھوم رہا تھا۔" ناظمہ نے پوچھا۔

"زارا کا دماغ خراب ہوگیا ہے ماہ نور ایک سال سے گھر سے باہر ہی نہیں نکلی صائم کبھی کبھی بچوں کو لے کر باہر جاتا ہے میں تو خود اسے کہتی ہوں کہ صائم کے ساتھ چلی جاؤ مگر وہ تو صاف انکار کردیتی ہے پھر میں کیسے مان لوں کہ وہ صائم کے ساتھ باہر گھوم رہی تھی۔" آمنہ نے حیران ہوکر کہا۔

"آپ زارا کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس نے ان دونوں کو ساتھ دیکھا ہے تو بات کی ہے۔" ناظمہ نے کہا۔

"میں نہیں مانتی میری زارا سے بات کراؤ۔" آمنہ نے کہا۔

ناظمہ نے فون زارا کو دے دیا۔

"سلام خالہ میں نے بھابی کو مارکیٹ میں کپڑے کی دکان سے صائم کے ساتھ نکلتے دیکھا تو میں بھی پاس پہنچ گئی۔ وہ بار بار اسے بھابی کہنے کی بجائے مانو کہہ رہا تھا اور اس نے تین چار شاپر بھی اٹھائے ہوئے تھے اس کا مطلب ہے کہ وہ بہت دیر سے شاپنگ کررہے تھے۔"

"میرے خدا! کتنی گھٹیا سوچ ہے تمہاری۔ اس دن وہ میرے ساتھ گئی تھی ایک سال کے بعد گھر سے نکلی تھی میرے ساتھ اس نے ساری چیزیں خریدی تھیں جب میں تھک گئی تو میں بچوں کے ساتھ بیٹھ گئی اور صائم کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔" آمنہ نے کہا۔

"آپ تو مجھے کہیں نظر نہیں آئیں وہ دونوں تو بہت خوش نظر آرہے تھے۔" زارا نے کہا۔

"اب تم اپنے انداز سے مجھے بتا رہی ہو بہرحال مجھے تمہاری بات بالکل پسند نہیں آئی۔ کل کو تم نے اس کی دیورانی بننا ہے یہی تمہاری سوچیں رہیں تو گزارا کرنا مشکل ہوگا مجھے ایسی چھوٹی سوچ والی بہو نہیں پسند تمہیں خود کو بدلنا ہوگا۔" آمنہ نے فون بند کردیا۔

آمنہ سوچ رہی تھیں کہ یہ دنیا کسی کو جینے کیوں نہیں دیتی ذرا سی بات کو اتنا کیوں بڑھا لیتے ہیں لوگ؟ آج ہم زندہ ہیں ہمارے ہوتے ہوئے میری سگی بھانجی اس پر الزام لگا رہی ہے۔ ہم نہ ہوتے تو بات کہاں سے

کہاں پہنچا دیتے؟ سادہ سی مانو کو کس کس کے سامنے وضاحت کرنی پڑتی کیا دیور کے ساتھ ہنستے ہوئے نظر آنا جرم ہے۔ اللہ کرے اس کے لیے مناسب رشتہ مل جائے تاکہ اپنے گھر والی ہوجائے مگر بیوہ کے لیے مناسب رشتہ تو دور کی بات ہے مناسب رشتے کا سوچا ہی نہیں جاتا معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کے رشتے آتے ہیں کیا کروں؟ آمنہ ابھی اور جانے کیا کیا سوچتیں کہ صائم پاس آکر بیٹھ گیا۔

"ماں کن سوچوں میں گم ہیں زیادہ سوچوں سے بال سفید ہوجائیں گے ابھی آپ نے میری شادی بھی کرنی ہے اور آپ نے میری شادی پر گانا بھی گانا ہے۔" صائم نے ماں کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"میں پریشان ہوں تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔" ماں نے کہا۔

"راہ چلتے کی پریشانی پالنا ہماری پاکستانی عورت کا پسندیدہ مشغلہ ہے اب آپ کو کس کی پریشانی پریشان کررہی ہے۔" صائم نے پوچھا۔

"مانو کی۔" ماں نے کہا۔

"اسے کیا ہوا ہے بیمار ہے ڈاکٹر کے پاس لیے چلتے ہیں۔" صائم نے کہا۔

"تمہارے بعد کون اس کا خیال رکھے گا۔" انہوں نے کہا۔

"میں مرگیا ہوں۔" صائم غصے میں آگیا۔

"تمہاری بیوی اسے جینے نہیں دے گی۔" وہ افسردہ تھیں۔

"اسے میں جینے نہیں دوں گا۔" صائم نے ذرا سختی سے کہا۔

"عورت ایسے باتوں میں لگاتی ہے کہ مرد کو گھما کر رکھ دیتی ہے" ماں نے کہا۔

"اور اگر مرد کا میٹر گھوم جائے تو دنیا کو ہلا دیتا ہے۔" صائم نے کہا۔

"میں ایسا نہیں چاہتی میں چاہتی ہوں کہ ہر کوئی اپنا مقام پہچانے اور عزت و احترام کے ساتھ رہے۔" ماں نے کہا۔

"پھر مانو جیسی کوئی لڑکی لائیں زارا میں تو ایسی کوئی خوبی نہیں ہے۔" صائم نے فوراً کہا۔

"تمہیں بھی تو پسند ہے۔" صائم نے کہا۔

"میں نے تو آپ کے کہنے پر ہاں کی تھی ورنہ اس کی بول چال... بس رہنے دیں آپ کی بھانجی ہے کچھ کہوں گا تو برا لگے گا ورنہ آپ جانتی ہیں کہ دیکھنے میں وہ قبول صورت ہے۔ لمبا قد اور سفید رنگ مگر جب بولتی ہے تو ساری شخصیت کا ستیاناس کردیتی ہے بس خاموش رہے تو ٹھیک ہے۔" صائم نے کہا۔

"خاموش وہ رہ نہیں سکتی۔ مانو نے کتنی چاہ سے اس کی منگنی کا جوڑا تیار کرایا تھا اب بھی بہت شوق سے شادی کی تیاریاں کررہی ہے۔" آمنہ بیگم نے کھوئے کھوئے انداز سے کہا۔

"کیا زارا نے کوئی بات کی ہے؟" صائم نے کریدا۔

"ہاں... نہیں کوئی بات نہیں کی میں یونہی آنے والے وقت کا سوچ رہی تھی۔" انہوں نے بات بدلی وہ نہیں چاہتی تھیں کہ صائم کو زارا سے بددل کریں۔

"ماں کیا آپ مانو کی شادی ضرور کرنا چاہتی ہیں۔" صائم نے پوچھا۔

"کرنی تو ہے مگر مناسب رشتہ ملے گا تو کروں گی۔" انہوں نے کہا۔

"اور اگر نہ ملا تو۔" صائم نے پوچھا۔

"اچھے لوگوں کی دنیا میں کمی نہیں ہے جو ہمارے نصیبوں میں ہوگا ہمیں مل جائے گا۔ ہم نے صرف نیت کرنی ہے اور کوشش کرنی ہے۔" انہیں یقین تھا۔

"ایک بات آپ کو کلیئر کردوں مانو اس گھر سے جانا نہیں چاہتی۔ آپ اس کے ساتھ زبردستی کریں گی تو وہ آپ کو انکار نہیں کرے گی اور خوش بھی نہیں ہوگی۔" صائم نے کہا۔

"میری دن رات ایک ہی دعا ہے اسے دائم سے بہتر ساتھی مل جائے اور ہم سب کو بھول جائے اور مجھے پکا یقین ہے ایسا ہوکر رہے گا۔" انہوں نے کہا۔

"کیا بھائی سے بھی اچھا ساتھی اسے مل سکتا ہے؟ میرا دل نہیں مانتا۔" صائم نے کہا۔

"جب ملے گا تو تمہیں بھی یقین آجائے گا۔" ماں نے کہا۔

"اور اگر مانو نہ مانی تو... اور پھر بچے۔" صائم نے کہا۔

"بچے ہم رکھیں گے پھر اس کے دوسرے شوہر سے اور بچے بھی ہو جائیں گے۔ یہ دنیا بڑی ظالم چیز ہے سب کچھ بھلا دیتی ہے یونہی ہم دنیاداری میں پڑتے ہیں تو سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ وقت کیسے گزرتا ہے انسان کو پتا ہی نہیں چلتا ہوش جب آتا ہے جب آگے جانے کا وقت آجاتا ہے آگے جانے والے آگے چلے جاتے ہیں اور پیچھے رہنے والے آگے جانے والوں کی جگہ لے لیتے ہیں اور اس طرح زندگی گزرتی رہتی ہے۔" انہوں نے کھوئے کھوئے انداز سے کہا۔

"اگر زندگی اتنی تیزی سے گزر جاتی ہے تو پریشانی کس بات کی ہے۔ مانو بھی ہمارے ساتھ رہ کر زندگی گزار لے گی۔" صائم نے کہا۔

"یہ شادی بیاہ، بچے، رشتے دار، دوست احباب اور والدین دنیاوی رشتے ہیں، یہ نہ ہوں تو پہاڑ جیسی زندگی گزرتی نہیں۔ جب دنیاداری میں پڑ جائیں تو زندگی ایسے گزر جاتی ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔" ماں نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ مانو کی شادی کا فیصلہ کر چکی ہیں تو مانو کو بھی راضی کریں میں بھی آس پاس کوئی اچھا لڑکا دیکھتا ہوں۔" صائم نے اداسی سے کہا۔

"اگر تم میرا مقصد سمجھ گئے ہو تو مانو بھی سمجھ جائے گی، ہم دونوں مل کر اسے سمجھا لیں گے۔" ماں نے کہا۔

"آپ نے مجھے باتوں میں الجھا لیا ہے مجھے کہیں بہت ضروری جانا تھا چلتا ہوں رات کو ملاقات ہوگی۔" صائم تیزی سے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

فون بجنے پر ماں نے فون اٹھایا تو دوسری طرف رشتہ کرانے والی تھی آمنہ بیگم اس کی آواز سن کر خوش ہو گئیں۔

"میں تو سمجھی تھی کہ تم ناراض ہو گئی ہو گی، شکر ہے تم نے فون کر لیا۔"

"ایسی باتوں پر ہم لوگ ناراض ہونے لگے تو کاروبار کر لیا ہم نے۔ ہمارا تو کام ہی یہی ہے کہ لوگوں کی باتیں سن کر بھی ناتا نہیں توڑنا۔ ماہ نور کے لیے بڑا اچھا رشتہ لائی ہوں سنو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔"

"جلدی سے بتاؤ، میں تو مانو کی بارات پر صائم کا ولیمہ رکھنا چاہتی ہوں بیٹی رخصت کر کے بہو لاؤں گی۔"

"بس آپ تیاری پکڑیں آج ہی اسے دیکھنے چلتے ہیں۔ صائم اگر گھر پر نہ ہو تو میں آپ کو لیتی ہوئی چلتی ہوں۔"

"تم آجاؤ ڈرائیور کے ساتھ چلتے ہیں۔"

"بس میں پہنچ رہی ہوں۔" دونوں نے فون بند کر دیا۔

راستے میں آمنہ بیگم نے پوچھا کہ اس کے کتنے بچے ہیں۔

"بچے... اس کی تو شادی ہی نہیں ہوئی، اچھی نوکری ہے نہ آگے نہ پیچھے اکیلی جان ہے اس کی۔ ابھی چالیس کا ہوا ہے پورے بیس سال اس کی نوکری باقی ہے، ریٹائرمنٹ پر اتنا پیسہ مل جائے گا کہ آسانی سے مکان بنا لیں گے۔"

"چالیس کا ہو گیا اور شادی نہیں ہوئی؟ بات دل کو لگتی نہیں ہے۔"

"والدین ہوتے تو شادی کراتے۔"

"اچھا دیکھتے ہیں۔"

آنٹی نے ایک گیٹ کے سامنے گاڑی رکوائی اور دونوں خواتین اندر چلی گئیں۔ سامنے صحن میں ہی ایک دبلا پتلا بیمار سا مرد کرسی پر بیٹھا ملا۔

"سلام خالہ۔ کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔"

"ٹریفک کا تو تمہیں پتا ہی ہے روز دفتر جاتے ہو۔" آنٹی نے چادر اتارتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" دبلے پتلے مرد نے کہا۔

"یہ لڑکی کی ساس ہے ان کا بیٹا پچھلے سال فوت ہوا ہے جوان بہو ہے۔ کتنی اچھی ساس ہیں کہ بہو کا گھر دوبارہ بسانا چاہتی ہیں ورنہ آج کے زمانے کون ایسے سوچتا ہے۔" آنٹی نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"اچھے لوگ بھی اس دنیا میں ہوتے ہیں۔ خالہ میں نے چائے کا بندوبست کیا ہوا ہے میں چائے لے کر آتا ہوں۔" اور وہ اٹھ کر اندر چلا گیا۔

"عذرا لڑکا کہاں ہے؟" آمنہ بیگم نے پوچھا۔

"یہی تو ہے۔" آنٹی نے کہا۔

"یہ لڑکا ہے! لاغر سا مجھے تو اس کی صحت بھی مشکوک لگتی ہے۔ تم مجھے کہاں لے آئی ہو یہ تو بیمار لگتا ہے بس چلو یہاں سے۔ مجھے وحشت ہو رہی ہے اسے دیکھ کر۔" ماں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آمنہ تمہارا تو مزاج ہی نہیں ملتا کیا کمی ہے اس میں کماتا کماتا ہے، اکیلی جان ہے ایک بیوہ کے لیے اس سے اچھا اور کیا رشتہ ہو سکتا ہے۔"

"تم کیا ہر وقت بیوہ بیوہ کہتی رہتی ہو۔ مجھے پہلی نظر میں ہی یہ نہیں بھایا۔ تم بیٹھو چائے پیو میں جا رہی ہوں۔ آئندہ ایسا رشتہ کبھی مت لانا۔" آمنہ نے چادر اٹھائی اور فوراً گھر سے باہر نکل گئیں۔

"اللہ معاف کرے اس عذرا کی بڑھاپے میں مت ماری گئی ہے۔ بار بار جتاتی ہے کہ مانو بیوہ ہے بیوہ ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم اپنی بہو کو کنویں میں دھکیل دیں۔ میں باز آئی اس کی شادی سے اچھا رشتہ نہ ملا تو گھر بٹھائے رکھوں گی، اپنے بعد صائم پر اس کی ذمہ داری ڈال کر جاؤں گی؟" آمنہ گاڑی میں بیٹھے مسلسل یہی سوچ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼
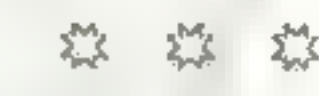
"امی آپ نے مجھے مانو کے رشتے کے لیے کہا تھا۔" صائم نے ماں کے کمرے میں آ کر کہا۔

"کیا کوئی ہے تمہاری نظر میں۔" انہوں نے فوراً پوچھا۔

"میرے آفس میں عامر کو اپنے بڑے بھائی کے لیے بھابی کی تلاش ہے، اس کی بھابی پچھلے سال ہی فوت ہوئی ہے عامر تو شکل و صورت اور سیرت کا بہت اچھا ہے بھائی میں نے دیکھا نہیں ہے۔ کسی دن چلتے ہیں اس کے بھائی کو دیکھنے گھر بار بھی دیکھ لیں گے۔" صائم نے بتایا۔

"کسی دن کیوں کل کیوں نہیں؟" ماں نے بے چینی سے کہا۔

"ٹھیک ہے عامر کو کل کے لیے کہہ دوں گا۔ آپ تیار رہیے گا۔ میں آفس کے بعد لے چلوں گا۔" صائم نے کہا۔

"تمہارے والد کو بھی ساتھ لے چلیں گے۔" آمنہ بیگم بولیں۔

"ہاں کیوں نہیں آخری فیصلہ تو انہیں کا ہوگا۔" صائم نے کہا۔

"آخری فیصلہ ان کا نہیں مانو کا ہوگا اگر ہمیں لڑکا پسند آگیا تو اسے گھر بلائیں گے اور مانو کو دکھا کر ہی کوئی فیصلہ ہوگا۔"

"یہ سوچ آپ کی بہت اچھی ہے مانو کو دکھائے بغیر تو فیصلہ کرنا مناسب نہیں لگتا۔" صائم خوش ہو گیا۔

"تمہارے سسرال والے بھی شادی کا کہہ رہے ہیں۔" آمنہ بیگم نے بتایا۔

"یہ تو طے ہے کہ مانو کی شادی سے پہلے میں شادی نہیں کروں گا اور زارا سے ہی کروں گا اس کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔ وہ بہت چھوٹے ذہن کی ہے۔ نجانے کیا کیا سوچتی رہتی ہے۔" صائم نے کہا۔

"ہے تو چھوٹے ذہن کی مگر تمہاری کزن بھی ہے۔"

"اب کزن کی وجہ سے میں اپنی زندگی تو برباد نہیں کر سکتا۔" صائم نے فوراً کہا۔

"ٹھیک ہو جائے گی۔" ماں نے تسلی دی۔

"اس لیے میں بھی اس کے ٹھیک ہونے کا انتظار کر رہا ہوں دیکھے کب اپنی عمر کے مطابق میچور ہوتی ہے۔" صائم نے ہنستے ہوئے کہا۔ آمنہ بیگم اس کی بات سن کر مسکرا دیں۔

☼ ☼ ☼

لڑکا دیکھنے کے بعد واپسی پر گاڑی میں سب اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے۔

"لڑکا شکل و صورت کا بھی اچھا ہے اور نوکری بھی بہت اچھی ہے 'گھر بار سب ٹھیک ہے' بات چیت میں بھی بہت بااخلاق ہے میرا خیال ہے بات آگے بڑھاتے ہیں۔" والد نے واپسی میں اپنی رضامندی دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں بظاہر تو سب کچھ ٹھیک ہے مگر آپ نے اس کے آفس میں جا کر پتا ضرور کرانا ہے۔" آمنہ بیگم بولیں۔

"وہ تو میں نے سوچ لیا ہے صبح ہی ابراہیم کو فون کروں گا اور اس سے پوچھوں گا۔ رشتہ کرانے والے لاکھ لڑکے کی گارنٹی دیں جو بات کولیگ بتاتے ہیں وہی درست ہوتی ہے۔" والد نے کہا۔

"ابراہیم بھائی وہاں کام کرتے ہیں۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے اب میں مطمئن ہو گئی ہوں کہ ابراہیم بھائی نے تسلی کرادی تو بات پکی کرلیں گے ورنہ نہیں۔" آمنہ بیگم نے کہتے ہوئے صائم سے پوچھا۔

"کیوں صائم تمہاری کیا رائے ہے۔"

"آپ بالکل درست فرمارہے ہیں اگر ابراہیم انکل نے لڑکے کی گارنٹی دی تو پھر ہم ماہ نو سے بات کریں گے ورنہ ابھی اس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" صائم نے سڑک پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔

☼ ☼ ☼

"ابراہیم میں نے اپنی بہو ماہ نور کے لیے ایک رشتہ پسند کیا ہے۔ اور وہ لڑکا تمہارے آفس میں جاب کرتا ہے۔" رضا صاحب نے فون کرنے کے بعد کہا۔

"کیا نام ہے اس کا؟ کیونکہ میرے آفس میں سب شادی شدہ ہیں۔" ابراہیم صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

"احمر سیال۔ اچھی سینئر پوسٹ پر کام کرتا ہے۔" رضا صاحب نے بتایا۔

"احمر سیال! کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ وہ تو شادی شدہ ہے بلکہ اس کی یہ دوسری شادی ہے پہلی بیوی پانچ سال پہلے فوت ہو گئی تھی اور ہم سب اس کی دوسری شادی میں مدعو تھے اور اس کی شادی بھی ہمارے پاس کی بیٹی سے ہوئی ہے اور وہ پچھلے سال ہی تو ریٹائرڈ ہوئے ہیں۔" ابراہیم صاحب نے وضاحت سے بتایا۔

"عجیب بات ہے۔" رضا صاحب نے کہا۔

"میں آپ کو اشفاق صاحب کا نمبر دیتا ہوں وہ احمر کے سسر ہیں آپ خود ان سے بات کریں۔" ابراہیم نے انہیں نمبر لکھواتے ہوئے کہا۔

صائم کے والد نے اسی وقت اشفاق صاحب کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے فون اٹھانے کے بعد صائم کے والد نے بات شروع کی۔

"کیا آپ اشفاق صاحب بول رہے ہیں؟"

"جی۔" اشفاق نے کہا۔

"آپ احمر کو جانتے ہیں؟" رضا صاحب نے پوچھا۔

"میرا داماد ہے۔ کیا ہوا اسے خیریت ہے؟" اشفاق نے کہا۔

"جی بالکل خیریت ہے آپ کی بیٹی کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔" والد نے پوچھا۔

"ہاں مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" اشفاق نے کہا۔

"اب آپ سے کیا چھپانا میری بہو جو بیوہ ہے اس کے لیے ہمیں کسی نے احمر کا رشتہ بتایا ہے۔ ہم اس کے بارے میں پتا کر رہے تھے کہ ابراہیم جو میرے دوست ہیں ان سے بات کی تو انہوں نے اس کے شادی شدہ ہونے کی تصدیق کی مگر میں نے یقین نہیں کیا تو انہوں آپ کا نمبر دے دیا۔ میں تو حیران رہ گیا ہوں کہ لوگ کس دیدہ دلیری سے جھوٹ بولتے ہیں اور کتنے مہذب بنتے ہیں۔" انہوں نے سیدھی بات کی۔

"وہ دوسری شادی کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ ابھی تو میری بیٹی اس کے گھر میں ہے۔" اشفاق نے گھبرا کر کہا۔

"مگر جب ہم ان کے گھر گئے تھے تو ان کی والدہ کے علاوہ کوئی دوسری عورت گھر پر نہیں تھی۔" رضا صاحب نے کہا۔

"میری بیٹی گھر آئی ہوئی ہے کیونکہ انہوں نے اسے جائیداد سے حصہ لانے کو کہا۔ وہ ہمارا خاندانی گھر بکوانا چاہتا ہے اور میری بیٹی کو مجبور کر رہا ہے کہ اپنا حصہ مانگے۔ اب میں گھر بیچ کر اس کا حصہ تو نہیں دے سکتا اور پھر میرے بیٹے کہتے ہیں کہ ایک بار ہم اس کے سامنے جھک گئے تو کل کو کوئی اور مطالبہ کردے گا۔ وہ دولہ سے میری بیٹی کو لینے نہیں آیا اور ہم نے بھی بیٹی کو نہیں بھیجا۔" اشفاق نے کہا۔

"آپ اگر برا نہ مانیں تو اتوار کو اپنی بیٹی کے ساتھ ہمارے گھر آسکتے ہیں۔" والد نے کہا۔

"اس سے کیا ہوگا؟" اشفاق نے کہا۔

"آپ آجائیں سب کچھ آپ کے سامنے ہوگا۔" رضا صاحب نے کہا۔

"ٹھیک ہے کتنے بجے پہنچنا ہے۔" اشفاق نے کہا۔

"شام چار بجے۔" رضا نے کہا۔

"ٹھیک ہے اتوار کو شام چار بجے ملاقات ہوگی۔" دونوں نے فون بند کردیا۔

☼ ☼ ☼

احمر اپنے بھائی اور والدہ کے ساتھ چار بجے سے پہلے پہنچ گیا۔ سوٹ میں وہ خاصا اسمارٹ لگ رہا تھا پھر اس کا بات کرنے کا انداز اور اس کا اخلاق ہر ایک کو گرویدہ کرلیتا تھا۔

"احمر صاحب آپ کی پہلی بیوی تو پانچ سال پہلے وفات پا گئی تھی اور وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔"

"جی مجھے اس کے مرنے کا اس قدر افسوس ہوا تھا کہ میں بہت عرصے تک صدمے سے باہر ہی نہیں نکلا اب تو امی جان کے اصرار پر شادی کے لیے راضی ہوا ہوں۔" احمر نے نرمی سے کہا۔

"پہلی بیوی سے تو کافی جائیداد ملی ہوگی اکلوتی اولاد جو تھی۔" رضا صاحب نے پوچھا۔

"یہ تو دنیا داری ہے ورنہ جائیداد سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" احمر نے نرمی سے کہا۔

"ہماری بہو کے نام تو کچھ بھی نہیں ہے۔" رضا صاحب نے کہا۔

"یہ مکان تو..." احمر نے پوچھا۔

"یہ مکان چھ کنال کا ہے میرے چھوٹے بیٹے اور پوتی پوتے میں تقسیم ہوگا مگر بچے تو ہم ہی رکھیں گے اور چاچا ہی ان کی دیکھ بھال کرے گا۔" آمنہ بیگم نے کہا۔

"یہ والدہ کے ساتھ نہیں جائیں گے۔ یہیں رہیں گے۔" صائم نے کہا۔

"یہ تو والدہ کے ساتھ زیادتی ہے۔" احمر کی ماں نے کہا۔

"زیادتی کیسی ماہ نور جب چاہے مل سکتی ہے ملنے پر کوئی پابندی تو نہیں ہوگی۔" آمنہ بیگم نے کہا۔

بیل بجنے پر صائم مہمانوں کو لینے چلا گیا اور جب اشفاق صاحب اور ان کی بیٹی صوبیہ کمرے میں داخل ہوئے تو دونوں بیٹا اور ماں کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"صوبیہ بیٹی تمہارا مجرم سامنے بیٹھا ہے جو چاہے سزا دو۔" صائم کے والد نے کہا۔ ان کی بات سن کر تینوں بہت دیر تک خاموش رہے۔

"ہمیں معاف کردیں انکل اور صوبیہ۔" احمر نے گھبرا کر کہا۔

"معافی تو مل سکتی تھی اگر ایک بار دھوکہ دیا ہوتا مگر ہمارے بعد نجانے کتنے گھروں کی بیٹیاں برباد کرو گے اور ابھی تو پہلی بیوی کی موت کی بھی تفتیش ہونی باقی ہے کہ وہ کیسے فوت ہوئی ہے۔" صائم نے کہا۔

"انکل ہم وعدہ کرتے ہیں کہ صوبیہ کو ہمیشہ خوش رکھیں گے اور جائیداد سے حصہ بھی نہیں مانگیں گے بس آپ ہمیں جانے دیں۔" احمر نے کہا۔

"اشفاق صاحب اور ان کی بیٹی صوبیہ آپ کو معاف کر بھی دیں مگر میں آپ کے خلاف ایف آئی آر درج کراؤں گا۔ تم جیسے دھوکے باز لوگوں کو جب

تک سزا نہیں ہو جاتی تم گھر برباد کرتے رہو گے۔ میں ہر بیٹی کے والدین سے درخواست کروں گا کہ رشتہ کرنے سے پہلے لڑکے کے کردار اور خاندان کے بارے میں مکمل جانچ پڑتال کیے بنا رشتہ کبھی نہ کریں۔ شادی نہ ہونا یا دیر سے ہونا پریشانی کا باعث نہیں ہے مگر دھوکے باز خاندان میں شادی ہونا زندگی بھر کا روگ بن جاتا ہے اور لڑکی اور اس کے والدین ساری زندگی بلیک میل ہوتے رہتے ہیں۔" صائم نے کہا ساتھ ہی پولیس کمرے میں داخل ہوئی اور تینوں کو گرفتار کر کے لے گئی۔

"اشفاق صاحب آپ فکر نہ کریں چند دن تھانے میں رہیں گے تو ہوش ٹھکانے آجائیں گے اور پھر کبھی صوسیہ بیٹی کو تنگ نہیں کریں گے چند دن بعد ہم انہیں معاف کر کے ان پر احسان جتا کر ان کی ضمانت کرالیں گے۔" صائم نے والد سے کہا۔

"آپ تو ہمارے لیے فرشتہ ثابت ہوئے ہیں ورنہ میں تو مکان بیچنے کا سوچ رہا تھا۔" اشفاق صاحب نے کہا۔

"اب ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا چلیے اب چائے پیتے ہیں۔" صائم نے کہا۔

☆ ☆ ☆

"تمہاری خالہ نے گھر بلایا ہے۔" ماں نے صائم کے کمرے میں آکر کہا۔

"کھانے پر یا یونہی۔" صائم نے پوچھا۔

"تمہیں کھانے کی پڑی ہے مجھے یہ فکر ہے کہ وہ شادی کی تاریخ نہ مانگ لیں۔" آمنہ بیگم فکر مند تھیں۔

"شادی کی تاریخ تو ہم دینے والے نہیں۔" صائم نے کہا۔

"ڈیٹ تو دینی پڑے گی دائم کی زندگی میں یہ رشتہ ہوا تھا اب اس کو بھی ہم سے جدا ہوئے سال سے اوپر ہو گیا ہے کیا بیٹے ماں کو اس طرح چھوڑ جاتے ہیں۔" ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

"ماں خالہ کے گھر جانے کی بات ہو رہی تھی۔" صائم نے فوراً ماں سے کہا۔

"کب چلیں۔" انہوں نے پوچھا۔

"ابھی چلتے ہیں۔" صائم نے کہا۔

"مانو کو کہوں تیار ہو جائے' یہ رشتہ بھی تو مانو کی مرضی سے طے ہوا تھا۔" صائم نے کہا۔

"اب مانو ہی انہیں کھٹک رہی ہے انہوں نے مانو کو نہیں بلایا۔" ماں نے بتایا۔

"میں تو نہیں جاتا پھر اگر مانو جائے گی اور خوب تیار ہو کر جائے گی تو جاؤں گا۔" صائم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"چھوٹی سی بات کو آگے نہیں بڑھاتے۔ ہم دونوں چلتے ہیں دیکھتے ہیں کیا بات انہوں نے کرنی ہے۔" ماں نے سمجھایا۔

"چلیں آپ تیار ہو جائیں۔" صائم نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

دونوں ماں بیٹے جب گھر پہنچے تو زارا انہیں لان میں ہی مل گئی۔ صائم نے فوراً اسے چھیڑا۔

"کھانا بھی بنایا ہے یا پھر چائے پر ہی ٹرخا دو گی۔"

"کھانا پکانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" زارا نے کہا۔

"مرد تو کھانا گھر والی کے ہاتھ کا ہی پسند کرتا ہے۔ اب تم بھی کھانا بنانا سیکھ لو تو بہتر ہے ورنہ میں مانو سے دوستی بڑھا لوں گا۔" صائم نے چھیڑا اور اندر داخل ہو گیا۔

"پہلے کیا کم ہے۔" زارا نے طنز سے کہا۔

"ہاں تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے اب کھانا کچن میں یا ڈائننگ روم میں کھاتا ہوں اگر تم نے کھانا بنانا نہ سیکھا تو مانو کے ساتھ مانو کے کمرے میں کھایا کروں گا۔" صائم کہاں خاموش رہنے والا تھا۔

"زارا تم کس کی باتوں میں الجھ رہی ہو اس کی مذاق کی عادت سے تم اچھی طرح واقف ہو خیر امی کو بلاؤ مجھے جلد گھر جانا ہے۔" آمنہ بیگم نے ناگواری سے کہا۔

"اس لیے تو ڈرتی ہوں کہ مذاق کی بات حقیقت نہ

بن جائے۔" زارا نے ایک نظر صائم پر ڈالتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ صائم جواب دیتا خالہ لاؤنج میں داخل ہوئیں۔

"السلام علیکم۔" ناظمہ نے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا بات کرنی تھی میں تو سارے کام چھوڑ کر آگئی ہوں۔" ماں نے پوچھا۔

"بس یونہی ملنے کو دل چاہ رہا تھا تو بلا لیا۔" ناظمہ نے کہا۔

"خود چلی آتیں مجھے کیوں بلایا ہے۔" ماں نے کہا۔

"میں ماہ نور کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔" ناظمہ نے کہا۔

"ماہ نور غیر تو نہیں گھر کا ایک فرد ہے۔" آمنہ بیگم نے کہا۔

"شوہر کے فوت ہونے کے بعد عورت میں بہت تبدیلی آجاتی ہے۔ ہر خواہش حسرت بن کر دل میں ڈیرہ ڈال لیتی ہے۔ اب شادی کی ڈیٹ کی بات تو اس کے سامنے نہیں ہو سکتی تھی۔" ناظمہ نے کہا۔

"اللہ نہ کرے ہمارے ہوتے ہوئے مانو کی کوئی خواہش حسرت بنے۔ وہ تو بہت شوق سے تیاریاں کر رہی ہے۔" آمنہ بیگم نے کہا۔

"میں ایک بات کہنا چاہ رہی تھی۔" ناظمہ نے کہا۔

"کیا کہنا چاہتی ہو۔" آمنہ نے کہا۔

"جب تک ماہ نور کی شادی نہیں ہو جاتی زارا الگ گھر میں رہنا چاہتی ہے۔ میرا مطلب ہے کچھ عرصے کے لیے صائم گھر کے پاس ہی کوئی مکان کرائے پر لے لے دن میں دونوں ایک آدھ بار گھر کا چکر بھی لگا لیں گے مگر گھر الگ ہونا چاہیے۔" ناظمہ نے کہا۔

"یہ بھی خوب ہے چھ کنال کا گھر میری بہو کے لیے جو میری بھانجی بھی ہے چھوٹا پڑ رہا ہے الگ رہنا چاہتی ہے کیا تمہارے دل کو یہ بات لگتی ہے۔" انہوں نے پوچھا۔

"بچی ہے اس کا الگ گھر میں رہنے کو دل چاہ رہا ہے تو کیا حرج ہے۔" ناظمہ نے کہا۔

"ایسا ہو سکتا ہے کہ اوپر کے پورشن میں زارا شفٹ ہو جائے میں مانو کو نیچے برابر والے کمرے میں شفٹ کر دیتی ہوں۔ اس طرح اوپر کا سارا پورشن زارا کے پاس رہے گا۔" انہوں نے تجویز دیتے ہوئے کہا۔

"مگر وہ ماہ نور کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ اس کا خیال ہے کہ ماہ نور بہانے بہانے سے صائم کو اپنے کاموں میں الجھائے رکھے گی اور بچے بھی صائم سے بہت فری ہیں زارا کو اتنا ٹائم نہیں مل سکے گا جتنا اسے ملنا چاہیے یا جتنا شادی کے بعد نئی نویلی دلہن اپنے شوہر کے ساتھ وقت گزارنا چاہتی ہے اور پرائیویسی بھی چاہتی ہے۔"

"کیا ماں باپ نے اولاد کو پال پوس کر اس لیے جوان کیا ہوتا ہے کہ جب والدین کو بچوں کی ضرورت ہو تو بیٹے بیویوں کے کہنے پر الگ ہو جائیں۔ خالہ میں ایسی بات سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوں عمل کرنا تو دور کی بات ہے۔" صائم جو مسلسل خاموش بیٹھا تھا ماں کے بولنے سے پہلے ہی بول پڑا۔

"پھر زارا شادی کے لیے نہیں مانے گی۔" ناظمہ نے کہا۔

"سے منا کون رہا ہے میں تو پہلے ہی مانو کے کہنے پر مانا تھا ورنہ اس کی عادت اور مزاج میرے ساتھ نہیں ملتا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ آپ کی طرف سے انکار ہو رہا ہے۔ میں انکار کرتا تو ماں اور مانو نے میرا دماغ کھا لینا تھا اب میں ہرگز شادی نہیں کروں گا۔" صائم بول پڑا۔

"تم چپ رہو میں بات کر رہی ہوں۔" ماں نے کہا۔

"آپ ایسی بات سن سکتی ہیں میں ہرگز نہیں سن سکتا اور مجھے ایسی لڑکی سے شادی کرنی ہی نہیں جو ہمارے خاندان میں جدائی ڈالنے آرہی ہو۔ چلیں امی مجھے اور نہیں یہاں رکنا۔" صائم کھڑا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے ناظمہ تم زارا کو سمجھاؤ ورنہ رشتہ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔" آمنہ نے کہا۔

"پھر ٹوٹ ہی جائے تو بہتر ہے جب آپ لوگ لڑکی

کی اتنی سی خواہش پوری نہیں کرسکتے تو کل کو بڑی خواہش کیسے پوری کریں گے۔" ناظمہ نے کہا۔

"ہو کہ اس سے بھی بڑی خواہش کی توقع ہو سکتی ہے۔ میں نے بتادیا ہے کہ اب مجھے زارا سے شادی نہیں کرنی جب دل میں میل آجائے تو بہتر ہے کہ اچھے طریقے سے انکار کردیا جائے آپ میری خالہ اس رشتے سے پہلے بھی تھیں اور ہمیشہ رہیں گی مگر اب میں زارا سے شادی نہیں کروں گا چاہے اماں ابا کتنا دباؤ ڈالیں۔" صائم اپنی ماں کو لے کر واپس گھر آگیا۔

☼ ☼ ☼

مانو صائم کے لائے ہوئے کپڑے پھیلا کر بیٹھی ہوئی تھی جب ماں بیٹا گھر میں داخل ہوئے ان دونوں کے اتنی جلدی واپس آنے پر اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"آج خالہ نے اتنی جلدی کیسے آنے دیا ہے کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا۔"

"آپ کو کھانے کی پڑی ہے انہوں نے سیدھے منہ بات بھی نہیں کی۔" صائم نے منہ پھلا کر کہا۔

"میں نہیں مانتی کہ خالہ ایسا کچھ کریں۔" مانو نے تمام کپڑے سمیٹ کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"کھانا انہوں نے پوچھا کب ابھی تو بات کا آغاز ہوا تھا کہ ہم واپس آگئے۔" امی نے اداسی سے کہا۔

"امی میں نے کتنی بار آپ سے کہا ہے کہ خالہ کے گھر جاتے ہوئے صائم کو ساتھ مت لے جایا کریں۔ اس کی اور زارا کی نوک جھوک ہی ختم نہیں ہوتی' جانے یہ دونوں آئندہ شروع ہونے والی زندگی اکٹھے کیسے گزاریں گے۔" مانو نے کہا۔

"اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی' آج میں نے انکار کردیا ہے۔" صائم نے بتایا۔

"امی یہ کیا کہہ رہا ہے۔" مانو نے پریشانی سے کہا۔

"ہاں انکار کرکے آگیا ہے۔" آمنہ بیگم نے کہا۔

"آپ نے روکا نہیں۔" مانو نے فوراً" کہا۔

"میرے روکنے سے یہ رک جاتا پھر ناظمہ نے بات ہی ایسی کی کہ یہ انکار نہ کرتا تو میں کردیتی۔" انہوں نے کہا۔

"ایسی کیا بات کہہ دی تھی خالہ نے۔" مانو نے حیرت سے پوچھا۔

"بتانے والی نہیں ہے بس اس رشتے کو ختم ہی سمجھو۔ دونوں میں کبھی بنی ہی نہیں تو زبردستی کی شادی کیا فائدہ۔" انہوں نے کہا۔

"لیکن خاندان میں رشتے اتنی جلدی نہیں ٹوٹ جاتے میں صبح بات کروں گی۔" مانو نے کہا۔"

"تم ہرگز فون نہیں کرو گی۔" آمنہ بیگم نے کہا۔

"ٹھیک ہے جیسے آپ کہتی ہیں۔ میں کھانا لگاتی ہوں ابا جی بھی نماز پڑھ کر آگئے ہیں۔ خیر صائم میں نے یہ تمام کپڑے جو اس دن تم نے میرے لیے خریدے تھے زارا کے لیے رکھ دیے ہیں۔" مانو نے پھیلے ہوئے کپڑے دوبارہ بیگ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"خبردار آپ نے دوبارہ زارا کا نام میرے سامنے لیا اتنی بدتمیز لڑکی میں نے کبھی نہیں دیکھی۔" صائم نے بہت اونچی آواز میں کہا کہ مانو گھبرا گئی۔

"میں کھانا لگانے جارہی ہوں۔" مانو تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

سب خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے کہ اچانک صائم بول پڑا۔

"مانو اتنے مزے کے دال چاول بنائے کہ میرا موڈ ٹھیک ہوگیا ہے۔"

"میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں میں جانتی تھی کہ زارا کے گھر جا رہے ہو نوک جھوک میں موڈ آف کرکے واپس لوٹو گے تو تمہاری پسند کا کھانا بنالیا تاکہ تمہارا موڈ ٹھیک ہو جائے۔" مانو نے ہنس کر کہا۔

"اس لیے میں نے اس سے شادی کا فیصلہ کرلیا ہے جو میری رگ رگ سے واقف ہے۔"

"لڑکی والوں کو انکار کر آئے ہو اور کہہ رہے ہو کہ شادی کا فیصلہ کرلیا۔" ماں نے کہا۔

"دنیا میں صرف زارا ہی لڑکی نہیں ہے اور بھی بے شمار ہیں۔ امی آپ کو میری اور مانو کی شادی کی فکر ہے تو میں آپ کی فکر ختم کیے دیتا ہوں۔" صائم نے کھاتے ہوئے کہا۔

"بولو کیا کہنے والے ہو۔" ماں نے فوراً" پوچھا۔

"مانو کو اگر انکار نہ ہو تو میں اس سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے جس مزاج کی لڑکی چاہیے۔ وہ صرف مانو ہے۔ پچھلے دس سالوں سے وہ اس گھر کے ہر فرد کے مزاج سے واقف ہے اور ہم بھی اس کے اتنے عادی ہوگئے ہیں کہ اس کے بغیر گھر کا ہر فرد ڈسٹرب ہو جائے گا اور اسے بھی اگلے گھر جاکر نئے ماحول کے مطابق خود کو ڈالنا پڑے گا۔ مجھے بھی نئی لڑکی کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کرنی پڑے گی جو بہت مشکل بات ہے۔ بہتر یہی ہے کہ مانو اسی گھر میں رہے۔" صائم نے اطمینان سے کہا۔

سب نے بات سنتے ہی چونک کر مانو کو دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ بولے مگر صائم نے مانو کے چہرے پر بکھرے رنگ دیکھ لیے تھے اس لیے وہ دل میں خوش ہوگیا مانو اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

"صائم تم بھی کمال کرتے ہو ایسی بات سب کے سامنے کہنے والی نہیں تھی تم ہم سے کہتے ہم مانو سے بات کرتے اب اس نے برا مانا ہے یا اچھا مانا ہے کیسے فیصلہ ہوگا۔" آمنہ بیگم نے کہا۔

"صائم بیٹے میں تمہارے ساتھ ہوں تم نے میرے دل کی بات کی ہے۔" ابا جی نے کہا۔

"مجھے بھی بری نہیں لگی مگر اس کا کہنے کا انداز درست نہیں تھا۔" آمنہ بیگم نے کہا۔

"اگر ہم سوچتے رہتے تو کئی مہینے گزر جاتے ہیں اب مانو خود فیصلہ کرے گی۔" صائم نے کہا۔

"ماں اگر صبح مانو نے معمول کے مطابق آپ کے کمرے میں چائے پہنچائی اور بچوں کے ساتھ ساتھ میرے لیے بھی ناشتا تیار کرکے مجھے آواز دی تو سمجھ جائیں کہ وہ خوش ہے اگر کمرے سے باہر نہ نکلی تو بھی ہم سب اسے منائیں گے۔" صائم نے اطمینان سے کہا۔

پھر صائم نے ماں کے ساتھ مل کر برتن سمیٹے اور کمرے میں آگیا۔

"مانو میری چیک والی شرٹ کدھر ہے؟" صائم نے اپنے کمرے سے آواز لگائی۔

"میں نے رات کو شرٹ استری کی تھی۔" مانو نے کچن سے جواب دیا۔

"میری آج خاص میٹنگ ہے مجھے وہی شرٹ پہننی ہے۔" صائم نے کمرے سے ہی جواب دیا۔

"تمہاری وارڈروب کے دوسرے خانے میں ہے۔" مانو نے کہا۔

"مگر مجھے کیوں نظر نہیں آرہی۔" صائم نے کہا۔

"تمہیں تو سامنے پڑی چیز نظر نہیں آتی یہ تو پھر الماری میں پڑی ہے۔" ماں نے اپنے کمرے سے کہا۔

"میں جگنو کو ناشتا دے کر آتی ہوں پھر استری بھی کردوں گی۔" مانو نے کہا۔

"تم نے اس کا دماغ خراب کردیا ہے۔" ماں نے دوبارہ اونچی آواز میں کہا۔

"تم دونوں کے درمیان کیوں آرہی ہو۔" ابا جی نے بیوی کو روکتے ہوئے کہا۔

"ماں آج اس کا دماغ خراب نہیں ہوا پچھلے دس سال سے یہی دیکھتی آرہی ہوں۔ یہ تو دائم کے ہوتے ہوئے بھی پہلے اپنے کام کراتا تھا۔" مانو نے ہنس کر کہا۔

"دونوں کو لڑنے دو۔" ابا جی نے ماں سے کہا۔

"شکر ہے مانو نے رات والی بات کا برا نہیں مانا۔" ماں نے کہا۔

"سمجھ دار بچی ہے میں تو بہت خوش ہوں۔" ابا جی نے کہا۔

"مانو مان گئی تو میں اس جمعے کو ان دونوں کا سادگی سے نکاح کرادوں گی۔" ماں نے ابھی بات مکمل بھی نہیں کی تھی کہ صائم کمرے میں داخل ہوا۔

"سادگی سے کیوں؟ میں نے پہلی اور آخری شادی کرنی ہے دھوم دھام سے کروں گا۔ شاندار بری ضرور تیار ہوگی جو ہمیشہ لڑکوں والوں کے لیے انگلش والی ورری بن جاتی ہے۔" والدین مسکرانے لگے وہ صائم کے فیصلے سے بہت خوش تھے۔

☼ ☼

سیدہ ضوباریہ

یونیورسٹی کینٹین اس وقت کسی مچھلی بازار کا سا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ بھانت بھانت کی بولیاں اور مختلف ٹیبلوں کے درمیان گھن چکر بنا رشید چھوٹو کہیں کولڈ ڈرنکس کا دور چل رہا تھا اور کہیں چائے اور اسنیکس کی شامت آئی ہوئی تھی۔ ہر ٹیبل پر چار چار پانچ پانچ اسٹوڈنٹس کسی نہ کسی موضوع پر زور شور سے بحث میں مصروف تھے اور یہ تقریباً" روز کا معمول تھا۔

پچھلے دنوں کینٹین کچھ اداس ویران ویران سی رہی جس کی بنیادی وجہ سیکنڈ ٹرم ایگزامز تھے۔ فری ہوتے ہی یونیورسٹی اور کینٹین کی رونقیں جیسے لوٹ آئی تھیں۔ اسٹوڈنٹس آج کل جان بوجھ کر پیریڈ مس کر کے کینٹین کو رونق بخش رہے تھے کہ یونیورسٹی میں یہ واحد عیاشی تھی جو وہ کر سکتے تھے۔ لڑکے لڑکیوں کی چیخ و پکار سے مشابہہ بحث مباحثہ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ رشید چھوٹو بے چارے کا بھاگ بھاگ کر سانس پھولا ہوا تھا۔

کینٹین کا دروازہ کھلا اور کوئی بہت دھیرے سے اندر آیا۔ دروازے کے قریب رکھی ٹیبلوں پر بیٹھے اسٹوڈنٹس کی نظر سب سے پہلے آنے والے پر پڑی تھی ساتھ ہی ان کی لاؤڈ اسپیکر جیسی آوازیں دھیمی ہوتی چلی گئیں۔ نووارد کی طائرانہ نظریں کینٹین کا جائزہ لیتے لیتے کارنر کی ایک ٹیبل پر ٹک گئیں۔ اس ٹیبل پر خلاف توقع صرف ایک لڑکی براجمان تھی اور وہ اس زاویے سے بیٹھی تھی کہ پوری کینٹین کی طرف اس کی پشت تھی۔

"السلام علیکم سر!" سب سے پہلے کامران کا سکتہ ٹوٹا۔ نووارد نے سر کی جنبش سے جواب دیا۔ سفید عوامی سوٹ میں ملبوس یہ اونچا لمبا شخص جس کی کنپٹیوں کے گرے بال اسے سب میں ممتاز کر رہے تھے۔ سنہری فریم کے پیچھے سے جھانکتی پرسکوت آنکھیں شانوں تک آئے سیدھے بال جن میں کہیں کہیں چاندی کا تار بھی جھلملا رہا تھا۔ یہ بے انتہا باوقار شخص پروفیسر ہاشم درانی تھے جو اسلامیات میں پی ایچ ڈی تھے اور یونیورسٹی میں اسلامیات ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ تھے۔ انہوں نے بڑے پروقار انداز میں قدم آگے بڑھائے۔

"عائشہ سردرانی۔" فائزہ نے قریب بیٹھی عائشہ کو ٹہوکا دیا۔ دونوں ان کے قریب آتے ہی کھڑی ہو گئیں۔

سر ہاشم درانی عجیب پراسرار سی شخصیت تھے۔ انتہائی باوقار اور سلجھے ہوئے۔ یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹس تو ایک طرف تمام پروفیسرز بھی ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ایک خاموش طبع، درویش منش انسان تھے۔ انہیں کبھی کسی نے قہقہہ لگاتے یا ہنستے نہیں دیکھا تھا۔ بڑی سے بڑی ہنسنے والی بات پر بھی ان کے لبوں پر بڑی مبہم سی مسکراہٹ پھیلتی جو بڑے غیر محسوس انداز میں سمٹ جاتی۔ ان کی پرسکوت آنکھیں دوسروں کی آنکھوں میں اترنے اور چہروں کو پڑھنے کا فن جانتی تھیں ان آنکھوں کا سکوت دیکھنے والے کو کسی شمشان گھاٹ کی یاد دلا دیتا تھا۔ جیسے کسی مرگھٹ پر چتا کے جل جانے کے بعد جلانے والے اپنی اپنی راہ لیتے ہیں

اور بعد میں جل جانے والی چتا کے اندر نہیں کہیں کوئی جلتی بجھتی لکڑی ہوا کے لمس سے چٹختی ہے۔ بالکل کچھ ایسا ہی سکوت اور ایسی ہی بولتی ہوئی آنکھیں تھیں ان کی کچھ بھی تھا وہ یونیورسٹی کے ان محدودے چند پروفیسرز میں سے تھے جن کی عزت یونیورسٹی کے خاکروب سے لے کر پرنسپل تک کرتے تھے۔

ان کے قدم اس ٹیبل کے قریب آکر رک گئے۔ جہاں وہ لڑکی بیٹھی تھی ان کے ساتھ ساتھ کامران' حیدر' فائزہ اور عائشہ بھی ازراہ احترام چل پڑے تھے ان کا خیال تھا کہ شاید پروفیسر صاحب چائے پینے آئے ہیں اور یقیناً" وہ الگ تھلگ بیٹھتے تو چلو سر کے ساتھ کچھ کمپنی ہی ہو جاتی۔ لیکن اب انہوں نے اس ٹیبل کو پسند کیا جس پر پہلے سے ہی ایک فریق موجود تھا تو اب وہ چاروں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"ایکسکیوزمی بیٹا! کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" باوقار' مہذب لہجے پر اس نے چونک کر دیکھا اور سر ہاشم درانی کو سامنے کھڑا پاکر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"وائے ناٹ سر! پلیز تشریف رکھیے۔" اس نے بہت مہذب لہجے میں کہا۔ وہ سامنے کرسی پر ٹک گئے۔

"ویسے آپ کسی کا انتظار تو نہیں کر رہی تھیں آئی مین اپنی فرینڈز وغیرہ کا۔"

"نو سر! ایسی کوئی بات نہیں۔ اصل میں میرا ابھی ایک پیریڈ باقی ہے۔ سر میں درد محسوس ہو رہا تھا سوچا ایک کپ چائے پی لوں شاید کچھ بہتر محسوس ہو۔"

"یعنی آپ کو بھی ہماری طرح چائے کی طلب یہاں گھسیٹ لائی۔ ارے بھئی تم چاروں کھڑے کیوں ہو آؤ بھئی بیٹھو۔" انہوں نے پہلے اسے پھر ان چاروں کو مخاطب کیا جو وہاں سے رفوچکر ہونے کے لیے پر تول رہے تھے۔

"وہ سر... اصل میں..." کامران نے کچھ کہنے کو منہ کھولا۔

"کوئی تکلف نہیں چلے گا۔ بیٹھ جاؤ یہ میرا حکم ہے۔" سر ہاشم درانی حسب عادت نرم لہجے میں بولے تو ان چاروں کو بیٹھتے ہی بنی۔

"رشید خان چھ چائے لانا مگر اچھی سی... سمجھے۔" سر ہاشم بولے۔ تو رشید چھوٹو سر ہلاتا ہوا کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔

"جی بیٹا کیا آپ اپنا تعارف کروانا پسند کریں گی۔" ان کا روئے سخن اس کی طرف ہو گیا۔

"سر میرا نام مہرالنساء ہے اور میں بیالوجی میں ایم ایس سی فائنل ایئر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔"

"اور آپ چاروں میں سے کامران اور حیدر کو تو میں جانتا ہوں یہ انگلش ڈیپارٹمنٹ میں ہوتے ہیں البتہ آپ دونوں کے بارے میں نہیں جانتا۔"

"سر میرا نام فائزہ ہے اور یہ عائشہ ہیں ہم دونوں جرنلزم ڈیپارٹمنٹ میں پریولیس کی اسٹوڈنٹ ہیں۔"

"یہ ہوئی نا بات۔ اب دیکھیں تھوڑی دیر میں ہم ایک دوسرے کے بارے میں اتنا جان گئے ہیں کہ گفتگو میں مزا آئے گا۔" سر ہاشم غیر محسوس سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ چھوٹو چائے رکھ کر جا چکا تھا۔ مہرالنساء اب تک سر ہاشم کی گفتگو یا ان کے یہاں بیٹھنے کا مقصد نہیں جان پائی تھی۔ لیکن وہ ان سے بھی یہ سوال نہیں کر سکتی تھی کہ بہرحال یہ چیز ایٹی کیٹس میں نہیں آتی اور سر ہاشم جیسے ٹیچرز تو شاید پورے ملک میں انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ اسٹوڈنٹس ان کی کمپنی کی خواہش کرتے تھے اور اگر وہ کسی ورکشاپ' کسی مباحثے وغیرہ میں شرکت کرتے تو اسٹوڈنٹس اس کو اپنی خوش قسمتی تصور کرتے تھے۔

"مہرالنساء بیٹا! آپ یقیناً" ہماری یہاں موجودگی اور اپنی تنہائی میں ہماری مداخلت کا مقصد جاننے کی کوشش کر رہی ہوں گی۔ اصل بات یہ ہے کہ جیسے ہی ہم نے کینٹین میں قدم رکھا عجیب و غریب ہاؤ ہو نے ہمارا استقبال کیا۔ اگرچہ ہماری موجودگی کو محسوس کر کے اسٹوڈنٹس کچھ مودب ہو گئے' لیکن ہماری نظر آپ پر پڑی تو حیرت ہوئی۔ اتنی ہاؤ ہو اور ہاہا کار میں آپ جس اطمینان سے بیٹھی تھیں ہمیں عجیب لگا اور ہم نے اکیلے بیٹھ کر چائے پینے سے بہتر یہ جانا کہ آپ کے پاس بیٹھیں اور آپ سے کچھ باتیں کی جائیں اور میرا خیال ہے ان چاروں کے اندر بھی شاید یہی تجسس تھا جو یہ کشاں کشاں ہمارے پیچھے چلے آئے۔" سر ہاشم نے وہاں بیٹھنے کا جواز دیا۔

"سر اطمینان اور سکوت میں بہت فرق ہوتا ہے۔" مہرالنساء بس اتنی سی بات کہہ کر خاموش ہو گئی۔ سر ہاشم نے گہری نگاہوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کا چہرہ سادہ سا تھا' لیکن بات بہت بامعنی۔

"ہوں ٹھیک کہا آپ نے بیٹا۔ اطمینان تو اندر سے پھوٹتا ہے اور پھر پورے وجود کو اپنی چھاؤں میں لے لیتا ہے۔ انسان جو ہے جیسا ہے کی بنیاد پر خوش ہو جاتا ہے۔ طلب کا کانٹا پاؤں کے تلووں سے نکل جاتا ہے اور دست سوال دراز نہیں ہوتا۔ قناعت اور عجز پیدا ہو جاتا ہے جبکہ سکوت تو جمود اور موت کا دوسرا نام ہے۔" سر ہاشم اس کی بات سمجھ رہے تھے۔

"لیکن سر کیا رگوں میں دوڑنے والا کرنٹ سینے میں ایک مخصوص انداز کی دھک دھک اور چہرے پر موجود یہ دو پتلیاں کیا ان کے باوجود ہم پر سکوت طاری ہو سکتا ہے۔" کامران جیسے بحث کے موڈ میں تھا۔

"بیٹا یہاں دو حالتیں ہیں۔ جسم کا سکوت' روح کا سکوت۔ مہر بیٹی کا اشارہ روح کے سکوت کی طرف ہے۔ اس صورت میں جسم متحرک ہے ہم دیکھ رہے ہیں سن رہے ہیں چل پھر رہے ہیں' لیکن ہماری روح خاموش ہے اس میں کوئی ہلچل نہیں اور ہلچل کیا ہے۔ آرزوؤں اور امنگوں کا نام ہے جب یہ ہلچل نہیں ہو گی تو روح پر سکوت ہو گی۔ جسم جو کر رہا ہے کرتا پھرے روح کو اس سے کوئی غرض نہیں رہتی۔ بہرحال میرا خیال ہے یہ بحث بہت طویل ہو جائے گی پھر کسی دن اس پر مغز ماری کریں گے۔ آپ لوگ چائے پیو ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" انہوں نے کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ لیکن سنہرے فریم کے پیچھے چھپی ان کی پرسکوت آنکھیں مہرالنساء کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ بہت عام سے ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھی تھی' لیکن ہاشم درانی کو چہرے پڑھنے کا فن بخوبی آتا تھا۔ انہیں اس کے عام سے تاثرات سے مزین چہرے کے پیچھے کچھ خاص سا لگا' لیکن فی الوقت انہوں نے سر جھٹک کر چائے ختم کی اور چھوٹو کو بلایا۔

"یہ لو رشید خان... چائے کے پیسے۔"

"سر جی! رہنے بھی دیں آپ کون سا روز روز آتے ہیں جی۔ ہماری تو کینٹین کے بھاگ جاگ جاتے ہیں جب آپ آتے ہو۔" چھوٹو دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

"چھوٹو! میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں بیٹا! لیکن میں یہ خیرات میں نہیں دے رہا۔ چائے پی ہے اس کا معاوضہ دے رہا ہوں۔ تم نے مجھے ایک سہولت بہم پہنچائی۔ یہ اس سہولت کا عوضانہ ہے۔ تمہارا حق ہے میرا احسان نہیں سمجھے۔" انہوں نے پیسے زبردستی چھوٹو کی جیب میں اڑس دیے تو اسے لیتے ہی بنی۔ وہ شکریہ جی کہتا ہوا پلٹا ہی تھا کہ مہرالنساء نے اسے روک

لیا۔

"چھوٹو بھائی! میری چائے کے پیسے تو لیتے جائیے۔" اس نے پرس میں سے دس کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"باجی! سر جی نے آپ کی چائے کے پیسے بھی دے دیے ہیں۔"

"نہیں چھوٹو بھائی آپ سر کو وہ پیسے واپس کردیں۔" وہ حتمی انداز میں بولی تو چھوٹو بے چارہ مخمصے میں پڑ گیا اب کس کی مانے اور کس کی نہ مانے۔

"ارے بیٹا! آپ کس تکلف میں پڑ گئیں۔ میرے لیے تو آپ سب بچے برابر ہی ہو اگر ایک باپ اپنی اولاد کے لیے کچھ کرے تو وہ قرض یا احسان تو سمجھ کر نہیں کرتا نا۔ آپ یہ ہی سمجھ لیجیے اگر میری جگہ آپ کے والد ہوتے تو کیا آپ انہیں بھی یہی کہتیں۔" سرہاشم اس کے احساسات سے بے خبر بولے گئے اور وہ تو جیسے وہاں موجود ہی نہیں تھی۔ ایک جھکڑ سا تھا جو اس کے ذہن کو بگولے کی طرح اڑاتا ہوا لے جا رہا تھا اس نے مضبوطی سے اپنے قدم زمین پر جمانے کی کوشش کی اسی اضطراری کیفیت میں وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی سرہاشم کے ساتھ وہ چاروں بھی بہت خاموشی سے اس کے چہرے پر نگاہیں ٹکائے ہوئے تھے۔

"سر! آپ میرے لیے بہت محترم ہیں۔ جہاں تک والدین کی بات ہے تو کچھ بچے اپنے والدین سے زیادہ خوددار اور غیور ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ اسے میری بدتمیزی خیال نہیں کریں گے۔ مجھے اجازت دیجیے۔" اس نے بات مکمل کرتے ہوئے دس کا نوٹ ٹیبل پر دھرا اور بیگ اٹھا کر کینٹین کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

اس کا یہ جملہ سرہاشم پر کچھ اثر کرتا یا نہ کرتا۔ وہ چاروں بری طرح ہرٹ ہوئے تھے پیسے تو ان کی جیب میں بھی تھے لیکن وہ سرہاشم کی آفر کو اپنے لیے اعزاز سمجھ کر ان کے ہمراہ چلے آئے تھے اور وہ اپنی جھونک میں ان کی ٹھیک ٹھاک بے عزتی کر گئی تھی۔ جبکہ دوسری طرف سرہاشم کے چہرے پر وہی اطمینان اور آنکھوں میں وہی ازلی سکوت ٹھہرا ہوا تھا۔ یوں جیسے کچھ دیر قبل یہاں کچھ بھی نہیں ہوا تھا بلکہ ان کے مونچھوں تلے چھپے تراشیدہ لبوں پر وہی غیر محسوس سی مسکراہٹ رینگ گئی تھی جو ان کے مقابل کو بعض اوقات ان کا گرویدہ کردیتی تھی اور بعض اوقات شرمندہ — وہ جان گئے تھے کہ وہ نادانستگی میں مہرالنساء کی کوئی دکھتی رگ چھیڑ بیٹھے تھے۔

☼ ☼ ☼

آج خان شمس علی خان ایم این اے کا دورہ تھا۔ ہر طرف یوں بھگدڑ مچی ہوئی تھی گویا بھونچال آیا ہوا ہو۔ جانے انہوں نے ایمرجنسی دورے کا فیصلہ کس وجہ سے کیا تھا۔ بہرحال مینٹل اسپتال کے عملے پر تو آفت ٹوٹ پڑی تھی نا۔ معمولی سوئیپر سے لے کر ہائی لیول کے ڈاکٹرز تک سب پریشان تھے۔

"یہ ایم این اے صاحب کو کیا سوجھی بھلا پاگل خانہ بھی کوئی دورہ کرنے والی جگہ ہے۔" فاطمہ دانت نکوستے ہوئے بولی۔

"اری پاگل! یہ ہی تو بڑے لوگوں کی باتیں ہیں۔ کرنا کرانا تو انہوں نے کیا ہے۔ پاگلوں کو پکڑ کر دو چار تصویریں کھینچیں گے۔ اسپتال کے لیے کسی چھوٹے موٹے فنڈ کا اعلان کریں گے اور بس یہ جا وہ جا۔" شہزادی اس وقت وارڈ کی صفائی کرکے آرہی تھی کیونکہ انچارج کا حکم تھا اسپتال کو لشکا دیا جائے۔ ایسی چمک ہو ہر چیز میں کہ ایم این اے صاحب کو اپنا منہ نظر آئے۔

"دیکھو فاطمہ ابھی پچھلے ہفتے سارے بستروں کی چادریں بدلی ہیں اور اب حال دیکھو یوں لگتا ہے بدتمیز کیچڑ میں لت پت ہو کر بستروں پر لوٹنیاں لگاتی رہی ہیں۔" شہزادی کڑھ کر بولی۔

"نہ شہزادی بدتمیز نہ کہہ بے چارے انہیں اپنا ہوش نہیں یہ کیا جانیں انہیں کیا کرنا ہے اب چادریں بدلنے کا وقت نہیں کہ آدھے ایک گھنٹے میں خان صاحب پہنچ جائیں گے اور ابھی بہت سارے کام ہیں تو بس نمٹانے کی کر۔" فاطمہ بکھرے ہوئے برتن ٹرالی میں ڈالتے ہوئے بولی۔ شہزادی نے بھی بولنے سے احتراز کرتے ہوئے بس چادروں کو جھاڑ کر دوبارہ بچھا دیا اور ابھی بمشکل آدھا کام نمٹا تھا کہ شمس علی خان صاحب کی سواری باد بہاری آگئی اور جو بھونچال قدرے تھما تھا تو ایک بار پھر سارے میں جیسے پھریری سی دوڑ گئی تھی۔ پہلے انہوں نے مردانہ وارڈ کا جائزہ لیا تھا اور حسب توقع خاصے برافروختہ بھی ہوئے تھے۔

"دیکھیے آپ لوگوں نے اسپتال کا ماحول کس قدر ان ہائی جینک رکھا ہوا ہے۔ اتنی گندگی۔ ذرا ان کے حلیے دیکھیں آپ۔ اس طرح تو انہوں نے کیا ٹھیک ہونا ہے مزید بیماری بڑھنے کا خدشہ ہے۔ سب سے پہلے تو آپ ان کی اور ان کے اردگرد کی صفائی پر خصوصی دھیان دیں۔"

"جی سر جی۔" ڈاکٹر حشمت بس نام کے ہی حشمت تھے ورنہ ان کی عاجزی اور جی حضوری دیکھ کر سارے عملے کا خیال تھا کہ ان کا نام عاجز خان یا خاکسار ہونا چاہیے۔

"آپ بھی دیکھ لیں۔ ان کے بستر۔ کیا آپ ایسے بستر پر سونا پسند کریں گے۔" ایم این اے صاحب تو جیسے آج پورے پاگل خانے کو سدھارنے کی آرزو لے کر آئے تھے۔

"نہیں جی سر جی۔"

"تو پھر آپ نے ان کے لیے ایسے بستر کیوں لگوائے ہیں کیا آپ انہیں انسان نہیں سمجھتے۔"

"نہیں جی سر جی۔ نن۔ نہیں میرا مطلب ہے ہاں جی سر جی۔" ڈاکٹر حشمت بوکھلا کر رہ گئے۔

"کیا آپ کے عملے میں کوئی معقول شخص نہیں ہے۔" خان صاحب نے ڈاکٹر حشمت کی نہیں جی سر جی سے کوفت زدہ ہو کر پوچھا۔ تو ایک پل کو ان کے ہمراہ چلتے تینوں ڈاکٹرز بے چارے ان کا منہ دیکھ کر رہ گئے۔

"آئیے سر دوسرے وارڈ کی طرف چلتے ہیں۔" ڈاکٹر تارک نے آگے بڑھ کر مہذب لہجے میں کہا تو خان صاحب کے تیوریوں کے بل کچھ کم ہوئے۔ لیڈیز

وارڈ کے باہر ہی ڈاکٹر زینت ڈاکٹر تنویر اور ڈاکٹر رفعت ان کے استقبال کو کھڑی تھیں۔

رسمی سے تعارف کے بعد وہ سب وارڈ میں داخل ہوئے تو یہاں کی حالت قدرے بہتر دکھائی دی۔ فاطمہ اور شہزادی نے مختصر سے وقت میں کچھ عزت رکھ لی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب! یہاں میڈیکیشن کی کیا صورت حال ہے؟"

"سر! اسپتال کی اپنی ڈسپنسری بھی ہے لیکن اگر کوئی میڈیسن نہ ہو تو میڈیکل اسٹور سے منگوالی جاتی ہے۔ اس کے لیے باقاعدہ ہمیں گورنمنٹ فنڈ دیتی ہے اور ادویات بھی فراہم کی جاتی ہیں۔" ڈاکٹر زینت نے سلجھے ہوئے انداز میں کہا تو انہوں نے ستائشی انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

"کیا یہ مریض ہر وقت پاگل پن کا شکار رہتے ہیں یا مخصوص اوقات میں ہی ان پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔"

"سر مختلف صورت حال ہے۔ کچھ تو بالکل بے حواس ہوتے ہیں یعنی خاموش اور ایک طرف بیٹھے رہتے ہیں کسی کسی وقت ان پر دورے کی کیفیت طاری ہوتی ہے ایسے وقت ہم مختلف تھیراپیز عمل میں لاتے ہیں جبکہ چند ایک جن میں ہمیں شدید جارحانہ رد عمل دکھائی دیتا ہے انہیں ہم الگ کمروں میں رکھتے ہیں تاکہ وہ خود کو یا کسی اور کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔" ڈاکٹر زینت نے تفصیل سے جواب دیا۔ خان شمس علی خان پشت پر ہاتھ تھامے ڈاکٹروں کی فوج ظفر موج کے ہمراہ وارڈ کے راؤنڈ پہ تھے کہ اچانک ان کی نظر ایک مریضہ پر ٹک گئی۔

وہ جو کوئی بھی تھی انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ انہیں دیکھتے ہی بدک کر اپنے بستر سے چھلانگ لگا کر دوسرے بستر پر چلی گئی اور وہاں موجود دوسری عورت کو اس نے یوں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا جیسے اسے اپنے سامنے ڈھال بنانا چاہتی ہو۔ انہوں نے دلچسپ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ۔ یہ عورت۔"

"یہ۔ یہ نیم پاگل ہے اور جینٹس کو دیکھ کر یونہی گھبرا جاتی ہے۔ اس کا کیس ڈاکٹر تبارک ہینڈل کر رہے ہیں۔ سر میرا خیال ہے اب واپس پلٹنا چاہیے۔" ڈاکٹر زینت اس کے چہرے کی سراسیمگی کو اچھی طرح سمجھ رہی تھیں اور اسی لیے وہ ان سب کو وہاں سے ہٹانا چاہتی تھیں لیکن خان صاحب کی توجہ اس پر مبذول ہو گئی تھی۔

"کیا بیک گراؤنڈ ہے اس کا اس کی کیس ہسٹری بتائی جائے۔"

"سر دو ماہ قبل اسے کوئی شخص یہاں چھوڑ گیا تھا۔ نام تو اس کا فردوس ہے لیکن اسے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ ذہنی طور پر یہ مکمل مفلوج نہیں ہے بلکہ اکثر بچوں کی طرح باتیں کرتی ہے لیکن ایک بات جو بہت اہم ہے وہ یہ ہے کہ جب بھی اس کے سامنے کوئی مرد آ جائے تو یہ شدید گھبراہٹ کا شکار ہو جاتی ہے اور اس کی آنکھوں میں وحشت بھر آتی ہے صرف ڈاکٹر تبارک سے یہ مانوس ہو پائی ہے اور وہ بھی ان دو ماہ میں بہت مشکل سے البتہ یہاں خواتین کے درمیان یہ بالکل مطمئن رہتی ہے۔"

"میرا خیال ہے میں اگر کوشش کروں تو یقیناً" یہ میری بات سنے گی۔ آپ لوگوں نے اس کا خوف ختم کرنے کی کوشش نہیں کی ہو گی۔" انہوں نے کہہ کر قدم آگے بڑھائے۔

"سر سوری تو سے۔ آپ اس کے قریب مت جائیں ممکن ہے یہ گھبراہٹ میں کوئی جارحانہ قدم اٹھا کر آپ کو نقصان پہنچا دے۔" ڈاکٹر زینت انہیں آگے بڑھتا دیکھ کر گھبرا کر بولیں۔

"دیکھیے ڈاکٹر! ہم لوگ باشعور انسان ہیں۔ ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ کسی انسان کو محض اس کی ناقص ذہنی کیفیت کی بنا پر ایک ناکارہ وجود جان کر کونے میں ڈال دیں یا اسے انسان سمجھنا ہی چھوڑ دیں۔" شمس صاحب آج مکمل طور پر خدمت خلق کے جذبے سے

سرشار ہو کر آئے تھے' لیکن شاید وہ یہ بھول گئے تھے کہ ان کا سامنا ذی ہوش انسانوں سے نہیں ذہنی طور پر ناکارہ اور پاگل افراد سے ہے۔ وہ جنہیں خود کا ہوش نہیں وہ انسانیت کے درس کو کیا سمجھ سکتے تھے۔ شمس علی خان بڑے والہانہ انداز میں آگے بڑھے اور انہوں نے اسے پچکارنے کے لیے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھنا چاہا لیکن یہ خلوص انہیں بہت مہنگا پڑا۔ فردوس نے اپنی ساتھی عورت کا بازو چھوڑ کر بستر سے ایک جست لگائی تھی اور اگلے ہی پل وہ دونوں ہاتھوں سے خان شمس علی خان کے بال نوچنے لگی وہ بے چارے اس افتاد سے بری طرح گھبرا گئے اور خود کو چھڑانے کی ناکام سعی کرنے لگے' لیکن فردوس میں اس وقت پانچ چھ آدمیوں جتنی طاقت آئی ہوئی تھی یونہی ان کے بال اور منہ نوچتے کھسوٹتے اس نے اچانک ان کے کندھے میں اپنے دانت گاڑ دیے ایک بھیانک چیخ ان کے حلق سے برآمد ہوئی۔ اسپتال کا عملہ بے چارہ گھبرایا ہوا انہیں فردوس کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا' لیکن جب تک انہوں نے اسے قابو کیا خان صاحب کی قمیص کندھے پر سے خون میں سرخ ہو چکی تھی اس سے جان چھوٹتے ہی وہ تیر کی طرح باہر نکلے تھے۔ بڑی مشکل سے ڈاکٹر تبارک انہیں اپنے آفس لے کر آئے۔

"یہ۔۔۔ یہ اس قدر خطرناک پاگل آپ نے یونہی کھلی چھوڑ رکھی ہے۔ اسے الگ تھلگ رکھیں یہ تو جان لینے سے بھی گریز نہ کرے اف۔" انہوں نے اپنا کندھا سہلانے کی کوشش کی۔ جہاں ڈاکٹر تبارک بینڈیج کر رہے تھے۔

"سر میں نے تو پہلے ہی کہا تھا' لیکن آپ نہیں مانے وہ عام حالات میں۔۔۔"

"دیکھیے ڈاکٹر زینت! آپ مجھ سے زبان چلانے کے بجائے تسلیم کریں کہ غلطی آپ کی ہے۔ کیا آپ نہیں جانتیں کہ مکمل پاگل سے نیم پاگل زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ بہرحال بہتر یہی ہے کہ آپ ایک بار تمام مریضوں کو اچھی طرح دیکھ بھال لیں اور جو اس طرح کے پاگل ہوں انہیں باقیوں سے الگ رکھیں۔" بینڈیج ہوتے ہی انہوں نے وہاں سے بھاگنے کی کی۔ شاید ڈاکٹر زینت کی بات نہ ماننے کی صورت میں جو کچھ پیش آیا تھا اس پر کھسیاہٹ بھی تھی اسپتال کے احاطے سے نکلتے ہی انہوں نے سکون کا سانس لیا۔

"توبہ! اس قدر حسین عورت اور اتنی خطرناک۔" اس کا معصوم چہرہ' سیاہ زلفوں میں چھپا کسی ماہتاب کی طرح جگمگاتا ہوا دکھائی دیا تھا اندر کے مرد کے اکسانے پر وہ اس کی طرف بڑھے تھے وہی ازلی مرد کی فطرت' لیکن منہ کی کھا کر آ گئے تھے۔ شاید اس پاگل عورت نے ان کی آنکھیں پڑھ لی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اسلامیہ یونیورسٹی کے دونوں گیٹ اس وقت پورے کھلے ہوئے تھے اور اسٹوڈنٹس جوق در جوق باہر نکل کر اپنے اپنے رستوں پر جا رہے تھے۔ رش قدرے کم ہوا تو مہرالنساء بھی علینہ اور سلمٰی کے ساتھ باہر نکل آئی۔

"یار آج گرمی کس قدر شدید ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے سورج آگ برسا رہا ہے اور زمین بھی آگ اگل رہی ہے جوتوں کے اندر پیروں کے تلوے جل رہے ہیں۔" سلمٰی ہاتھ میں پکڑی فائل سر کے آگے رکھ کر اپنے چہرے کو دھوپ سے بچانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں مہو! ابھی سے حلق میں جیسے کانٹے پڑ رہے ہیں۔ پتا نہیں پوائنٹ کب تک آئے گا۔ ایک تو ابھی ہمارے نکلتے نکلتے ہاتھ سے نکل گیا۔ دوسرے کا بھی اللہ حافظ ہے۔ ذرا چاروں طرف نگاہ دوڑاؤ یوں لگتا ہے سارے پاکستان کے لڑکے لڑکیاں یہیں موجود ہیں۔ آخر یہ جو تھوک کے حساب سے لڑکیاں ہیں یہ کہاں کھپیں گی۔ مجھے تو ان کی پریشانی ہے آخر ان کا کیا مستقبل ہے۔" علینہ بولی تو ہمیشہ کی سنجیدہ مہرالنساء کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تمہیں کیوں فکر ہے؟ تم نے انہیں جہیز دینا ہے یا ان کے لیے بر ڈھونڈنے ہیں۔"

"میں نے یہ دونوں کام نہیں کرنے' لیکن یار یہ بھی تو سوچو کہ میں بھی تو اسی سسٹم کا پرزہ ہوں۔ میں بھلا ان کے انجام سے بے خبر کیسے رہ سکتی ہوں۔" علینہ نے خاصے مدبرانہ انداز میں کہا۔

"پرزہ تو تم ہو لیکن بے کار پرزہ۔" سلمٰی نے چوٹ کی۔

"ارے تو اب ہر کوئی مس مہرالنساء جیسی آبشار سی زلفیں جھیل سی آنکھیں' گلاب سے لب' دودھ سی رنگت' سرو سا قد اور چنبیلی کی ڈال سا جسم کہاں سے لائے۔"

"یہ تم نے مہرالنساء کا شخصی خاکہ کھینچا ہے یا چھانگا مانگا کے جنگلات کا جغرافیہ بیان کیا ہے۔" سلمٰی بھنا کر بولی۔

"اچھا زیادہ کڑھو نہیں۔ مابدولت سے فرمائش کرو تاکہ تم پر احسان کرنے کے بہانے ہم بھی کبیر آئس کریم والے کی جیب میں کچھ ٹھونس سکیں اور اپنا خشک لکڑی جیسا حلق تر ہو جائے۔"

"علینہ کسی کسی وقت تم جو حاتم طائی کی قبر پر لات مارتی ہو نا اس وقت حقیقتاً" بہت اچھی لگتی ہو۔ ذرا مس صُمٌ بُکمٌ سے بھی پوچھ لو کہ یہ کیا کھانا پسند کریں گی۔" سلمٰی نے مہرالنساء کو مسلسل خاموش دیکھ کر علینہ سے کہا۔ وہ تینوں یونیورسٹی کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی اب تھوڑے فاصلے پر آ گئی تھیں۔ یونیورسٹی کی دیوار جہاں سے دوسری جانب مڑتی تھی وہیں فٹ پاتھ کے قریب کبیر کا کیبن نما آئس کریم پارلر اور ڈرنک کارنر تھا۔ اکثر لڑکے لڑکیاں وہاں رک کر آئس کریم کھاتے اور اپنی راہ لیتے۔ اس کے کہنے کے مطابق بیس سال سے اس کا کیبن یہیں تھا۔ اسے منافع بھی بہت ہو جاتا تھا وہ چاہتا تو کسی کمرشل ایریا میں دکان لے کر یہی کام کر سکتا تھا' لیکن بقول اس کے یہاں اس کا ایسا دل لگا تھا کہ پھر اس کا کہیں آنے جانے کو جی نہیں چاہا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ بے اولاد تھا اور یہاں لڑکے لڑکیوں میں وہ اپنی اولاد کو دیکھتا تھا اس کی کبھی کسی سے تلخ کلامی نہیں ہوئی تھی۔ سب ہی اس کی بہت عزت کرتے تھے۔

"کبیر چاچا! تین آئس کریم تو دیں فلیور تو آپ کو پتا ہوں گے۔" علینہ کے کہنے پر کبیر مسکرایا۔

"بالکل پتا ہے بیٹا! اپنے بچوں کی پسند بھی کبھی بھولی ہے۔" اس کی بات سن کر مہرالنساء نے جھکا سر اٹھایا۔ کبیر آئس کریم کپ تیار کرنے میں مصروف تھا۔ مہرالنساء نے اس کی چہرے پر پھیلی شفقت اور پدرانہ محبت کو عجیب کوفت بھرے انداز میں دیکھا اور دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

"یہ لو بیٹا! دو چاکلیٹ ایک ونیلا۔ یہی پسند ہیں نا تم تینوں کو۔" کبیر نے ہاتھ آگے بڑھا کر باری باری تینوں کپ علینہ کو پکڑائے۔

"مان گئے چاچا! مان گئے یہ آپ کا ہی حوصلہ ہے جو اتنی اولادوں کی فرمائشیں یاد رکھتے ہیں۔" علینہ نے ستائش بھرے انداز میں کبیر کی طرف دیکھا اور پھر ایک طرف لگے درخت کے نیچے بچھے بنچ کی طرف بڑھ گئی۔ سلمٰی اور مہرالنساء بھی اس کے ہمراہ تھیں۔ اچانک سلمٰی کی نگاہ سامنے بڑی یونیورسٹی کے ذیلی روڈ کے ساتھ ملحقہ مین روڈ کے فٹ پاتھ پر اسے جو شخصیت نظر آئی تھی اس نے اس کی ساری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔

"لگتا ہے آج بابا جی پھر جلال میں ہیں۔" اس کی آواز کسی سرسراہٹ کی مانند علینہ اور مہرالنساء کی سماعت سے ہم آغوش ہوئی تھی اور اگلے ہی پل ان کی نگاہیں بھی سلمٰی کی نظروں کے تعاقب میں اس طرف اٹھ گئی تھیں۔ وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ بے ترتیب جلیے والا' لمبے لمبے جٹاؤں سے بال جن میں مٹی اور تنکے یوں گھل مل گئے تھے کہ اب ان کو الگ کرنے کا تصور محال تھا۔ چہرے کے نقوش کو بے ترتیب داڑھی مونچھوں نے اس حد تک چھپا دیا تھا کہ اگر وہ کبھی مونچھیں داڑھی منڈوا لیتا تو اس کی پہچان مشکل ہو جاتی۔ کھردرے ہاتھ پیر پھٹے ہوئے گریبان اور چیتھڑوں جیسے لباس میں ملبوس وہ ننگے پاؤں سڑک پر

ادھر ادھر بھاگ رہا تھا۔ جیسے کسی تلاش میں سرگرداں ہو۔ لیکن اسے کس کی تلاش تھی۔ اس کے پھٹے دامن میں چھوٹے بڑے پتھروں کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ وہ دامن سمیٹے آنے جانے والی گاڑیوں کے پیچھے یوں بھاگتا جیسے انہیں پکڑنے کا ارادہ ہو اور جب وہ اس کی دسترس سے باہر ہو جاتی تو کسی روٹھے ہوئے بچہ کی طرح منہ بسورتا' دانت کچکچاتا دامن سے پتھر اٹھا اٹھا کر گاڑی کی سمت پھینکنے لگتا۔ اس کی یہ حرکت یقیناً" گاڑی کے ڈرائیور اور مالک کو ناگوار گزرتی تھی۔ لیکن وہ اسے ڈانٹنے ڈپٹنے کا ارادہ ترک کر کے گاڑی بھگا لے جاتے کہ اس کا حلیہ اس کی ذہنی کیفیت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ وہ تینوں آئس کریم کھاتے ہوئے مسلسل اسے دیکھ رہی تھیں۔

وہ شاید گاڑیوں کے پیچھے بھاگ بھاگ کر تھک گیا تھا کہ ہارے ہوئے انداز میں فٹ پاتھ کی طرف چل پڑا۔ فٹ پاتھ کے قریب پہنچ کر اس نے سارے پتھر نیچے ڈھیر کر دیے اور سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ یوں جیسے اسے وہاں کچھ بہت خاص دکھائی دے رہا تھا پھر وہ ان ہی پتھروں کے قریب بیٹھ گیا اور انہیں یوں پھیلانے لگا گویا شطرنج کی بساط پر مہرے بچھا رہا ہو۔ کچھ دیر اس کام میں لگے رہنے کے بعد شاید وہ اس سے بھی اکتا گیا تھا جب ہی ایک بار پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر یک دم کھڑا ہو گیا اب اس کے قدم کبیر آئس کریم والے کے کیبن کی طرف بڑھ رہے تھے اور وہ تینوں گھبرا گئیں کیونکہ ممکن تھا کہ وہ اپنے پاگل پن میں کوئی نقصان دہ حرکت کر بیٹھتا' لیکن وہ ان سے چند قدم کے فاصلے پر منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"خادم علی! وہاں کیوں رک گئے ادھر آؤ میرے پاس لو آئس کریم کھاؤ۔" کبیر چاچا اس ادھیڑ عمر شخص کو یوں پچکار رہے تھے گویا کسی تین چار سالہ بچے کو لالی پاپ کا لالچ دے رہے ہوں۔

"چاچا! کیا کر رہے ہیں آپ؟ یہاں کیوں بلا رہے ہیں اسے؟" سلمیٰ گھبراہٹ بھرے لہجے میں بولی۔

"ارے بیٹا! کیوں ڈرتی ہو؟ پاگل ہے دشمن نہیں۔ اب تو وہ زمانہ ہے کہ ہوش مند سے ڈرنا چاہیے جو بے چارہ اپنے جوگا نہیں وہ کسی کو کیا کہے گا بھلا۔"

"لیکن چاچا! میں نے سنا ہے پاگل زیادہ خطرناک بھی ہو سکتے ہیں اور یہ تو آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کیسے آتی جاتی گاڑیوں کو پتھر مار رہے تھے یہ بابا جی ایسے تو کسی کا بھی سر پھٹ جائے۔" علینہ نے سلمیٰ کی ہاں میں ہاں ملائی۔ لیکن مہرالنساء ہنوز خاموش تھی اور اس کی نظریں بابا خادم علی کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ سرخ وحشت بھری نظریں جو جانے کتنے رتجگوں کی امین تھیں اور مٹی سے اٹے بال۔ جانے کتنی مسافت تھی جو اس شخص نے ننگے پیر اپنے وجود سے بے نیاز ہو کر طے کی تھی اور جانے کتنی مسافت ابھی باقی تھی۔

"خادم علی! میری بات بھی نہیں مانو گے۔" کبیر چاچا کے لہجے میں ایسا مان اور بھروسہ تھا جیسے وہ ان کی ہر بات اچھی طرح سمجھ رہا ہے اور جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ مان بھی جائے گا۔ اور شاید کبیر چاچا کے لہجے کا مان تھا یا کیا کہ اس نے رخ موڑ کر ان کی طرف دیکھا اور دھیرے سے ہنس پڑا۔ حیرت انگیز طور پر اس کی ہنسی میں بالکل معصوم بچوں جیسی تازگی اور معصومیت تھی۔ پھر وہ تیز تیز قدموں سے چل کر کیبن کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ سلمیٰ اور علینہ نے ہراساں ہو کر پہلے اسے اور پھر کبیر چاچا کی طرف دیکھا جو بڑے مطمئن انداز میں کپ میں آئس کریم ڈال کر اسے تھما رہے تھے اس نے جھپٹ کر کپ ان کے ہاتھوں سے تقریباً" چھینا اور دو قدم آگے بڑھا کر ان تینوں کے انتہائی قریب آگیا اب کے مہرالنساء نے حیرت سے دیکھا تھا جبکہ باقی دونوں کی سانس رکنے میں پل بھر کا وقت رہ گیا تھا۔ ان کی خوف زدہ نظریں اس کی جانب اٹھی تھیں جبکہ اس نے دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر پہلے مہرالنساء پھر سلمیٰ اور آخر میں علینہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پلٹ کر مین روڈ کی طرف بھاگ پڑا۔ وہ تینوں تعجب بھری نظروں سے دیکھتی رہیں۔ دور جا کر فٹ پاتھ پر وہ ان کی جانب پشت کر کے بیٹھ گیا۔

"یہ کیا تھا بھئی۔؟" علینہ نے اپنی سابقہ شگفتگی بحال کرنے کی کوشش کی۔

"یہ اس کی طرف سے شفقت کا اظہار تھا۔ وہ پاگل سہی انسان تو ہے نا۔ چند حسیات تو اس کے پاس بھی ہوں گی اور یقیناً" اس نے تمہاری نظروں میں اپنے لیے خوف محسوس کر لیا ہو گا جبھی۔" مہرالنساء نے کہا تو کبیر چاچا نے تائیدانہ انداز میں سر ہلایا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا! یوں بھی یہ مکمل پاگل نہیں اللہ لوک ہے۔ اور اللہ لوک تو دلوں کے بھید بھی جان لیتے ہیں۔"

"کبیر چاچا! یہ بابا خادم علی کیا شروع سے یہیں کے رہنے والے ہیں۔" مہرالنساء نے پوچھا۔

"نہیں بیٹا! شروع کے تو نہیں پر بہت عرصہ ہو گیا ہے اسے یہاں۔ خدا معلوم کہاں سے آیا اور اس کے ساتھ کیا پیش آیا کوئی نہیں جانتا۔" کبیر چاچا جواب دے کر دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گئے اور وہ تینوں بھی پوائنٹ آتا دیکھ کر جلدی سے آگے بڑھ گئیں۔ لیکن جانے سے پہلے مہرالنساء نے آخری بار بابا خادم علی کو فٹ پاتھ پر بیٹھے دیکھا۔ آئس کریم کا کپ یونہی اس کے قریب دھرا تھا اور وہ سر جھکا کر یوں بیٹھا ہوا تھا گویا کسی مراقبے میں ہو وہ سوچتی ہوئی بس میں سوار ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"ایکسکیوز می ڈاکٹر زینت اگر آپ فارغ ہیں تو دو منٹ کے لیے میری بات سن لیں۔" ڈاکٹر تبارک زینت کے کیبن میں جھانکتے ہوئے بولے اور پھر وہاں سے چلے گئے۔

ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ میل ڈاکٹرز میں سے کسی کو ڈسکس کرنے کی ضرورت پیش آئی ہو۔ عموماً" وہ اپنے اپنے وارڈز اور عملے تک ہی محدود رہتے تھے۔ بس ڈاکٹر حشمت کبھی کبھار ادھر ٹہلتے دکھائی دے جاتے تھے تو اس کی بڑی وجہ ڈاکٹر رفعت تھیں جو ان کی منکوحہ تھیں۔ لیکن وہ بے چارے جب بھی آئے وہ بھی دل لیے ہی واپس گئے کیونکہ ڈاکٹر رفعت جی! انہیں دیکھ کر عام لڑکیوں کی طرح نہ شرماتی تھیں اور نہ ہی ان کے رومانٹک ڈائیلاگ کے جواب میں محبت بھرے مکالمے بولتی تھیں بلکہ ان کا ہر محبت بھرا جملہ سن کر وہ صرف "اچھا" کا پتھر دے مارتی تھیں اور وہ دل مسوستے وہاں سے چمپت ہو جاتے تھے۔ ڈاکٹر تبارک کا ڈاکٹر زینت کو بلانا کسی اہم بات کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ وہ چند ثانیوں بعد ہی ڈاکٹر تبارک کے آفس میں ان کے سامنے تھیں۔

"ڈاکٹر ہیو آ سیٹ پلیز۔" ڈاکٹر تبارک کچھ بے چین سے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بیٹھ گئیں۔

"یس ڈاکٹر۔" ڈاکٹر زینت ہمہ تن گوش تھیں۔

"فردوس کو آپ میں سے کون ڈیل کر رہا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"سر میں ہی اسے دیکھ رہی ہوں خیریت؟"

"وہ پچھلے تین ماہ سے یہاں ہے کیا آپ نے اس میں کوئی تبدیلی محسوس کی۔"

"نو سر۔ وہ تو ویسی ہی ہے جیسی آئی تھی۔"

"تو ڈاکٹر شی از گوئنگ ٹو بی آ مدر۔ حیرت ہے ایک ڈاکٹر ہو کر آپ نہیں جان سکیں۔" ڈاکٹر تبارک کڑے لہجے میں بولے۔

"سوری ڈاکٹر دراصل میرا خیال تھا کہ ایسا ممکن نہیں۔ پھر اسے یہاں چھوڑ کر جانے والے نے بھی تو نہیں بتایا کہ وہ شادی شدہ ہے۔" ڈاکٹر زینت کھسیانے لہجے میں بولیں۔

"آپ کو کیا ہو گیا ہے ڈاکٹر۔ کیا اس کی کیس فائل میں اس کے ٹیسٹ یہ ثابت نہیں کرتے کہ وہ پانچ سال کی عمر سے نیم پاگل ہے اس کا جسم تو وقت کے ساتھ ساتھ نشوونما پاتا رہا ہے۔ لیکن ذہن وہیں پانچ سال کی عمر میں اٹک گیا ہے۔ ایسی صورت میں اس سے کون شادی کر سکتا ہے۔" ڈاکٹر تبارک پیشانی مسلتے ہوئے بولے۔

"تو۔ آپ کا خیال ہے کہ۔" لفظ ان کے حلق میں گھٹ کر رہ گئے اور انسانیت کی ایسی تذلیل پر وہ بس

آنکھیں پھاڑ کر تاسف سے دیکھے گئیں۔
"لیں... اور سب سے بڑا مسئلہ اب اسے اس سب کو فیس کرنے کے لیے تیار کرنا ہے۔ ابھی وہ اپنے اندر ہونے والی تبدیلیوں سے بے خبر ہے' لیکن آہستہ آہستہ جو تبدیلیاں رونما ہوں گی ایک بے شعور وجود اور ناقص ذہنیت کے باوجود وہ ان سے بے خبر نہیں رہ پائے گی۔ ممکن ہے یہ تبدیلیاں اس کے لیے الجھن پیدا کریں اور الجھن میں اس ذہنی کیفیت کے حامل افراد کس طرح کی حرکتیں کرتے ہیں آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔" ڈاکٹر تبارک اب قدرے ریلیکس دکھائی دے رہے تھے۔ غالباً" اپنا بوجھ ڈاکٹر زینت کے کندھوں پر ڈال کر کچھ اطمینان ہو گیا تھا انہیں۔
"لیکن ڈاکٹر! یہ انتہائی مشکل کام ہے میں..."
"جی ہاں یہ کام مشکل ہے اور یہ مشکل کام آپ نے کرنا ہے۔ کیونکہ ایک عورت ہونے کے ناتے آپ کے اندر جو محسوسات ہو سکتے ہیں وہی محسوسات اس پاگل عورت کو آنے والی پریشانیوں سے بچانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔"
"ٹھیک ہے ڈاکٹر! میں کوشش کروں گی۔" ڈاکٹر زینت اٹھ کھڑی ہوئیں۔
"تو ڈاکٹر! کوشش نہیں فوری ایکشن لیں اور اس ایکشن کا رزلٹ نظر آنا چاہیے۔ وِش یو آل..." ڈاکٹر زینت اثبات میں سر ہلا کر ان کے آفس سے باہر نکل آئیں یقیناً" ایک بہت بڑا چیلنج تھا جو انہوں نے قبول کیا تھا۔ وارڈ میں داخل ہوتے ہی غیر ارادی طور پر ان کی نظر فردوس کے بستر پر پڑی۔ وہ کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی اور بالکل ساکت تھی۔ وہ بس اسے دیکھے گئیں۔ جب وہ بالکل خاموش ہوتی تھی تو بالکل نہیں لگتا تھا کہ وہ پاگل ہے۔ اس کے چہرے کے نقوش میں گھلی ملاحت اس کی آنکھوں کی معصومیت' ان کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔ ایک تو قدرت کی طرف سے اس پر آزمائش تھی اور دوسری آزمائش ایک باشعور انسان کی بے ضمیری کی وجہ سے اس کی کوکھ میں پل رہی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتیں اس کے قریب آگئیں۔

"فاطمہ! تم نے آج لگتا ہے فردوس کو چینج نہیں کروایا۔ سب کام چھوڑو پہلے اس کی حالت ٹھیک کرو۔" انہوں نے فاطمہ کو جھاڑا جو ہاتھ میں جھاڑن لیے شہزادی کے ساتھ گپیں ہانکنے میں لگی ہوئی تھی۔
"جی اچھا جی..."
"دیکھو یہ اسپتال ہے بلکہ عام اسپتالوں کے مقابلے میں یہاں دگنی ڈیوٹی دینی پڑتی ہے۔ گپوں کے لیے کوئی اور وقت رکھ لیا کرو اور ذرا اس کا ہاتھ منہ دھلا کر میرے پاس لے کر آؤ۔" ڈاکٹر زینت یہ کہہ کر وارڈ سے ملحقہ اپنے کیبن میں چلی گئیں۔
"شہزادی! تم ذرا باقیوں کا خیال رکھنا میں ذرا اس کے کپڑے بدل لوں۔" فاطمہ یہ کہہ کر فردوس کی طرف بڑھی اور اس کا بازو تھاما تو خلاف توقع وہ بالکل آرام سے اس کے ساتھ چل پڑی۔ غنیمت تھا کہ منہ ہاتھ دھونے سے لے کر کپڑے بدلنے تک کے مرحلے میں وہ بس خاموش رہی تھی۔ فاطمہ بے چاری نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ اس کے لمبے بالوں میں تیل لگا کر چٹیا بناتے اس نے شہزادی کی طرف دیکھا۔
"دیکھ شہزادی جانے نمانی کہاں سے آئی اور کیا بیتی اس پر۔ لیکن تو اس کی شکل تو دیکھ کسی اونچے خاندان کی لگتی ہے نا۔"
"ہاں فاطمہ! یہ باقی عورتوں میں بیٹھی ان جیسی نہیں لگتی بلکہ زیادہ تر تو یہ خاموش پڑی رہتی ہے نہ دوسروں کے ساتھ جھگڑتی ہے نہ شور مچاتی ہے۔ پر بڑے ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے یہ بچپن سے ہی پاگل ہے۔ میرا خیال ہے باتیں زیادہ نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے دیکھ لیا تو پھر ناراض ہوویں گی۔" شہزادی اپنے کام میں لگ گئی اور فاطمہ فردوس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ڈاکٹر زینت کے کیبن میں لے آئی۔
"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" انہوں نے فاطمہ سے کہا تو وہ جلدی سے باہر چلی گئی۔ فردوس مطمئن نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ دھیرے سے اپنی کرسی سے اٹھیں اور اس کے قریب چلی آئیں' پھر اس کا ہاتھ تھام کر سائیڈ پر رکھے اسٹریچر نما بیڈ پر بٹھا دیا۔ وہ بغور

اس کا جائزہ لے رہی تھیں اس وقت وہ اگر ہوش میں نہیں تھی تو دورے کی حالت میں بھی نہیں تھی۔ اس پر سکوت کی سی کیفیت طاری تھی اور وہ بلا چون و چرا ان کی ہر حرکت قبول کر رہی تھی۔ گویا وہ ان لمحوں میں سکون سے اپنا کام کر سکتی تھیں۔ انہوں نے پہلے تو اس کا بلڈ پریشر چیک کیا اس کے بعد الٹرا ساؤنڈ کیا۔ الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے ڈاکٹر تبارک کی کہی گئی بات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ وہ تین ماہ کی حاملہ تھی۔ انہیں خود پر حیرت تھی کہ ان کی زیرک نگاہیں کہاں گھاس چرنے چلی گئی تھیں۔ فردوس ان کے سامنے رہتی تھی۔ ہر پل' ہر لمحہ' اس کے باوجود وہ نہ جان سکیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس میں بظاہر حاملہ عورتوں والی کوئی خاصیت دکھائی نہیں دی تھی اور شاید ہلکی پھلکی ہو بھی تو انہوں نے دھیان نہیں دیا تھا۔
"فردوس..." انہوں نے بہت نرمی سے اسے پکارا۔ وہ خالی خالی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"میری بات سن رہی ہو فردوس۔ میں تم سے بات کر رہی ہوں۔" ان کے جملوں کے جواب میں اس پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔ وہ کچھ مایوس سی ہونے لگیں۔ اسے یہ تک خبر نہیں ہو پا رہی تھی کہ وہ اس سے مخاطب ہیں تو ان کی باتیں کیا خاک اس کی سمجھ میں آئی تھیں۔
"ابھی سے مایوس ہو گئیں ڈاکٹر زینت بانو... یہی تو دراصل تمہاری صلاحیتوں کا امتحان ہے۔" انہوں نے جیسے خود کو تازہ دم کرنے کی کوشش کی۔
"فردوس..." انہوں نے اس کا کندھا تھام کر ہلکا سا جھنجھوڑا تو وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں میں شناسائی کی کچھ جھلک دیکھ کر انہوں نے قدرے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گئیں۔
"فردوس! تم سمجھ رہی ہو میری بات..." اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"کیوں...؟"
"آپ نے سمجھانے والی کوئی بات ہی نہیں کی۔" اس نے قدرے معصومیت سے جواب دیا تو وہ اس کے اس مدلل جواب پر قدرے حیران سی اس کی طرف دیکھنے لگیں۔
"مثلاً" کون سی بات سمجھانے والی ہوتی ہے۔" انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔
"کوئی نہیں..." وہ ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنساتے ہوئے اضطراری انداز میں بولی۔
"اور... اگر میں آپ کو کچھ سمجھاؤں تو سمجھو گی۔" ان کا لہجہ دوستانہ تھا۔
"نہیں... میں نہیں سمجھوں گی۔" وہ ضدی بچے کی طرح ہٹیلے لہجے میں بولی۔
"کیوں بھئی؟ کیا میں آپ کو اچھی نہیں لگتی؟"
"نہیں تو... آپ تو بہت اچھی ہو... بہت... بہت اچھی۔"
"مجھ سے کوئی ناراضی ہے؟" ڈاکٹر زینت کو اس کے ساتھ باتیں کرنے میں مزا آنے لگا۔ ایک پچیس سالہ لڑکی کے چہرے اور لہجے میں ایک پانچ سالہ بچی کی سی معصومیت عجیب بھی لگ رہی تھی اور پرکشش بھی۔ اس سے پہلے وہ بہت کم بولی تھی۔ زیادہ تر اس کی گفتگو بے ربط اور بے معنی سی ہوتی تھی۔ لیکن آج اس کے ساتھ باتیں کر کے انہیں لگ رہا تھا کہ اگر اس پر اسپیچ تھیراپی کا تجربہ کیا جائے تو وہ سو فیصد کامیاب ہو سکتی ہیں۔
"ہاں..." ان کی بات کے جواب میں اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
"بھئی کس بات کی ناراضی؟"
"آپ لوگ مجھے جانے جو نہیں دیتے۔" موقع غنیمت جان کر اس نے دلی خواہش بیان کر دی۔
"کہاں جانا چاہتی ہو؟" ڈاکٹر زینت قدرے چونکی ہو گئیں۔
"اپنے گھر... اپنی ماں کے پاس... وہ مجھے یاد کر کے روتی ہوگی۔" اس کے لہجے میں بے چینی در آئی۔
"کیا بہت پیار کرتی ہیں تمہاری اماں تم سے؟"

"ہاں... میری اماں مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں اور میرے بابا بھی۔ میری اماں جو ہیں نا... وہ بالکل اس چاچی کی طرح مجھ سے پیار کرتی ہیں جیسے یہ چاچی میرے سر میں تیل ڈال کر میری چٹیا بناتی ہے نا... ویسے میری اماں بھی میرے بالوں میں تیل ڈال کر میری چٹیا بناتی ہیں اور وہ... وہ مجھے کھانا بھی اپنے ہاتھ سے کھلاتی ہیں... پر یہاں تو مجھے کوئی کھانا نہیں کھلاتا اور وہ... چاچی مجھے ڈانٹتی بھی ہے۔" وہ منہ بسورنے لگی۔

"ارے وہ چاچی آپ کو ڈانٹتی ہے' میں اس کو ڈانٹوں گی پھر وہ آپ کو کچھ نہیں کہے گی' ٹھیک ہے۔ لیکن آپ مجھے یہ تو بتائیں کہ آپ کے اماں ابا کہاں رہتے ہیں؟" ڈاکٹر زینت اس کی وقتی معتدل ذہنی کیفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے ماضی کو کریدنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ شاید ایسی ہی بے معنی باتوں کے درمیان کوئی کام کی بات ان کے ہاتھ لگ جائے۔

"ہاں... مجھے پتا ہے پر میں بتاؤں گی تو نہیں۔" وہ سر دائیں بائیں گھما کر بولی گویا ان کی متوقع جھنجلاہٹ سے لطف اٹھا رہی ہو۔

"دیکھو اگر تم مجھے نہیں بتاؤ گی تو پھر تمہیں ہم کس طرح چھوڑ کر آئیں گے۔"

"میں اپنی اماں کے پاس اکیلی جاؤں گی نہیں تو وہ ناراض ہو جائیں گی۔ بس اب آپ مجھے جانے دیں۔" وہ یک دم جیسے اپنے اردگرد کے ماحول سے اکتا گئی۔

"دیکھو تم کچھ دن یہاں رہو۔ پھر ہم خود تمہیں تمہارے اماں اور ابا کے پاس چھوڑ آئیں گے ٹھیک۔"

"نہیں میں نے ابھی جانا ہے۔" وہ ضدی لہجے میں بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ تمہیں چھوڑ آئیں گے۔ لیکن تم آئی کیوں تھیں اماں کو چھوڑ کر؟" ڈاکٹر زینت اب دوسری سمت سے اس کے گرد گھیرا تنگ کرنے لگیں۔ وہ جانتی تھیں کہ اس قسم کے ذہنی مریض شاذونادر ہی بات چیت پر آمادہ ہوتے ہیں اور اگر اب انہوں نے اسے بولتے رہنے پر مجبور نہیں کیا تو پھر کئی ماہ تک انہیں اس کی اسی موجودہ کیفیت کا انتظار کرنا پڑے گا۔ ان کے سوال کے جواب میں اس نے ڈاکٹر زینت کو یوں دیکھا جیسے ان کی کم عقلی پر ماتم کر رہی ہو۔

"وہ تو میں مار سے بچنے کے لیے آ گئی تھی۔ اگر میں نہ آتی نا تو... تو وہ مجھے مار ڈالتے۔" اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی سنسنی تھی۔

"کون...؟"

"وہ بہت سے لوگ تھے۔ انہوں نے مجھے پکڑ لیا تھا پھر وہ مجھے لے گئے۔"

"کہاں لے گئے؟" ڈاکٹر زینت کے لیے یہ لمحات خاصے سنسنی خیز تھے۔ بہت جلد وہ فردوس کے ماضی میں جھانکنے کے قابل ہو سکتی تھیں۔

"وہ... وہ مجھے جو ہے نا زمین کے نیچے لے گئے تھے۔"

"پھر...؟" ڈاکٹر کی بے تابی عروج پر تھی۔

"پھر..." وہ سر کھجاتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔

"پھر... پھر تا میری اماں کہتی ہے۔"

"یہ اماں بیچ میں کہاں سے آ گئی ہے۔" ڈاکٹر حیران پریشان سی رہ گئیں۔

"کیا کہتی ہیں تمہاری اماں..." حوصلہ ہارنا انہوں نے بھی نہیں سیکھا تھا۔

"اماں کہتی ہے کہ اگر سچے دل سے اللہ میاں جی کو یاد کرو۔ تو وہ پھر اپنے پیاروں کی مشکل میں مدد کے لیے اپنے فرشتوں کو بھیج دیتا ہے۔ پھر... پھر تا ایک فرشتہ آیا اس نے ان سب کو بہت مارا اور مجھے وہاں سے بھگا دیا۔ پھر... پھر میں یہاں آ گئی۔ اگر میں یہاں نہ آتی تو وہ سب مجھے بہت مارتے..."

"اور دین محمد تمہارا کیا لگتا ہے؟" ڈاکٹر زینت نے سوال کیا تو وہ استعجابیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"وہ کون ہے؟"

"جو تمہیں یہاں لے کر آیا تھا۔"

"کون لے کر آیا تھا؟" سوال سے زیادہ اس کے لہجے میں تعجب تھا۔

"وہی بابا سا جس کے سر پر پگڑی تھی لمبی سی قمیص اور تہبند میں ملبوس تھا اور ہاتھ میں لاٹھی تھی۔" ڈاکٹر نے اس کا حلیہ بیان کر دیا۔

"اچھا وہ... وہ دین محمد تو نہیں ہے۔" وہ جیسے کھکھلا کر بولی تو ڈاکٹر زینت پریشان ہو اٹھیں کہ اس شخص نے تو اپنا نام دین محمد ہی بتایا تھا۔

"تو پھر کون ہے وہ؟"

"وہ... وہ تو دینو چاچا ہے۔" موضوع غالباً" اس کا پسندیدہ تھا کہ وہ ایک بار پھر ان کی باتوں میں دلچسپی لینے لگ گئی تھی۔

"کیا وہ تمہارا چاچا لگتا ہے؟"

"ہاں تو اور کیا۔ بابا کہتے ہیں جو بڑے ہوتے ہیں نا وہ سب کے چاچا لگتے ہیں۔ دینو چاچا بھی سب کے چاچا ہیں۔" وہ اب مزے سے بیڈ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی تھی۔

"وہ کیا کرتے ہیں؟"

"کرنا کیا ہے ساری رات لاٹھی لے کر گلیوں میں شور مچاتے ہیں نہ خود سوتے ہیں نہ لوگوں کو سونے دیتے ہیں شور مچا مچا کر ڈراتے ہیں۔"

"اچھا تمہارا گھر کہاں ہیں؟ میرا مطلب ہے تمہاری اماں کس شہر یا گاؤں میں رہتی ہیں؟" ڈاکٹر زینت کا خیال تھا کہ اسے جب اتنا کچھ یاد تھا اور شاید اس شہر کا نام یا اس سے متعلق کوئی نہ کوئی چیز اسے ضرور یاد ہو گی۔

"وہ..." وہ ان کی طرف دیکھنے لگی۔ دانتوں میں انگلی دبا کر سر ہلاتی ہوئی وہ کسی طور ایک بے شعور لڑکی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

"کیا ہوا... کیا سوچنے لگیں۔" ڈاکٹر کو اس کا یہ انداز خاصا دلچسپ لگا۔

"آپ... آپ بی جمالو ہو۔"

"ہیں..." ڈاکٹر زینت اس خطاب پر چڑ سی گئیں۔ غالباً" انہیں امید نہیں تھی کہ وہ کچھ اس قسم کی بات کہہ گزرے گی۔ "کیا مطلب...؟"

"پتا ہے ہمارے گھر بھی آتی ہے بی جمالو۔ اس کی باتیں ختم ہی نہیں ہوتیں۔ وہ آپ کی طرح بس بولتی رہتی ہے سوال پوچھتی رہتی ہے تھکتی ہی نہیں۔ اماں اسے بی جمالو کہتی ہیں۔ آپ بھی تو نہیں تھکتی ہیں۔ مجھ سے باتیں پوچھے جا رہی ہیں آپ... آپ بھی بی جمالو ہیں۔"

"ارے بھئی میں تو اس لیے تم سے پوچھ رہی ہوں کہ تم کچھ بتاؤ تاکہ تمہیں چھوڑ آؤں۔" انہوں نے ایک بار پھر اسے راستے پر لانا چاہا' لیکن وہ پٹڑی سے اتر چکی تھی۔

"میں نہیں بتاؤں گی بس آپ مجھے جانے دیں' میں خود ہی چلی جاؤں گی۔" وہ نروٹھے پن سے کہتی ہوئی کیبن سے نکل گئی اور ڈاکٹر زینت اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہیں۔

☼ ☼ ☼

وہ پچھلے تین گھنٹوں سے شدید بخار کے زیر اثر نیم غشی کی سی کیفیت میں تھی۔ ایک سو چار بخار نے اس کے ملیح چہرے پر عجیب سی حدت آمیز سرخی پھیلا دی تھی۔ گھنی سیاہ لانبی پلکیں گلابی رخساروں پر سایہ فگن تھیں اور سیاہ بال تکیے پر ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ مسلسل اس کا ٹمپریچر چیک کر رہی تھیں جو کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ انجکشن اور میڈیسن بھی دی جا رہی تھیں۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھ گئیں۔ دھیرے سے اس کی صبیح پیشانی پر آئے بال ہٹا کر انہوں نے اس کا ماتھا چوما۔ ان کی نظریں اس کے چہرے کے نقوش سے الجھ رہی تھیں اور ذہن جانے کہاں کا کہاں سفر میں تھا۔ کہ دروازہ کھول کر وقار الحسن اندر آ گئے۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں ملبوس تھے اور ہاتھ میں جون کیٹس کی شاعری کی بک تھام رکھی تھی۔

"ماما! میرا خیال ہے آپ اب جا کر آرام کر لیں۔ کافی دیر سے آپ اسی طرح بیٹھی ہوئی ہیں۔ میں ہوں

یہاں۔۔۔" انہوں نے ماں کی نیند سے بوجھل آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے بیٹا کیسے چلی جاؤں' ابھی تک اس کی طبیعت نہیں سنبھلی۔ میں یہاں ہوں گی تو میڈیسن وغیرہ کا دھیان رکھوں گی۔ شاید اسے پانی یا کسی اور چیز کی ضرورت پڑ جائے۔" مما اس کی طرف سے فکرمند تھیں اور یہ ہمیشہ سے تھا۔ وہ ہمیشہ یونہی اس کی فکر کرتی تھیں گویا وہ کانچ کی بنی ہوئی تھی اور ذرا سی ٹھیس سے اس کے ٹوٹ جانے کا ڈر ہو۔

"کوئی بات نہیں ماما میں دیکھ لوں گا۔ آپ جائیں ریسٹ کریں۔" وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے بیڈ کے قریب رکھ کر بیٹھ گئے تو ماما بھی چاروناچار جانے کو تیار ہو گئیں۔

"اوکے بیٹا گڈ نائٹ۔ ضرورت ہو تو مجھے جگا لینا۔"

وہ ان کے بال سہلاتی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی کتاب سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی اور جگرپاش نظروں سے اس کے صبیح چہرے کو دیکھنے لگے۔ یہ چہرہ جو رنگ ہے نور ہے نکہت گل ہے یا فصل بہار کی آمد کا ثبوت۔ وہ بے سدھ پڑی تھی اور کوئی والہانہ نگاہوں کے ساتھ دل کے سب پاکیزہ جذبے اس پر نچھاور کیے جا رہا تھا۔

انہوں نے دھیرے سے اس کا موی ہاتھ تھام کر نبض کی رفتار معلوم کی۔ رفتار ست تھی لیکن خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ پھر انہوں نے اس کی پیشانی پر سے سیاہ بالوں کو بہت نرمی سے پرے ہٹاتے ہوئے اس کی پیشانی کا درجہ حرارت معلوم کیا۔

اس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
روح تک آگئی تاثیر مسیحائی کی

وہ مسکرا دیے۔ ابھی ان ہاتھوں میں وہ تاثیر نہیں ہے۔ مہ۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے ان کی آنکھوں کے تاثرات بدل رہے تھے۔ ایک پل کو کہکشاں کی طرح جگمگاتی آنکھیں جانے کیا سوچ کر الجھن میں پڑ گئیں اور پھر جیسے ان جگمگاتی آنکھوں میں قبرستان کے اندھیرے در آئے پتا نہیں وہ کس کشمکش میں تھے۔

"ماما۔" اس کی نقاہت بھری آواز پر انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی تھی۔

"مہ۔ ماما سو گئی ہیں۔ کچھ چاہیے کیا۔"

"بھائی۔۔۔ پانی۔۔۔ مجھے۔۔۔ پانی چاہیے۔" نیم غنودگی کے باعث اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ وقارالحسن تیزی سے اٹھے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر دھرے جگ میں سے گلاس میں پانی انڈیلا۔ ایک ٹیبلٹ لی اور دھیرے سے اس کی گردن کے نیچے ہاتھ رکھ کر اسے سہارا دے کر بٹھایا۔

"لو یہ ٹیبلٹ کھاؤ۔" گولی اس کے منہ میں رکھ کر گلاس اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ اس نے چند گھونٹ پی کر بمشکل گولی نگلی اور جیسے تھک کر ان کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔ اس قدر قربت کہ اس کی خوشبو ان کے مشام جاں کو معطر کیے دے رہی تھی۔ لیکن اس کا کیا کیا جاتا کہ وہ بے نیاز تھی ان کے جذبوں سے اور اس وقت ان کے وجود سے بھی انہوں نے دھیرے سے اس کا سر تکیے پر دھرا اور خود اٹھ کر کرسی پر جا بیٹھے۔

"مہ۔۔۔ سو جاؤ شاباش۔"

"ہاں سو جاؤں گی۔۔۔ اٹھ کر جاؤں گی بھی کہاں۔۔۔ وہ کون ہے۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔" وہ کچھ بے ربطی سے بڑبڑا کر پھر سو گئی تھی۔ لیکن وقارالحسن کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ ان کی آنکھوں میں پل کے پل جو اس کی قربت نے روشنیاں سے بھر دی تھیں۔ وہاں ایک بار پھر قبرستان کی تاریکی آن ٹھہری۔ ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ تین بجے کے قریب کہیں جا کر اس کے بخار کا زور ٹوٹا تو انہوں نے کچھ سکون کا سانس لیا اور کرسی چھوڑ کر ساتھ والے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئے۔ کچھ سارے دن کی کلینک کی بھاگ دوڑ' کچھ اپنی ذہنی کشمکش نے انہیں مل کر اچھا خاصا تھکا ڈالا تھا کہ رات کے اس آخری پہر تھک ہار کر بالآخر ان کی آنکھ لگ گئی۔

وہ صبح ماما کے دروازہ کھولنے پر جاگ اٹھی تھی۔

دونوں کی نظریں ملتے ہی ماما کے چہرے پر شفقت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیسی ہے میری چندا؟" انہوں نے نرمی سے اس کی پیشانی چھوئی۔ ساتھ ہی ان کی نظر اس کے ساتھ ہی بچھے بیڈ پر نیم دراز وقار پر پڑی تو اس نے بھی ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

"یہ بھائی کس وقت یہاں۔۔۔"

"رات دس بجے سے یہیں موجود ہے۔ ساری رات بیٹھا رہا۔ مجھے زبردستی بھیج دیا کہ ماما میں خود دیکھ لوں گا۔ آپ جائیں مجھے بھی اطمینان تھا سو چلی گئی۔ تم بتاؤ طبیعت کیسی ہے اب تمہاری؟"

"میں۔۔۔ ٹھیک ہوں۔" اس نے دھیرے سے مسکرا کر گویا انہیں تسلی دینی چاہی۔ ان کی باتوں کی وجہ سے وقار بھی اٹھ بیٹھے۔

"السلام علیکم اینڈ گڈ مارننگ ایوری باڈی۔" وہ بشاش لہجے میں گویا ہوئے۔

"ویسے وکی! یہ فاؤل ہے تم مجھے بے فکر کر کے خود اتنی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔" ماما مصنوعی خفگی سے بولیں۔

"اوہ مائی گاڈ ماما! میں تین بجے کے بعد سویا ہوں اور وہ بھی اس لیے کہ ان محترمہ کا بخار اتر چکا تھا اور انہیں میڈیسن کی ضرورت نہیں تھی۔ خیر میں ٹمپریچر چیک کیے لیتا ہوں تاکہ آپ کو بھی اطمینان ہو جائے۔" ٹمپریچر چیک کیا گیا جو نارمل تھا۔

"لیں۔۔۔ دیکھ لیں بالکل تندرست ہیں آپ کی لاڈلی صاحبہ!" وہ خوش کن انداز میں گویا ہوئے۔

"بھائی مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے رات آپ نے بہت تکلیف اٹھائی۔ مجھے پتا نہیں کیا ہوا تھا۔" وہ کچھ مبہم لہجے میں بولی۔

"اس وقت کا تو پتا نہیں' لیکن اب یقیناً" تم قتل ہو جاؤ گی میرے ہاتھوں۔ یہ جو تم رسمی قسم کے جملے مجھ پر ڈونگروں کی صورت برسا رہی ہو کیا میں تمہارا فیملی ڈاکٹر ہوں جسے کال کر کے تم نے بلایا تھا۔ ارے بھئی ایک ہی خاندان کے افراد ہیں ہم اور ایک گھر میں رہتے ہیں یہ تو فرض تھا میرا۔ تم پر کوئی احسان تو نہیں۔" وقارالحسن کے لہجے میں محسوس کی جانے والی نرمی تھی۔

"پھر بھی۔۔۔"

"دیکھو اب تم پٹ مت جانا مجھ سے۔ ماما آپ دونوں فریش ہو جاؤ۔ آج ناشتا میں خود بنا کر لاتا ہوں۔" وقارالحسن اٹھ کر چلے گئے۔

"حیرت ہے یہ لڑکا کبھی کبھی تو حیران کر دیتا ہے۔ بہرحال تم اٹھو منہ ہاتھ دھو لو۔ فریش ہو جاؤ نہیں تو ناراض ہو جائے گا۔" ماما کے کہنے پر وہ اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ اور انہوں نے اس کے بیڈ کی چادر کمبل تکیے وغیرہ درست کر کے رکھے اور کھڑکیوں کے پردے ہٹا دیے۔ ٹھنڈی دھوپ کھڑکیوں کے شیشوں سے چھن کر اندر آنے لگی۔ جب واش روم سے باہر آئی تو ماما کسی حد تک اس کے کمرے کی حالت درست کر چکی تھیں۔ وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

"وہ اصل میں ماما کل کالج سے آنے کے بعد میری طبیعت کچھ بہتر نہیں تھی اسی لیے میں نے کمرہ بھی ٹھیک نہیں کیا۔" وہ جیسے کمرے کی ابتر حالت کا جواز دے رہی تھی۔

"تو کیا ہوا تمہیں کمرے کی فکر ہو رہی ہے اور رات جو تمہاری حالت تھی اس نے تو میرے ہاتھ پیر ہی پھلا دیے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب تم ٹھیک ہو۔" ماما کا لہجہ ہمیشہ کی طرح فکروتردد سے لبریز تھا۔ اور وہ ان کی ممتا سے بھرپور شخصیت سے یوں ہی تو متاثر نہیں تھی۔ ان کی محبت نے ہی تو ہمیشہ اسے سنبھالا تھا۔

"اوہ ماما! یو آر رئیلی سو گریٹ۔" وہ ان کے گلے میں بازو ڈالے بے ساختگی سے اظہار کر گئی تو انہوں نے بھی مسکرا کر اس کی پیشانی چومی۔ اسی وقت ناشتے کی ٹرے ہاتھوں میں لیے وقارالحسن اندر داخل ہوئے۔ ماں بیٹی کی محبت کا یہ عملی مظاہرہ ان کی نگاہوں نے بھی دیکھ لیا تھا۔

"ہوں تو یہاں محبت محبت کھیلا جا رہا ہے۔ ماما آپ اس کی باتوں میں نہ آئیے گا یہ موصوفہ بٹرنگ میں کمال رکھتی ہیں۔" انہوں نے بیڈ پر ٹرے رکھتے کے

بعد کرسی گھسیٹ کر نزدیک کرتے ہوئے کہا۔

"ماما یونہی تو یہ دن آدن پھولتے نہیں جا رہے۔ اصل میں انہیں پٹو تنگ بہت راس آتی ہے۔" اس نے بھی شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ماما اور وقار الحسن اسے ہمیشہ خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ دونوں اس کی ذرا سی تکلیف پر بھی یوں ہول جاتے تھے کہ وہ بعض اوقات خود کو کوسنے بیٹھ جاتی کہ اس کی وجہ سے اس کی ماما اور بھائی کو اذیت ہوئی۔ شاید خون کے رشتے بھی ہوتے تو اسے اس قدر پیار نہ ملتا۔ وہ اس کے کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ تھے اور شاید اسے کچھ اور چاہیے بھی نہیں تھا۔ اس نے ماما اور وقار الحسن کے مسکراتے چہروں کی طرف دیکھا جو اس کی صحت یابی کے بعد اطمینان کے رنگوں سے سج گئے تھے۔ اسے ان کے لیے خود کو ہمیشہ فریش ظاہر کرنا ہے۔ مہرالنساء نے خود کو یاد کرایا۔ یہی تو محبتوں کا قرض ہوتا ہے جو ہر اس شخص پر واجب الادا ہوتا ہے جو محبت کے اسرار و رموز کو تھوڑا سا بھی سمجھتا ہو۔

"ماما! وکی بھائی سے یہ پوچھیں ذرا کہ آج جو انہوں نے کچن کو رونق بخشی ہے تو اس کے پیچھے کیا راز ہے۔۔۔ کم سے کم میں تو ہرگز نہیں ہوں۔" اس نے شوخی سے کہا۔

"او ہو بلی کی خوش فہمیاں تو دیکھو۔ تم نے کیا سمجھا کہ یہ سب کچھ تمہارے جشن صحت کے ضمن میں کیا گیا۔ جی نہیں بلکہ مابدولت نے یہ سوچا کہ آج ہماری پیاری سی ماما ریسٹ کریں۔"

"لیکن شاید آپ بھول گئے کہ ناشتا ماما نہیں خالہ کبریٰ بناتی ہیں۔" اس نے جیسے ایک اور پتا پھینکا۔

"ارے تو کیا خالہ کبریٰ کا حق نہیں بنتا کہ کبھی وہ بے چاری بھی ریسٹ فرمالیں۔" ہارنا تو انہوں نے بھی نہیں سیکھا تھا۔

"اچھا بس ناشتے کی طرف دھیان دو' ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" ماما نے دونوں کی نوک جھوک ختم کراتے ہوئے کہا اور بوائلڈ انڈے چھیلنے لگیں۔ ناشتا اسی طرح ہلکی پھلکی باتوں کے درمیان کرلیا گیا۔ وقار الحسن کو بہت دنوں بعد اس نے اچھے موڈ میں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ سنجیدہ رہتے تھے۔ مسکراتے بھی تو یوں جیسے مخاطب پر احسان کر رہے ہوں اور آج وہ بلاوجہ بھی کھلکھلا رہے تھے۔

"ویسے بھائی! خدا خیر کرے دال میں کچھ نیلا کالا لگ رہا ہے۔" وہ قدرے شوخی سے بولی۔

"یہ دیکھ لو میرے ہاتھ میں انڈا ہے اور وہ بھی ہاف بوائل۔ کسی بے تکے شاعر کی طرح تمہارا سواگت بھی نہ ہو جائے۔" وقار الحسن اسے دھمکاتے ہوئے بولے۔

"دیکھیں جناب چاہے انڈے ماریں یا گندے ٹماٹر ہم تو پوچھ کر ہی ٹلیں گے۔ کون ہے وہ جس نے آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھیر دیں۔" وہ جھٹ سے ان کے قدموں میں بیٹھ گئی اور ایک ہاتھ ان کے گھٹنے پر دھرے ایک ہاتھ سے مضبوطی سے ان کا ہاتھ تھامے وہ استفسار کر رہی تھی۔ انہوں نے ایک نظر اس کے صبیح چہرے پر پھیلی معصومیت کی روشنی پر ڈالی پھر نظر چرا کر ماما کی طرف دیکھنے لگے۔

"ماما دیکھ لیں اس کے کام۔ اب کیا میں ہنس بھی نہیں سکتا۔" وہ نروٹھے لہجے میں بولے۔

"ارے کیوں نہیں میرے چاند۔ خدا تم دونوں کو یونہی ہمیشہ ہنستا رکھے میرے ویران آنگن کی بہار تو تم دونوں سے قائم ہے۔ لیکن مہو بھی ٹھیک کہتی ہے بھلا بھابھی کا چاؤ کیا اسے نہیں ہوگا۔" ماما مسکراتے لہجے میں گویا اس کی تائید کر رہی تھیں اور وقار الحسن سے گویا وہاں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ انہوں نے ادھ کھایا انڈہ دوبارہ پلیٹ میں دھرا۔

"میرا خیال ہے مجھے کلینک سے دیر ہو رہی ہے' میں تیاری کرلوں۔" انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی مہو کا ایک ہاتھ ابھی تک ان کے ہاتھ پر تھا۔ انہوں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا موی ہاتھ تھام کر بمشکل خود کو اس سے الگ کیا کہ دل کی دھڑکنیں تو اس کے اتنے سے قرب سے ہی بہکنے لگی تھیں۔۔۔ وہ تو یہ بھی نہ

جان پائے کہ کب اور کس وقت مہو کے لیے ان کے جذبات دوسرے رنگ میں ڈھلنے لگے تھے۔ جب پہلی بار انہیں اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے خود کو بے حد سرزنش کی اور برا بھلا کہا تھا۔ بہت سی اخلاقیات گھول کر دماغ میں ڈالنی چاہی تھی لیکن دل تو جیسے بگٹٹ گھوڑے کی طرح بھاگتا مہو مہو کی گردان کرتا اس کی طرف اس کے راستے پر گامزن ہو گیا تھا۔

تمہارے معاملے میں خود میرا دل
میرے مدمقابل ڈٹ گیا ہے

اور پھر تھک ہار کر وہ دل کی مان کر چپ ہو رہے تھے۔ لیکن قیامت تو ان کے گھر کی در و دیوار کے اندر مقید تھی۔ بھلا وہ اس سے صرف نظر کیسے کرسکتے تھے۔

"وکی بھائی! میں بھی یونیورسٹی جاؤں گی آپ کے تیار ہونے تک میں بھی تیار ہو جاؤں گی۔ پھر آپ مجھے ڈراپ۔۔۔" اس کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ ماما بول پڑیں۔

"ارے کمال ہے ایک دن تو ریسٹ کرو۔ اللہ اللہ کرکے تو طبیعت کچھ سنبھلی ہے۔"

"ہاں۔۔ اچھی ماما۔۔ میری کلاس مس ہو جاتی ہے سر غفار نے تو زندہ چبا جانا ہے۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے جانے کی۔ کس میں ہے جرأت کہ ہماری بلی کو کچھ کہے۔" وقار الحسن نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے بڑے مان اور پیار سے کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔

"اچھا ماما! یہ صاحبہ اب گھر پر ہی ہوں گی۔ دن بھر خوب ریسٹ کروائیں اسے اور ماں بیٹی مل کر خوب گپیں لگائیں۔ میں ذرا جا کر کلینک کا حال احوال پوچھ لوں۔" وقار الحسن اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ارے بیٹا! تم بھی تو ساری رات کے جاگے ہوئے ہو' دیر سے چلے جانا۔ کلینک کا کیا ہے۔ قاسم کے پاس چابی ہوتی تو ہے وہ کلینک کی صفائی وغیرہ کر دے گا۔ تم بھی ایک دو گھنٹے سو لو۔"

"ارے نہیں ماما! آئی ایم پرفیکٹلی آل رائٹ۔ ایک ڈاکٹر کے لیے اپنے آرام سے زیادہ دوسروں کی صحت کی اہمیت ہونی چاہیے۔"

"واہ بھئی اگر سارے ڈاکٹرز آپ جیسی سوچ رکھنے لگیں تو پاکستان میں ایک مریض بھی نظر نہ آئے۔" وہ جیسے چہک کر بولی تو انہوں نے چٹکی میں ایک پل کو اس ستواں ناک دبائی اور پھر اس کے سی کرنے پر چھوڑ کر مسکراتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئے۔

"دیکھا ماما آپ نے! خود کو ڈیوٹی کا کتنا شوق ہے کہ آرام کا خیال نہیں اور میرے یونیورسٹی جانے پر پابندی لگادی۔" ماما کے کندھے سے لگ کر ٹھنک کر بولی۔

"تو ٹھیک کیا نا اس نے۔ میری بات تو تم مانتی نہیں' اس کی بات نہ مان کر دیکھو۔" ماما مسکراتے ہوئے بولیں۔

"میری تو توبہ ہے۔ جو ان کی بات سے روگردانی کروں ان کا غصہ اللہ معافی۔" وہ کانوں کو باقاعدہ ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

"نہیں مہو اب ایسی بات بھی نہیں تم سے تو پیار ہی بہت کرتا ہے۔"

"ہاں ماما! اور میری ساری دوستیں جلتی ہیں جب میں انہیں بتاتی ہوں کہ وکی بھائی میرا کس قدر خیال رکھتے ہیں۔ مجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں۔" وہ چہرے پر آئی بالوں کی سیاہ لٹ کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے بولی۔ باہر سے گزرتے وقار الحسن ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کوریڈور میں سے گزرتے چلے گئے۔ گاڑی کا دروازہ کھولتے اس میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کرنے تک ان کی سوچ وہیں تھی "یہی تو بات ہے مہو کہ تم سمجھ ہی نہیں سکتیں کہ میں کتنا چاہتا ہوں تمہیں۔ تمہاری خوشبو مشام جاں کو صبح سے شام تک معطر رکھتی ہے اور اگر میں تمہیں بہت دیر تک دیکھ نہ پاؤں تو دھڑکنیں بغاوت پر اتر آتی ہیں۔ لیکن میں یہ سب تمہیں کیسے بتاؤں کہ تمہاری پاکیزہ نظریں تو مجھے کسی اور رشتے کا مان مرتبہ دیتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے یہ محبت مجھے اپنے دل کے قبرستان میں ہی دفن کرنی پڑے گی۔ شاید تم میری محبت کی یہ بدلتی صورت

برداشت نہ کرپاؤ۔" وہ مسلسل سوچتے ہوئے گاڑی کو پورچ سے نکال لے گئے۔ اس سفر کی تو منزل شاید پانچ دس منٹ میں آجاتی' لیکن وہ مسافت جو ان کے دل نے چن لی تھی اس کی تو کہیں کوئی منزل ہی نہیں تھی۔ ان کی آنکھوں میں صدیوں کی تھکن اتر آئی۔

☼ ☼ ☼

پچھلے دو دن کی غیر حاضری کے بعد آج وہ یونیورسٹی آئی تھی۔ پوائنٹ انہیں کبیر چاچا والے کیبن کے پاس اتار کر اپنی راہ ہولیا۔ وقار الحسن کی مصروفیت کی وجہ سے وہ زیادہ تر بس سے ہی آجاتی تھی۔ جب سلمیٰ کی نظر یونیورسٹی گیٹ کی مخالف سمت فٹ پاتھ پر جا ٹکی۔

"علینہ! وہ دیکھنا ذرا بابا خادم علی کے پاس اپنے درانی ہی بیٹھے ہوئے ہیں یا کوئی اور ہے۔" سلمیٰ نے علینہ کو متوجہ کیا تو مہرالنساء نے بھی ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور یہ دیکھ کر وہ حیران ہی رہ گئیں کہ واقعی سر ہاشم درانی بابا خادم علی کے پاس بڑی عقیدت مندانہ پوزیشن میں سر نیہوڑائے بیٹھے کچھ گفت و شنید میں مصروف تھے۔ ان تینوں سے آگے جانے والا لڑکیوں کا گروپ بھی قدرے حیرت سے اسی طرف دیکھ رہا تھا۔

"یار آج اپنے سر کی خیر نہیں' بابا خادم علی تو ہر وقت اینٹ پتھر سے لیس رہتے ہیں۔ کوئی بات بری لگ گئی تو سر درانی کا متھا پھوٹا ہی پھوٹا۔" سلمیٰ بھونڈے انداز میں اپنی پریشانی کا اظہار کررہی تھی' جبکہ مہرالنساء کی نگاہیں سر ہاشم درانی اور بابا خادم علی دونوں کے چہروں کا جائزہ لے چکی تھیں۔ وہاں بے طرح سکوت اور اطمینان تھا۔ یوں جیسے دو بچھڑے ہوئے دوست عرصے بعد ملیں تو ایک سکون اور خوشی چہرے پر الوہی سی چمک پیدا کردیتی ہے۔ بالکل ویسی ہی چمک اسے ان دونوں کے چہروں پر دکھائی دے رہی تھی۔

"مجھے تو سر ہاشم بھی کبھی کبھار بابا خادم ہی کی کیٹگری کے لگتے ہیں۔ کسی کسی وقت یہ بھی یوں ہی کھسکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے دونوں ہی ایک دوسرے کا سر پھوڑنے کی نیت کر بیٹھے ہیں۔" علینہ نے کہا تو آگے جانے والے گروپ میں سے ایک لڑکی نے پلٹ کر عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ایکسکیوزمی! آپ سر ہاشم کو کھسکا ہوا کہہ کر ان کی انسلٹ کررہی ہیں۔ وہ یقیناً" آپ کے والد محترم جتنے ہوں گے۔ کسی کے متعلق ریمارکس دینے سے پہلے انسان کو کچھ تو سوچ لینا چاہیے۔" آگے جانے والا گروپ یقیناً" اسلامیات ڈیپارٹمنٹ سے تعلق رکھتا تھا۔ تبھی اپنے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کی انسلٹ ان سے برداشت نہیں ہوئی۔

"بھئی جو سچ ہو وہ کسی کے بھی سامنے بے دھڑک کہہ دینا چاہیے۔ میرے ابا اگر کھسکے ہوئے ہوتے تو یقیناً" میں انہیں بھی کہہ دیتی۔" علینہ جیسے بحث پر ہی اتر آئی تھی۔

"او جسٹ شٹ اپ۔" وہ لڑکی قدرے بے زاری سے گویا ہوئی۔ "آپ کتنا جانتی ہیں ان کے بارے میں جو ان پر آپ نے کھسکے ہوئے کا لیبل لگا دیا ہے۔"

"او ہو یار' اب بس بھی کرو' کیا ایک پیٹیچر سے لفظ کی گردان شروع کردی ہے۔ فاریہ تم بھی بس شروع ہی ہوجاتی ہو۔ بھلا تمہیں کیا ضرورت ہے اس قدر پکی ہونے کی۔ اگر کوئی کسی پر رائے دے رہا ہو تو اس میں کون سی قیامت آگئی۔" اس لڑکی کی ساتھی نے اچھا خاصا جھاڑنے والا انداز اپنالیا۔ علینہ' سلمیٰ اور مہرالنساء بھی تقریباً" ان کے ہم قدم ہی تھیں۔

"بھئی قیامت اس لیے ہے کہ وہ کوئی آؤٹ سائیڈر نہیں ہیں ہمارے ٹیچر ہیں۔"

"اچھا تم کب سے ٹیچرز کی اس قدر حمایت کرنے لگیں۔" دوسری لڑکی ناک بھوں چڑھا کر بولی۔

"بھئی بحیثیت ٹیچر وہ ہمارے لیے انتہائی قابل احترام ہیں۔" فاریہ ہنوز اڑی ہوئی تھی۔

"یعنی وہ جو پاگل کے پاس بیٹھے گفت و شنید فرما رہے ہیں تم انہیں بہت عزت کے قابل سمجھتی ہو۔" اسی گروپ کی ایک اور لڑکی طنزیہ لہجے میں بولی۔

"ہاں میں انہیں روحانی باپ کا درجہ دیتی ہوں۔" فاریہ کا لہجہ اطمینان بھرا تھا۔

"تم کچھ زیادہ ہی متاثر نہیں سر ہاشم سے۔" ایک لڑکی نے جیسے اعتراض کیا۔

"ہاں تو اس میں کیا حرج ہے۔ ہوں میں ان سے متاثر اس لیے کہ میں جانتی ہوں کہ وہ کتنے صاحب علم اور اندر سے کتنے شفاف آدمی ہیں۔ اینڈ مائنڈ اٹ کہ وہ اگر بابا خادم علی کے پاس بیٹھے ہیں تو بلاوجہ نہیں ہوں گے' کوئی نہ کوئی مقصد ہوگا جو انہیں وہاں تک لے گیا۔" فاریہ کی بات کے اختتام تک یونیورسٹی گیٹ آچکا تھا وہ سب آگے پیچھے اندر داخل ہوگئیں۔ علینہ بے چاری تو بحث شروع کرکے ہی پچھتا رہی تھی جبکہ مہرالنساء کچھ لمحے قبل ہونے والی اس نوک جھوک سے عاجز ہو کر چند قدم پیچھے چل رہی تھی۔

بے مقصد بحث و مباحثہ میں وقت ضائع کرنا اس کی عادت نہیں تھی اور اسے سلمیٰ اور علینہ کی اس عادت سے کبھی کبھار بہت چڑ ہوتی تھی۔ ڈیپارٹمنٹ پہنچتے ہی ایک مایوس کن خبر نے جیسے ان تینوں کو وقتی طور پر بے ہوش ہی کردیا۔ جس خوف سے کشاں کشاں یونیورسٹی چلی آئی تھیں وہ تو ہفتے کی چھٹی پر گئے ہوئے تھے۔ یعنی بائیولوجی کے سر غفار جو اکثر خواب میں آکر بھی اپنی دہشت ان کے دلوں میں بٹھاتے رہتے تھے۔

"لو بتاؤ! اتنی خواری کا کیا فائدہ ہوا۔" سلمیٰ نے بیٹھنے کے ساتھ بے زاری سے کتابیں پٹخیں۔

"یار انجوائے کرو سال میں ایک آدھ بار تو یہ عیاشی ہاتھ لگتی ہے۔ سر غفار جیسے ہنکچو ٹکل بندے سے تو بندہ یوں بھی پابند ہوجاتا ہے۔ چلو آج مہو کی پاکٹ منی سے کولڈ ڈرنکس پیتے ہیں۔" علینہ نے یوں چہکتے ہوئے کہا۔ جیسے سر غفار ہفتے کی چھٹی پر نہیں استعفیٰ دے کر چلے گئے ہوں۔

"ہفتے بعد تمہارا منہ دیکھنے والا ہوگا اس دوران نوٹس کمپلیٹ کرلو۔ اگر کچھ بچی کھچی عزت رہنے دینا چاہتی ہو تو۔" مہرالنساء نے اسے یاد دلایا کہ اس کا سارا کام ادھورا پڑا ہے۔

"کولڈ ڈرنکس نہیں پلوانی تو نہ پلواؤ' کم سے کم دہلاؤ تو نہیں۔" علینہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

"اب کوئی مجھے یہ تو بتائے کہ آخر ہمارا آج کا سارا دن کس کھاتے میں گیا۔ ہائے کاش رملہ کے کہنے پر میں رک جاتی کچھ شاپنگ ہی کرلیتی۔" سلمیٰ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولی۔

"سر ہاشم درانی کی طرح بابا خادم علی کے پاس نہ چلیں۔ کبھی کبھی کھسک جانے میں کوئی خاص حرج تو نہیں ہوتا۔" علینہ نے کہا تو مہرالنساء نے اس پر مکا تان لیا۔

"اب اگر تم نے ایک لفظ بھی سر درانی یا بابا خادم کے بارے میں کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا حد ہوگئی آدھے گھنٹے سے یہ بابا خادم نامہ سنتے ہوئے۔"

"ہاں ویسے کیا ہمارے پاس اور کوئی ٹاپک نہیں۔" سلمیٰ بھی جیسے بور ہوگئی تھی۔

"ہے کیوں نہیں۔ انگلش ڈیپارٹمنٹ کی لیلیٰ سردار آج کل جرنلزم ڈیپارٹمنٹ کے تیمور حسن پر بری طرح فدا ہے اور عنقریب لگتا ہے کہ تیمور حسن مس لیلیٰ کی کٹی ہوئی زلفوں کے دو' تین پیچ و خم میں پھنس کر رہ جائیں گے۔" علینہ نے کمنٹری کے سے انداز میں کہا تو سلمیٰ اور مہرالنساء ہنس پڑیں۔

"یار کوئی نئی بات کرو۔ مس لیلیٰ نے تو اپنے نام کی ضرورت سے زیادہ ہی لاج رکھ لی ہے۔ ہر ہفتے موصوفہ کسی نہ کسی نئے عشق میں گوڈے گوڈے ڈوبی سرد آہیں بھررہی ہوتی ہیں۔" سلمیٰ چڑ کر بولی۔

"ویسے تیمور حسن ایسا لڑکا تو ہرگز نہیں کہ اس ٹمپرامنٹ کی لڑکی کے چنگل میں پھنس جائے۔" علینہ نے کہا۔

"مس علینہ! ایسا نہ ویسا' ہے تو وہ لڑکا ہی پھر لیلیٰ کے پاس حسن اور عشوہ و انداز ہے دونوں چیزیں موجود ہوں تو کوئی کب تک بچ پائے گا۔"

"لیکن ہر لڑکا اس انداز سے تو نہیں سوچتا ہوگا۔" علینہ نے کہا تو مہرالنساء نے اسے گھور کر دیکھا۔

"تمہاری ریسرچ کتنی ہے لڑکوں کے بارے میں۔ لڑکے سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کی ایک ذرا سی توجہ ملنے پر لٹو ہو جانے والے۔"

"بہرحال ہمیں کسی سے کیا لینا دینا اور مہو تم ٹال رہی ہو کولڈ ڈرنکس تو ہمیں آج تمہاری ہی جیب سے پینی ہیں۔" علینہ نے بحث سمیٹتے ہوئے دوبارہ تقاضا کیا تو وہ تینوں اٹھ کر کینٹین آ گئیں۔

ایک گھنٹہ مزید یونیورسٹی میں بور ہونے کے بعد سلمیٰ نے تو موبائل پر رملہ سے آنے کا کہہ دیا کہ بجائے یونیورسٹی میں بور ہونے کے بہتر ہے شاپنگ کرلی جائے۔ علینہ نے بھی کچھ چیزیں خریدنی تھیں، سو وہ بھی ان کے ساتھ ہی ہولی۔ جبکہ مہر النساء کچھ دیر کو لائبریری چلی گئی۔ کچھ کنسلٹنٹ بکس ایشو کروانے کے بعد اس نے بھی گھر کی راہ لی۔

ماما حسب معمول ڈیوٹی پر جا چکی تھیں اور وقار الحسن اپنے کلینک۔ گھر پر اس وقت صرف مالی بابا، چوکیدار اور خالہ خورشیدن تھے۔

☆ ☆ ☆

"اری فاطمہ! یہ فردوس کو دیکھ کر تجھے کچھ محسوس نہیں ہوتا۔" شہزادی خاصے رازدارانہ انداز میں بولی تو فاطمہ نے جھنجلا کر اس کی طرف دیکھا۔

"دیکھ شہزادی! تجھے ہزار بار بولا ہے بات صحیح طرح کیا کر مجھ سے۔ پہیلیاں بوجھنے کا وقت نہیں ہوتا ہمارے پاس اور پھر پاگلوں کو دیکھ کر کیا محسوس کرنا ہے بھلا۔" فاطمہ جیسے اس کی کم عقلی پر ماتم کرتے ہوئے بولی۔

"اری کھانے کو کیوں دوڑتی ہے، میں تو یہ کہنے والی تھی کہ لگتا ہے جیسے فردوس امید سے ہے۔" شہزادی نے راز کہہ کر گویا ٹھنڈا سانس بھرا بڑی دیر سے اس کے پیٹ میں درد اٹھ رہا تھا۔

"ہوں... اوں۔" فاطمہ دوپٹے میں منہ چھپا کر ہنس پڑی۔

"خدا کو مان شہزادی بھلا اس کی حالت ہے ایسی کہ اس سے کوئی مرد شادی کرے۔ مرد تو بھلی چنگی عورتوں کو پاگل بنا دیویں یہ تو بے چاری پہلے ہی جھلی ہے۔ تجھے یوں ہی لگا ہووے گا۔"

"نہیں فاطمہ تو مان یا نہ مان میں کئی دنوں سے بڑا غور کر رہی ہوں۔ اس کی تو چال ڈھال ہی بدل گئی ہے۔ اری اندھے کو بھی ———— نظر آ جاوے تو پتا نہیں کہاں رہتی ہے۔ تو نے شاید غور نہیں کیا۔ اب وہ زیادہ تر خموش لیٹی رہتی ہے۔ دورے بھی نہیں پڑتے اسے 'سوئی' جو رہتی ہے۔"

"تو کیا زیادہ سونے سے امید لگ جاوے ہے۔ پھر تو آج سے میں بھی چارپائی پر پسر جاؤں گی۔" فاطمہ ہنوز اس کا مذاق اڑا رہی تھی لیکن شہزادی سنجیدہ تھی۔ اس کی نظریں فردوس پر جمی ہوئی تھیں جو اپنے بستر پر چت لیٹی چھت کو گھورے جا رہی تھی۔ لمبے سیاہ الجھے ہوئے بال تکیے پر ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے اور ستواں ناک بڑے شاہانہ انداز میں کھڑی ہوئی تھی۔

"شہزادی! فردوس کیا کر رہی ہے۔" ڈاکٹر زینت نے وارڈ میں آتے ہی اسے مخاطب کیا۔

"ڈاکٹر صاحب! وہ تو زیادہ تر جی بس لیٹی رہتی ہے۔" شہزادی نے جواب دیا۔

"ہاں میں تمہیں اور فاطمہ کو بتانا چاہتی تھی کہ اس کا خاص خیال رکھنا ہے وہ ماں بننے والی ہے۔ کہیں کسی دورے کی کیفیت میں خود کو نقصان نہ پہنچا لے اور اس کی خوراک کا چارٹ بھی آج مجھ سے لے لینا۔ کھانا پینا اسی کے مطابق ہونا چاہیے۔" ڈاکٹر زینت کہہ کر فردوس کی جانب بڑھ گئیں تو شہزادی نے طنزیہ نظروں سے فاطمہ کی طرف دیکھا، جیسے بزبان چشم کہہ رہی ہو۔

"میری تجربہ کار نگاہیں دھوکا نہیں کھا سکتیں بی فاطمہ۔ دیکھ لو سچ نکلا نا جو کچھ میں نے کہا۔" اور فاطمہ اس کی طرف سے نگاہیں پھیر کر دوسری جانب چل پڑی۔

ڈاکٹر زینت نے فردوس کا بازو تھام کر بی پی آپریٹس سیٹ کیا تو اس نے خالی خالی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر زینت پر شفقت انداز میں مسکراتے

ہوئے اس کی ہارٹ بیٹ' بی پی وغیرہ چیک کرتی رہیں اور وہ بھی بہت سکون سے بغیر ان کے کام میں خلل ڈالے لیٹی رہی۔

"شاباش! اب تم بہت جلدی ٹھیک ہو جاؤ گی ان شاء اللہ۔" ڈاکٹر زینت نے اس کی پیشانی پر آئے ہوئے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"میں تو ٹھیک ہوں۔" وہ معصومیت سے بولی۔

"ہاں تم ٹھیک ہو' اچھا دیکھو میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں۔" انہوں نے بیگ میں سے ایک انتہائی پیارے سے گول مٹول بچے کی پوسٹر سائز تصویر نکالی اور اس کی آنکھوں کے سامنے کی۔

"یہ کون ہے؟ کیا یہ تمہیں اچھا لگا۔" ڈاکٹر زینت اسے راستے پر لانے کی کوشش کرنے لگیں۔ اس نے نظر بھر کر اس طرف دیکھا اور رخ پھیر لیا۔

"نہیں...." اس کا انداز حتمی تھا۔

"لیکن یہ تو بہت پیارا ہے۔" ڈاکٹر زینت بوکھلا گئیں۔ اس کا یہ رویہ آنے والے بچے کے لیے بہت سی پرابلمز کری ایٹ کر سکتا تھا۔ کیونکہ ایک بار وہ جو فیصلہ کر لیتی اس کا ذہن اس کے خلاف کچھ بھی برداشت نہ کر پاتا۔

"نہیں یہ پیارا نہیں ہے۔ اس کے منہ پر خون لگا ہے' یہ گندا ہے' بہت گندا ہے۔" اس نے بال نوچتے ہوئے جس اضطراری انداز میں کہا تھا ڈاکٹر زینت نے وقتی طور پر اس موضوع سے ہٹ جانے میں ہی عافیت جانی۔ یقیناً" اس کا ردعمل ان کے لیے غیر متوقع تھا۔ ان کا خیال تھا کہ پاگل ہو یا ہوش مند بچے سب کو ہی پیارے لگتے ہیں۔ لیکن یہاں ان کے اس خیال کی نفی ہوئی تھی۔ فردوس جہاں کو اس معصوم صورت میں خدا جانے کیا دکھائی دیا تھا کہ اس نے اس سے سخت نفرت کا اظہار کرتے ہوئے منہ پھیر لیا۔ ڈاکٹر زینت ایک پل کو مایوس ہو گئیں۔

"میں ڈاکٹر تبارک سے کہہ دوں گی کہ میں کم سے کم یہ چیلنج پورا نہیں کر سکتی۔ وہ میڈیکل ٹریٹمنٹ کے ذریعے اس کا علاج کریں۔" انہوں نے سوچا۔

چھ ماہ کے ریگنینسی پیریڈ میں بہت بار انہوں نے کوشش کر دیکھی تھی لیکن ہر بار انہیں مایوسی ہوئی تھی اور اب فردوس خود بھی کسی الجھن کا شکار دکھائی دیتی تھی۔ اکثر بیٹھے بیٹھے وہ یوں چونک کر اپنے پیٹ کی طرف دیکھتی جیسے کوئی نادیدہ چیز اسے گدگدا رہی ہو۔ کبھی یوں ہی ہنستی تو پھر ہنستی ہی چلی جاتی۔ وہ بھیڑ میں بہت کم بیٹھتی تھی' زیادہ تر اکیلی بیٹھی خود سے کچھ بولتی رہتی۔ فاطمہ اور شہزادی اس کا بے حد خیال رکھتی تھیں۔ کچھ فرض سمجھ کر اور کچھ اس بن ماں' باپ کی بے شعور بچی کی متوقع اذیت کا خیال کر کے جو اپنے وجود میں پلنے والی زندگی سے بھی بے خبر تھی۔

وہ پاگل نہیں تھی لیکن اسے ہوش مند بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس پچیس سال کے جوان وجود کے پاس پانچ سالہ دماغ تھا۔ ایک ایسے بچے کا دماغ جو صرف وہی دیکھنا چاہتا تھا جو اسے اچھا لگتا تھا۔ ایک ضدی اور اپنی منوانے والے بچے کا دماغ۔ ڈاکٹر تبارک کا خیال تھا کہ اس کا لاشعور سویا ہوا تھا اور شعور حقیقت کو تسلیم کرنے کی صلاحیت سے محروم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس کی عمر کے مطابق اس سے کوئی بات یا سوال کیا جاتا تو ایک لمحے کو خاموش ہو جاتی ایک الجھن آمیز خاموشی اور اس کے بعد اس کی ہٹ دھرمی عود کر آتی۔ ڈاکٹر تبارک کا خیال تھا کہ مسلسل کوشش سے اس کے اندر چھپا ہوا غبار نکالا جا سکتا ہے۔ اسے بولنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ ڈاکٹر زینت بانو کو ان کے اس خیال سے اختلاف تھا اور اس کی وجہ پچھلے چھ ماہ کی ان کی مسلسل اسٹرگل تھی جس کا نتیجہ صفر تھا۔ وہ ہنوز وہیں کھڑی تھی جہاں سے ڈاکٹر زینت نے اسے اپنے ہمراہ لیا تھا۔ فاطمہ اور شہزادی کی مصروفیت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ ان میں سے ایک صبح سے شام تک اور دوسری رات سے صبح تک اسے اٹینڈ کرتی تھی۔ اس کے ساتھ اس قدر امتیازی سلوک ہر گز نہ ہوتا' لیکن فی الوقت اپنی نوعیت کا یہ واحد سیریس کیس تھا جو مینٹل اسپتال کے عملے کے لیے چیلنج بنا ہوا تھا۔

انہی بے روح و بے کیف دوڑتے بھاگتے دنوں میں زندگی کی ہلچل اس وقت مچی جب چوکیدار شامل خان نے حسب عادت اپنی خونخوار مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے ڈاکٹر زینت کو کسی دین محمد کے آنے کی اطلاع دی۔ ڈاکٹر زینت اس دن تمام پیشنٹس کی ہسٹری شیٹ اسٹڈی کر رہی تھیں۔ اسپتال کا ماحول بھی قدرے سازگار تھا۔ چوکیدار کی بات سن کر فائل ان کے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچی۔ انہوں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"کون آیا ہے شامل خان؟"

"او خوچہ بی بی کوئی دین محمد آئی اے۔" اب کے وہ کچھ بے زاری سے بولا۔ غالباً" ڈاکٹر صاحبہ کا اس قدر متجسس انداز اسے کچھ بھایا نہیں تھا۔

"شامل خان! فوراً" جاؤ اور اس شخص کو ابھی اور اسی وقت میرے پاس لے کر آؤ۔" ان کے وجود کے ساتھ ساتھ لہجے میں بھی سنسنی در آئی۔ فردوس کی ذات کا عقدہ کھلنے والا تھا۔ اس کے ذہن کے بند کمرے کی چابی خود بخود ان کے ہاتھ لگنے والی تھی۔

اب.... اب فردوس اور اس کا بچہ بے نام و نشان نہیں رہیں گے۔ وہ چند لمحوں میں ہی جانے کیا کیا سوچتی چلی گئیں۔ یہ چند لمحے انہیں صدیوں سے بھی زیادہ طویل اور صبر آزما لگ رہے تھے۔ ان کی منتظر نظریں بیرونی دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور ذہن بے شمار سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور پھر ان کی آنکھوں نے شامل خان کے ہمراہ ایک شخص کو آتے دیکھا۔ مضبوط تن و توش کا مالک یہ شخص پچاس کے پیٹے میں تھا۔ سر کے بال اور داڑھی مونچھیں کالی گھنی' گھنگھریالی اور سلیٹی مائل تھیں۔ اونچے لمبے قد کے ساتھ بھاری تن و توش نے اسے کافی متاثر کن بنا دیا تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر واضح آنکھیں اس قدر پر وحشت تھیں کہ جن کی سرخی مقابل کو ایک پل کے لیے دہلا کر رکھ دے۔ شامل خان اسے کیبن کے دروازے پر چھوڑ کر دوبارہ اپنی جگہ جا چکا تھا۔ ڈاکٹر زینت نے ایک بھرپور نگاہ میں اس نووارد کا جائزہ لیا جو بقول فردوس کے چوکیدار تھا لیکن بظاہر کسی ڈاکو کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

"آئیے بیٹھیے۔" ڈاکٹر زینت نے بمشکل اپنے سلے ہوئے لبوں کو جنبش دی۔ ان کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں جہاں کوئی تاثر نہیں تھا بس اک جمود تھا۔ وہ خاموشی سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"آپ کا نام...."

"دین محمد۔" سوال کی طرح جواب بھی مختصر تھا۔

"آپ فردوس کے...."

"بیٹی ہے وہ میری۔" سوال بیچ میں سے ہی اچک لیا گیا تھا۔ ڈاکٹر زینت نے اس اجنبی شخص کو ندیدہ نظروں سے دیکھا۔

"آپ آج سے چھ ماہ قبل اسے یہاں چھوڑ کر گئے اور جاتے ہوئے اپنا ایڈریس یا کانٹیکٹ نمبر تک نہیں دیا۔ کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہمیں بعد میں کتنی پریشانی ہوئی۔"

"دیکھیں ڈاکٹرنی صاحبہ! فردوس کو علاج کی ضرورت تھی۔ اس لیے اسے چھوڑ گیا تھا۔ کچھ مسئلے مسائل تھے جن میں الجھ کر میں نہیں آسکا۔ اب باقاعدگی سے آؤں گا۔ آپ ذرا مجھے اس سے ملوا دیں۔" اس نے صلح جویانہ انداز میں جیسے اعتراف کیا۔

"دیکھیے دین محمد صاحب! فردوس سے ملنے سے پہلے آپ کو ہمارے کچھ سوالوں کے جواب دینا ہوں گے۔"

"مثلاً"...." اس نے بھنویں سکیڑتے ہوئے تلخ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"ہمیں فردوس کے والدین اس کے بہن بھائیوں وغیرہ کے بارے میں معلومات چاہئیں۔"

"کس لیے۔" وہ ہنوز اسی انداز میں بولا۔ اسی پل ڈاکٹر تبارک نے ڈاکٹر زینت کے کیبن میں جھانکا۔

"ایکسکیوزمی ڈاکٹر! اگر آپ فارغ ہیں تو کچھ لمحے ہمیں دے دیں۔ یہ مسٹر دین محمد ہیں جو فردوس کو یہاں چھوڑ گئے تھے۔" ڈاکٹر زینت نے جملہ مکمل ہونے کے ساتھ آنکھوں سے مخصوص اشارہ کیا اور ڈاکٹر کیبن کے اندر آ گئے۔ دراصل ڈاکٹر زینت اتنی سی دیر میں ہی جان گئی تھیں کہ کم سے کم دین محمد کے

ساتھ دوبدو وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکیں گی۔ وہ ایک تند خو شخص تھا اور کسی حد تک بدلحاظ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ ڈاکٹر تبارک نے بہت خوشدلی سے دین محمد کے ساتھ مصافحہ کیا اور اس کے بائیں جانب رکھی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"دین محمد صاحب! فردوس کا کیس ڈاکٹر تبارک ڈیل کر رہے ہیں اور ان ہی کے کہنے پر میں نے آپ سے اس کا بیک گراؤنڈ پوچھا تھا۔"

"مر ڈاکٹر صاحبہ! اس کا فردوس کے علاج سے بھلا کیا تعلق۔"

"دیکھیے ایک ڈاکٹر ہونے کے ناتے ہمیں اپنے مریض سے متعلق تمام معلومات ہونی چاہئیں۔"

"نہیں" ڈاکٹرنی صاحبہ! آپ کا فرض بنتا ہے علاج کرنا۔ مریض کا خیال رکھنا۔ اس کا شجرہ کھنگالنا آپ کا فرض نہیں" اس نے رکھائی سے کہا۔

"دیکھیے دین محمد! آپ سمجھنے کی کوشش کریں ہمیں اس کے بارے میں ساری معلومات چاہئیں اور ہمارے لیے بے حد ضروری ہے آپ مہربانی فرما کر اس سلسلے میں ہم سے تعاون فرمایئے۔" اب کے ڈاکٹر تبارک نے اسے مخاطب کیا۔

"وہ پر کس لیے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ نے علاج فردوس جہاں کا کرنا ہے یا اس کے خاندان والوں کا۔ آپ کو اس سے کیا وہ کس کی بیٹی ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ آپ اس کا علاج کرو اور اپنی فیس لو۔ باقی کے پھڈوں میں کس لیے ٹانگ پھنساتے ہو۔" دین محمد چڑ گیا۔ "میرا خیال ہے ڈاکٹر آپ ان کو اس کی حالت کے بارے میں کھل کر بتا دیں۔" ڈاکٹر تبارک سمجھ گئے تھے کہ ٹیڑھے بندے سے واسطہ پڑا ہے۔

"دراصل دین محمد صاحب! فردوس ماں بننے والی ہیں اب ایسی صورت میں آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ ان کے خاندان کے بارے میں علم ہونا ہمارے لیے کیوں ضروری ہے۔" ڈاکٹر زینت کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے پل بھر کر دین محمد کے چہرے پر ان گنت شکنوں کا جال بن دیا۔ اس کی آنکھوں کی وحشت دو چند ہو گئی تھی۔ اور چہرے کی رنگت بدل گئی تھی۔

"تو تو آپ کیا چاہتے ہیں؟" آواز گھٹ کر اس کے گلے سے نکلی تھی۔ لیکن مسلسل اپنی کیفیت کو کنٹرول کرنے کی کوشش میں تھا اور کسی حد تک وہ اپنے احساسات پر قابو بھی پا چکا تھا۔

"ہم اس سلسلے میں اس کے خاندان کو انفارم کرنا چاہتے ہیں تاکہ ڈلیوری کے وقت کسی بھی قسم کی ممکنہ کارروائی کی جا سکے۔ یعنی آپریشن وغیرہ کے وقت اس سے متعلقہ افراد یہاں موجود ہوں اور کل کو کسی نقصان کی صورت میں وہ ہمیں مورد الزام نہ ٹھہرا سکیں۔"

"بس ڈاکٹرنی صاحبہ! ہو گئی آپ کی بات پوری۔ فردوس کے رشتے داروں کو خبر کرنی ہے تو تم لوگ مجھے ہی اس کا رشتے دار سمجھ لو نا۔ اس کا باپ یا ماں بھائی یا بہن۔ اسے یہاں لے کر آنے والا میں تھا اور اس کی خبر گیری بھی مجھے ہی کرنی ہے۔ اس کے کسی بھی مسئلے پر مجھ سے اجازت نامہ لے سکتے ہو آپ لوگ۔" اس کا اطمینان ڈاکٹر زینت کا دل جلا رہا تھا اور دین محمد وہ تو پل صراط پر کھڑا تھا۔ ذرا سی جنبش اسے جہنم کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل سکتی تھی لیکن اس پل صراط پر بھی وہ ثابت قدم تھا۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ کیا اس طرح آپ ہمیں یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ فردوس کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔" ڈاکٹر زینب کوفت زدہ لہجے میں بولیں۔

"نہ ڈاکٹرنی صاحبہ نہ 'ایسا نہ بول۔ سچے سیدوں کا گھرانا ہے اللہ رکھے سارے ہیں اس کے پر میں آپ میں سے کسی کو بھی اس بارے میں نہیں بتا سکتا۔" اس کا لہجہ حتمی تھا۔ ڈاکٹر زینت ڈاکٹر تبارک کی طرف دیکھنے لگیں۔

"دیکھیے اسپتال کے رولز کے مطابق آپ ہمیں سب کچھ بتانے کے پابند ہیں آپ جب چپ چپاتے اسے لے کر یہاں آئے۔ اور صرف اپنا اور اس کا نام بتا کر چلتے بنے۔ پورے چھ ماہ آپ نے پلٹ کر خبر تک نہ لی۔ اس کی حالت کے بارے میں آپ کو سرے سے کچھ علم ہی نہیں تھا اور اب اس سے انتہائی قرابت داری کا دعوا کر رہے ہیں آپ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اس وقت کہ آپ کی پوزیشن کتنی نازک ہے۔"

ڈاکٹر تبارک گمبھیر لہجے میں بولے تو دین محمد نے کھری نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"ڈاکٹر باؤ کھل کر کہہ جو کہنا چاہتا ہے۔ تیرے لفظوں کی جک پھیریاں میں خوب سمجھ رہا ہوں۔"

"میں نے کوئی مشکل زبان نہیں بولی۔ یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ خوش اسلوبی سے ہمیں سب کچھ بتا دیں۔ دوسری صورت میں ہمیں قانون کی مدد لینی پڑے گی جو یقیناً" آپ کے لیے بھی کچھ خوشگوار بات نہیں ہو گی۔" ڈاکٹر تبارک نے کھل کر کہہ دیا۔ دین محمد کے باریک تراشیدہ ہونٹ عجیب سی مسکراہٹ سے مزین ہو گئے۔

"اب مزا آیا نا ڈاکٹر باؤ تیری بات کا۔ تو ویسا کر جیسا تو کہہ رہا ہے۔ پولیس میں دے دے 'جیل بھجوا دے مجھے۔ ستر کوڑے مروا پر دین محمد کے بتیس دانتوں میں چھپی گوشت کی بوٹی میرے ملک کی ساری فوج بھی مل کر نہیں ہلا سکے گی سمجھا۔" اس کی آواز میں غراہٹ نمایاں تھی۔

"تم لوگ۔ تم پڑھے لکھے لوگ خدا معلوم کون سی دنیا میں رہتے ہو۔ تم یہی چاہتے ہو نا کہ فردوس کے خاندان والوں کے بارے میں تم لوگوں کو بتاؤں۔ میں بتاؤں گا مگر اس کے بعد جو طوفان آئے گا اس کی ذمہ داری کون لے گا تم دونوں؟"

"دین محمد صاحب! آپ غصہ نہ ہوں۔ آپ بھی اچھی طرح سمجھتے ہوں گے کہ ہم لوگوں پر فردوس کی کتنی بڑی ذمہ داری ہے۔" ڈاکٹر زینت نے اسے قدرے ٹھنڈا کرنے کی غرض سے کہا۔

"ہاں میں جانتا ہوں 'اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں اٹھاؤں گا اس ذمہ داری کو۔ میری طرف سے اس کے آپریشن کی اجازت ہے اور بھی اس کے علاج میں جو جو کچھ ضروری ہے تم لوگ کرو' میں خرچہ اٹھاؤں گا سارا۔ بس کوئی لاپرواہی نہ کرنا۔ اسے یا اس کے بچے کو کچھ نہیں ہونا چاہیے نہیں تو تیرا اسپتال اس دھرتی پر نظر نہ آئے گا۔" دین محمد انگارے برساتے لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے دین محمد صاحب! ان چند کاغذات پر دستخط کر دیں اور ساتھ ہی اپنا پتا بھی دے دیجیے تاکہ کسی وقت آپ سے رابطے کی ضرورت پیش آئے تو۔" ڈاکٹر زینت نے کاغذ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"باز نہ آنا تم پڑھے لکھے لوگ گول مول باتیں کرنے سے۔ دیکھ ڈاکٹرنی صاحبہ! تجھے میں کھل کر بتا دوں فردوس کا خاندان بڑا جاہ و حشمت والا ہے۔ غیرت اور عزت ان کے در کی لونڈیاں ہیں اور دولت ہاتھ کا میل۔ نصیبوں کی ہار تھی کہ فردوس بچپن میں ہی بے شعور ہو گئی۔ میں اس حادثے کا بھی گواہ ہوں جو اس پر گزرا لیکن جس دن اس کے گھر والوں کو پتا چلا تم شاید سوچ بھی نہیں سکتیں کہ کتنی بڑی قیامت آ جائے گی۔ سینکڑوں بے گناہ لاشیں خون میں نہا جائیں گی۔ خون کی ہولی کھیلی جائے گی اور فردوس جہاں کی کوکھ میں پلنے والا معصوم بے قصور اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سلا دیا جائے گا۔ کیا اب بھی تم لوگ چاہتے ہو کہ میں اس کے گھر والوں کے بارے میں تمہیں بتا دوں۔" دین محمد کی آواز میں واضح لرزش تھی ڈاکٹر زینت بھی کچھ گھبرا گئیں۔

"نہیں دین محمد صاحب! بس ٹھیک ہے آپ اپنا رابطہ نمبر لکھ کر دے جایئے۔" دستخط شدہ کاغذات فائل میں رکھتے ہوئے ڈاکٹر زینت نے کہا تو دین محمد نے ایک کاغذ پر موبائل نمبر لکھ دیا پھر جیب سے ایک کاغذ نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔

"یہ بلینک چیک ہے اس پر اپنی ضرورت کی رقم بھر لو۔ بس اتنا دھیان رکھنا کہ فردوس جہاں لاوارث نہیں ہے جب تک دین محمد زندہ ہے۔ میں ہر ہفتے اس کی خبر گیری کے لیے آتا رہوں گا۔ کیا اب مجھے فردوس جہاں سے ملنے کی اجازت ہے؟" وہ سوالیہ نظروں سے

ڈاکٹر زینت کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"بالکل دین محمد صاحب! اجازت تو پہلے بھی تھی بس کچھ گتھیاں سلجھانی تھیں جو مزید الجھ گئی ہیں۔ خیر۔" بات نامکمل چھوڑ کر انہوں نے گھنٹی بجائے۔ اشرف کیبن میں داخل ہوا۔

"اشرف! ان صاحب کو فردوس جہاں کے پاس لے جاؤ۔" دین محمد شکریہ کہہ کر اشرف کے ہمراہ باہر نکل گیا وارڈ کے باہر بنے لان میں ایک سنگی بنچ پر فردوس جہاں خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ اشرف نے اسے وہاں تک کا راستہ دکھایا اور پھر پلٹ گیا۔ دین محمد آہستگی سے اس کی طرف بڑھا پھر اس کا بازو پکڑ کر اس کی توجہ اپنی طرف کی اس کی آنکھوں میں دین محمد کے لیے اپنائیت بھری شناسائی جاگی۔

"فردوس بیٹی۔۔۔" دین محمد کا لہجہ بھیگ گیا۔

"دینو چاچا۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ بہت گندے ہیں۔ کتنے دن بعد مجھ سے ملنے آئے۔" وہ کسی ننھی بچی کی طرح منہ بسورتی اس کے کندھے سے جھول گئی اس نے فردوس جہاں کی دمکتی پیشانی پر بوسہ دیا۔ محبت کا یہ بے ساختہ مظاہرہ کیبن کے دروازے میں کھڑی ڈاکٹر زینت نے بھی بخوبی دیکھ لیا تھا۔

"دینو چاچا! مجھے نہیں پتا آپ بس مجھے یہاں سے لے جاؤ۔" وہ ضدی لہجے میں بولی۔

"ارے بیٹا! تمہاری ڈاکٹر کہتی ہے کچھ دن بعد آپ فردوس کو لے جانا۔ ابھی یہ یہیں رہے گی۔ تم باقی باتیں چھوڑو دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔ تمہاری چاچی نے چاولوں کے آٹے کی پنیاں بھیجی ہیں تمہارے لیے' یہ پراندے اور چوڑیاں سب کچھ تمہارے لیے ہے۔" دین محمد نے بڑے بڑے دو شاپر اس کے سامنے رکھ دیے تو وہ بالکل بچوں کی طرح خوش ہو کر ایک ایک چیز دیکھنے لگی۔ دین محمد کی نظریں کرب میں ڈوبی اس پر ٹکی ہوئی تھیں اور وہ بے خبر بے شعور جو اپنا سب کچھ ہاری ہوئی تھی مگر کتنی پرسکون تھی۔ زندگی کے جھمیلوں سے یکسر بے نیاز پچھلے چھ ماہ سے اس کے اندر جرات پیدا نہ ہو سکی تھی کہ وہ فردوس جہاں کی مجروح شخصیت کا سامنا کرتا۔ لیکن آج جب وہ آگیا تھا اور اس کا سامنا بھی کر چکا تو اسے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی تھی کہ فردوس جہاں نے نہ صرف اسے پہچان لیا تھا بلکہ اس کی آمد پر انتہائی خوشی اور اپنائیت کا اظہار بھی کیا اور گزرے حادثے کی پرچھائیں بھی اس کے چہرے پر نہیں آئی تھی۔ شاید اس کا معصوم ذہن اپنے اوپر گزرنے والے سانحے کو فراموش کر چکا تھا اور شاید یہ اچھا ہی ہوا۔ اس کا وجود آنے والے خاموش طوفان کی آہٹیں سنا رہا تھا۔ ایک ان دیکھے وجود کی چغلی کھا رہا تھا۔

"دین محمد! زبان کے بدلے زبان' ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور جان کے بدلے جان یہی ہماری شریعت ہے اور یہی ہمارا قانون اور تو اچھی طرح جانتا ہے ہم اپنے فیصلے بدلا نہیں کرتا خواہ جان چلی جائے۔" کسی کا بھاری بھرکم لہجہ اس کی سماعت میں گونجا اور ایک پھریری سی اس کے سارے وجود میں دوڑ گئی۔

"نہیں میں بھی کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ فردوس بیٹی کہاں ہے جب تک وہ اس ننھی سی جان کی امین ہے بچے کی پیدائش کے بعد میں اسے یہاں سے لے جاؤں گا۔" وہ جب وہاں سے اٹھا تو مصمم ارادہ کر چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دن معمول کے دنوں سے کچھ ہٹ کر تھا اور وجہ یہ تھی کہ ماما آج صبح سے کہیں نہیں گئی تھیں اور مہو کا بھی یونیورسٹی سے آف تھا۔ بہت دنوں بعد ماں بیٹی فراغت کے مزے لوٹ رہی تھیں۔ وقارالحسن کے کلینک چلے جانے کے بعد دونوں نے مل کر گھر کی صفائی ستھرائی کروائی اور اس کے بعد کچن میں گھس گئیں۔ ماما کا اور مہو کا فراغت میں یہی دل پسند مشغلہ تھا کہ کوئی اچھی سی ڈش تیار کی جائے۔

"ہوں لگتا ہے آج فوجوں کا رخ ہمارے مورچے کی طرف ہے۔" خالہ کبریٰ مسکراتے ہوئے بولیں۔ وہ ایک پڑھی لکھی سلجھی ہوئی خاتون تھیں لیکن تنہا ہونے کی وجہ سے شروع سے ماما انہیں اپنے پاس لے

آئی تھیں۔ وہ مہو کی پیدائش سے پہلے سے اسی گھر میں تھیں۔

"جی ہاں! اور آج کا سارا مینو مابدولت نے تیار کرنا ہے سوائے میٹھے کے۔ میٹھا ماما خود بنائیں گی۔" مہو بھی خوشدلی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"اصل میں وکی کا فون آیا تھا کچھ دیر پہلے کہہ رہا تھا کہ کوئی بہت خاص الخاص مہمان آرہے ہیں لنچ پر۔ بس اسی لیے ہم نے سوچا کہ کچن پر دھاوا بول دیں۔"

"یہ فاؤل ہے ماما آپ نے مجھے تو نہیں بتایا۔" مہو ٹھنک کر بولی۔

"تو کیا ہوا اب تو بتا دیا نا۔ بس اب جلدی جلدی ہاتھ ہلاؤ۔ دس بج چکے ہیں ایک بجے تک وکی کی آمد کے چانسس ہیں۔ کوفتہ بریانی' چکن کڑاہی اور چکن جلفریزی بنا لیتے ہیں اور میٹھے میں ڈبل ڈیلائیٹ کیا خیال ہے؟" ماما نے مینو ترتیب دے دیا۔

"جتنا فانٹ آپ نے کہا ہے اتنی دیر طلب ڈشز ہیں بہرحال خالہ کبریٰ زندہ باد۔ کیوں خالہ ہیلپ کروائیں گی نا۔"

"ارے بیٹا کہو تو میں خود یہ سب کچھ تیار کر دوں۔" خالہ ہنس پڑیں۔

"نہیں خالہ اب اتنی بھی فیاض نہ بنیں بس آپ پیاز لہسن ادرک وغیرہ تیار کر دیں اور گوشت دھو کر دے دیں۔ باقی کا کام میں خود کرلوں گی۔" مہو نے ایپرن باندھتے ہوئے کہا اور پھر مصروف ہو گئی۔ ماما نے تیسرے برنر پر میٹھا تیار کر لیا تھا اور فریج میں رکھ کر کچن سے جا چکی تھیں۔ بہت تیز تیز ہاتھ چلانے کے باوجود جب اس نے بریانی کو دم دیا۔ پونے ایک بج رہے تھے۔ دم لگا کر وہ باہر آگئی۔ ماما لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی ریموٹ سے چینل بدل بدل کر ٹیلی ویژن دیکھ رہی تھیں۔ نک سک سے درست ماما بالکل ینگ دکھائی دے رہی تھیں۔

"کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اسمارٹ سی خاتون دو جوان بچوں کی اماں جان ہیں۔" مہو نے باآواز بلند کہا تو ماما ہنس پڑیں۔

"تو آپ کیوں جیلس ہو رہی ہیں مائی چائلڈ۔ آپ بھی اگر منہ ہاتھ دھو کر اچھے کپڑے پہن لیں تو میرا خیال ہے کافی کم عمر اور خوب صورت دکھائی دے سکتی ہیں۔" ماما اس کی توجہ اس کے حلیے کی طرف دلاتے ہوئے بولیں تو وہ مصنوعی انداز میں گھورتی وہاں سے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

وارڈ روب کا دروازہ کھولے وہ سوچ میں پڑی ہوئی تھی کہ کیا پہنے اور کیا نہ پہنے۔ پتا نہیں مہمان پروفیشنل تھے یا نان پروفیشنل۔ بہرحال ان کے سامنے ایک بار تو جانا پڑے گا۔ یہ سوچ کر اس نے بلیک کاٹن کا جدید تراش خراش کا سوٹ نکالا اور نہانے کے لیے باتھ روم میں جا گھسی اور جس وقت وقارالحسن کی گاڑی کا ہارن بجا وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے لمبے بالوں کو کلپ کر رہی تھی۔ چہرے کو ہلکا سا ٹیف کرنے کے بعد اس نے دوپٹا سلیقے سے شانوں پر پھیلایا اور باہر نکل آئی۔ مہمانوں کی آوازیں ڈرائنگ روم سے آرہی تھیں۔ وہ لاؤنج سے ہوتی ہوئی کچن کی طرف جانے لگی اسی پل ڈرائنگ روم کے دروازے سے وقارالحسن لاؤنج میں داخل ہوئے۔ اسے دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئے۔ نظریں مبہوت سی اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اس نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا۔

"وکی بھائی۔۔۔ کتنے مہمان ہیں کولڈ ڈرنکس میں لے کر آؤں یا خالہ کو بھیج دوں۔"

"آں۔۔۔ دو مہمان ہیں کولڈ ڈرنکس تم خود لے کر آؤ۔" وہ جیسے اس کے مخاطب کیے جانے پر چونکے اور پھر بات مکمل کر کے تیزی سے دوبارہ ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔

"کبھی کبھی وکی بھائی بھی عجیب عجیب سے دکھائی دیتے ہیں۔" وہ فریزر سے بوتلیں نکالتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔

اور جب کولڈ ڈرنکس لے کر وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو حیرت سے جھٹکا کھاتے کھاتے رہ گئی۔ سامنے صوفے پر براجمان شخصیت جو ماما کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی کوئی اور نہیں سرہاشم

درانی تھے اور ان کے ساتھ وقاص درانی جو اس کا یونیورسٹی فیلو بھی تھا اور کلاس فیلو بھی۔ بہرحال اس نے اپنی موجودہ کیفیت پر قابو پاتے ہوئے آگے بڑھ کر نہ صرف سلام دعا کرلی بلکہ کولڈ ڈرنکس بھی سرو کردیں۔ اتنی دیر تک وقاص درانی کی نظروں کی تپش اسے اپنے چہرے پر مسلسل محسوس ہوتی رہی تھی اور وہ کوفت زدہ انداز میں باہر نکل آئی۔

"یہ لڑکا انتہائی بدتمیز ہے۔ پتا نہیں اسے اس طرح کرکے کیا ملتا ہے ذرا جو اسے لحاظ ہو کہ یہ کسی اسپاٹ پر نہیں ایک عزت دار فیملی کے گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔ سر ہاشم کے نام کو تو بٹا لگا کر رکھ دیا ہے اس نے۔" مہو دانت کچکچارہی تھی۔ اسے یونیورسٹی میں بھی وقاص سے یہی شکایت تھی کہ وہ مسلسل ٹکٹکی باندھے اسے دیکھا کرتا تھا۔ اگرچہ اس نے کبھی کوئی اور نازیبا حرکت نہیں کی تھی، لیکن مہو کے نزدیک اس کا یوں یک ٹک دیکھنا بھی کسی نازیبا حرکت سے کم نہیں تھا اور یونیورسٹی تو ایک طرف رہی وہ تو اس کے گھر میں بھی اسی معمول کا مظاہرہ کررہا تھا۔ "احمق کہیں کا" وہ بس دانت کچکچا کر یہی لقب اسے نواز سکی اور پھر کچن میں آگئی۔

"تم کس بات پر اس قدر خفا ہورہی ہو؟" سماعت کے بے حد قریب وقارالحسن کا گمبھیر لہجہ گونجا تو وہ یک دم بوکھلا کر پلٹی۔ اس قدر نزدیک کھڑے تھے وہ کہ بمشکل ان سے ٹکراتے ٹکراتے بچی پھر بھی اپنی جھونک میں اس کا سر ان کے سینے سے جا ٹکا۔

"وکی بھائی! بہت بری بات ہے پریشان لوگوں کو مزید پریشان کرنا۔" وہ سرزنش والے انداز میں کہہ کر بریانی والی پتیلی کا ڈھکن اٹھا کر دیکھنے لگی۔

"ارے تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ تمہارے رشتے کے لیے آئے ہیں۔" وقارالحسن شرارتی انداز میں گویا ہوئے۔

"وکی بھائی! میں روٹھ جاؤں گی۔" وہ منہ بسورتی ہوئی فریج سے سلاد کی پلیٹیں نکالنے لگی۔

"آں... ہاں روٹھنا نہیں۔ ہمارا گزارا کیسے ہوگا۔" وہ جیسے خود سے بولے پھر سر جھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"تم نے بتایا نہیں کہ تمہیں غصہ کس پر آرہا تھا۔"

"آپ کو کس نے بتایا کہ میں غصے میں ہوں۔"

"دیگچیوں کے ڈھکنوں نے' فریج کے دروازے اور سنک میں پڑے بے چارے برتنوں نے..." وہ اس کے برتن پٹخنے کی آوازیں سن کر ہی کچن میں آئے تھے۔ وہ جیسے قائل ہوگئی۔

"سوری وکی بھائی! بس یونہی۔ آپ ایسا کریں خالہ کبری کو بھیج دیں تاکہ کھانا سرو کیا جائے خاصی دیر ہوچکی ہے۔" وہ انہیں ٹال گئی۔

"ہوں..." وہ جانے کے لیے پلٹے پھر کچھ سوچ کر دوبارہ اس کی طرف دیکھا۔ "شاید تم نے سرہاشم درانی کو نہیں پہچانا۔ اسلامیات ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ ہیں اور پاپا کے بیسٹ فرینڈ تھے کبھی زمانے میں..."

"میں نے پہچان لیا تھا سرہاشم کو... ہاں یہ نئی خبر ہے کہ وہ پاپا کے بیسٹ فرینڈ تھے کیونکہ کبھی ماما نے بھی ذکر نہیں کیا ان کا۔"

"وقاص بتا رہا تھا کہ وہ بھی تمہارے ہی ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔" وہ اسے جیسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"ہاں ٹھیک کہہ رہا تھا وہ۔ اب آپ جائیں بھی۔" وہ انہیں باہر کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی تو وہ مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

"کمینہ کہیں کا۔ ضرور بتاتا تھا کہ میری کلاس میں مرا رہتا ہے ہونہہ۔" اس کا موڈ سخت خراب ہوگیا۔ کھانا ٹیبل پر لگانے کے بعد وہ جو کمرے میں گھسی تو پھر تب ہی نکلی جب مہمان جاچکے تھے۔ ماما کی سرزنش پر سردرد کا بہانا بنا کر لیٹی رہی وقاص درانی کا سامنا کرنے سے بہتر یہی لگ رہا تھا کہ ماما کی ڈانٹ اور وقارالحسن کی ناراضگی سہہ لے۔

☆ ☆ ☆

گھڑی کی سوئیاں آگے پیچھے یوں بھاگی جاتی تھیں کہ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چل رہا تھا۔ جیسے جیسے فردوس تخلیق کے مراحل طے کررہی تھی مینٹل اسپتال کے ڈاکٹرز کے ہاتھ پیر پھول رہے تھے۔ فردوس بظاہر اپنے آپ سے بھی بے نیاز تھی لیکن جب اس کے پہلو میں ننھا سا وجود گدگداتا تو وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگتی۔

ڈاکٹر رفعت آج کل اپنی شادی کی چھٹیاں منا رہی تھیں اس لیے ڈاکٹر زینت پر دہرا بوجھ پڑا تھا۔ ڈاکٹر تبارک مردانہ وارڈ کے سب سے سینئر ڈاکٹر تھے اور فردوس کے کیس میں ڈاکٹر زینت کی رہنمائی بھی انہوں نے ہی کی تھی۔ ڈاکٹرز زینت' فردوس کو بچے کی آمد کے سلسلے میں بہت بار کونسلنگ کرکے دیکھ چکی تھیں۔ لیکن ہر بار نتیجہ صفر ہی رہا تھا۔ اول تو اس کے ذہن میں بچے کا کوئی ٹھوس تصور ہی نہیں تھا۔ جو تھوڑا بہت تھا تو وہ ایسا کہ وہ اس تصور سے چڑ جاتی تھی بے زار ہوجاتی تھی۔ سو ڈاکٹر زینت نے اس مسئلے کو یونہی بنا حل کے چھوڑ دیا تھا۔ انہیں اب فکر تھی تو بس یہ کہ فردوس اپنی بے شعور کیفیت میں خود کو یا آنے والے بچے کو کوئی نقصان نہ پہنچادے۔ اور اس ضمن میں انہوں نے فاطمہ اور شہزادی کو بہت سختی سے کہہ رکھا تھا۔

دین محمد اپنی بات کا بہت پکا نکلا۔ وہ ہر ہفتے فردوس کو دیکھنے آتا تھا ہر بار اس کے لیے ڈھیروں چیزیں لے کر آتا۔ اور وہ بھی جیسے اس کے انتظار میں ہوتی تھی۔ اس کے بازو سے جھول جھول کر فرمائشیں کرتی۔ فاطمہ اور شہزادی کو چاچی کہہ کر انہیں برا بھلا کہتی کہ وہ بے چاریاں ہق دق منہ دیکھتی رہ جاتیں۔ دین محمد اسپتال والوں کی کارکردگی سے بہت حد تک مطمئن ہوگیا تھا۔ پہلی بار کے علاوہ دوبارہ اس کی کسی سے کوئی تلخ کلامی نہیں ہوئی۔ وہ بڑے سکون سے آتا گھنٹہ آدھا گھنٹہ فردوس کے ساتھ گزارتا اور رخصت ہوجاتا۔ وہ دن بھی بہت سے عام دنوں میں سے ایک دن تھا۔ صبح صبح کا وقت تھا ڈاکٹر زینت اپنے کیبن میں تھیں۔ جب ایک دردناک چیخ ان کی سماعت سے ٹکرائی۔ فائل ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جاگری۔

اس کے ہونٹوں سے چیخ نما کراہ نکلی تھی اور ساتھ ہی وہ دہری ہوتی چلی گئی۔ چہرے پر پسینے کی بوندیں تھیں اور ماتھے پر بالوں کی سیاہ لٹیں پسینے سے بھیگ کر چپکی ہوئی تھیں۔ رہ رہ کر درد کی لہریں اٹھتی تھیں' وہ بے حال ہوتی جارہی تھی۔ فاطمہ اور شہزادی اسے سنبھالنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں لیکن وہ کسی اڑیل گھوڑی کی طرح ان سے اپنا بازو چھڑوا کر بھاگنے کی کوشش میں راستے میں پڑے بنچ سے ٹکراگئی۔

"اری شہزادی پکڑ اسے۔ گر گرا گئی تو لینے کے دینے پڑجائیں گے۔ نوکری سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے بے عزتی بھی بڑی ہوگی۔" فاطمہ تیزی سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ زمین پر گرنے کے بعد اس میں اٹھنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اسی پل ڈاکٹر زینت وارڈ میں داخل ہوئیں اور اسے نیچے گرا ہوا دیکھ کر تیر کی طرح اس کی طرف لپکیں۔

"تم دو عورتوں سے قابو نہیں آئی یہ۔ اب اگر کوئی نقصان ہوجائے تو۔" انہوں نے آتے ہی پہلے ان دونوں کو لتاڑا۔ پھر بیڈ پر سے تکیہ اٹھا کر اس کے سر کے نیچے رکھا اور اس کی نبض کی رفتار معلوم کی۔ نبض بہت مدھم چل رہی تھی لیکن وہ مکمل ہوش میں تھی۔ بس تکلیف میں سر تکیے پر پٹخ رہی تھی۔

"فاطمہ جلدی جاؤ اشرف سے کہو اسٹریچر لے کر آئے اور ہاں ڈاکٹر تنویر فاطمہ اور ڈاکٹر تبارک کو بھی بتاتی آنا۔ شہزادی تم میرے ساتھ مل کر اسے بیڈ پر لٹاؤ۔" انہوں نے شہزادی کی مدد سے اسے بستر پر لٹادیا۔ اور اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو جیسے واپس پلٹنا بھول گئی' بادامی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اگرچہ وہ خود ان آنسوؤں سے بے نیاز تھی۔ ستواں ناک تراشیدہ لب اور ہیرے جیسی دمکتی رنگت۔ وہ قدرت کی ستم ظریفی پر دل مسوس کر رہ گئیں۔ اس قدر مکمل حسن' پچیس سالہ پرشباب وجود رکھنے والی لڑکی

اور ہوش و حواس سے بیگانہ اپنے وجود سے بے نیاز صرف اپنے وجود سے ہی نہیں۔ اس وجود سے بھی جو اس کا خون پی پی کر اس کے وجود میں پلا تھا اور اب کوئی دم میں عدم سے وجود میں آنے والا تھا۔ انہوں نے اس کے ماتھے پر سے پسینے میں بھیگے بال پیچھے ہٹائے۔

"ڈاکٹر صاحب! کیا اس کا کیس نارمل ہے جی۔" شہزادی نے ترحم بھری نگاہ اس پر ڈال کر پوچھا۔ "کیس تو نارمل ہے لیکن نارمل طریقے سے ہینڈل نہیں ہو پائے گا۔ کیونکہ یہ ہوش میں رہ کر ہمیں کسی طور اپنا کام نہیں کرنے دے گی۔" ان کی بات کے مکمل ہوتے ہی وارڈ کے کھلے دروازے سے ڈاکٹر تنویر اور ڈاکٹر تبارک افتاں و خیزاں اندر داخل ہوئے۔

"کیا بات ہے ڈاکٹر؟ کیا کوئی مسئلہ ہے؟" ڈاکٹر تنویر نے پوچھا۔

"مسئلہ ہے بھی اور نہیں بھی۔ فردوس کی ڈلیوری قریب ہے اور اب اس سلسلے میں مجھے آپ دونوں ڈاکٹرز سے رائے لینی ہے کہ کیا کیا جائے۔ میں سے کوئی بھی ڈسیژن نہیں لے سکتی۔" ڈاکٹر زینت کے کانوں میں دین محمد کے الفاظ گونج رہے تھے۔ جو اس نے پہلی ملاقات میں دھمکی آمیز انداز میں کہے تھے۔

"آپ ایسا کریں کہ دین محمد صاحب کو ٹریس کریں اور فوری انہیں اسپتال آنے کو کہیں ان کی اجازت سے ہی آپریشن کیا جائے ویسے آپ جو مناسب سمجھیں۔" ڈاکٹر تبارک نے کہا تو انہوں نے بھی تائید میں سر ہلا دیا۔

دین محمد ڈاکٹر کی کال کے محض آدھے گھنٹے بعد اسپتال میں موجود تھا۔ اس کے چہرے پر فکر و تردد کی لکیروں نے گویا جال سا بن ڈالا تھا۔ اس نے بھیگی آنکھوں سے اسٹریچر پر لیٹی نیم غشی کی کیفیت کا شکار فردوس کو دیکھا اور بجھے دل کے ساتھ آپریشن کے اجازت نامے پر دستخط کر دیے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور فردوس اسٹریچر سمیت اس کے پیچھے اوجھل ہو گئی پھر ایک ایک پل قیامت تھا۔

"خدایا! میری بچی کی مشکل آسان کر دے۔ یہ نو ماہ میں نے جس اذیت میں کاٹے ہیں تو بہتر جانتا ہے۔ میرے مولا تو جو امانت ہمیں دینا چاہتا ہے ہم بخوشی تیار ہیں پر فردوس کو کچھ نہ ہو میرے مالک میں مصاحب شاہ جی کو کیا منہ دکھاؤں گا۔"

وہ چپکے چپکے دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا اور ادھر آپریشن تھیٹر میں زندگی اور موت کے بیچ آنکھ مچولی جاری تھی۔ ڈاکٹر زینت نے اس ضمن میں سرجن عالیہ کی خدمات حاصل کی تھیں جو مایہ ناز گائناکالوجسٹ تھیں اور یہ ان کی مہربانی ہی تھی کہ وہ محض آدھا گھنٹہ قبل بتانے کے باوجود یہ کیس ہینڈل کرنے چلی آئی تھیں۔

اور پھر تین گھنٹے کی ان تھک محنت کے بعد ان کے ہاتھوں میں ایک چاند سی بچی کا گورا گورا نرم و نازک وجود ہمک رہا تھا۔ جو دنیا کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اور گلابی پنکھڑیوں سے لب کھول کھول کر سانس لے رہی تھی۔ یہ دنیا اس کی بھی تو تھی لیکن مقدر نے اس کے لیے جو گود منتخب کی تھی۔ اس گود کی گرمی شاید اس کے لیے نہیں تھی کیونکہ وہ گود اس کے وجود سے بے نیاز تھی۔ بچی کو نرس کے حوالے کرنے کے بعد انہوں نے فردوس کے چہرے کی طرف دیکھا جس کی پیلاہٹ آمیز رنگت میں دھیرے دھیرے ممتا کی سرخیاں گھلنے لگی تھیں۔ وہ اس امتحان میں سرخرو ہو گئی تھی جو قدرت نے اس کے لیے رکھا تھا۔

اور جب نرم سے کپڑے میں لپٹا ننھا سا وجود ڈاکٹر زینت نے دین محمد کے کھردرے ہاتھوں میں دے کر یہ کہا کہ۔

"فردوس اور بچہ دونوں بالکل ٹھیک اور صحت مند ہیں۔" تو دین محمد نے ایک سکون آور سانس سینے سے خارج کرتے ہوئے اس ننھے سے وجود کو اپنے سینے کی گرم پہنائیوں میں اتار لیا۔ نو ماہ سے جو سل اس کی چھاتی پر دھری ہوئی تھی اس ننھے سے وجود نے اس سل کو اس کی چھاتی پر سے ہٹا کر اسے مطمئن کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

پچھلے پندرہ دنوں سے فردوس مسکن ادویات کے زیر اثر تھی۔ محض اس لیے کہ ڈاکٹر زینت اور دوسرے تمام ڈاکٹرز کا یہ خیال تھا کہ وہ ایک بہت بڑے مرحلے سے گزری ہے ذرا سی بے احتیاطی یا لاپرواہی اس کے لیے شدید خطرہ پیدا کر سکتی تھی۔ اس دوران دین محمد تقریباً روزانہ ہی آ رہا تھا۔ فردوس کی بچی بالحال ڈاکٹر زینت کی کسٹڈی میں تھی اور اس کی دیکھ بھال فاطمہ اور شہزادی کے ذمہ تھی۔

سولہویں دن فردوس کو طبعی نیند کے دورانیے کے بعد جاگنے دیا گیا اس کے زخم تقریباً مندمل ہو چکے تھے' لیکن باوجود بہترین خوراک و ادویات کے اس کی رنگت میں جیسے ہلدیاں سی گھل کر رہ گئی تھیں۔ فاطمہ نے اسے نہلا دھلا کر صاف ستھرے کپڑے پہنائے۔ اس کے الجھے ہوئے نم بالوں کو بہت نرمی اور محبت سے سلجھایا' لیکن فردوس بالکل خاموش تھی۔ اس نے کسی کے کام میں کوئی مداخلت نہیں کی اور نہ ہی کسی قسم کا استفسار کیا لیکن فاطمہ نے اس کی غلافی آنکھوں میں عجیب سی ویرانی ضرور دیکھی اور پھر نظریں جھکا لیں۔ وہ ممتا بھرے جذبات سے تو ناواقف تھی' لیکن بہرحال اس کی زندگی کا ایک سخت لیکن خوب صورت دور اس پر گزرا تھا جس کی ہلکی ہلکی سی پرچھائیاں اس کی سوچ پر ثبت ہونی لازمی تھیں۔ اس کے ذہن میں ان دنوں کا بہت ہلکا سا خاکہ ابھرا جب وہ ایک نادیدہ بوجھ اٹھائے پھر رہی تھی۔

"چاچی! یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟" وہ فاطمہ اور کبھی شہزادی سے پوچھتی جو بس مسکرا دیتیں کہ ذی ہوش کو تو سمجھانا آسان ہے اب وہ ایک پانچ سالہ بچی کو تخلیق کا فلسفہ کیا سمجھاتیں اور اب پھر اس نے اپنی ویران آنکھیں فاطمہ پر مرکوز کر رکھی تھیں اور ان ویران مگر معصوم آنکھوں میں وہی سوال امڈتا دکھائی دے رہا تھا۔

"چاچی! یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟" فاطمہ اس سے نظریں چرائے وہاں سے اٹھ گئی ڈاکٹر زینت اپنے کیبن میں تھیں جب اشرف نے آکر انہیں بتایا کہ دین محمد آیا ہے اور وہ آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔ انہوں نے اجازت دے دی کچھ نہ کچھ اندازہ تو انہیں تھا ہی لیکن وہ اس کے آنے کے بعد اپنے اندازے کی توثیق کر سکتی تھیں۔ اسی اثناء میں وہ اندر داخل ہوا۔

"سلام ڈاکٹر صاحب!" نارمل لہجہ میں سلام کرتا وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"وعلیکم السلام دین محمد! کیسے ہو؟" ڈاکٹر زینت نے خوشدلی سے جواب دیا۔ یوں بھی پہلی ملاقات کے بعد سے دین محمد کے ساتھ پھر کبھی تلخ کلامی کی نوبت نہیں آئی تھی۔

"رب کا کرم ہے جی.... وہ ڈاکٹر صاحب میں آپ سے ایک بہت اہم بات کرنے آیا ہوں جی۔ آپ کے پاس وقت ہو گا۔" وہ کچھ جھجک کر کچھ ہچکچا کر بولا حالانکہ یہ اس کا مزاج نہیں تھا وہ تو ڈنکے کی چوٹ پر کہہ گزرتا تھا خواہ مقابل پر اس کا اثر کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو۔

"کیوں نہیں دین محمد! تم کھل کر بات کرو کیا کہنا چاہتے ہو؟" ڈاکٹر زینت نے اس کی ہمت بندھائی۔

"وہ جی دراصل میں فردوس کو یہاں سے لے جانا چاہتا ہوں۔" اس نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے دین محمد! لیکن یہاں کے کچھ تقاضے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ابھی اس کا علاج مکمل نہیں ہوا پھر اس کی بچی کا مسئلہ بھی ہے۔" ڈاکٹر زینت رسان سے بولیں۔

"ڈاکٹر صاحب! فردوس کا علاج ممکن ہی نہیں ہے وہ پاگل نہیں ہے جی بس اس کا ذہن اپنی عمر سے بہت پیچھے ہے۔ باقی باتیں تو وہ بالکل ٹھیک کرتی ہے جی۔" دین محمد اپنی سمجھ کے مطابق بولا۔

"نہیں دین محمد! میں یہ نہیں کہہ رہی کہ وہ پاگل ہے لیکن اس کی جو ذہنی حالت ہے وہ بھی ایب نارملٹی

میں ہی آتی ہے اور نفسیات میں اس کا علاج بھی دریافت ہو چکا ہے ــــــ اس پر وقت بہت لگتا ہے لیکن ستر فیصد علاج کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔"

"آپ سب کچھ ٹھیک کہہ رہی ہیں ڈاکٹر صاحبہ! لیکن فردوس محض ایک عام لڑکی کا نام نہیں ہے جی۔ وہ جدی پشتی رئیسوں کے خاندان سے ہے اور آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ ایسے لوگوں کے دماغ کس طرح کے ہوتے ہیں۔ بہرحال یہاں سے جانے کے بعد میں فردوس کے بارے میں اس کے والد کو آگاہ کردوں گا۔ میرا خیال ہے آپ مجھ پر بھروسہ نہیں کر رہیں۔" دین محمد بولا تو ڈاکٹر زینت اس کی ذہانت کی قائل ہو گئیں شروع سے لے کر اب تک وہ دین محمد کو تمام شکوک و شبہات سے بالاتر نہیں کر پائی تھیں۔ حالانکہ وہ فردوس کے والہانہ پیار کے مظاہرے بھی دیکھ چکی تھیں اور دین محمد کی پدرانہ شفقت کو بھی چھپ کر ملاحظہ کر چکی تھیں، لیکن وہ جس طرح اسے یہاں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس ایک بات نے اس کی ذات کو خاصا ناقابل اعتبار بنا دیا تھا اور اس وقت بھی وہ یہی سوچ رہی تھیں کہ فردوس کے سرپرست سے متعلق دین محمد سے پوچھیں۔ لیکن ساتھ ہی اس سے پہلی ملاقات کے دوران ہونے والی جھڑپ نے انہیں خاموش رکھا تھا۔ اب اس کی بات کے جواب میں انہیں کچھ نہ کچھ ایسا کہنا تھا کہ وہ بھی برا نہ مانے اور ان کی بات بھی اس تک پہنچ جائے۔

"نہیں دین محمد! ایسی کوئی بات نہیں۔ تم اسے یہاں چھوڑ کر گئے اور اب تم ہی اس کو لے جانے آئے ہو۔ ہمیں اعتراض نہیں لیکن وہ کون ہے اس کا تعلق کہاں سے ہے کم سے کم اسپتال کے ریکارڈ کے لیے ہمیں کچھ تفصیلات چاہئیں۔"

"میں ایک شرط پر آپ کو ساری تفصیل بتاؤں گا۔ پہلے آپ وعدہ کریں کہ اس تفصیل کے بدلے میں جو چاہوں گا آپ وہ کریں گی۔" دین محمد ڈرامائی لہجے میں بولا۔

"بھئی یہ کیسے ممکن ہے خدا معلوم کیا شرط رکھ دو جو مجھ سے پوری ہی نہ ہو سکے۔" ڈاکٹر زینت ہچکچاہٹ آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

"نہیں ڈاکٹر صاحبہ! میرا یقین ہے کہ میری وہ شرط آپ کے سوا کوئی پوری نہیں کر سکتا۔ آپ میری بات ماننے کی قدرت رکھتی ہیں۔" دین محمد ہنوز اسی انداز میں بولا تو ڈاکٹر زینت نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بہت شکریہ ڈاکٹر صاحبہ! اب آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ آپ شرط پہلے سنیں گی یا فردوس کے بارے میں پہلے جاننا چاہیں گی۔" دین محمد کے انداز میں قدرے اطمینان در آیا۔

"اب جب میں نے تمہاری شرط بنا جانے مان لی ہے تو پہلے فردوس کے ماضی کے بارے میں تفصیل سننا چاہوں گی۔" ڈاکٹر زینت نے کہا تو دین محمد نے سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے تو سنیے۔ فردوس سید پور کے نوابوں کی اولاد میں سے ہے۔ مصاحب علی شاہ کی پوتی اور مکرم علی شاہ کی بیٹی ہے۔ پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے لیکن بچپن میں اپنی ماں کا قتل اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد اس کے ذہن میں ایک گرہ سی لگ گئی۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس کا ذہن عمر کے اسی حصے میں اٹک گیا ہے اور اس کا علاج ممکن نہیں کیونکہ یہ خود بھی اس عمر سے باہر نہیں نکلنا چاہتی۔ پچھلے ایک سال سے مصاحب علی شاہ اور مکرم شاہ جی نے آدھا پاکستان کھنگال لیا فردوس کی بازیابی کے لیے۔ لیکن میں نے انہیں نہیں بتایا کہ فردوس کہاں ہے اور اس کی وجہ اس کے پیٹ میں پلنے والا بچہ تھا۔ اگر انہیں پتا چل جاتا تو وہ اس معاملے کے قصوروار کے ساتھ وہ سلوک کرتے کہ اس کی سات پشتیں جھلس کر رہ جاتیں۔ اب جبکہ فردوس ٹھیک ہو چکی ہے تو میں انہیں بتاؤں گا کہ میں اپنے طور پر فردوس کو ڈھونڈ رہا تھا اور وہ مجھے ایک مینٹل اسپتال میں نظر آگئی ہے پھر وہ خود ہی آکر اسے لے جائیں گے۔ اس کے پیٹ کے زخم چھپے تو نہیں رہ سکتے لیکن مجھے اتنا پتا ہے کہ شاہوں کی حویلی

میں کم سے کم کوئی نوکرانی یہ جرات نہیں کر سکے گی کہ اس بارے میں مردوں کو کچھ بتائے۔" دین محمد نے ڈاکٹر زینت کو کافی اطمینان بخش معلومات بہم پہنچا دی تھیں۔

"شکریہ دین محمد! تم نے مجھ پر بھروسہ کر کے فردوس کے بارے میں بتا دیا۔ اب تم وہ شرط بھی بتا دو جس کے بدلے تم نے اس راز پر سے پردہ اٹھایا تھا۔" ڈاکٹر زینت بظاہر مسکراتے ہوئے بولیں لیکن کچھ پریشان بھی تھیں کہ خدا معلوم وہ کیا کہہ بیٹھے۔

"اسے آپ شرط سمجھ لیں یا عرض۔ وہ یہ ہے کہ فردوس کی بچی کی ذمہ داری آپ قبول کر لیں۔ اس کی پیدائش کے بارے میں فردوس کے خاندان میں سے کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ ضروری نہیں ہے کہ بچی کو آپ ہی پالیں آپ اپنے کسی قابل اعتماد خاندان کو بھی یہ ذمہ داری دے سکتی ہیں اس کے بدلے ہر ماہ ایک معقول رقم کا چیک آپ کو بھیجتا رہوں گا۔ بس اس بچی کی اگر جان بچانا چاہتی ہیں تو فیصلہ کر لیں نہیں تو مجھے اسے کسی یتیم خانے میں داخل کروانا پڑے گا اور یہ تو آپ بھی جانتی ہیں ڈاکٹر صاحبہ کہ وہاں بچوں کی تربیت کیسے ہوتی ہے۔ آپ بے شک سوچ لیں میں کل آپ کا جواب لینے آؤں گا اور اس کے بعد ہی فردوس کے بارے میں فیصلہ ہوگا۔" دین محمد اپنی بات مکمل کر کے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہو سکتا ہے میں نے آپ کے کندھوں پر کچھ زیادہ بوجھ ڈال دیا ہو۔ پر جی میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ چلتا ہوں۔" دین محمد کیبن کے دروازے کی طرف چل پڑا۔

"دین محمد!" ڈاکٹر زینت کی پکار پر وہ رک گیا اور مڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"تمہیں فیصلے کے لیے کل تک انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میں اس بچی کی ذمہ داری قبول کرتی ہوں کسی زور زبردستی کے بغیر میں خود اس کو پالوں گی۔ تم بے شک کل ہی فردوس کے والد یا دادا کو لے آؤ۔" ڈاکٹر زینت کے مضبوط لہجے میں کہی گئی بات دین محمد کے اعصاب کو بالکل ہلکا پھلکا کر گئی۔

"بہت شکریہ ڈاکٹر صاحبہ! آپ نے میری بہت بڑی پریشانی حل کر دی جی۔ آپ فکر نہ کرنا دین محمد کسی موقع پر آپ کو اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ بس کل فردوس کو مصاحب علی شاہ کی حوالے کر کے میرے کندھے اس بوجھ سے چھوٹ جائیں گے پھر ہم مل کر اس بچی کے لیے سوچیں گے۔ اجازت دیں ڈاکٹر صاحبہ! بہت کام ہے بڑی ذمہ داری ہے جی۔ جوان بچی کا بوجھ سال بھر اٹھا کر ہی میں ہانپ گیا ہوں۔ اب خیال آتا ہے رب سوہنے نے مجھے اولاد کیوں نہ دی۔ اولاد تو جی بڑی آزمائش ہے بڑا امتحان ہے رب کا۔ چلتا ہوں جی کل آؤں گا۔" دین محمد سرخوشی کے عالم میں مسکراتا ہوا کیبن کے دروازے سے نکل گیا۔ ڈاکٹر زینت نے طویل سانس لے کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ ان کے تصور میں روئی کے گالوں سی نرم گلابی بچی آگئی۔ انہوں نے بہت بڑی ذمہ داری اٹھالی تھی اور اب انہیں خود کو اس ذمہ داری کا اہل ثابت کرنا تھا۔

دین محمد کی آزمائش ختم ہونے والی تھی اور ڈاکٹر زینت بانو کی آزمائش شروع ہونے والی تھی۔ دونوں کا فردوس جہاں سے کوئی رشتہ نہیں تھا مگر یہ ان لوگوں میں سے تھے جو دنیا کا سب سے بڑا رشتہ نبھانے والے ہوتے ہیں انسانیت کا رشتہ، خلوص اور وفا کا رشتہ۔

☼ ☼ ☼

پچھلے کچھ دنوں سے مہرالنساء کو یونیورسٹی پک اینڈ ڈراپ کرنے کی ذمہ داری وقار الحسن کے کندھوں پر تھی اور وہ تو جیسے اس ذمہ داری کے انتظار میں تھے۔ وقت سے پہلے اسے لینے پہنچ جاتے پتا نہیں کیوں انہیں اس کا انتظار کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ کافی دیر تک منتظر نظریں گیٹ پر جمی رہنے کے بعد جب گیٹ پر اس کا حسین چہرہ دکھائی دیتا تو جیسے خشک ہوتی تمازت سے جھلستی ندی میں روانی آجاتی۔ جلتے سلگتے ارمانوں پر محبت کی شبنم برسنے لگتی۔ وہ سرشار سے ہو جاتے اس کی ہمراہی میں ایک ایک پل گزارنا ان کے لیے

سرخوشی تھا اور ایک پل کی دوری بھی سوہان روح۔

انہوں نے ایک نظر اپنے بائیں جانب بیٹھی مہرالنساء کو دیکھا جو ان کے جذبات سے بے خبر ونڈ اسکرین سے باہر بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کی طرف متوجہ تھی۔

"مہو۔۔۔!"

"جی۔۔۔!"

"آئس کریم کھانی ہے۔۔۔؟"

"جی وکی بھائی۔۔۔ ونیلا۔" وہ خوش ہوگئی۔

"او کے۔۔۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے گاڑی ایک قریبی ریسٹورنٹ کے سامنے جا روکی۔

"چلو۔۔۔"

"نہیں وکی بھائی۔۔۔ یہیں منگوا لیں نا۔۔۔ مجھے باہر جانا اچھا نہیں لگتا۔" مہو عجیب سے انداز میں بولی تو وقارالحسن نے کچھ الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا مطلب۔۔۔؟ کوئی مسئلہ ہے مہو؟" نہیں اس کے چہرے پر کچھ غیر معمولی نظر آیا۔

"نہیں تو۔۔۔ کچھ بھی نہیں ہے بس میں باہر نہیں جاتی۔"

"او کے! او کے۔" وہ جیسے خود ہی سمجھ گئے اور گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ مہرالنساء نے انہیں ریسٹورنٹ کے ڈور سے اندر جاتے دیکھا اس کی نظریں بھٹک رہی تھیں اور پھر جیسے کوئی غیر معمولی چیز اس کے احاطہ بصارت میں آگئی اس کی نظریں ٹک گئیں۔ گاڑی سے کچھ فاصلے پر خادم بابا کھڑے تھے۔ کالی چادر میں لپٹا بے ترتیب وجود' بکھرے بال اور متوحش آنکھیں اور ان آنکھوں میں اپنے لیے واضح شناسائی کی جھلک دیکھ کر ایک جھرجھری سی اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ ان کی نظریں اس کے چہرے پر مسلسل گڑی ہوئی تھیں اور ان کی تپش وہ اتنے فاصلے پر ہونے کے باوجود بھی محسوس کر رہی تھی۔ شکر ہوا کہ وقارالحسن جلدی آگئے انہوں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور آئس کریم پیک اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہوگئے۔

"مہو۔۔۔ تم کبھی کبھی بہت عجیب ہو جاتی ہو۔" گاڑی کو ٹرن کرکے روڈ پر لاتے ہوئے انہوں نے اس کے چہرے اور پیشانی پر آئے ہوئے پسینے کی طرف دیکھا۔

"تم گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

"کچھ نہیں۔۔۔ وکی بھائی بس ویسے ہی۔۔۔ ڈونٹ وری۔" وہ جیسے واپس اعتماد کی فضا میں لوٹ رہی تھی۔ انہوں نے گہری نگاہوں سے اس چھوٹی موئی کو دیکھا اور پھر کسی اور وقت پر ڈالتے ہوئے اپنی توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کردی۔

☼ ☼ ☼

پُرشکوہ حویلی کے شاندار در و دیوار جیسے کسی ان دیکھے درد پر واویلا کرتے نظر آتے تھے۔ دین محمد نے ایک نظر شاندار گیٹ پر ڈالی چوکیدار نے اسے دیکھا اور گیٹ کھول دیا۔ وہ اس گھر کے مکین کی حیثیت رکھتا تھا۔

"شاہ جی ہیں کرم داد۔" دین محمد نے چوکیدار سے پوچھا۔

"جی۔۔۔ چاچا۔۔۔ شاہ جی اپنے حجرے میں ہیں کچھ بیمار ہیں دشمنوں کو خبر نہ ہو۔۔۔ آپ جاؤ جی اندر جاؤ۔"

دین محمد نے خاموشی سے گیٹ سے اندر قدم رکھا۔ بہت بڑے بڑے سبزے کے میدانوں کے بیچ ایک طویل روش کافی آگے جا کر دو رویہ ہو جاتی تھی ایک راستہ زنان خانے کی طرف اور دوسرا مردان خانے کی طرف جاتا تھا۔ دین محمد کے پاؤں تلے آکر بجری کے چھوٹے چھوٹے پتھر چرمرا رہے تھے۔

مردان خانے کے بڑے دروازے پر پہنچ کر اس نے دروازے پر دستک دی اور کچھ لمحے انتظار کے بعد اندر داخل ہوگیا۔ سامنے وسیع و عریض لاؤنج میں ایک طرف گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے کچھ نحیف نظر آتے مصاحب علی شاہ تنہا بیٹھے تھے۔ دروازے سے آتی کھٹک کی آواز پر انہوں نے سر اٹھا کر دین محمد کو دیکھا۔

"آؤ دینو۔۔۔ اس بار تو بہت دن گم رہے تم؟ کہاں چلے گئے تھے۔" نحیف وجود سے آتی آواز میں گونج اور

رعب بلا کا تھا۔

"سرکار۔۔۔ میرے ماں باپ بھی آپ پر قربان۔۔۔ پورا سال آپ کے درد کا ہمراہی رہا ہوں جانتا ہوں جو دکھ آپ اٹھا رہے ہیں وہ میں بانٹ نہیں سکتا۔ بانٹنے کی کوشش تو کر سکتا ہوں نا۔۔۔ شاہ جی میری یہ کوشش کامیاب ہوگئی۔ شاہ زادی مل گئی شاہ جی۔۔۔ خدا کی قسم وہ شاہ زادی ہی تھی۔ میں پتا کرکے آگیا ہوں جی۔" دین محمد سر جھکا کے بولا پتا نہیں آج وہ کیوں نظر نہیں ملا پا رہا تھا۔

"کون؟" مصاحب علی شاہ چونک کر سیدھے ہو بیٹھے غالباً "انہیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔

"شاہ جی! اپنی چھوٹی بی بی۔۔۔ فردوس بی بی۔۔۔ شاہ جی۔" دین محمد جانتا تھا اس کے الفاظ اس گھر کے مکینوں کے لیے زندگی کا پیغام ہیں۔ ایک سال کی طویل معیاد اس گھر کے ایک ایک فرد نے آگ کے بستر پر سوتے اور کانٹوں پر چلتے گزاری تھی۔ کیسا حیات آفریں لمحہ تھا یہ مصاحب علی شاہ کا ہاتھ اپنے بائیں پہلو پر ٹک گیا۔

"تم۔۔۔ تم سچ کہہ رہے ہو دینو۔"

"جی سرکار۔۔۔ وہ لاہور کے مینٹل اسپتال میں زیر علاج ہیں۔ میں مل چکا ہوں ان سے اور ڈاکٹروں کو آپ کے بارے میں بھی تفصیل سے بتا دیا ہے۔ ہم سب جائیں گے بی بی کو لینے کے لیے۔" دین محمد دھیرے دھیرے خود کو اعتماد کی فضا میں سانس لیتا محسوس کرنے لگا۔ مصاحب علی شاہ کی پلکیں نم اور ہونٹوں پر ایک الوہی مسکراہٹ تھی۔ کچھ دیر پہلے کا اضمحلال ان کے سن رسیدہ چہرے پر سے غائب ہوگیا تھا۔ ایک محسوس کی جانے والی خوشی تھی جو ان کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ کاؤچ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں زبیدہ خاتون کو خبر کردوں۔۔۔ نمانی نے بہت درد کاٹ لیا اس خوشی پر سب سے زیادہ حق اسی کا ہے۔" انہوں نے بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ کچھ ہی پل میں فردوس کے مل جانے کی خبر نے پوری

حویلی میں ایک ہلچل سی مچا دی۔ ہر چہرہ خوشی سے کھل اٹھا بڑی اماں نے اسی پل شکرانے کے نوافل کی نیت باندھ لی۔ زبیدہ خاتون کے ممتا کے مارے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں۔ کہنے کو وہ تائی تھیں مگر پانچ سال کی بن ماں کی بچی کو اپنی اولاد سے محروم گود میں پالا تھا اس کے ناز اٹھائے تھے اور آج ان کی ممتا کو قرار آگیا تھا جس نے ان کی خالی جھولی آباد کی تھی۔ پورے ایک سال بعد اس کے مل جانے کی خبر نے انہیں نہال کر دیا تھا۔ ان کا بس چلتا تو دین محمد کو اپنی آنکھوں پر بٹھا لیتیں۔

☼ ☼ ☼

پھر بعد کے معاملات بہت تیزی سے رونما ہوئے مصاحب علی شاہ گھر کے دیگر افراد کے ہمراہ دین محمد کی رہنمائی میں فردوس کو مینٹل اسپتال سے گھر لے آئے۔ ایک سیاہ گھور تاریک رات کا اختتام روشن صبح پر ہوا تھا۔ ہر دکھ فراموش ہو چکا تھا۔ زبیدہ خاتون کی ممتا کا کلیجہ شبنمی ہوگیا۔ بڑی اماں کو ان کے طویل سجدوں کا انعام مل گیا۔ مصاحب علی شاہ' مکرم علی شاہ اور ان کے پانچ جوان سپوتوں کی گردنیں دوبارہ اٹھ گئیں معمولات اپنی ڈگر پر آگئے تھے۔

بس ایک ننھا سا گلابی وجود تھا جو ماں کے وجود سے بے خبر اپنی پیدائشی محرومی سے بے نیاز زندگی کے ہنڈولے میں جھول رہا تھا۔ سانس لے رہا تھا مسکرا رہا تھا۔ نیند اور جاگنے کے عمل سے گزر رہا تھا۔ ڈاکٹر زینت بانو کی ماتا بھری بانہوں نے اس وجود کو اپنے سینے میں سمو لیا۔

"تم میری بیٹی ہو۔۔۔ تمہاری ان پیاری آنکھوں کی مسکراہٹ کے لیے میں کچھ بھی کروں گی۔۔۔ ہر رشتہ لالچ اور غرض کا نہیں ہوتا۔۔۔ دنیا دیکھے گی۔" اسے اپنی آغوش میں سمیٹ کر وہ اسے اپنے سونے آنگن میں لے آئی تھیں اور پھر ہر گزرتے دن اس معصوم بچی نے ان کے وجود سے زندگی کشید کی تھی اور اب ایک خوب صورت وجود میں ڈھل چکی تھی۔ ڈاکٹر زینت کو

ان کی محنت کا پھل مل گیا۔ وہ حسن صورت اور حسن سیرت میں بے مثال تھی۔

٭ ٭ ٭

یہ ایک ڈیرے کا منظر تھا۔ عجیب ہاؤ ہو کا سماں تھا۔ پھر ایک کمرے کا منظر کچھ واضح ہوا۔ ایک نسوانی وجود رسیوں سے جکڑا ہوا ایک چارپائی پر نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔ تین نشے میں ڈوبے انسان نما درندے کمرے کے کھلے دروازے سے اندر آئے دروازہ بند کردیا گیا اور ایک ایسا شیطانی کھیل شروع ہوگیا کہ جس سے انسانیت کا سر شرم سے جھک جائے۔

ایک دلدوز چیخ کے ساتھ وہ اٹھ گئی۔ اس کی نیند سے بوجھل آنکھوں سے سوتے میں بھی آنسو رواں تھے۔

یہ اس نے کیا دیکھا تھا۔ یہ کیا تھا جو اس کے لاشعور نے اسے دکھایا تھا۔ اس کا وجود کانپ رہا تھا' پسینے سے شرابور مرتعش سینے پر ہاتھ رکھ کر جیسے اس نے خود کو تسلی دی تھی۔ اس پل کمرے کا دروازہ کھلا اور مما نے اندر جھانکا۔

"کیا ہوا مہو۔ تم ٹھیک تو ہو نا۔" وہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

"کیا ہوا تمہیں میری جان۔" اس کی ناگفتہ بہ حالت پر وہ گھبرا کر اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

"مما۔ بہت عجیب خواب تھا۔ بہت عجیب۔" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"کیا دیکھ لیا میری جان۔" مما نے اس کے کانپتے وجود کو سینے میں بھر لیا اسے کچھ تقویت محسوس ہوئی اس نے ایک طویل سانس لیا۔

"پانی۔" مما نے آگے بڑھ کر جگ سے پانی گلاس میں انڈیلا اور اس کے ہونٹوں سے لگایا' اس نے دو گھونٹ پی کر گلاس پرے دھکیل دیا اور پھر کچھ بے ربطی کے ساتھ اپنا خواب بیان کیا۔

مما نے بہت چونک کر اس کے معصوم چہرے کی طرف دیکھا ماضی کی کچھ پرچھائیاں ان کی سوچ کے پردے پر لہرائیں انہوں نے سر جھٹکا۔

"کچھ نہیں جسٹ آ ڈریم میرا بچہ۔ ڈونٹ وری۔" انہوں نے اسے تھپکتے ہوئے بہلایا۔ اسے لٹا کر کمبل درست کرتے ہوئے انہوں نے اس کی پیشانی چومی اور کمرے کا دروازہ بند کرتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ جسٹ ڈریم کہہ کر وہ مہرالنساء کو تو بہلا سکتی تھیں مگر خود کو نہیں۔ ماضی اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ ان کے سامنے آ ابھرا ہوا تھا۔

٭ ٭ ٭

آج پھر علینہ اور سلمٰی نہیں آئی تھیں۔ کبھی کبھی مہو کو ان پر سخت غصہ آتا جب وہ اہم لیکچر مس کر کے چھٹیاں مناتی تھیں۔ وقار الحسن کی مصروفیت کے باعث آج اسے پوائنٹ سے آنا پڑا اور پوائنٹ نے ہمیشہ کی طرح یونیورسٹی کی بیک سائیڈ دیوار کے ساتھ اتار دیا۔ اس نے اپنی بکس ایک ہاتھ میں سنبھالیں ایک ہاتھ سے دوپٹا درست کرتی وہ بس سے نیچے اتری۔ اس کے قدموں میں واضح تیزی تھی۔

"رک جاؤ۔ کچھ دیر کے لیے رک جاؤ۔" بھاری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اس نے پلٹ کر دیکھا بابا خادم علی سیاہ کمبل کی بکل مارے اس سے کچھ فاصلے پر تھے۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا کوئی اور موجود نہیں تھا۔ یقیناً" ان کا مخاطب وہی تھی۔ اس کا دل وحشت سے جیسے رک گیا۔ اس دن بھی ان کی نظروں کا عجیب سا تاثر اسے دہلا گیا تھا اور آج تو انہوں نے حد ہی کردی تھی۔

"یہ دورے کی کیفیت میں نہ ہوں۔" اس نے کمبل سے جھانکتی خون رنگ آنکھوں کو ایک لحظہ دیکھا۔

"دیکھو۔ اگر تم مری بات نہیں سنو گی تو بہت کچھ ایسا ہے جو اوجھل رہے گا۔ ساری عمر بھٹکو گی مگر اپنا اصل نہ ڈھونڈ پاؤ گی۔" کرخت لہجے میں واضح تنبیہہ تھی اس کے تیزی سے بڑھتے قدم رک گئے۔ تعجب

بے یقینی اور ہراس اس کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔

"آپ نے کیا کہا؟" خوف کے باوجود اس کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے۔

"اپنا اصل جانتی ہو....؟ نہیں جانتی نا!" بابا خادم بالکل ہوش مندوں کی طرح باتیں کر رہے تھے۔ آج ان کی جھولی میں پتھر تھے نہ اس کے گرد کوئی ہجوم۔

"نہیں.... میں نہیں جانتی۔" مہو کا لہجہ جانے کیوں بھیگ گیا۔

"میں جو جانتا ہوں.... میں بتاؤں گا تمہیں مجھ سے ڈرو نہیں کچھ وقت دو مجھے۔" بابا خادم اس کے قریب چلے آئے۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی یونیورسٹی کے گیٹ سے اسٹوڈنٹ آجا رہے تھے۔ کبیر چاچا کا کولڈ اسپاٹ اس وقت بند تھا روڈ تقریباً سنسان تھا۔ اس کی نظریں خادم بابا کے چہرے پر ٹک گئیں۔

"کیا آپ واقعی جانتے ہیں کہ میں کون ہوں؟" مہو بے یقینی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ہاں.... میں وہ جانتا ہوں جو اگر ظاہر ہو جائے تو ایک قیامت برپا ہو جائے۔ اس خون رنگ داستان کا اول سے آخر تک گواہ ہوں میں.... اگر میں تمہیں یہ کہوں کہ یہ پاگل پن کا سوانگ بھی میں نے اسی لیے بھرا کہ یہ داستان اس کے اصل مالک تک پہنچا سکوں تو کیا تم یقین کرو گی؟" خادم بابا کا لہجہ ٹھہرا ہوا اور آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

مہرالنسا حیرت و بے یقینی کے ساتھ ان کے چہرے کو تکے جا رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ پاؤں برف کی سلوں کی طرح جم گئے تھے۔ دل کی دھڑکن کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔

"جج.... جی۔" لرزتی ہوئی آواز میں وہ بس اتنا ہی کہہ پائی۔

"چلو.... اس درخت کے سائے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" خادم بابا اتنا کہہ کر آگے ہو لیے تو چار و ناچار اس کو بھی اپنے قدم ان کی طرف بڑھانے پڑے۔ وہ سامنے درخت کے سائے میں بچھے بنچ پر براجمان ہو گئی جبکہ خادم بابا اس سے قدرے فاصلے پر نیچے گھاس پر بیٹھ گئے۔ وہ اس طرح ترچھے رخ پر بیٹھے تھے کہ دور سے دیکھنے والے کو محسوس نہ ہو سکے کہ وہ مہرالنساء سے ہمکلام ہیں۔

"وقت کم ہے اور بات طویل.... پھر بھی میں مختصر کر کے بتاتا ہوں۔ بہت اونچا گدی نشین گھرانا تھا۔ بے حد دولت کی ریل پیل۔ پھر مانو جہاں دولت ہو جائیداد ہو.... خوشیاں ہوں وہاں حاسد پیدا ہو ہی جایا کرتے ہیں۔ زمینوں کا معمولی سا جھگڑا دولت کے بل بوتے پر مخالفین کے درمیان ایک محاذ کی شکل اختیار کر گیا۔ ایک طرف سیدوں کا گدی اور پیری مریدی والا گھر تو دوسری طرف چوہدریوں کے اونچے شملے۔ برابری کی ٹھن گئی تھی۔ چوہدریوں نے پانی کا ناکہ توڑا اور مصاحب علی شاہ کی کھڑی فصل زیر آب آگئی اس بات پر ان کے فرزندوں کی انا اور غیرت کو شدید دھچکا پہنچا۔ انھوں نے رات کی تاریکی میں چوہدریوں کے ڈیرے پر دھاوا بولا۔ دونوں طرف سے فائرنگ ہوئی اور چوہدری حشمت کے دو بیٹے لڑائی میں کام آگئے۔"

وہ سانس لینے کو رکے۔ مہرالنساء عجیب انداز میں ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے ابھی تک اس طویل تمہید میں کوئی بات خود سے مربوط نظر نہیں آئی تھی۔ مگر وہ خاموش بیٹھی تھی کہ اسے اپنے اصل کی تلاش تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ آخر وہ کیا راز تھا جو خادم بابا کے سینے میں چھپا تھا۔ وہ راز جو اس کی ماما نے بھی کبھی نہیں کہا تھا۔ وہ راز جس پر سے پردہ اٹھتے ہی بہت کچھ انہونا وقوع پذیر ہو سکتا تھا۔

"بیٹوں کی موت نے چوہدری حشمت کو پاگل ہی کر ڈالا۔ اس کے کرگوں نے دن دیہاڑے سادات کے گھر پر شب خون مارا۔ اس دن مصاحب علی شاہ کے دادا کا عرس تھا۔ گھر میں کچھ مریدنیاں اور مصاحب علی شاہ کی بڑی بہو موجود تھی۔ چوہدری حشمت کے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر چھری کے پے در پے وار کر کے سید زادی کو قتل کر دیا ایک دو مریدنیاں بھی لپیٹ میں آگئیں۔ گھر میں توڑ پھوڑ بھی کی گئی۔ جس طرح سے بھی وہ اپنے جنون کا مظاہرہ کر سکتے تھے انھوں نے کیا اور وہاں سے چلے گئے یہ سارا خونی منظر ایک پانچ سالہ معصوم بچی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے حواس کھو بیٹھی.... کھلی آنکھوں سے اپنی ماں کا بے دردی سے ہونے والا قتل ہمیشہ کے لیے اس کے حواس چھین گیا۔ حویلی پر موت کا سا سماں طاری ہو گیا۔ عرس کی مبارک تقریب ماتم کدہ بن گئی۔ مریدین غصے اور اشتعال سے بھرے ہوئے تھے لیکن مصاحب علی شاہ نے سختی سے روک دیا تھا کہ کوئی بھی کسی قسم کا منفی اقدام نہیں اٹھائے گا۔ قل کے بعد تمام مریدین بجھے دل اور شدید صدمے سے دوچار اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ زندگی گزرتی گئی لیکن سب سے بڑا نقصان اس کا ہوا جس نے ماں بھی کھوئی اور ذہن بھی۔ جس کے نازک اعصاب اس ناقابل بیان منظر کی ہولناکی نے کچل کر رکھ دیے۔ وہ پھر کبھی حواسوں میں نہ آسکی۔"

خادم بابا کی نظریں سامنے روڈ پر چلتی آتی جاتی گاڑیوں پر مرکوز تھیں مگر پورا دھیان مہرالنساء کی طرف تھا جو اب بے چینی سے پہلو بدلتی عجیب انداز سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ابھی تک وہ اس داستان کا متن نہیں سمجھ پائی تھی۔

"مصاحب علی شاہ نے مریدین کو تو خاموش کروا دیا تھا لیکن دل تھا کہ جل رہا تھا۔ ایک ان دیکھی آگ تھی جو دن رات ان کے وجود کو خاکستر کیے دے رہی تھی اور ایک دن انہیں موقع مل ہی گیا۔ چوہدری حشمت ایک دن اچانک ان کی راہ میں آگیا۔ کچھ تلخ جملوں کے تبادلے کے ساتھ ہی مصاحب علی شاہ کے جلتے دل نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ پورا میگزین چوہدری حشمت کی چھاتی میں اتارا سڑک پر خون کا دریا بہہ گیا اور یہ خون مصاحب علی شاہ کے جلتے دل پر شبنم کی طرح گرا تھا۔ آج قصاص پورا ہوا تھا چوہدری حشمت کے ساتھ دو باڈی گارڈ بھی تھے۔ جنہیں چوہدری سے وفاداری کا انعام موت کی صورت میں مل گیا تھا۔ مصاحب علی شاہ بہت پرسکون انداز میں اپنی حویلی کی طرف چلے گئے اور پھر سکون ہی سکون رہا۔ چوہدری حشمت کی موت نے چوہدریوں کی کمر توڑ دی.... وہ کمزور ہو گئے تھے۔ چوہدری کے دو بیٹے اور ایک بھتیجا اپنے روز مرہ معمولات میں مصروف ہو گئے۔ وہ عمر اور تجربے میں بہت چھوٹے تھے۔ سیدوں کا مقابلہ کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی مگر نفرت اور اشتعال ہر لحظ گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھ رہا تھا۔ مصاحب علی شاہ کو اب کسی مخالف کا سامنا نہیں تھا۔ سو علاقے میں بس ان ہی کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔

ایک طویل عرصہ گزر گیا۔ امن کا دور دورہ تھا وقت پر فصلوں کی کٹائیاں اور محنت مل جانے کی وجہ سے علاقے کے لوگ خوشحال ہوتے چلے گئے تعلیم میں بھی اضافہ ہوا۔ ہاں تو میں اب اصل موضوع کی طرف آرہا ہوں یقیناً" تمہیں حیرت ہو گی کہ میں آخر یہ سب تمہیں کیوں بتا رہا ہوں تو وجہ اس کی یہ ہے کہ تم بھی اسی کہانی کا ایک حصہ ہو....."

"بابا.... مجھے ابھی تک اس کہانی کی سمجھ نہیں آئی۔" مہرالنساء نے بے چین نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"جانتا ہوں.... پھر بھی توجہ سے بات سن لو خود بخود سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ وہ معصوم بچی جو اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ وقت کے چلتے دھارے نے اسے اس قدر حسن عطا کیا کہ دیکھنے والی نظر مبہوت ہو کر رہ جائے۔ وہ اس وقت تک باہوش نظر آتی تھی جب تک بات نہیں کرتی تھی کیونکہ اس کی باتیں پانچ سال کی بچی کے برابر تھیں وہ صرف گھر میں ہی نہیں اکثر گھر سے باہر کھلے بندوں گھومتی۔ سب جانتے تھے کہ بی بی کا ذہنی توازن اس کی ذہنی استعداد درست نہیں سو ہر طرح خیال رکھا جاتا..... گاؤں والے بہت عزت اور تکریم کے ساتھ پیش آتے کہ بے شک وہ بے حواس تھی۔ مگر سید زادی ہونے کے ناتے وہ سب کے لیے لائق عزت و احترام تھی۔ پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن اور اپنے دادا کی لاڈلی تھی' وہ مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا مقدر کیا کھیل کھیلنے والا تھا۔ ایک دن وہ اکیلی گاؤں سے فاصلے پر موجود کھیتوں کی طرف چلی گئی اور راستہ بھول گئی۔ شام کے سائے

گھرے ہو رہے تھے۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا، مگر دور دور تک کوئی ذی روح نہیں تھا۔ اچانک کچے راستے کی طرف سے گرد اڑتی ہوئی دکھائی دی۔ کوئی جیپ بہت تیز رفتاری سے اس کی طرف بڑھ رہی تھی پھر سب کچھ آناً "فاناً" ہو گیا اسے چلتی گاڑی میں گھسیٹ لیا گیا سختی سے اس کے ہاتھ اور منہ کو باندھ دیا گیا اور پھر وہ چوہدریوں کے ڈیرے پر پہنچادی گئی۔

بند دروازے کے ایک طرف وہ بے یارومددگار بے ہوشی کی حالت میں چارپائی پر بندھی ہوئی تھی اور دوسری طرف دالان میں بچھی چارپائیوں پر چوہدری حشمت کے بیٹے اور بھتیجا اپنے حواریوں کے ہمراہ شراب نوشی اور قہقہوں میں مصروف تھے۔ آج ان کی مراد بر آئی تھی۔ مصاحب علی شاہ کی وہ رگ ان کے ہاتھ میں آئی تھی جسے کاٹ کر وہ انہیں ہمیشہ کے لیے ایک زندہ لاش میں تبدیل کر سکتے تھے

وہ انسان نہیں جانور تھے آدم خور درندے جنہوں نے اس بے حواس معصوم بچی کے ساتھ ظلم و جبر کی انتہا کردی۔ رات کے آخری پہر وہ اسے شدید زخمی حالت میں وہیں پھینک کر اپنی حویلی چلے گئے۔ ڈیرے پر صرف ایک ملازم رہ گیا جس نے ظلم اور ہوس کے اس ہولناک منظر کو دیکھا تھا۔ اتنا ظلم اتنی بے دردی انسانیت کی ایسی تذلیل کہ اپنے انسان ہونے پر شرم آنے لگے ـــــ اس نے ڈیرے سے گاؤں کی طرف دوڑ لگادی۔ اس وقت صرف ایک شخص تھا جس کے پاس جا کر وہ مدد مانگ سکتا تھا۔ اس نے اس کے گھر کا دروازہ دھڑ دھڑایا۔

صورت حال نے اسے کس قدر مضطرب اور برا فروختہ کردیا تھا۔ اس کی لرزتی ٹانگیں اور سلب ہوتے ہوئے حواس بمشکل مجتمع ہوئے اور اس نے اس شخص کو اپنے ہمراہ لیا۔ راستے میں اسے تفصیل بتائی تو جیسے اس پر بھی مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ یہ وہ قیامت تھی جو ابھی اس بچی کی ذات پر گزری تھی مگر یہ قیامت اس وقت کئی گنا زیادہ وارد ہوتی تھی اگر اس بچی کی ذات سے وابستہ لوگوں کے کانوں تک بھنک بھی پڑ جاتی۔ وہ دونوں ڈیرے پر پہنچے۔ اس زخمی بچی کے بے پردہ وجود کو ڈھکا اور راتوں رات اسے وہاں سے ہٹا لیا گیا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ درندے بار بار اس معصوم کو اپنے اپنے جبر کی لپیٹ میں رکھنے کی چاہ لے کر آئیں گے اور اسے موجود نہ پا کر بہت مشتعل بھی ہوں گے۔ ممکن ہے کہ اس کی جان بھی لے لیں لیکن اس کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ وہ اس معصوم کو اس حالت میں وہیں پڑا رہنے دیتا۔ اس نے اپنے قابل اعتماد ساتھی کے حوالے یہ ذمہ داری لگادی کہ اس بچی کو کسی محفوظ مقام پر پہنچادیا جائے۔ خود وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اس کی عدم موجودگی اس کے گھٹیا مالکن کے ذہنوں میں فکر و اندیشہ پیدا کرسکتی تھی۔" وہ خاموش ہوگئے اور پرخیال نظروں سے مہرالنساء کا چہرہ دیکھنے لگے۔ جس پر ناقابل بیان تاثرات رقم تھے۔

"اس لڑکی کے ساتھ ظلم کرنے والے کتنے افراد تھے؟" اس نے کسی خیال کے تحت چونک کر پوچھا۔

"تین۔" مہرالنساء کا دل دھک سے رہ گیا۔ خواب کا منظر بہت واضح ہوگیا تھا۔ چارپائی پر رسیوں سے بندھا نازک سا وجود تین نشے میں بدمست درندہ نما انسان۔ شیطان کا ہولناک رقص جنوں۔

"او میرے خدا!" اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کا سر چکرا گیا تھا۔ قدرت کوئی عقدہ حل کرنا چاہ رہی تھی۔ جو یہ سب کچھ اس کے سامنے آرہا تھا۔ بابا خادم علی نے گہری نگاہوں سے اس کے چہرے کی سراسیمگی کو دیکھا تھا۔

"کیا ہوا؟ تم کیوں پریشان ہوگئی؟"

"بابا۔ جو کچھ آپ بتا رہے ہیں کچھ دن پہلے میں نے خواب میں دیکھا ہے وہ سب کچھ اور میں ان چہروں کو بہت اچھی طرح پہچان سکتی ہوں اگر وہ میری نظروں کے سامنے آجائیں تو۔" وہ کچھ بے چین کچھ پرجوش تھی۔

"لگتا ہے برائی کا انجام قریب ہی ہے۔" بابا خادم علی کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ کچھ پل کو دونوں کے درمیان خاموشی در آئی۔

"بابا پھر کیا ہوا؟" داستان میں اب ایک محسوس کی جانے والی تبدیلی نے مہو کو پوری طرح متوجہ کرلیا تھا۔

"پھر اس شخص کے ساتھی نے آگے کی ذمہ داری سنبھال لی۔ ایک سال تک اس بچی کو روپوش رکھا گیا۔ جب وہ تخلیق کے مرحلے سے بخیر و خوبی گزر گئی تو اسے بحفاظت دوبارہ مصاحب علی شاہ کی حویلی یعنی اس کے گھر پہنچادیا گیا۔ کسی کو بھی پتا نہ چلا قیامت سادات کی حویلی کے دروازے تک آکر واپس چلی گئی۔ اس معصوم کو خود بھی پتا نہیں چلا کہ اس کے وجود پر کیا عذاب اترے۔" بابا خادم علی کی آنکھیں دور خلا میں کسی ان دیکھے نقطے پر مرکوز تھیں۔ مہرالنساء نے عجیب انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

"یعنی وہ ظلم و جبر اس ایک رات پر محدود نہیں رہا پوری زندگی پر محیط ہوگیا؟" اس نے جیسے خود کلامی کی۔

"ہاں لیکن قدرت نے اس ظلم کے عوضانے میں اس بے حواس بچی کو اولاد کی صورت میں جو رحمت دی۔ وہ رحمت بہت مہربان ہاتھوں میں نازو نعم سے پلی۔ اور اس کی ماں نے بھی اپنی باقی کی زندگی بہت سکون سے گزاری رہ گئے یہ دونوں گواہ تو انہوں نے خود کو اس ذمہ داری سے عہدہ برا نہیں کیا۔ انہوں نے اس بے حواس عورت کی اولاد کی پل پل خبر گیری کی تاکہ جب وہ مخصوص عمر کو پہنچے تو اسے اس کی ماں کے بارے میں بتادیا جائے۔ وہ بے نام و نشان نہ رہے۔"

ان کی بات کے اختتام تک مہرالنساء کے وجود پر جیسے سکوت سا طاری ہوگیا کچھ انہونا سامنے آنے والا تھا۔ کچھ ایسا جو اس کے وجود کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کردینے والا تھا۔ اس نے نگاہیں بابا خادم علی کے چہرے پر گاڑ دیں اور سماعت ان کی جنبش لب پر۔

"اس بچی کو کس نے پالا بابا؟" الفاظ بمشکل اس کے لبوں سے ٹوٹے۔

"ایک مسیحا نے۔ وہ سب کے لیے مہربان تھیں مگر ہم پر تو انہوں نے ایسا احسان کیا کہ ہماری سات نسلیں بھی اس احسان کا بدلہ نہیں اتار سکتیں۔"

"کون ہیں وہ بابا؟" مہرالنساء پر پل بھر پہلے منکشف ہوچکا تھا بس وہ تصدیق چاہتی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ دل بہت شدت سے دعا مانگ رہی تھی کہ جو انکشاف اس پر ہوا ہے وہ غلط ثابت ہوجائے۔ وہ جھوٹ ہوجائے۔

"ڈاکٹر زینت بانو" یہ نام مہربانی کی انتہا کا تھا مگر اس پل اس کی سماعت پر کسی بارود کی طرح مہلک ثابت ہوا تھا۔

"چھن چھن چھناک۔" سینکڑوں آئینے ٹوٹے تھے اور ان کی باریک کرچیاں اس کے وجود و روح اس کی آنکھوں میں آچبھی تھیں۔ ارد گرد کیا تھا سب ہی کچھ آنکھوں کے سامنے سے غائب ہوگیا تھا۔ یہاں تک کہ اسے اپنا وجود بھی بے وزن خلا میں ڈولتا محسوس ہو رہا تھا۔ انہونی ہو چکی تھی۔ یہ مرگ تھی یا مرگ سے پہلے جاں کنی کا عالم۔ سانس چل رہی تھی یا اندر ہی اندر آری چل رہی تھی۔ اسے اپنے حلق میں اپنے ہی زخموں سے رستے خون کا نمکین ذائقہ محسوس ہو رہا تھا۔

دور کہیں کوئی خارش زدہ کتا بلبلا رہا تھا۔ اسے خود میں اور اس کتے میں کچھ خاص فرق محسوس نہیں ہوا۔ کیونکہ اس معاشرے کے لیے اس کا وجود ایک خارش زدہ کتے سے بھی زیادہ قابل نفرت تھا۔ وہ بینچ سے اٹھی کتابیں گود سے پھسل کر نیچے گر گئیں۔ بابا خادم علی اسے شاید پکار رہے تھے مگر ان کی آواز اس کے وجود میں مرتعش زلزلے میں کہیں ڈوب گئی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی وہ گھر تک کیسے پہنچی۔ کوریڈور کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے اسے لگا جیسے آسمان یک دم زمین پر آگرا اس بلند و بالا پرشکوہ کوٹھی کی دیواریں یکدم ایک دوسرے کے گلے سے لگ گئیں۔ دھڑام کی پرزور آواز کے ساتھ اس کا وجود زمین پر آرہا۔ وقار الحسن اسی پل باہر نکلے۔ اسے اس حالت میں وہاں گرا پا کر وہ جیسے بدحواس ہی ہوگئے۔ مما بھی گھر پر موجود نہیں تھیں انہوں نے اس کے سر کو دھیرے سے اٹھا کر گود میں رکھا اس کے گال تھپکے۔

"مہو..... مہو آنکھیں کھولو۔ کیا ہوا مہو؟" وہ

مسلسل اسے مخاطب کر رہے تھے اسے جھنجوڑ رہے تھے مگر جواب نہیں ملا۔ انہیں فوراً ہی کسی غیر معمولی نوعیت کا احساس ہو گیا۔ ایک پل بھی ضائع کیے بنا انہوں نے اسے بانہوں میں اٹھایا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ ایک اسپیڈ سے گاڑی بھگاتے شہر کے معروف اسپتال پہنچ گئے۔

اس کے کمزور اعصاب اس قیامت کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ جو اچانک اس کے وجود و روح پر نازل ہوئی تھی۔ اسے نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا اور اتنا شدید اٹیک تھا کہ وہ اس وقت انتہائی نگہداشت میں تھی۔ ڈاکٹر زینت کو وقار الحسن نے فون پر اطلاع دی وہ بے چاری افتاں و خیزاں چلی آئی تھیں۔ وقار الحسن کوریڈور میں ادھر سے ادھر چکر کاٹتے شل وجود کے ساتھ یہ سوچ رہے تھے کہ۔

"ایسا کیا ہو گیا تھا جو مہو کے لیے اس قدر ناقابل برداشت ثابت ہوا۔" نظران کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ ڈاکٹر زینت بھی ایک طرف رکھے صوفے پر بیٹھی مسلسل پریشان کن سوچوں کے زیر اثر تھیں۔ دن گزر گیا رات اپنی سیاہ صورت لیے پوری کائنات کو اپنی ہولناکی کی لپیٹ میں لینے آ گئی سوچوں کا ایک بحر بیکراں تھا جو وقار الحسن کو اپنے بھنور میں لپیٹے ہوئے تھا۔ اس کی پلکیں ایک دوسرے میں یوں پیوست تھیں جیسے اب کبھی بھی وا نہیں ہوں گی۔ سخ بستہ لب نیلاہٹ آمیز رنگت اختیار کر چکے تھے۔ وقار الحسن اس کے بیڈ کی پٹی پر بیٹھ گئے۔ برف کی طرح ٹھنڈا ہاتھ اپنے حرارت سے بھرپور ہاتھ میں تھام کر انہوں نے اس کے چہرے پر نظریں جماویں۔

"مہو! ایسا مت کرو۔ دیکھو کتنی دیر ہو گئی جانتی ہو اٹھارہ گھنٹے ہو گئے تمہیں اس طرح خاموش لیٹے۔ تمہیں پتا ہے نا جب تم خاموش ہوتی ہو تو سب سے زیادہ تکلیف مجھے ہوتی ہے۔ تم آنکھیں کیوں نہیں کھولتیں۔ مجھے بتاؤ تو سہی آخر ایسا کیا ہو گیا جس نے تمہارا یہ حال کر دیا پلیز جاؤ۔ آنکھیں کھول دو۔" دھیرے دھیرے اس کے قریب بیٹھے وہ سرگوشیوں میں اس سے باتیں کر رہے تھے۔ ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ صبح کاذب کا جھٹپٹا پھیل رہا تھا جب انہوں نے اسے چیک کیا۔ تو اس کی نبض اور دل کی دھڑکن کی رفتار کسی حد تک تسلی بخش تھی۔ انہوں نے سکون کا سانس لیا ڈاکٹر زینت بانو آدھی رات تک تو یہیں تھیں پھر کسی ایمرجنسی کی صورت میں اسپتال چلی گئیں۔ انہوں نے انہیں بھی فون کر کے تسلی دی۔ دوسری ڈرپ اختتامی مرحلے پر تھی جب اس کے نحیف وجود میں بہت ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔

"خدایا تیرا شکر۔" دل محبت سے لبریز تھا انہیں خود پر اختیار نہ رہا بہت دھیرے سے اس کی پیشانی چوم لی۔ پھر فجر کی نماز ادا کرنے کے لیے بیڈ کے ایک طرف جائے نماز بچھالی۔

مہر النساء کی آنکھیں بہت بوجھل انداز میں کھلیں پھر بند ہو گئیں اس نے دھیرے سے گردن موڑ کر ایک نظران کو دیکھا پھر پلکیں موند لیں وہ نماز ادا کر کے دوبارہ اس کے قریب چلے آئے۔ بہت دھیرے سے اس کے چہرے پر بکھرے بالوں کو پیچھے کر کے انہوں نے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھا "مہر" خوابناک لہجے میں محبت کی محسوس کی جانے والی مٹھاس تھی۔ مگر جواباً "اس کی آنکھیں نہیں کھلی تھیں۔ آنکھوں کے گوشوں سے دو گرم آنسو پھسل کر کان کی لوؤں تک چلے گئے۔ یہ خاموش درد تھا جو بہہ رہا تھا۔ وقار الحسن کا دل کٹ گیا۔

"مہر نہیں۔ مت کرو ایسا پلیز۔ کچھ کہو بولو نا" وقار الحسن کے لہجے میں محبت کے ساتھ ساتھ فکر و تردد گھل گیا۔

"کتنا پیار کتنی محبت ہے ان کے لہجے میں میرے لیے۔ اور جب یہ حقیقت جان لیں گے تو سب سے زیادہ نفرت بھی ان ہی کو ہو گی مجھ سے۔ میرا وجود ایک غلیظ پھوڑے کی طرح ہے اس معاشرے میں قابل نفرت ناقابل علاج و توجہ۔" اسے اپنے وجود سے گھن آنے لگی۔ کراہیت محسوس ہونے لگی۔

"میں صرف غلیظ اور قابل نفرت ہی نہیں وحشت بھی ہوں۔ یہ سب کچھ سن کر بھی زندہ ہوں۔ موت نے بھی مجھے قبول نہیں کیا اف خدایا۔"

"مہر۔" وقار الحسن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"آپ پلیز یہاں سے چلے جائیں۔ پلیز وکی بھائی۔" اس کی آنکھوں میں التجا تھی درد تھا عجیب سا سوز تھا کہ وہ برا بھی نہیں مان سکے بس خاموشی سے باہر نکل گئے۔ اسی پل ڈاکٹر زینت روم میں داخل ہوئیں انہوں نے وقار الحسن کو روکنا چاہا مگر وہ کترا کر باہر نکل گئے۔ ڈاکٹر زینت نے ایک نظران کے چہرے کے غیر معمولی تاثر کو دیکھا اور پھر کچھ بھی کہنے کا ارادہ ملتوی کرتی ہوئی مہر کے قریب چلی آئیں۔

"مہر۔" انہوں نے بہت دھیرے سے اسے پکارا تھا۔

"کیسی ہو بیٹا مہر" اس کے بالوں میں ممتا بھری انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے انہوں نے بڑے دلار سے پوچھا اور اس بار اسے خود پر اختیار نہیں رہا۔ آنسوؤں کا ایک سیل رواں تھا جو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلا تھا۔ وہ گھبرا اٹھیں۔ اس کے نازک وجود کو اپنی آغوش میں بھر کر اس کی کمر سہلاتے ہوئے انہوں نے کئی بار اس کو پکار ڈالا۔

"مما۔ مما میں کون ہوں مما؟ مجھے بتائیں نا؟" اس کے رندھے ہوئے گلے سے نکلتی آواز بمشکل ان تک پہنچی۔

"میری بیٹی ہو، میری جان ہو میرا بچہ" ڈاکٹر زینت اس کے اس طرح رونے پر تڑپ اٹھی تھیں۔

"مما۔ مما خدا کے لیے مجھے بتا دیں۔ میرا دل پھٹ جائے گا مما۔"

"میں۔۔ میں بہت حقیر ہوں نا بہت بے مایہ۔ مجھ جیسے بچوں کو تو پیدا ہونے سے پہلے مار دیا جاتا ہے یا پیدا ہوتے ہی کچرے کے ڈھیر پر پھینک دیا جاتا ہے مما۔ آپ کا دل کیوں اتنا بڑا ہے کہ اس غلاظت کو اٹھا کر گھر لے آئیں مما۔" وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ ڈاکٹر زینت سناٹے میں آ گئیں۔

"کس نے کہا یہ؟ بکواس ہے یہ سب۔ غلط کہا جس نے بھی۔ تم میرے جگر کا ٹکڑا ہو میری زندگی ہو میری جان ہو تم۔" اسے خود میں سمیٹنے کی ناکام کوشش کرتے وہ خود سسک پڑیں۔

"کیا میری ممتا پر کوئی شک گزرا۔ کبھی ایسا لگا کہ میرے پیار میں کوئی کمی ہے۔ میری جان میرے لیے تم اور وکی ہی تو ہو میرے جینے کا بہانہ۔ خدا کا واسطہ میری ممتا کا امتحان نہ لو میری بچی یہ آنسو ماں کا کلیجہ چیر دیں گے۔"

"مما۔ مما۔۔ کون تھی جو مجھے جنم دے کر آپ کی گود میں ڈال گئی کتنی بے حس تھی اگر۔۔ اگر آپ نہ ہوتیں تو وہ مجھے کچرے کے ڈھیر پر پھینک دیتی نا۔ اپنا گناہ چھپانے کے لیے مما۔۔" وہ ان کے سینے میں منہ چھپائے پھپھک کر روئے جا رہی تھی۔

"نہیں میری بچی اسے تو اپنی ذات کا ہوش بھی نہیں تھا۔ فرشتوں کی طرح پاک اور معصوم تھی وہ۔ چاند جیسی صورت تھی اس کی۔ وہ تو بے حمیت درندوں کے ہتھے چڑھ گئی۔ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم سے بھی ناآشنا تھی وہ اور تمہارے وجود کو ہست سے زیست میں لانے تک بے نیاز اور لاعلم۔ اسے کچھ مت کہو اور پھر وہ انجانے میں مجھ پر احسان کر گئی میری گود میں تم جیسی بیٹی ڈال گئی میرا بچہ۔" ڈاکٹر زینت نے بہت میٹھے لہجے میں اسے سمجھایا۔

"یعنی خادم بابا نے ٹھیک بتایا جو بھی بتایا مما۔"

"یہ خادم بابا کون ہیں؟" "تمہیں کہاں ملے؟ تمہیں کس طرح جانتے ہیں؟ اور یہ سارا معاملہ کس طرح ان کے علم میں ہے؟" انہوں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

"انہوں نے اسی شہر میں پاگل بن کر میری خبر گیری کی اور اب جب انہیں محسوس ہوا کہ مجھے حالات سے باخبر ہونا چاہیے تو انہوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا مما۔"

"لیکن اس شخص کا نام تو دین محمد تھا جو فردوس جہاں کو میرے پاس لے کر آیا تھا۔" انہوں نے جیسے خود کلامی کی۔

"ابھی تم ریسٹ کرو میری جان اپنے ذہن کو بالکل

پرسکون رکھو۔ کسی قسم کا بوجھ مت ڈالو اوکے۔"
انہوں نے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔ وہ جانتی تھیں اس وقت سینکڑوں سوال اس کے ذہن میں کلبلا رہے ہوں گے۔ بہت بے چینی بے سکونی در آئی ہوگی روح میں۔ اپنے اصل کو پہچان لینے کے بعد جان لینے کی آرزو بری طرح مچل رہی ہوگی۔ مگر اس وقت وہ خود اس قدر منتشر ——— تھیں کہ اس کے کسی سوال کا جواب نہ دے پائیں۔ سو اسے لٹا کر انہوں نے ہلکے ہلکے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ اس کے اعصاب تو ویسے ہی مضمحل تھے جلد ہی وہ دوبارہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ اس کی طرف سے اطمینان کر لینے کے بعد وہ باہر نکل آئیں۔ کوریڈور میں ایک طرف رکھے صوفے پر بیٹھے متفکر سے وقار الحسن تیزی سے ان کی طرف بڑھ آئے۔

"مما کیسی ہے اب وہ؟" انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔

"سو گئی ہے ابھی۔ بہت برا ہو گیا ہے وکی، میرے تصور سے بھی برا۔ یہ خادم علی کون ظالم ہے جس نے اس کی رگوں میں سچائی کا زہر اتار دیا پل میں مجھ سے چھین کر بے گانہ کر دیا اس شخص نے میری بچی کو۔" ڈاکٹر زینت کی پلکیں بھیگتی چلی گئیں۔

"آپ کیا کہہ رہی ہیں مما؟ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا۔ مہر بھی کچھ نہیں بتاتی ہے کہ میں سمجھ سکوں۔" وقار الحسن قدرے جھنجلا گئے۔ وہ ان کو لیے وہیں بڑے صوفے کی طرف بڑھ گئیں۔ سچائی کیا ہوتی ہے اور حقیقت کس قدر بدصورت ہو سکتی ہے یہ آج وقار الحسن کی سمجھ میں آیا تھا۔ ان کے ذہن میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ آنکھیں ساکت ایک نقطے پر ٹکی ہوئی تھیں اور دھڑکنیں رک سی گئی تھیں۔ ان کے وہم و گمان کے کسی گوشے میں بھی نہیں تھا کہ کل سے مہر کس جذباتی اذیت سے دوچار ہے۔ یہ سب سن کر اگر وہ زندہ تھی تو اس کی مضبوط دل پاور داد کے قابل تھی۔

"وکی۔ اس شخص کو ڈھونڈو۔ اسے تلاش کرو۔ کیوں آیا وہ ہماری زندگیوں میں زہر گھولنے۔ کس نے اسے اجازت دی میری آغوش کا پھول نوچنے کی وکی مجھے جیتے جی مار دیا اس نے۔" ڈاکٹر زینت بری طرح رو رہی تھیں۔ دل تو وقار الحسن کا بھی بین کر رہا تھا مگر وہ مرد تھے رو نہیں سکتے تھے۔ ورنہ آج کے بعد ان کی مہو کب وہ پہلے جیسے مہو رہے گی۔ سچ جان لینے کے بعد اجنبیت کی ایک دیوار ان کے درمیان خود بخود حائل ہو گئی تھی۔ اس میں جذبوں کی بے ساختگی مر جائے گی اور اس کی جگہ احسان مندی کا احساس جنم لے لے گا۔ رشتوں کا خلوص برطرف کر کے وہ نئے رشتوں کی طرف متوجہ ہو جائے گی۔ ان کا ذہن مسلسل ادھیڑ بن میں لگا ہوا تھا۔

"مما اس نے کیا بتایا وہ خادم علی نامی شخص کہاں ملا تھا اسے۔"

"وہ یونیورسٹی ایریا میں پاگل بابا کے نام سے مشہور ہے اور وہیں ہوگا۔" ڈاکٹر زینت نے انہیں بتایا۔

"آپ مہر کا خیال رکھیے میں ابھی جاتا ہوں۔" وہ آج یہ گتھی سلجھانے کی غرض سے روانہ ہو گئے تھے۔ یونیورسٹی کے قریب پہنچ کر انہیں خادم علی کو تلاش کرنے میں چنداں مشکل پیش نہیں آئی روڈ کے کنارے لگے درخت کے نیچے وہ پتھروں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف دکھائی دیے۔

انہوں نے گاڑی قدرے فاصلے پر روکی۔ پیدل چلتے ہوئے ان کے قریب آ گئے۔ "آپ ہی خادم علی ہو۔" انہوں نے دھیمے سے اس شخص کو مخاطب کیا۔ جھکا ہوا سر اوپر اٹھا کر انہوں نے ایک نظر نووارد کو دیکھا اور پھر سے پتھروں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"بابا میں بہت پریشان ہوں۔ پلیز آپ بتائیں آپ ہی خادم علی ہیں۔" وقار الحسن نے کہا تو ایک مسکراہٹ ان کے ہونٹوں کو چھو گئی۔

"بڑے بے صبر ہو۔ ہمیں دیکھو کتنے سالوں سے پاگل پن کی بکل اوڑھے کسی معصوم کی خبر گیری میں لگے رہے اور تم سے چند لمحے برداشت نہیں ہوئے ہاں میں ہی ہوں خادم علی۔ جانتا تھا تم ضرور آؤ گے۔"

"آپ۔ مجھے کیسے جانتے ہیں آپ؟" وہ قدرے حیران ہوئے۔

"ایک دن ایک ریسٹورنٹ کے باہر دیکھا تھا مہر النساء بی بی کے ساتھ۔"

"اوف۔ بابا آپ نے مہر کو یہ سب کچھ کیوں بتایا۔ کیا آپ نہیں جانتے تھے کہ آپ کے اس انکشاف کا اس پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ شدید صدمے سے اس کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔ کوئی بھی ناقابل تلافی نقصان کر سکتی تھی وہ اپنا۔ آخر آپ نے ایسا کیوں کیا بابا؟" وقار الحسن کا لہجہ قدرے سخت ہو گیا۔

"نہیں۔ وہ جس کی اولاد ہے اس میں انتہا کا صبر ہے اس کے وجود میں سید عورت کا خون دوڑ رہا ہے۔ بہت برداشت بہت صبر ہوتا ہے سید زادیوں میں۔"

"بابا یہ کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہر انسان کی ہمت اور برداشت دوسرے سے الگ ہوتی ہے اور آپ نے اسے سچائی بتا کر ہم سب سے دور کر دیا ہے، اسے غیر بنا دیا ہے۔" وہ جھنجلائے ہوئے تھے۔

"دھیرج بیٹا جی۔ وہ تم لوگوں کی ہی ہے تم لوگوں سے کبھی الگ نہیں ہوگی۔ بس ایک فرض تھا جو پورا کرنا تھا وہ کر دیا۔" خادم علی کا لہجہ اور انداز بہت پرسکون تھا۔

"کمال ہے یہ سب کچھ آپ نے کس بنیاد پر اسے بتایا کیا آپ کا یہ خیال تھا کہ وہ اپنی ماں کا انتقام لینے اٹھ کھڑی ہوگی اگر آپ مجرموں کو سزا دلوانا چاہتے تھے تو یہ سب مصاحب علی شاہ کو بتاتے مہر جیسی بے بس اور معصوم لڑکی بھلا کیا کر سکتی تھی۔" وقار الحسن کا استفسار یقیناً "ٹھوس تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ وہ کوئی انتقام نہیں لے سکتی لیکن اس کے ذہن میں کلبلانے والے بے شمار سوالات کو جواب مل چکے ہیں۔ پھر اس کے ساتھ تم ہو تم بہت سے معاملات میں اس کا سہارا بن جاؤ گے۔ رہ گئی مصاحب شاہ جی کی بات تو وہ کچھ عرصہ پہلے طویل علالت کے بعد وفات پا گئے ہیں اور مکرم علی شاہ جی بھی بستر مرگ پر پڑے ہیں۔ سو ان کو بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے آج تک وہ لاعلم رہے ہیں آئندہ بھی لاعلم ہی رہیں تو بہتر ہے۔"

"کمال ہے آپ کی کوئی لاجک میری عقل میں نہیں آرہی۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مہر کو اس گھر میں کوئی خاندانی حیثیت مل سکے گی؟ میرا خیال ہے ایسا ہونا ناممکن ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو مگر میرا خیال یہ ہے کہ اگر کوشش کی جائے تو اسے اس کا حق دلایا جا سکتا ہے۔" خادم علی پرخیال انداز میں بولے۔

"سادات کے پیری مریدی والے گھر میں ایک ناجائز بچی کے لیے کبھی جگہ نہیں نکل سکے گی بابا۔ آپ نے بہت برا کیا محض ایک مفروضے کی بنا پر آپ نے مہر کی زندگی کو جہنم بنا دیا۔ اسے اس کے اپنے بھی قبول نہیں کریں گے اور وہ ہم میں بھی اجنبیت محسوس کرتی رہے گی پوری زندگی اف خدایا۔" وقار الحسن کڑھ کر رہ گئے۔

"مہر بیٹا اس وقت کہاں ہے؟"

"اسپتال میں ہے نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے اس کا۔"

"میں شام میں اسپتال آؤں گا پھر بات کریں گے ابھی تم جاؤ۔" خادم علی یک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک پتھر اٹھا کر سامنے سے آتی گاڑی کی طرف اچھال دیا پھر ہنستے ہوئے مخالف سمت کی طرف بھاگ گئے۔ وقار الحسن بوجھل دل کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے اور اسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

علینہ، سلمی اس کے سرہانے بیٹھی اس کا آدھا دماغ چاٹ چکی تھیں۔ "بھئی سچ بتاؤ کہیں مس آف ہاشم درانی کے ہجر کی وجہ سے تو یہ سب نہیں ہوا؟" سلمی نے کافی بلند سرگوشی کی۔

"آہستہ یار میرے کان ذاتی ہیں۔" علینہ نے کان پر ہاتھ رکھ کر ہانک لگائی۔

"ارے یہ تو بتاؤ وہ ہینڈسم کدھر ہے تمہارا تو بس بہانا تھا اصل میں تو ان سے ملاقات کرنی تھی میں نے۔" سلمیٰ بڑے ناز سے کندھے اچکا کر بولی تو مہر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"کون؟ وکی بھائی۔"

"ہائے ٹھاہ کر کے لگا یہ نام سیدھا میرے معصوم دل پر۔" ایک آنکھ بند کر کے اس نے خاصے لوفرانہ انداز میں کہا۔

"اف توبہ سلمیٰ خوف خدا کرو کہاں وہ ڈیسنٹ سا انسان اور کہاں تم اول جلول۔" علینہ تو آج اس غریب کا اچھا خاصا دل دکھانے پر آگئی تھی۔

"دیکھو جب کیوپڈ کا تیر چل جائے تو ہم جیسے اول جلول ڈیسنٹ لوگوں کے منظور نظر بن جاتے ہیں پوائنٹ ٹو بی نوٹڈ مائی لارڈ" سلمیٰ نے علینہ سے کہتے ہوئے آخری جملہ مہر کو کہا جو ان کی نوک جھوک کی وجہ سے کافی بہتر محسوس کر رہی تھی۔ اسی پل ڈاکٹر زینت کمرے میں آگئیں اس کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ دیکھ کر ان کے دل کو جیسے سکون سا ہو گیا۔

"کیا منگواؤں بچوں تم دونوں کے لیے۔"

"آنٹی یہ بیگم ٹھیک ہو جائیں تو پی سی میں ڈنر کرا دیجیے گا بس زیادہ مہنگی ڈیمانڈ ہم نہیں کرتے۔" سلمیٰ نے گویا احسان کرتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر زینت ہنس پڑیں۔

"اوکے بیٹا جی ڈن۔ میری بچی جلدی ٹھیک ہو جائے بس یہ دعا کرو۔"

"ان شاء اللہ آنٹی بہت جلدی ہٹی کٹی ہو جائے گی فکر نہ کریں آپ" علینہ نے انہیں ا ہی انداز میں تسلی دی۔ پھر کافی دیر تک وہ دونوں اس کے ساتھ رہیں اپنی باتوں سے اس کا دل بہلاتی رہیں۔ شام میں وقار الحسن بھی آگئے تو مہر نے اپنے آپ کو خاصا بہتر محسوس کیا۔ علینہ اور سلمیٰ کے جانے کے بعد وقار الحسن نے ڈاکٹر زینت کو خادم علی کے بارے میں بتا دیا اور یہ بھی بتایا کہ کچھ دیر میں وہ یہاں آنے والا ہے۔

"ٹھیک ہے پتا چل جائے گا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔" ڈاکٹر زینت نے اپنے ذہن کو آنے والے وقت کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ وقار الحسن نے دروازہ کھولا دو شخصیات کھلے دروازے سے اندر در آئیں۔ ان میں سے ایک کو وقار الحسن پہچانتے تھے جبکہ دوسری شخصیت ڈاکٹر زینت بانو کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ بابا خادم علی کے ساتھ آنے والی دوسری شخصیت وہی تھی جس نے آج سے کئی سال پہلے ایک مجبور بے کس لڑکی کو اس کے خاندان سے ملانے کے لیے اس کی گود کا گوہر ان کی جھولی میں ڈالا تھا۔ دین محمد آج بھی اسی طرح مضبوط اعصاب کا مالک دکھائی دے رہا تھا اور پر عزم بھی۔

"السلام علیکم! ڈاکٹر صاحبہ" اس نے آگے بڑھ کر بے حد عقیدت سے سلام کیا تھا۔ اس کے لہجے میں محسوس کیا جانے والا خلوص اور احترام ڈاکٹر زینت بانو کو ڈھارس دے گیا یقیناً" وہ کسی بری نیت سے نہیں آئے تھے۔ انہیں اپنے اعصاب خاصے پرسکون ہوتے محسوس ہوئے۔ ایک سکون آمیز سانس ان کے سینے کی قید سے آزاد ہوئی۔

"آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔" انہیں مسلسل خاموشی سے اپنی طرف دیکھتا پا کر دین محمد نے کہا۔

"نہیں دین محمد تمہیں کیوں نہ پہچانوں گی میں۔۔۔ تمہیں کس طرح بھول سکتی ہوں میں بھلا۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ کمرے میں موجود تمام نفوس سب کچھ جانتے ہوئے بھی جیسے لاعلمی کی حالت میں تھے۔ بیڈ پر دراز وجود سب کی توجہ اور سب کے خیالات کا مرکز تھا۔

"آیئے بیٹھیے پلیز۔۔۔" ڈاکٹر زینت نے انہیں بیٹھنے کو کہا۔

"ہمیں معاف کر دیجیے گا کہ ہم آپ کی زندگی میں بے سکونی اور بے چینی پیدا کرنے کا سبب بنے۔ یقیناً" ہماری یہ مداخلت آپ کے خیال میں بے جا اور فضول ہے۔ بظاہر اس کا کوئی خاص مقصد نظر نہیں آتا۔ لیکن مہر النساء بیٹا کو اس کا اصل مقام اس کا حق دلانے کے لیے یہ ضروری تھا۔" بابا خادم علی بہت رسان سے بولے۔

"آپ جانتے ہیں بابا کہ یہ سب کس قدر مشکل ہے ایک طرف اس گھر کے افراد اس کے وجود کو تسلیم نہیں کریں گے اور اگر تسلیم کر بھی لیں تو ہم کبھی بھی مہر سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ یہ ہماری زندگی ہے۔" وقار الحسن کا جذباتی لہجہ مہر کی روح تک کو شانت کر گیا۔

"مصاحب علی شاہ کا سارا خاندان بکھر چکا ہے۔ فردوس کے تین بھائی ہمیشہ کے لیے ملک سے باہر چلے گئے ہیں۔ مکرم علی شاہ کی شدید علالت کے باعث گدی کا سارا انتظام اکرام علی شاہ صاحب نے سنبھال لیا ہے جو فردوس کا سب سے چھوٹا بھائی ہے اور فردوس جہاں خود بھی بہت علیل ہیں۔ مجھے دین محمد نے کہا تھا کہ میں مہر النساء کی خیر خبر رکھوں اور جب یہ جوان ہو جائے تو اسے سب حقیقت بتا دی جائے۔ تاکہ یہ اپنے مجرموں کو خود سزا دے اپنی ماں سے مل سکے۔" بابا خادم علی اسی طرح پرسکون لہجے میں بولے۔

"کیا فردوس کے مجرم ابھی تک زندہ ہیں۔" ڈاکٹر زینت نے پوچھا۔

"جی ہاں۔۔۔ نہ صرف زندہ ہیں بلکہ اسی طرح شیطانی افعال میں سرگرم ہیں کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں۔" بابا خادم علی نے جواب دیا۔

"ہم چاہتے ہیں مہر النساء بیٹا جب ٹھیک ہو جائے تو یہ ہمارے ساتھ اس علاقے میں جائے۔ اپنی جائیداد کا حق وصول کرے۔ اس حویلی میں ا حقدار کی حیثیت سے رہے۔" دین محمد نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"اس معاملے کو مہر پر چھوڑا جاتا ہے کہ وہ کیا فیصلہ کرتی ہے۔ وہ جو فیصلہ بھی کرے گی ہمیں قبول ہو گا۔ یوں بھی دین محمد ایک ماں کا سچا پیار دینے کے باوجود میں نے کبھی اس بات کو فراموش نہیں کیا کہ میرے آنگن کا یہ گلاب کسی اور کی امانت ہے۔ میں اس پر کوئی حق نہیں رکھتی ہوں۔"

ڈاکٹر زینت کی پلکیں نم ہو گئیں۔

"مما" مہر النساء اٹھ کر بیٹھ گئی۔ زینت بانو تیزی سے اس کے قریب آئیں۔

"جی میرا بچہ۔"

"فیصلے کا اختیار میرے پاس ہے نا۔ کیا آپ سب مجھے یقین دلائیں گے کہ میں جو بھی فیصلہ کروں وہ قبول کر لیا جائے گا۔" مہر کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔ وہ عام دنوں کے مقابلے میں آج خاصی مستحکم اور بہادر دکھائی دے رہی تھی۔

"ہاں بیٹا آپ جو کہو گے بالکل اسی طرح ہو گا۔" دین محمد نے اسے یقین دلایا۔

"تو مما جانی۔ سب سن لیں۔ مجھے اس علاقے یا جائیداد سے کوئی دلچسپی نہیں جس کا مجھے حقدار ٹھہرایا جا رہا ہے۔ مجھے کسی سے کوئی حق نہیں لینا رہا مجرموں کا

سوال۔ وہ میرے مجرم نہیں تھے وہ انسانیت کے مجرم تھے انہوں نے انسانیت کو پامال کیا۔ اپنے انسان ہونے کی تذلیل کی سو قدرت خود ان کا فیصلہ کرے گی۔ ایک ہوش و حواس سے بیگانہ عورت کے وجود سے میں نے جنم لیا۔ جسے اولاد کے وجود کا ممتا کے احساسات کا نہ کوئی تجربہ تھا اور نہ ہی وہ جانتی تھی۔ پھر بھی کس رشتے پر اسے ماں کہوں۔ وہ تو آج بھی اسی طرح ہے نہ مجھے جانے گی نہ پہچانے گی۔ ممتا کیا ہوتی ہے میں نے سرد راتوں میں آپ کے سینے سے لگ کر محسوس کیا ہے مما۔ میری ذرا سی تکلیف پر آپ کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ میری بیماری میں ساری ساری رات جاگ کر آپ نے میرا خیال رکھا اپنے وجود کی زندگی اور حرارت سے ایک دو دن کی بچی کو اتنی طاقت فراہم کی کہ آج دنیا کا مقابلہ کر سکتی ہوں میں۔ میں نہیں جانتی جنم دینے والی کون تھی میں یہ جانتی ہوں کہ میری ماں اگر کوئی ہے تو وہ آپ ہیں۔ میں آپ سے کبھی الگ نہیں ہو سکتی مما۔" اس نے تھک کر سانس لیا۔ پلکیں بھینچ کر آنسو حلق میں اتارے اور پھر سر اوپر اٹھایا اس کے اردگرد موجود سبھی اس کی طرف خاموش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"آج سے تقریباً" ڈیڑھ سال پہلے آپ کی ڈائری سے میں یہ جان گئی تھی مما کہ میں آپ کی سگی اولاد نہیں ہوں۔ میں نے وہ دن قیامت کی طرح گزارا تھا اگلے دن میں نے اپنے ایک ٹیچر ہاشم درانی صاحب کو اپنا مسئلہ بیان کیا تو انہوں نے مجھے ماں لفظ کا مفہوم سمجھایا۔ انہوں نے کہا ماں درد اٹھا کر جنم دیتی ہے۔ پھر تم میں قطرہ قطرہ زندگی انڈیلتی ہے کسی امرت کی طرح تم وہ قطرہ قطرہ پی کر زندگی جیتے ہو۔ اور شعور پاتے ہو۔ اور میں تو دو ماؤں کے بیچ کی کہانی تھی ایک نے جنم دیا۔ دوسری نے قطرہ• قطرہ زندگی مجھ میں انڈیل کر مجھے جینے کی طاقت دی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کبھی اپنی ماں کے وجود میں تمہیں خود سے الگ کچھ محسوس ہوا میں نے کہا نہیں تو انہوں نے کہا پھر یہی تمہاری ماں ہیں۔ مما۔ مجھے آپ کے سوا کچھ بھی نہیں چاہیے۔" وہ

زینت بانو کے سینے میں منہ چھپا کر بلک بلک کر رو پڑی۔ وقار الحسن اس کے آنسوؤں سے تڑپ اٹھے اور اس کے دوسری جانب بیٹھ کر اپنا بازو اس کے کندھے پر پھیلا دیا۔ بابا خادم علی اور دین محمد دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"لگتا ہے ہمارا فرض پورا ہو گیا خادم علی۔ خدا نے فردوس بی بی کے دکھ کا بڑا پیارا اجر دے دیا۔" دین محمد کا لہجہ بھیگا ہوا مگر پر اطمینان تھا۔ اس مکمل منظر میں ان کی جگہ نہیں تھی سو وہ دونوں خاموشی سے وہاں سے چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

اگلے آنے والے دنوں میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ چوہدری کے ڈیرے میں آگ لگ گئی تھی اور کئی افراد زندہ جل گئے۔ ٹی وی پر یہ خبر آئی اور وقار الحسن ٹھٹک گئے۔ یہ سب سن کر زینت بانو اور مہر النساء بھی عجیب سی کیفیت سے دوچار ہوئیں۔

قدرت نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد زینت بانو حج کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب روانہ ہو گئیں۔ مہر النساء کی زندگی کے کینوس کے الجھے ہوئے سب رنگ ایک مکمل تصویر میں ڈھل چکے تھے۔ وہ بہت سے اتار چڑھاؤ سہہ چکی تھی۔ ان گزرتے دنوں میں وقار الحسن بہت اچھی طرح جان گئے تھے کہ مہر النساء کے دل میں ان کے لیے محبت کا وہ رخ کبھی نہیں آئے گا جو وہ چاہتے ہیں۔ سو وہ سب محبت سب جذبے انہوں نے اپنے دل میں چھپا لیے کہ جو عزت جو تکریم مہو کی آنکھوں میں ان کے لیے تھی وہ عزت و تکریم وہ کبھی نہیں کھونا چاہتے تھے۔ اور محبت صرف پانا ہی تو نہیں محبت اپنے محبوب کی خوشی میں خوش ہو جانے کا نام بھی تو ہے۔ اور مہر کی خاطر تو وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔

اپنے کمرے کی کھڑکی سے انہوں نے نیچے لان میں گھاس پر چہل قدمی کرتی مہو کو بھرپور توجہ سے دیکھا اور کھڑکی کا پردہ برابر کرتے ہوئے پلٹ گئے۔ ||

ایک صبح میں اپنے دوست شیراز کے ساتھ گھر واپس آیا اس وقت تقریباً" 7 بجے ہوں گے۔ ہم روزانہ ہی صبح کی واک کے لیے جایا کرتے تھے۔

"معاف کیجیے گا سر ایک شخص آپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔" دروازے کھولتے ہوئے چوکیدار نے اطلاع دی۔

"تم نے اس سے پوچھا نہیں کہ وہ کون ہے؟ تم نے اسے اندر انتظار کرنے کے لیے نہیں کہا" ایک ڈیٹیکٹو ہونے کی وجہ سے اکثر لوگوں کا میرے پاس آنا جانا رہتا تھا اس لیے مجھے اس بات کی حیرانی نہیں ہوئی۔

"جی ہاں سر میں نے اسے ویٹنگ روم میں بٹھایا تھا اور وہ آدھے گھنٹے تک بیٹھا آپ کا انتظار کرتا رہا۔ وہ بہت بے چین اور بے قرار سا لگ رہا تھا اور اس آدھے گھنٹے میں وہ سو بار آپ کا استفسار کرتا رہا پھر مجھ سے مخاطب ہوا کہ تمہارے سر گھر میں آتے بھی ہیں یا نہیں؟ میں یہاں بند کمرے میں بہت گھٹن محسوس کر رہا ہوں میں بعد میں آجاؤں گا۔ یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا' اس نے مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا بس فوراً" ہی تیز ہوا کی طرح تیزی سے نکل گیا۔" چوکیدار نے جلدی جلدی بتایا۔

"او کے او کے تم نے اپنا فرض پورا کیا زیادہ پریشان نہیں ہو اس کا کام ہو گا تو وہ واپس آجائے گا۔" چوکیدار کو یوں شرمندہ دیکھ کر میں نے اسے تسلی دی۔

پھر ہم دونوں دوستوں نے مل کر انڈے پراٹھے کا مزے دار ناشتا کیا یوں تو روزانہ ہی ہم ساتھ ساتھ مارننگ واک کرتے لیکن چونکہ آج چھٹی کا دن تھا تو ساتھ ہی ناشتا کرنے بیٹھ گئے۔

اکثر چھٹی کا دن بھی نام کا ہی ہوتا اس دن بھی کئی کلائنٹس اپنے کیس لے کر میرے پاس آجاتے تھے یوں یہ دن بھی ایسے ہی گزر جاتا لوگوں کی خدمت کر کے نہ صرف زندگی بسر کرنے کے لیے پیسہ میسر ہو جاتا ساتھ ساتھ ایک روحانی مسرت نصیب ہوتی۔

ناشتا کرنے کے بعد شیراز سے کافی گپ شپ رہی اور جب وہ چلا گیا تو میں کمپیوٹر آن کر کے بیٹھ گیا۔ فارغ اوقات میں یہ میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ نیٹ پر دوستوں سے چیٹ کرنے کے ساتھ معلومات بھی حاصل ہو جاتیں۔

کچھ وقت ہی گزرا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی میں نے دروازہ کھولا تو اپنے سامنے ایک لمبا چوڑا نوجوان کھڑا پایا۔ ڈارک گرے کلر کے سوٹ میں وہ کافی ہینڈسم نظر آرہا تھا۔

"معاف کیجیے سر میں اندر آسکتا ہوں۔" وہ بہت اپ سیٹ نظر آرہا تھا اور نہایت جلدی میں تھا۔

"جی اندر تشریف لائیے پلیز بیٹھیے۔" میں سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو صبح میری غیر حاضری میں آیا تھا۔

"میرے خیال میں آپ شاید پوری رات نہیں سوئے۔" اس کی بڑی بڑی سوجی ہوئی آنکھوں کو بغور دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"مجھے نہیں معلوم میں کیا کروں میری زندگی تو ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"دیکھیے میں ایک ڈاکٹر ہوں آپ اپنا پورا معاملہ مجھ سے کہیے۔ مجھ سے چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں مسٹر عفان۔"

اپنا نام میرے منہ سے سن کر وہ کرسی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا کہا آپ نے؟ کیا آپ میرا نام جانتے ہیں؟" اسے کافی حیرت ہوئی۔

"میرے خیال سے کوئی بھی شخص آپ کے نام سے واقف ہو سکتا ہے۔ آپ نے جو ٹوپی پہنی ہوئی ہے اس پر آپ کا نام لکھا ہوا ہے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اوہ! تو آپ نے اس طرح جان لیا۔ مجھے یقین ہے آپ میرا مسئلہ ضرور حل کرلیں گے۔" اس کی آنکھوں میں ایک امید تھی ایک آس تھی۔

"دیکھیں آپ کے ساتھ جو بھی مسئلہ درپیش ہے

مجھے صاف صاف بتایئے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میری شادی کو تین سال گزر چکے ہیں پچھلے تین سالوں سے میری بیوی اور مجھ میں بہت پیار تھا اور ہم خوشگوار زندگی گزار رہے تھے۔ ہماری زندگی میں کوئی ٹینشن نہیں تھی لیکن پچھلے دو مہینے سے اچانک اس کے رویے میں تبدیلی آگئی ہے میرے اور اس کے درمیان میں کوئی آگیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اچانک اس کا رویہ میرے ساتھ کیوں اتنا بدل گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ دل سے مجھے پیار کرتی ہے اس لیے اس بارے میں اس سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا ہو سکتا ہے میرا یہ وہم ہو اور بعد میں مجھے پشیمانی ہو میں اپنی بیوی کو کھونا نہیں چاہتا۔" وہ بہت افسردہ نظر آرہا تھا۔

"پلیز آپ مجھے تفصیل سے بتایئے۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا جب تک معاملے کی تہہ تک نہیں پہنچ جاتا۔"

"اروبا سے جب میں پہلی بار ملا وہ صرف بائیس سال کی خوب صورت عورت تھی جو کم عمری میں ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ اس کے شوہر کا نام سعد تھا وہ اچھا وکیل تھا ان کا ایک بچہ بھی تھا لیکن ایک کار ایکسیڈنٹ میں دونوں کی موت ہو گئی میں نے خود ان کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ دیکھے ہیں۔ اس کا شوہر اس کے لیے کافی جائداد چھوڑ کر مرا تھا لیکن میں نے اس سے شادی اس لیے نہیں کی کہ وہ ایک امیر کبیر آدمی کی بیوہ تھی بلکہ وہ ایک مخلص اور پیار کرنے والی عورت تھی اور جیسی بیوی کی میں نے خواہش کی تھی اس میں وہ تمام گر تھے۔

شادی کے بعد اس نے اپنے ہی بنگلے میں رہنے کی خواہش ظاہر کی چونکہ اس کا شوہر اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس کے مرنے کے بعد تمام تر جائداد صرف اس کی تھی۔ اس بنگلے کے علاوہ بھی اس کے شوہر کے دو اور بنگلوز تھے۔

میں ایک تاجر ہوں اور کاروبار کے غرض سے اکثر میرا دوسرے ملکوں میں آنا جانا لگا رہتا ہے لیکن چھٹیاں ہمیشہ اپنی فیملی کے ساتھ گزارنا پسند کرتا ہوں، ہم اچھا وقت گزار رہے تھے جب ہماری شادی ہوئی تو میری بیوی نے اپنی تمام تر جائداد کی رکھوالی میرے ذمہ کر دی۔ ان تین سالوں میں کبھی اس نے اپنی جائداد کے بارے میں مجھ سے استفسار نہیں کیا لیکن کچھ ہفتے پہلے اس نے مجھ سے پچاس ہزار روپے کا مطالبہ کیا۔

"تمہیں اتنی رقم کس لیے چاہیے؟" میں نے پوچھا۔

"اوہ! تم ہوتے کون ہو مجھ سے پوچھنے والے" اس کا رویہ میرے ساتھ اچانک بدل گیا۔

"تم صرف میرے بینکر ہو اور تم جانتے ہو کہ بینکر سوال نہیں کیا کرتے۔"

میں نے پچاس ہزار روپے کا چیک اس کو کاٹ کر دے دیا۔ مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ اس نے مجھ سے رقم مانگی یہ سب کچھ اسی کا ہے میں نے کبھی اس کی جائداد پر نظر نہیں رکھی لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ وہ مجھے اس قابل نہیں سمجھتی کہ وجہ بیان کر سکے۔

میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ ہمارے کاٹیج کے کچھ ہی فاصلے پر ایک کاٹیج اس کا اور بھی ہے۔ وہاں جانے کے لیے جو سڑک جاتی ہے وہیں سے میرے آفس کا آنا جانا ہے۔ یہ کاٹیج کافی عرصے سے خالی پڑا ہے۔ پچھلے جمعے کی شام جب میں اس راستے سے آفس سے گھر کی طرف آرہا تھا کہ غیر ارادی طور پر میرے قدم چلتے چلتے اس کاٹیج کے قریب آکر رک گئے۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہاں ایک کھڑکی سے مجھے ایک جھانکتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کس کا چہرہ تھا لیکن کسی انسان کا نہیں نظر آرہا تھا بالکل زرد رنگ کا چہرہ تھا اچانک وہ چہرہ غائب ہو گیا۔ میں تقریباً" پانچ سے دس منٹ تک وہیں بت بنا کھڑا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ کیا یہ حقیقت تھی یا میرا وہم؟

میں یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ چہرہ کسی عورت کا تھا یا آدمی کا۔ اتنی ہمت نہیں تھی کہ کاٹیج کے اندر جا کر

معلوم کروں لیکن دل میں تجسس پیدا ہوا تو حقیقت جاننے کے لیے اس کاٹیج کے بالکل برابر والے کاٹیج کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہاں ایک لمبی اور دبلی پتلی سی عورت ماتھے پر بل لیے کھڑی تھی اور سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"کون ہو؟ کس لیے آئے ہو؟" مجھے اس طرح چپ دیکھ کر وہ غصہ سے آگ بگولا ہو گئی۔

"میں آپ کا پڑوسی ہوں۔ میرا کاٹیج آپ کے کاٹیج کے برابر میں ہے میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں اگر آپ میری مدد......"

ابھی میری بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے ایسے دروازہ بند کر دیا جیسے میں کوئی بھکاری ہوں اور اس سے بھیک مانگ رہا ہوں۔ میں اپنے گھر واپس آ گیا۔

گھر آ کر بھی میں سوچ میں پڑا رہا۔ دماغ بار بار اس کھڑکی کی طرف پہنچ جاتا جہاں پر وہ چہرہ نظر آیا تھا اور پھر اس عورت کی بدسلوکی پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔

رات کو جب میں نے اپنی بیوی سے اس کاٹیج کے بارے میں پوچھنا چاہا تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا وہ سو چکی تھی یا پھر سونے کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔

اسی سوچوں میں غرق اچانک میری آنکھ لگ گئی رات کے نجانے کون سے پہر میری آنکھ کھلی تو مجھے محسوس ہوا کہ میری بیوی جاگ رہی ہے میں نے ادھ کھلی آنکھ سے اس کو دیکھا۔ موم بتی کی روشنی میں اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور وہ بہت تیز تیز سانس لے رہی تھی اس سے پہلے کہ میں اٹھ کر اس سے کچھ کہتا وہ آہستگی سے بیڈ سے اٹھی میں نے جلدی ادھ کھلی آنکھیں بند کر لیں ایسا ہو گیا جیسے بے خبر سو رہا ہوں۔ وہ خاموشی سے اپنے ہاتھ میں لیمپ لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں 20 منٹ تک اسی طرح بیڈ پر لیٹا اس کے آنے کا انتظار کرتا رہا یہ سوچ کر کہ شاید وہ کچن میں پانی پینے یا کچھ کھانے گئی ہو گی۔ لیکن جب آدھا گھنٹہ گزر گیا تو میں نے اٹھنا چاہا لیکن سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے قدموں کی آہٹ سن کر پھر آنکھ بند کر کے لیٹ گیا۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔

"روبا اس وقت تم کہاں گئی تھیں؟" اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے پوچھا۔

میرے پوچھنے کی دیر تھی کہ اس نے چلانا شروع کر دیا۔ اس کی انگلیاں تھرتھرا رہی تھیں۔

"مجھے کمرے میں گھٹن محسوس ہو رہی تھی تو اگر تھوڑی دیر کے لیے باہر چلی گئی تو کیا آفت آ گئی۔" اس کی اس بدتمیزی پر میں تلملا اٹھا ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔

مجھے اس دن کاروبار کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا تھا لیکن میں بہت ڈسٹرب تھا اور اپنے کاروبار پر پوری توجہ نہیں دے پا رہا تھا اور اس کی وجہ میری بیوی تھی۔ ناشتے کی میز پر بھی خاموشی رہی۔ مشکل سے کوئی لفظ ایک دوسرے کو کہا گیا۔ ناشتے کے بعد میں گھر سے باہر نکل گیا مجھے ایک بجے کی فلائیٹ لینی تھی۔ باہر نکلتے ہی میرے قدم خود بخود اس کاٹیج کی طرف بڑھ رہے تھے اور بے خودی میں اس کھڑکی کی جانب رک گیا جہاں پر وہ زرد چہرہ نظر آیا تھا ابھی میں کھڑکی کو تک ہی رہا تھا کہ اس کاٹیج کا دروازہ کھلا اور آپ یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں یہ دیکھ کر کتنا شوکڈ ہوا کہ اس دروازے سے میری بیوی نکلی اس کا گلابی چہرہ اس وقت بالکل سفید ہو رہا تھا جیسے کہ سارا خون بدن سے نچوڑ لیا گیا ہو اور آنکھوں میں ایک خوف تھا۔

"تو یہ وہی جگہ ہے نا جہاں پر تم رات کو آئی تھیں۔" میں نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو۔" وہ زور سے چلائی۔

"مجھے یقین ہے کہ کل رات تم یہاں آئی تھیں وہ کون سے لوگ ہیں جن سے ملنے تم یہاں ایک گھنٹے تک رہیں۔" مجھے اس کے چلانے پر بہت افسوس ہو رہا تھا۔

"آج سے پہلے میں یہاں کبھی نہیں آئی" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

"تم کس طرح کہہ سکتی ہو کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" میں چلایا۔

"تمہاری آواز ہی تمہاری بات کا ساتھ نہیں دے رہی۔ وہ کون سا راز ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو؟ میں اس کاٹیج کے اندر جاؤں گا اور اس معاملے کی تہہ تک پہنچوں گا۔"

"نہیں نہیں پلیز... خدا کے واسطے۔" وہ اپنے جذبات قابو نہ رکھ سکی اور ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔

جیسے ہی میں دروازہ کی جانب بڑھا اس نے ہذیانی کیفیت میں میری آستین سے مجھے گھسیٹا اور مجھے واپس گھر کی طرف لے جانے لگی۔

"میں تمہیں اندر نہیں جانے دوں گی۔" وہ چلائی۔ "مجھے کچھ دن دو میں سب کچھ تمہیں بتا دوں گی لیکن اندر نہیں جاؤ میری پوری زندگی کا سوال ہے۔"

اس کے الفاظوں نے جیسے میرے پاؤں جکڑ لیے۔

"میں تم پر ایک شرط پر یقین کر سکتا ہوں کہ یہ کھیل اب ختم ہو جانا چاہیے جو کافی دنوں سے چل رہا ہے۔ تم کو مجھ سے وعدہ کرنا ہو گا تم سب کا سب میرے علم میں لاؤ گی۔"

"مجھے یقین ہے تم مجھ پر یقین کر لو گے۔" وہ چلائی اور میری آستین کو پکڑ کر وہ گھسیٹتی ہوئی اپنے گھر کی طرف بڑھی۔

گھر آ کر بھی میں بہت پریشان رہا۔ بار بار وہ زرد چہرہ میری نگاہوں میں گھوم جاتا تھا آخر کھڑکی میں وہ شخص کون ہے اور میری بیوی سے اس کا کیا تعلق ہے۔

دوسرے دن بھی میری بیوی کا رویہ میرے ساتھ کچھ اچھا نہیں تھا اور تیسرے دن بھی اس کی یہی حالت تھی۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس نے اپنا وعدہ توڑ دیا ہے وہ مجھے کچھ بتانا ہی نہیں چاہتی۔

چوتھے دن مجھے کاروبار کے سلسلے میں پھر شہر سے باہر جانا تھا لیکن اس دن میں وقت سے پہلے ہی واپس آ گیا اور دیکھا میری بیوی گھر میں موجود نہیں ہے۔

غصہ کے عالم میں گھر سے باہر آ گیا اور اس کاٹیج کی طرف روانہ ہوا وہاں پہنچ کر میں نے دروازہ کھٹکھٹانا چاہا اور جب دستک دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو معلوم ہوا کہ وہ تو پہلے ہی سے کھلا ہوا ہے۔

گھر میں گھس کر میں نے معائنہ کیا۔ پورا گھر مکمل طور پر ریگستان لگ رہا تھا ہال میں موجود فرنیچر مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

ایک دیوار کو دیکھ کر میرے دماغ کو زوردار جھٹکا لگا۔ جس پر ایک بہت بڑا فریم لگا ہوا تھا اور اس فریم میں میری بیوی کی تصویر تھی جو میں نے تین مہینے پہلے ہی کھنچوائی تھی۔ میرے دل میں ایک بوجھ سا تھا اور یہ بوجھ لیے میں گھر واپس لوٹ آیا۔

اس شام میں نے اپنی بیوی سے اس تصویر کے بارے میں پوچھا جو میں نے کاٹیج میں لگی دیکھی تھی۔

"تم مجھے اب یہ صاف صاف بتا دو کہ اس کاٹیج میں کون رہتا ہے جس کو تم نے اپنی تصویر دی ہے۔"

اب میرا غصہ ناقابل برداشت تھا۔

"اب میرے اور تمہارے درمیان اعتماد کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔" میں نے اس سے کہا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

اس دن کے بعد میں نے اس کو نہیں دیکھا میں اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا ہوں اور کسی قیمت سے کھونا نہیں چاہتا اب آپ بتائیں کہ میں کیا کروں۔

اس نے اپنی تمام کہانی مجھ سے بیان کر دی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے جس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ واقعی وہ اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا ہے۔"

اس کی تمام روداد میں نے بغور سنی اور سوچ میں پڑ گیا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اس کی تہہ تک جانا تھا۔

"مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے کھڑکی میں جو چہرہ دیکھا تھا وہ کیسا تھا۔" آخر کار میں نے پوچھا۔

"وہ چہرہ گہرے زرد رنگ کا تھا۔ آج سے پہلے کبھی ایسا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔

"اس بات کو کتنا عرصہ ہو گیا جب تمہاری بیوی نے تم سے روپیہ کا مطالبہ کیا تھا۔"

"تقریباً" دو مہینے پہلے۔"

"کیا تم نے اس کے پہلے شوہر کی تصویر دیکھی

ہے۔"
"نہیں اس کی موت کے بعد ایک خطرناک آگ کی وجہ سے تمام کاغذات برباد ہو گئے جن میں اس کی تصاویر بھی تھیں۔
تمہاری بیوی کے پاس اس کی موت کا سرٹیفکیٹ ہے۔"
"جی ہاں آگ پر قابو پانے کے بعد اس نے اپنے شوہر کی موت کا ڈپلی کیٹ سرٹیفکیٹ نکلوایا تھا۔
"تم اس کے رشتہ داروں میں سے کسی کو جانتے ہو یا ملے ہو۔"
"نہیں! اس دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔"
"اوکے اب آپ اپنے گھر واپس چلے جائیے میں اس مسئلے پر تھوڑا غور کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کی بیوی سے بذات خود ملنا چاہوں گا لیکن آپ ان کے سامنے یہ ظاہر نہیں کرنا کہ میں کون ہوں ورنہ اس مسئلے کو حل کرنے میں دشواری پیش آسکتی ہے۔" میں نے اس کو ہدایات دیں۔
"آپ مجھے اپنا مکمل ایڈریس لکھوا دیں میں پہنچ جاؤں گا۔"
"آپ میرا سیل فون نمبر نوٹ کرلیں اور صرف کال کریں گے تو میں آپ کو لینے آجاؤں گا۔" اس نے کہا اور نمبر نوٹ کروا کے جھکے قدموں سے باہر نکل گیا۔
شام کے سائے تیزی سے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ میری ٹرین ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن میں پہنچ کر رک گئی۔ میں نے اپنا سامان اٹھایا اور پلیٹ فارم پر اتر گیا 5 منٹ کے بعد انجن نے زور دار سیٹی بجائی اور آہستہ آہستہ ٹرین پلیٹ فارم سے روانہ ہو گئی اور جلد ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ سردیوں کی سنسان رات تھی ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے آسمان کی جانب دیکھا تو گھٹا چھائی ہوئی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ بس اب بارش ہونے والی ہے۔ میں تمام تر راستوں سے ناواقف تھا اس لیے وہیں ٹھہرے رہنے میں عافیت جانی اور عفان کا انتظار کرنے لگا میں نے نکلتے وقت کال کر کے اسے آنے کی اطلاع دے دی تھی اور اس وقت اسے یہاں موجود ہونا چاہیے تھا لیکن اسے وہاں نہ پا کر ایک الجھن سی ہو رہی تھی۔ کیسے کیسے خیالات دماغ میں پیدا ہو رہے تھے کہ اگر وہ نہیں آیا؟ سردی کی راتیں ویسے ہی خوفناک ہوتی ہیں اور دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا دل زور سے دھڑکنے لگا میں یہاں پہلی بار آیا تھا اور میں سوچوں میں غرق تھا کہ ایک ـــــــ آدمی نے مجھے پکارا۔
"آپ ہی مبشر حسین ہیں۔" اس کے استفسار پر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"آپ گاڑی میں بیٹھیے مجھے مسٹر عفان نے بھیجا ہے آپ کو لانے کے لیے۔"
ڈرائیور نے میرے ہاتھ سے سوٹ کیس لے کر گاڑی میں رکھا اور گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا اور گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔
گاڑی ناہموار راستے پر دوڑ رہی تھی بیٹھے بیٹھے میں بہت بور ہو گیا تھا گاڑی آڑے ترچھے راستوں سے گزرتی ہوئی آخر کار اپنی منزل تک پہنچ گئی۔ میں نے اپنے دماغ میں جس طرح کا نقشہ بنایا تھا اس سے بالکل مختلف نظر آرہا تھا پرانے طرز کا یہ حویلی نما کاٹیج تھا جس کی دیواریں لمبی لمبی تھیں۔
ڈرائیور نے میرا سوٹ کیس گاڑی سے نکالا اور میری طرف کا دروازہ کھول دیا میں گاڑی سے اتر آیا۔ عجیب سی ویرانی وہاں چھائی ہوئی تھی۔ کاٹیج میں داخل ہو کر وہاں مجھے ایک بہت بڑے ہال میں بٹھا دیا گیا میں پورے کاٹیج کا بغور معائنہ کرنے لگا۔
کچھ ہی لمحوں بعد عفان وہاں آگیا اور نہایت ادب سے مصافحہ کیا۔
"آیئے میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔" یہ کہہ کر وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں داخل ہو کر مجھے احساس ہوا کہ وہ نوجوان کتنا رئیس ہے پورے کمرے میں بیش قیمت قالین بچھے ہوئے تھے۔ پورا ہال نہایت شاندار فرنیچر سے آراستہ تھا جگہ جگہ خوب صورت فانوس آویزاں تھے۔ کمرے کے ایک طرف ایک بڑا آتشدان تھا جس کی کمرے کی فضا گرم تھی پورے کمرے میں بھاری بھاری ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔
ایک طرف آرام کرسی میں ایک بوڑھی عورت بیٹھی تھی مجھے دیکھ کر وہ بمشکل اپنی جگہ سے اٹھی اور خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔
"مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی تھی کہ اتنے امیر ہو کر وہ اس کو اتنی زیادہ عزت دے رہے ہیں حالانکہ ان سے پہلی بار ملا تھا۔ وہ خاندانی رئیس تھے اور اچھے خاندان سے معلوم ہوتے تھے۔
"بیٹا تمہارا سفر کیسا رہا کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ میں تمہارے یہاں آنے کی بہت شکر گزار ہوں تم نے اتنی دور سے آکر ہمارے لیے وقت نکالا۔" بوڑھی عورت پیار بھرے انداز میں مخاطب تھی اور میں تھا کہ اتنی عاجزی دیکھ کر شرمندہ ہوا جا رہا تھا۔
"ارے ایسی کوئی بات نہیں یہ تو میرا پیشہ ہے اور سفر بہت اچھا گزرا لیکن تھوڑا لمبا تھا۔" مجھے اسٹیشن سے گھر تک کا فاصلہ یاد کر کے ایک جھرجھری سی آگئی۔
"دراصل ہم شہری لوگوں کو شہر کے شور شرابے سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ بعض اوقات تو دل چاہتا ہے کہ یہ تھکا دینے والی زندگی سے نکل کر پرسکون زندگی گزاریں۔"
"ضروری نہیں کہ شہر سے دور رہ کر زندگی پرسکون گزر سکتی ہے انسان کا دل پرسکون ہو تو ہر جگہ اسے اچھی لگتی ہے۔ جنگل ہو یا بیابان۔"
عفان کے لہجے میں اداسی اتر آئی۔
کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ مجھے اکتاہٹ سی ہونے لگی۔
"مبشر صاحب آپ کھانا کھالیں اور آرام کریں میرے خیال سے رات زیادہ ہو گئی ہے اور آپ تھکے ہوئے بھی لگ رہے ہیں باقی باتیں ان شاء اللہ صبح ہوں گی۔

میں اور مسٹر عفان ڈائننگ روم میں آ گئے۔ میں نے کھانا کھایا اور اس کے بتائے ہوئے کمرے میں آ گیا۔
یہ ایک خوب صورت بیڈ روم تھا ضرورت کی ہر شے وہاں موجود تھیں۔
"سر آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو یہاں لگا بٹن دبا دیجیے گا۔" نوکر نے مجھ سے کہا تو میں نے صرف سر ہلا دیا میں سفر سے اتنا تھک گیا تھا کہ بولنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

رات میں نے بہت اچھی نیند لی۔ نرم و گداز اور گرم بستر نے میرے حواسوں کو بہت سکون بخشا تھا کمرے کا دروازہ بجا تو مجھے احساس ہوا کہ میں کتنی دیر تک سوتا رہا۔ دن چڑھ آیا تھا 12 بج رہے تھے۔ میں بہت شرمندہ ہوا۔
"اندر آ جاؤ۔" میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔
"آپ کو عفان صاحب نے ناشتے کے لیے بلایا ہے۔" نوکر نے آ کر اطلاع دی۔
"او کے تم چلو میں آتا ہوں۔" میں تیزی سے بیڈ سے اٹھا اور واش روم میں گھس گیا۔
نہا دھو کر تیار ہوا اور ڈائننگ روم میں آ گیا۔ لمبی سی میز پر انواع و اقسام کے لذیذ پکوان موجود تھے۔
"میں معذرت چاہتا ہوں دیر سے اٹھنے کی۔ دراصل کچھ سفر کی تھکان تھی" میں نے ان سے معذرت کی۔
"ارے کوئی بات نہیں آپ تشریف رکھیے۔" مسٹر عفان استقبال کے لیے اٹھے اور مجھے اپنے برابر والی کرسی پر بٹھا لیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جیسے رات دیر تک جاگا ہو۔
کچھ لمحوں بعد مسز عفان ڈائننگ روم میں داخل ہوئیں وہ بیش قیمت لباس زیب تن کیے انتہائی حسین و جمیل عورت تھی۔ میں اس کو دیکھ کر تعظیماً کھڑا ہو گیا لیکن عافان مستقل بیٹھا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ عفان اکھڑا اکھڑا سا تھا چہرے پر افسردگی کے تاثرات بھی نمایاں تھے لگتا تھا کہ دونوں میاں بیوی میں پھر کوئی بحث ہوئی ہے۔

مسز عفان جیسی خوب صورت 'باوقار اور دلکش عورت میں نے آج سے پہلے کبھی بھی نہیں دیکھی تھی جس کو دیکھ کر کوئی بھی اس کی محبت میں گرفتار ہو سکتا تھا۔
"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" میں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ مسز عفان نے چہرہ اٹھا کر بغور مجھے دیکھا اس کی آنکھوں میں نجانے کیسا سحر تھا کہ لمحہ بھر بھی اس سے نظر نہیں ملا سکا۔
میں نے نظریں جھکا کر ناشتے کی طرف توجہ دی لیکن میں نے محسوس کیا کہ مسز عفان نے اپنی پلیٹ میں بہت کم کھانا ڈالا ہوا تھا۔
"میڈم آپ اپنے شوہر کی طرف بھی توجہ دیا کریں کیا یہ اتنا ہی کم کھاتے ہیں۔"
ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی اس نے شیریں انداز میں کہا۔
"آپ خود ہی انہیں سمجھایئے۔ ہر وقت نجانے کن خیالات میں گم رہتے ہیں۔"
مسٹر عفان کی انگلیاں فرط غیض و غضب سے لرز رہی تھیں وہ اس طرح کی باتیں سن کر اس کی ڈھٹائی پر بہت پیچ و تاب کھا رہا تھا لیکن ایک الفاظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔
میں نے اس کی ہمت کی داد دی کہ وہ نہ صرف اپنی بیوی سے بے انتہا پیار کرتا ہے بلکہ اس کی عزت اس کو بہت پیاری ہے۔
وہ اپنے شوہر سے کافی کم عمر تھی اس کا چہرہ نہایت تر و تازہ اور شاداب تھا لیکن اس کی نیلی جھیل سی آنکھوں میں اضطراب کی کیفیت تھی۔ بظاہر ان کا تعلق کسی اعلا درجے کے خاندان سے تھا لیکن دونوں میاں بیوی میں تعلقات سخت کشیدہ تھے۔
"آپ اسلام آباد سے آئے ہیں۔" مسز عفان نے اپنے سریلی آواز میں پوچھا۔
میں نے اثبات میں سر ہلا دیا وہ چند سیکنڈ تک دیکھ کر مجھے مسکراتی رہی اور پھر کہنے لگی۔
"میں یہ اندازہ کر سکتی ہوں کہ اسلام آباد سے یہاں

آنے میں آپ کو بہت زحمت ہوئی ہو گی کیونکہ میں بھی جب اسلام آباد سے آئی تو کئی دن تک طبیعت ایسی نڈھال رہتی کہ کئی دن تک میں بستر سے نہیں اٹھ سکتی تھی۔

"اچھا آپ کا تعلق اسلام آباد سے ہے۔" مجھے بہت حیرت ہوئی کیونکہ مسٹر عثمان نے اپنی باتوں میں اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔

جی ہاں میں اسلام آباد جیسے شہر کی رونقوں میں روز و شب گزارنے کی عادی رہی ہوں یہ ویران جگہ کیسے پسند آسکتی ہے لیکن قسمت کی بات ہے۔"

کمرے میں ایک بار پھر گہری ناگوار خاموشی مسلط ہو گئی۔

"اچھا اب میں اپنے کمرے میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔" مجھے اس طرح گھورتا دیکھ کر وہ کچھ متذبذب سی ہو گئی۔

"آگے آپ کا کیا پلان ہے۔" مسٹر عثمان اپنی بیوی کے جانے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا۔

"میں اس کاٹیج میں جانا چاہتا ہوں ہو سکتا ہے مجھے وہاں کوئی سوراغ مل جائے کیا آپ مجھے وہاں لے چلیں گے۔"

"ہاں لے چلوں گا لیکن... میں اگر آپ کو کل صبح لے چلوں تو؟" وہ رات کے وقت اس کاٹیج میں جانے سے خوفزدہ تھا۔

"صحیح ہے پھر ہم صبح کی واک کے بہانے وہاں چلیں گے۔"

"لیکن کل صبح تو وہاں جانا ممکن نہیں ہے کیونکہ مجھے آفس میں بہت ضروری کام ہے۔" مسٹر عثمان کو اچانک یاد آگیا۔

"پھر آج رات کو چلیں گے۔" مسٹر عثمان کو بہت جلدی تھی اس معاملے کو نمٹانے کی۔

رات بہت تاریک تھی ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ہم دونوں مسٹر عثمان کے آفس سے سیدھے واک کرتے اس کاٹیج کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"یہ وہی کاٹیج ہے جس کے بارے میں" میں نے آپ کو بتایا تھا۔" اس نے کاٹیج کی طرف اشارہ کیا۔

ہم دونوں صدر دروازے تک پہنچے کہ اچانک ایک عورت کا سایہ وہاں سے باہر نکلتا ہوا نظر آیا اسٹریٹ لائیٹ کی روشنی میں وہ زرد نظر آرہا تھا۔ اندھیرا اتنا تھا کہ واضح طور پر چہرہ نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

اچانک اس سایہ نے مسٹر عثمان کے بازوؤں کو پکڑ کر زور سے جھنجھوڑ ڈالا۔

"نہیں ..... نہیں خدا کے واسطے' میں نے سوچا تھا کہ جب تم شام کو گھر آجاؤ گے میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی مجھ پر یقین کرو میں تمہیں دھوکا نہیں دینا چاہتی۔" وہ بری طرح بلک رہی تھی۔

"روبا میں نے بہت عرصہ تک بھروسہ کیا ہے۔" وہ چلایا" لیکن آج میں اور میرے دوست اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لیے سلجھائیں گے۔" اس نے اپنی بیوی کو ایک طرف دھکا دیا اور تیزی سے اوپر جانے والی سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دیں۔

دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ایک عمر رسیدہ عورت وہاں سے نمودار ہوئی اور کچھ کہنے کے لیے آگے بڑھی لیکن اس نے اس کو دھکا دے کر پیچھے کیا اور تیزی سے کمرے میں داخل ہو گیا میں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

یہ ایک بڑا ہال نما کمرہ تھا جو بہترین فرنیچر سے سجایا ہوا تھا۔ ایک ٹیبل پر دو موم بتیاں جل رہی تھیں۔ پورے کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ موم بتیوں کی روشنی میں دیکھا کہ ایک ڈیسک تھا جس پر ایک چھوٹی سی لڑکی بیٹھی تھی اس کا چہرہ پیچھے کی جانب تھا لیکن یہ دیکھا جا سکتا تھا کہ وہ ایک لال رنگ کی فراک میں تھی اور دونوں ہاتھوں میں لمبی کہنی تک دستانے پہنے ہوئی تھی وہ بچی جیسے ہی ہماری طرف مڑی تو دیکھا کہ اس نے چہرہ پر زرد رنگ کا ماسک لگایا ہوا تھا جس کو اتارا گیا تو خوف اور حیرت سے ہم سب کی چیخیں نکل گئی۔ کوئلے کی طرح کالی وہ بچی کسی حد تک بہت خوفناک لگ رہی تھی۔

اوہ میرے خدا! اس کا کیا مطلب ہے؟" وہ چلایا۔

"میں تمہیں بتانے والی تھی۔" وہ چلائی۔ کمرے میں اس کے رونے کی آواز گونجنے لگی۔

"میں تمہیں بتانے والی تھی۔" اس جملے سے آگے اس کے الفاظ اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ جب تھوڑی طبیعت بحال ہوئی تو کہنا شروع کیا۔

"میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا کہ میرے شوہر اور بچہ مر گئے ہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا۔" مسٹر عثمان کو ایک دھچکا لگا۔

"یہ بچی میری ہے۔ جب ہم تینوں گاڑی میں جا رہے تھے تو بہت زبردست ایکسیڈنٹ ہو گیا جس کی وجہ سے میرے شوہر کی اسی وقت ڈیتھ ہو گئی میں ایک مہینے تک کومے میں رہی اور جب ہوش آیا تو پتا چلا کہ میرے شوہر مر گئے ہیں اور میری بچی کا چہرہ جھلس گیا اور اس طرح بری طرح جھلس گیا کہ کوئی بھی دیکھتا تو خوفزدہ ہو جاتا لوگ اسے دیکھ کر ڈرتے تھے۔ میری شادی جب تم سے ہوئی تو اس وقت یہ بہت چھوٹی تھی اس کی حالت بہت نازک تھی اسے ایک ایسے سہارے کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے دل پر جبر کر کے اسے یتیم خانے میں داخل کروا دیا لیکن کچھ مہینے پہلے میں نے اپنی بچی کو خواب میں دیکھا تو میں پریشان ہو گئی اسے میری ضرورت تھی اپنی ماں کی.... یہ جیسی بھی ہے میری اولاد ہے میں اسے دوسروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتی۔

میں نے تم سے ہی پیار کرنا سیکھا ہے میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں اور تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔

خدا مجھے معاف کرے میں اس بچی کو بھی اپنے سے الگ نہیں کر سکتی اس لیے میں نے اس راز کو تم سے چھپایا اور اس کاٹیج میں اس بچی کو رکھا اور ایک نرس رکھی اس نرس کو میں نے دیکھ بھال کرنے کے پچاس ہزار روپے تھے جو تم سے لیے تھے۔

میں نے اس کو یہ ہدایت دی تھی کہ دن کے وقت میری بچی کا خیال رکھے اور اسے اس ماسک میں چھپائے رکھے۔ مجھے خوف تھا کہ اس کا اصلی چہرہ دیکھ کر کوئی ڈر نہ جائے۔ میں آدھی پاگل ہو چکی تھی جب تم نے مجھ پر شک کیا میں سوچ رہی تھی کہ یہ سچ تم کو کیسے بتاؤں؟

"میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں۔" ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپائے زور زور سے بلکنے لگی۔

"اب تم یہ سب حقیقت جان گئے ہو تو مجھے میری سزا بھی بتا دو۔"

تھوڑی دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ میں بھی حیرت میں کھڑا اس کے جواب کا انتظار کر رہا تھا کہ مسٹر عثمان نے اس بدنما بچی کو اپنی گود میں اٹھا لیا پیار سے اس کے گالوں پر بوسہ دیا اور دوسرے بازوؤں سے اپنی بیوی کو سنبھالا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکلے تھے لیکن سب ہی اس کا جواب جان گئے تھے۔

اگلے روز میں اپنے گھر واپس آگیا اور اس رات میں بہت پرسکون نیند سویا۔ میری زندگی میں کئی کیس آئے لیکن یہ پہلا کیس ہے جس کے حل سے مجھے روحانی خوشی نصیب ہوئی۔
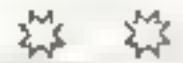
☆ ☆

مصباح نوشین

انہوں نے ابھی ابھی ٹی وی آن کیا تھا مشہور چینل پر کوئی مارننگ شو ریپیٹ ٹیلی کاسٹ ہو رہا تھا انہوں نے راحمی سے چائے بنانے کو کہا اور خود وقت گزاری کے خیال سے ٹی وی دیکھنے لگے مگر مقابل جو ہستی انہوں نے دیکھی اس نے ان کی روح فنا کر دی تھی' ان کی ذات کا غرور اور انا پسندی کو بہت اونچائی سے زمین پر گرایا تھا۔ عتیق علی کو اپنا آپ گہری پستیوں میں گرتا محسوس ہوا تھا۔ پچھتاووں کی آگ نے پوری شدت سے انہیں اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔

"میں نے اپنی زندگی میں دکھوں کی آزمائش کے ساتھ کڑی محنت کی ___ کبھی بھی کسی مقام پر خود کو گرنے نہیں دیا ایک وقت ایسا بھی آیا جب کچھ لوگوں نے میری ذات کے غرور اور میری صلاحیتوں کو کچلنا چاہا میرے راستے کھوٹے کرنے چاہے مگر میرا عزم و ارادہ اور خدا کی ذات پر کامل یقین نے مجھے کبھی بھی کسی بھی مقام پر گرنے نہیں دیا عورت کے عزم کے سامنے دنیا کی ہر طاقت ہیچ ہے یہ ہی میرا تجربہ ہے اور یہ ہی میرا ماننا ہے۔" انہیں لگا وہ جانتی ہے کہ وہ اسے دیکھ رہے ہیں تب ہی تو ان کو سنانے کو وہ سب ان سے کہہ رہی ہے وہ الفاظ نہیں تھے طمانچے تھے پتھر تھے جو عتیق علی نے اس کی باتیں سن کے اپنے چہرے پر پڑتے محسوس کیے تھے آن واحد میں انہوں نے اپنی ہستی خاک ہوتی محسوس کی تھی پچھتاوے کو زہریلے ناگ کی مانند ان کے وجود کے گرد اپنا گھیرا کسنے لگے تھے۔ انہوں نے سانس لینے کی کوشش کی فقط بیالیس برس کی عمر میں پچاس برس کے دکھنے والے عتیق احمد کو پچھلے تین سال سے دل کا عارضہ بھی لاحق تھا___ درد حد سے سوا ہو رہا تھا انہوں نے دل کو مسلا اور درد کی وجہ سوچنے کی کوشش کی۔

"کیا ہوا تھا بھلا___ پانچ سال پہلے؟" انہوں نے دماغ پر زور دیا۔ مگر وہ کوئی کہانی کار تو نہیں تھے جو واقعات و حادثات کی کڑیاں ملاتے اور اسے کہانی کی شکل دیتے کہانی کار تو وہ تھی جو___!

☼ ☼ ☼

شام اپنے سرمئی پنکھ دیہات کے کچے پکے گھروں اور لہلہاتے کھیتوں پر پھیلا رہی تھی۔ یاسمین بی بی نے پہلے مشین پر چارہ کترا پھر بھینسوں کے باڑے میں لگے پمپ سے پانی کے ٹب بھر بھر کر تمام بھینسوں کو پانی پلایا ___ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ احاطے سے نکل کر گھر میں داخل ہوئی تھی اس نے اپنی اکلوتی لخت جگر کو حسب معمول کتابوں میں سر دیے رجسٹر پر جھکے کچھ لکھتے پایا۔

"زرقا! اٹھ جا بیٹی جا کے تندور میں بالن ڈال دے۔ میں روٹی لگا لوں گی۔" ہاتھ میں تھامی بالٹی نلکے کے نیچے رکھ کر بھرتے اس نے اسے آواز لگائی تھی۔

"کرتی ہوں اماں___ بس تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ تھوڑا سا لکھ لوں اور۔" زرقا نے نلکے کے نیچے رکھی بالٹی بھرتی اماں کو دیکھ کر لجاجت سے کہا تھا۔ لائٹ چلی گئی تھی روز ہی اس وقت چلی جاتی جب تمام کاموں سے فارغ ہونے کے بعد یاسمین بی بی کے نہانے کی باری آیا کرتی۔ سارا دن کی تھکی ہاری وہ شل بازوؤں کو زبردستی نلکا چلانے پر مجبور کرتے ٹھنڈے اور تازہ پانی سے نہا کر خود کو تازہ دم کرنے کی کوشش کرتی۔

"یہ کیا اوٹ پٹانگ لکھتی رہتی ہے ہر وقت اس کا کوئی فائدہ بھی ہے یا نہیں؟" ماں کی بات سن کے وہ ذرا کی ذرا کاغذوں کے پلندے سے نظر ہٹا کے مسکرائی تھی۔

"فائدہ___" اس نے قلم دانتوں میں داب کے سوچا پھر کھنکاری۔

"فائدہ تو بہت ہے لال۔ تو بس دعا کر کہ قسمت ساتھ دے جائے۔" اس نے ڈبا بھر کر پانی کا کپڑوں سمیت نہاتی یاسمین کو اپنے اوپر انڈیلتے دیکھ کر کہا تھا۔

"میری تو ہر دعا تیرے سے شروع ہو کر تیرے نام پر ہی ختم ہوتی ہے پتر___ اپنے لیے تو عرصہ ہوا میں نے کبھی کچھ مانگا ہی نہیں۔ پر مجھے پتا بھی تو چلے تو ہر ماہ یہ اتنے سارے کاغذ لکھ کر بھیجتی کدھر ہے نہ ہی کبھی ان لوگوں کی طرف سے کوئی جواب آتا ہے؟"

"جواب بھی آئے گا اماں___ ضرور آئے گا مجھے

اپنی محنت پر پورا بھروسہ ہے۔" زرقا نے گول جواب دیتے کاغذوں کا پلندہ سمیٹا اور چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے پرائیوٹ میٹرک کا امتحان پاس کیا ہوا تھا خداداد صلاحیتوں سے مالامال تھی۔

اس نے بڑی مہارت سے کیکر کی لکڑیاں تنور میں بالن کے طور پر ڈالیں اس کے بعد موی کاغذ رکھ کر تیلی دکھائی موم پگھل کر لکڑیوں پر گرتے ہی آگ پھیلنے لگی تھوڑی ہی دیر میں تندور میں ڈالا بالن بھڑک رہا تھا یاسمین بی بی نے تندور کے دہکتے بالن میں چمکتا اپنی بیٹی کا سنہرا روپ دیکھا اور ڈر گئی ..... اس کی بیٹی پر خوشی کی روپہلی کرن چمکی تھی۔ اس کی جوانی بھرپور اور خود وہ سیدھی سادی تھی۔

"میم جی سے جلد ہی کہہ کے اس کا کہیں رشتہ ڈالتی ہوں بیس کی تو ہونے والی ہے اب مزید کیا انتظار کروں بھلا؟" تنکے کے نیچے نہالی یاسمین بی بی نے بڑے تفکر سے سوچا تھا۔

"آج پھر دال پکائی ہے ماں..... آپ کو پتا ہے مجھے مسور کی دال اچھی نہیں لگتی۔" وہ اس کی سوچوں سے بے نیاز روٹھے پن سے کہہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم میم جی!" ہاتھوں میں تھامی ڈھکی پلیٹ اس نے چارپائی پر رکھتے دوپٹہ سر پر اچھی طرح جماتے ماسٹر میم جی کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام جیتی رہو بیٹی..... آج کیا لائی ہو؟" ماسٹر میم جی لڑکوں کے اسکول کے ٹیچر تھے عرصہ دراز سے ادھر ہی مقیم تھے وہ کہاں سے آئے تھے ان کا احوال کیا تھا اب تو وہ خود بھی بھول چکے تھے۔

"آج گیارہویں کا ختم دلایا ہے ناماں نے..... کھیر پکائی تھی تو اماں نے کہا کہ آپ کو بھی دے آؤں۔" وہ ان کے پاس چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ تب ہی ادھر ادھر دیکھتے میم جی سے ٹیپو کا پوچھا تھا جس کے لیے شاید وہ بطور خاص آئی تھی۔

"ٹیپو کدھر ہے میم جی؟"

"اندر بیٹھا پڑھ رہا ہے تجھے کوئی کام ہے کیا اس سے؟"

وہ جانتے تھے کہ زرقا اپنی ضرورت کی تمام اشیا ٹیپو سے ہی منگوایا کرتی تھی۔ کیونکہ وہ شہر کالج میں پڑھتا تھا۔

"جی ..... ایک رجسٹری بھجوانی تھی؟" اس نے آہستہ سے بتایا تھا۔

"رجسٹری..... پر کہاں؟" ماسٹر میم جی کو سخت تعجب ہوا تھا۔

"ڈائجسٹ کے لیے میں نے ایک کہانی لکھی ہے ..... بس وہی بھجوانی تھی؟" زرقا نے تھوڑا جھجکتے ہوئے مگر اعتماد کے ساتھ بتایا تھا۔ ماسٹر جی تو لیٹے سے اٹھ بیٹھے۔

"تو کہانیاں لکھتی ہے؟" زرقا نے آہستگی سے سر اثبات میں ہلایا۔

"پر تو نے سیکھی کہاں سے کہانیاں لکھنا؟" ماسٹر جی ابھی تک حیران تھے اپنے گاؤں سے کبھی باہر نہ جانے والی زرقا کو کہانی لکھنی آتی تھی بھلے خداداد صلاحیت تھی مگر اسلوب بیاں اور انداز تحریر تو سیکھنا ہی پڑتا نا..... اس نے وہ کہاں سے سیکھا ہوگا انہیں اسی بات کی حیرت تھی۔

"وہ رحمن سائیں کی بیٹی پروین ہیں نا..... وہ ہر ماہ ڈھیر سارے رسالے منگواتی ہیں شہر سے..... میری ان سے اچھی سلام دعا ہے بس ان ہی سے لے کر آتی ہوں غور سے پڑھ کر سیکھتی ہوں اور پھر لکھ کے بھجوا دیتی ہوں۔" زرقا نے انہیں ساری بات تفصیل سے سنائی تھی۔

"مجھے اپنی کہانی پڑھوائے گی تو؟" میم جی کو اشتیاق ہوا۔

"کیوں نہیں میم جی..... سب سے پہلے آپ کو ہی پڑھواؤں گی مگر پہلے چھپ تو جائے۔" میم جی اس کی چالاکی پر دل کھول کے ہنسے تھے۔

"اچھا چل جیسے تیری مرضی..... تو بس محنت کرتی رہنا اگر کامیابی نہ بھی ملے تب بھی محنت کرنا کبھی نہ چھوڑنا کیونکہ اللہ تعالیٰ محنت کا صلہ دیتا ہے اگر کبھی

دینے میں دیر کرے تو اکٹھا نواز دیتا ہے وہ ادھار رکھتا کہاں ہے۔" ماسٹر میم جی نے اسے اپنے سادہ انداز میں بہت گہری بات سمجھائی تھی۔

"جی میم جی..... آپ بس میرے لیے بہت سی دعا کریں اور مجھے اچھی اچھی کتابیں منگوا کر دیں پڑھنے کے لیے کیونکہ اچھا لکھنے کے لیے اچھے مطالعہ کا ہونا بہت ضروری ہے۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں..... میں صبح ہی ٹیپو کے ساتھ مل کر اپنا کتابوں والا صندوق نکلواتا ہوں اور اس میں سے تمہارے کام کی ساری اچھی کتابیں نکال کر تمہیں بھجوا دوں گا۔"

"بہت شکریہ میم جی..... میں یہ رجسٹری ٹیپو کو دے دوں۔" وہ اٹھ کر کمرے کی طرف بڑھی تو میم جی نے اس کی پشت کو دیکھتے محبت سے اس کے لیے دل ہی دل میں دعا کی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ پڑھنے میں بری طرح سے منہمک تھی ارد گرد سے بے نیاز..... جبھی کوئی اس کے پیچھے آ کے کھڑا ہوا مگر اسے خبر نہیں ہو سکی تھی وہ کہانی میں بری طرح سے گم تھی جہاں ڈھیر ساری کٹھنائیاں بانٹنے کے بعد ہیرو اور ہیروئن کا بالآخر ملن ممکن ہو پایا تھا اور اب ہیرو نہایت رومینٹک انداز میں ہیروئن کو اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا ابھی وہ آخری ڈائیلاگز پر ہی پہنچی تھی کہ کسی نے اس کا ڈائجسٹ جھپٹا تھا وہ ہڑبڑا کے سیدھی ہوئی تو لگا روح فنا ہو گئی ہو سامنے ہی ابا سائیں کڑے تیور لیے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔

"کون لایا یہ اس گھر میں؟" وہ اپنی پوری قوت سے دھاڑے تھے اپنے کمروں میں آرام کرتے تمام گھر کے افراد باہر نکل آئے پروین کا سر جھک گیا وہ رسالے پڑھنے کے سخت خلاف تھے کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ ڈائجسٹ صرف عشق عاشقی کا سبق سکھاتے ہیں اور لڑکیوں کو گمراہی و بے راہ روی کی راہ دکھاتے ہیں۔

"میں نے پوچھا کون لایا یہ یہاں؟" وہ پوری طاقت سے دوبارہ دھاڑے تھے پروین کی سانس حلق میں ہی اٹک گئی۔

"بھا..... بھابھی سے منگوائے تھے۔" اس نے ان کی خشمگیں نگاہوں سے خائف ہوتے سچ بولنے کی ٹھانی تھی بھابھی تو ویسے بھی آج کل اپنے میکے تھی۔

"کیوں؟" وہ چلائے۔

"کیا اسے خبر نہیں کہ مجھے ان خرافات سے کتنی چڑ ہے اور تم۔" وہ اس کی طرف انگلی کر کے دھاڑے۔

"کبھی سوچنا بھی مت کہ میں تمہیں شتر بے مہار چھوڑ دوں گا جان نکال دوں گا تمہاری اگر کچھ ایسا ویسا دیکھا بھی تو۔" انہوں نے رسالہ دونوں ہاتھوں سے پھاڑ کر چلاتے ہوئے کہا۔ پروین کے اندر ڈھیروں آنسو جمع ہونے لگے سر جھک گیا ہتھیلیاں پانی سے بھیگ گئیں اور دل بے بسی سے کرلانے لگا۔ اس زندان میں جینے کو تمام لوازم درکار تھے مگر دل کی مرضی و خوشی کے لیے کچھ کرنا تو دور سوچنے پر بھی پابندی تھی۔

"اماں۔" اس کے بعد ان کا رخ دروازے میں دبک کے کھڑی اپنی والدہ کی جانب ہوا تھا۔

"سمجھا دیں اپنی لاڈلی کو..... ہماری مرضی کے خلاف چلے گی تو نتائج کی ذمہ دار خود ہوگی میں نے کتنی مرتبہ اسے روکا ہے ان خرافات سے بچنے کو مگر یہ میرے ساتھ ضد لگاتی ہے۔ میرے ساتھ ضد لگا کے اسے کچھ نہیں ملے گا الٹا اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔ آج کے بعد میں اس گھر میں اخبار کا کوئی ٹکڑا بھی نہ دیکھوں رسالہ تو دور کی بات!" وہ غصے سے ٹکڑے ٹکڑے ہوا رسالہ اس کے منہ پر مارتے وہاں سے چلے گئے پروین کی سسکیاں آزاد ہوتے گونج اٹھیں ایک ذرا سے شوق کی تکمیل کے لیے اتنی بے عزتی و ہتک..... اس کی برداشت سے باہر ہونے لگا۔

سچی بات تو یہ تھی کہ حویلی کی عورتیں باقی سب کچھ سمجھی جاتی تھیں مگر انسان نہیں انسان کے سینے میں تو دل ہوتا ہے اور دل میں خواب ہوتے ہیں خواہشیں

اور آرزوئیں ہوتی ہیں اور اپنی مرضی سے دل کی چھوٹی سی خواہش بھی پوری کرنے کی اجازت اس گھر کی عورتوں کو نہیں تھی ہاں مردوں کو تمام اختیار حاصل تھے دولت ان کے گھر کی باندی تھی طاقت کا غرور اس گھر کے مردوں کے انگ انگ سے جھلکتا تھا وہ زمین پر پاؤں فرعون کی طرح بڑے کروفر سے رکھتے تھے۔

"اماں ــــ" پروین عتیق علی کے جاتے ہی ماں کے سینے میں منہ چھپا کے روئی تھی۔

"کیوں پڑھتی ہے ان منحوسوں کو ــ جب تیرے بھائی کو پسند نہیں یہ سب تو؟" اماں سیفن نے اس کا سر سہلاتے ہمیشہ کی کہی بات دہرائی تو پروین تڑپ کر رہ گئی۔

"اماں ....." اس کے لہجے میں حیرت و دکھ یکساں تھا۔

"ایک ذرا سی تفریح کے لیے ہی تو انہیں پڑھتی ہوں اماں ..... ورنہ اس زندان میں کون جی پائے جہاں میں پچھلے تیس برسوں سے جی رہی ہوں اور ان رسالوں میں برا ہے کیا ..... ان سے تو میں نے سمجھوتہ کرنا سیکھا ہے اماں ..... قربانی دینا سیکھی ہے صبر و شکر کرنا سیکھا ہے اور اماں شاید نہیں یقیناً" میں اس حویلی کی گھٹن زدہ زندگی سے گھبرا کر ہار جاتی اگر میرے پاس یہ رسالے نہ ہوتے جنہوں نے قدم قدم پر ایک ہمدرد و غمگسار دوست کی طرح میری رہنمائی کی ــ میں تو ایسا کچھ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی اماں سیفن ..... جس کا خدشہ ادا سائیں کو لاحق ہے۔" اس نے ماں کے دونوں ہاتھ تھامتے تڑپ کر کہا تھا۔

"مجھے تجھ پر پورا بھروسہ ہے بیٹا مگر تو ہر بار یہ بات کیوں بھول جاتی ہے کہ اس گھر کی عورتیں اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتیں کیونکہ اس حویلی کے مردوں کے سینوں میں پتھر کے دل فٹ ہیں جن پر کوئی جذبہ اثر نہیں کرتا۔" انہوں نے دوبارہ اسے سینے سے لگاتے روتے ہوئے کہا تھا اپنی بیٹی کی بے بسی پر انہیں بھی رونا آ رہا تھا ایک ماں ہونے کے باوجود وہ اس کی کوئی خواہش کبھی پوری نہیں کر پائی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"پروین اوی۔" وہ ہال کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی پروین اور رابعہ بھابھی جو آج ہی میکے سے لوٹی تھیں دونوں باتیں کر رہی تھیں اس کی آواز پر چونک کے مڑیں۔

"ارے زرقا ــــ آؤ اندر آؤ وہاں کیوں رک گئیں کتنے دنوں کے بعد چکر لگایا تم نے تو۔" پروین کو بے حد سلجھی اور نرم گفتار "زرقا" بہت پسند تھی اکثر ہی اس کے بلانے پر وہ حویلی آجایا کرتی پروین اس کا ہاتھ تھام کے اندر لے آئی۔

"السلام علیکم اوی!" زرقا نے اندر آ کے رابعہ بھابھی کو سلام کیا جس کا جواب انہوں نے بمشکل تمام سر کو ہلکی سی جنبش دے کر دیا۔

"اب بتاؤ کہاں گم رہیں اتنا عرصہ!" پروین نے اسے اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"اس بے چاری نے کہاں مصروف رہنا ہے پروین ــ سوائے بھینسوں کو چارہ ڈالنے یا کھیتوں میں کام کرنے کے۔" زرقا کے جواب دینے سے پہلے ہی رابعہ بھابھی نے جلے ہوئے انداز میں بہ ظاہر مسکرا کر کہا تھا دوسرے لفظوں میں شاید زرقا کو اس کی اوقات یاد دلائی گئی تھی۔

"بس گھر میں ہی تھی ..... اماں ادا سائیں کی کپاس کی بیجائی میں مصروف تھیں تو میرے ساتھ آ نہیں پائی تھیں آج کپاس کی بیجائی ختم ہو گئی تو گھر جلدی آ گئیں اسی لیے میں نے آپ کے ہاں آنے کی ضد کی تو فوراً" مان گئیں۔"

"اچھا ــ تو ابھی تمہیں یاسمین بی بی چھوڑ کر گئی ہے۔" پروین نے حیرت سے استفسار کیا۔

"جی ..... آدھے گھنٹے تک دوبارہ لینے بھی آ جائیں گی۔" زرقا نے آہستگی سے بتایا تو پروین کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"کمال ہے یار ــ یہ پاس ہی تو تمہارا گھر ہے پھر بھی تمہیں تمہاری اماں چھوڑنے آئی۔ میں تو سمجھتی تھی

کہ پابندیاں صرف ہماری ہی ذات پر لاگو ہوتی ہیں مگر لگتا ہے ادا سائیں کی سختی اس پورے گوٹھ کی لڑکیوں کے لیے ایک جیسی ہے۔" پروین نے ہلکے پھلکے انداز میں مذاق اڑایا۔

"یہ پابندی نہیں احتیاط پسندی ہے ان کی ــ تم خواہ مخواہ میں اپنے ادا سائیں سے خائف مت رہا کرو۔" رابعہ بھابھی نے فوراً" ہی عتیق علی کی اچھی بیوی ہونے کا فرض ادا کرتے ان کی وکالت کی۔

"آپ کو تو ایسا ہی لگے گا نا۔" پروین کے لہجے میں گزشتہ واقعہ کی یاد تلخی بن کر گھلی تھی بمشکل اس نے خود کو کچھ سخت کہنے سے روکا۔

"ادا سائیں کا تو پتا نہیں مگر میری اماں ضرور سختی کرتی ہے میرے کہیں بھی آنے جانے پر جس دن اسے کھیتوں میں زیادہ کام ہو یا تو گھر کو تالا لگا کر جاتی ہے یا پھر اپنے ساتھ ہی لے جاتی ہے۔" زرقا نے اپنی ازلی سادگی سے بتایا تھا۔

"خیر تم تو ہو بھی چھپا کر رکھنے والی چیز ..... گدڑی میں چھپے لعل کی مانند ــ میں اب یاسمین بی بی سے کہوں گی کہ تمہیں یہاں چھوڑ جایا کریں میرا بھی اچھا وقت گزر جایا کرے گا۔"

"پروین ..... لوگوں کو ان کی اوقات میں رہنے دیا کرو ..... تم کیوں انہیں اپنی اوقات بھولنے پر مجبور کر دیتی ہو۔" رابعہ بھابھی کو زرقا کے ساتھ پروین کا التفات کبھی بھی نہیں بھایا تھا اسی لیے ہمیشہ کی طرح وہ آج بھی اسے ٹوک بیٹھیں۔ زرقا کے چہرے کا رنگ آن واحد میں اڑا تھا وہ لوگ غریب ضرور تھے مگر عزت نفس اور غیرت سے مالا مال تھے۔

"تم بھابھی کی باتوں کا برا مت ماننا ..... یہ بس ایسے ہی ہیں۔" رابعہ بھابھی کے جاتے ہی اس نے زرقا کے اڑے چہرے پر بکھرے ہتک کے رنگ دیکھتے اس کا غم کم کرنے کی کوشش کی ــ پروین نے اس کے موٹی ہاتھ پر اپنا سپید ہاتھ دھرا تو زرقا کی نگاہیں بے اختیار پروین کے ہاتھوں سے الجھ گئیں۔ اس کے ہاتھ بے حد سپید اور ملائم اور مخروطی انگلیوں والے تھے۔

"اس کے ہاتھ بھی بالکل آپ کے جیسے پیارے ہیں؟" زرقا کے منہ سے بے اختیار ہی پھسلا۔

"کس کے ہاتھ؟" پروین کا چونکنا فطری تھا۔

"ام رومان کے ــــ" زرقا کسی بات کو یاد کر کے مسکرائی۔

"یہ محترمہ کون ہیں؟" پروین کو اشتیاق سا ہوا۔

"ہیروئن ہیں؟" زرقا نے ہنسی دباتے شرارت سے کہا تو پروین اوہ کے اسٹائل میں لب سکوڑ کے رہ گئی۔

"میں آپ کے لیے کچھ لائی تھی۔" اچانک یاد آنے پر اس نے چادر کے نیچے بغل میں چھپا کر رکھا لفافہ باہر نکالتے پروین سے کہا۔

"میرے لیے کیا .....؟" پروین بے مطلب ہی ہنسی تھی زرقا نے لفافہ کھول کے اس کے سامنے کر دیا۔

"ارے تازہ شمارہ تمہیں کہاں سے ملا؟" پروین نے بے تابی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا زرقا اس کی خوشی و اشتیاق دیکھ کے مسکرائی۔

"پچھلے ماہ گوالہ جب دودھ کے پیسے دے کے گیا تھا تو میں نے ٹیپو سے کہہ کے سالانہ خریداری کے لیے ادارے والوں کو پیسے بھجوا دیے تھے اب ہر ماہ ڈاکیہ خود دے کے جایا کرے گا ابھی کل ہی وہ دے کر گیا تو میں نے سوچا پہلے آپ پڑھ لیں اس کے بعد میں پڑھ لوں گی۔"

"تھینک یو سو مچ زرقا! تم کتنی اچھی ہو یار ــ سچ مجھے کسی نشئی کی طرح سے ان کی لت لگ چکی ہے مگر ادا سائیں کو میرا ڈائجسٹ پڑھنا بالکل بھی پسند نہیں ہے ابھی چند روز پہلے انہوں نے مجھے بے حد ڈانٹا اور میرا رسالہ بھی پھاڑ دیا۔"

"ادا سائیں ایسا کیوں کرتے ہیں پروین باجی! حالانکہ وہ تو خود پڑھے لکھے ہیں انہیں تو سمجھنا چاہیے بلکہ خود اچھی اچھی کتابیں لا کر پڑھنے کو دینی چاہئیں۔" پروین کی زبانی ساری تفصیل سننے کے بعد زرقا نے بے حد دکھ سے کہا تھا۔ اس کی ماں ان پڑھ تھی مگر اس نے اسے بساط بھر تعلیم دلوانے کے ساتھ ساتھ کبھی بھی

رسالوں اور دیگر جرائد کو پڑھنے سے منع ہرگز نہیں کیا تھا۔

"پتا نہیں زرقا۔۔۔ ہمارے معاشرے کے مردوں کے ذہن میں ڈائجسٹ کے حوالے سے ایسا تصور کیوں بیٹھ گیا ہے کہ ڈائجسٹ خواتین کو غلط ترغیب دیتے ہیں انہیں بے راہ روی کا شکار بناتے ہیں حالانکہ اگر دیکھا جائے تو خواتین کے جرائد انہیں زندگی صبر و شکر اور سمجھوتے اور سمجھ داری کے ساتھ گزارنے کے کیسے انمول اور سنہرے گر باتوں ہی باتوں میں سکھا دیتے ہیں جن سے ہم سبق حاصل کرتے ہیں بالکل عام فہم انداز میں اور ہمیں خود بھی پتا نہیں چلتا مگر اچھی سوچ ہماری اچھی شخصیت کی پہچان بن جاتی ہے ہمیشہ کے لیے۔" پروین بے حد دکھی ہو گئی تھی۔

"پتا ہے ماسٹر جی بھی میرے لکھنے پڑھنے کی عادت سے بہت خوش ہوتے ہیں انہوں نے تو مجھے ڈھیر ساری کتابیں بھی دی ہیں پڑھنے کے لیے۔۔۔ میں آپ کے لیے بھی لائی ہوں۔" لفافے میں سے اس نے فوراً" ہی مرزا ہادی رسوا کی مشہور زمانہ تصنیف 'امراؤ جان ادا' نکال کر دی۔

"کڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے ادی! ہمیں اپنے حق کے لیے جنگ کرنی ہے، ہمیں اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے لیے خود اپنی آواز بلند کرنی ہے مگر اس طرح سے نہیں، بہت آرام اور آہستہ آہستہ سے۔۔۔ بظاہر لوگوں کو لگتا ہے نا کہ ڈائجسٹ پڑھنا معمولی تفریح ہے تو ہمیں اس شوق کی قربانی دے دینی چاہیے اپنے گھر والوں کے لیے۔ لیکن بات صرف ڈائجسٹ پڑھنے کی ہوتی تو ہم ایسا کر بھی لیتے اصل مسئلہ تو ہماری زندگی پر جا ان کا تسلط ہے جو ہمیں سانس بھی اپنی مرضی سے نہیں لینے دیتا پسند کی زندگی گزارنا تو دور کی بات ہے آہستہ آہستہ ان شاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا مجھے پورا یقین ہے ہمارے معاشرے کے مردوں کی سوچ بھی ایک دن ضرور بدلے گی۔۔۔ آپ بس دکھی مت ہوں۔" پروین کے کندھے پر ہاتھ رکھتے اس نے بہت نرمی سے اس کے زخموں پر مرہم لگایا تھا پروین نے بے ساختہ اسے گلے سے لگایا۔

"تم کتنی اچھی باتیں کرتی ہو بالکل کسی مسیحا کی مانند سارے زخم پل کے پل میں مندمل ہو جاتے ہیں تمہاری باتوں سے۔" زرقا اس کی اس قدر تعریف پر جھینپ کر مسکرائی تھی۔

"ارے ہاں۔۔۔ یاد آیا تم کسی ناول کا ذکر کر رہی تھیں کہ تم لکھ رہی ہو۔۔۔ لکھ لیا کیا؟" اچانک پروین نے یاد آنے پر پوچھا تھا۔

"بھیج بھی دیا۔" زرقا نے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"تو پھر فون کر کے پتا کیا کہ قابل اشاعت ہے یا نہیں؟" پروین کو تجسس نے گھیرا۔

"نہیں۔۔۔ ایک ماہ بعد کروں گی نیم جی کے موبائل سے۔" زرقا نے اسے بتایا۔

"مجھے فوری بتانا۔۔۔ اللہ تمہیں کامیاب کرے جس روز تم کامیاب ہو گئیں نا زرقا اس روز جیت صرف تمہاری نہیں بلکہ میرے جیسی کئی خواتین کی ہو گی جو اپنی کسی بھی خواہش کی تکمیل کے لیے دکھوں و اذیتوں کی بھٹی میں جل کر کوئلہ ہو جاتی ہیں مگر پھر بھی تہی داماں رہ جاتی ہیں تمہاری جیت ہمارے سارے دکھوں کا مداوا کر دے گی۔" پروین نے مستقبل کے کسی خوش کن خیال کے تحت اسے آس و امید کے کئی جگنو تھمائے تھے جسے زرقا نے فوراً" ہی اپنے آنچل میں چھپا لیا۔

☼ ☼ ☼

انتظار کا یہ مہینہ اس کے لیے پل پل صدی بن کے گزرا تھا۔ اس نے نیم جی کے موبائل میں بیلنس لوڈ کروا کے آفس کے نمبر پر فون کر کے اپنی کہانی کے متعلق پوچھا۔ اس کا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا ایسا لگ رہا تھا پسلیاں توڑ کر آج تو باہر آ ہی جائے گا۔ ایڈیٹر نے اسے اس کی کہانی سے متعلق بتانے کے لیے تھوڑے سے انتظار کا کہا وہ ہولڈ پر تھی اور اسے ڈر تھا کہیں اس کا بیلنس ختم نہ ہو جائے دو تین منٹ کے بعد ایڈیٹر نے اس کی کہانی کا نام دوبارہ پوچھا۔

زرقا کی آنکھیں پھر سے خواب بننے لگیں۔ اسے لگ رہا تھا ابھی ایڈیٹر اسے اس کی کہانی کے متعلق مژدہ جاں فزا سناتے اس کی تحریر کی تعریف کرنے کے ساتھ جلدی شائع ہو جانے کی نوید سنائے گی۔ کہانی کے چھپتے ہی اسے تحریری طور پر پروف مل جاتا کہ وہ واقعی میں ایک اچھی مصنفہ ہے اور وہ بہت کچھ کر سکتی ہے سہولیات اور وسائل کے بغیر بھی مگر۔۔۔ اس کی تحریر ریجیکٹ کر دی گئی تھی۔ ایڈیٹر اب اسے اس کی تحریر کی ناپختگی اور خامیاں بتا رہی تھی مگر زرقا خلیل کے کان سائیں سائیں کرنے لگے حلق میں پھندا سا کسنے لگا اس لگا وہ کبھی بھی بول نہیں پائے گی۔ آنسوؤں کا سیل رواں بڑی خاموشی سے آنکھوں سے جاری ہو گیا تھا۔

"ہیلو۔۔۔ ہیلو۔" ایڈیٹر اس کی جانب سے خاموشی پا کر ہیلو ہیلو کر رہی تھی وہ اس کا نام پکار رہی تھی۔ دفعتاً" کال کٹ گئی۔

زرقا فون کان سے ہٹاتے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ وہ اس کی پچاس دنوں کی محنت تھی جو انہوں نے پل کے پل ریجیکٹ کر کے ردی کی ٹوکری کی نذر کر دی تھی نیم جی نے اسے یوں زار و قطار روتے دیکھا تو فوراً" اس کے پاس آئے تھے۔

"زرقا۔۔۔ رو کیوں رہی ہو بیٹا؟"

"نیم جی۔۔۔ میری پچاس دنوں کی محنت اکارت گئی۔" وہ زار و قطار روتے ہوئے ان کی شفیق بازوؤں میں سمٹتے ہوئے ماہی بے آب کی طرح تڑپی تھی۔

"تو اس میں رونے والی کیا بات ہے پتر!" انہوں نے اس کا سر سہلاتے نرمی سے سمجھایا۔

"نیم جی۔۔۔" زرقا دکھ سے بول ہی نہ پائی تھی۔

"انہوں نے شاید میری کہانی غور سے پڑھی ہی نہیں ورنہ وہ ریجیکٹ نہ ہوتی میں نے تو اتنی اچھی لکھ کے بھیجی تھی۔" نیم جی دھیرے سے مسکرائے۔

"دیکھ پتر! وہ جو اس کرسی پر اتنے سالوں سے بیٹھی ہیں ان کو تو کہانی کا پہلا صفحہ دیکھ کر ہی کہانی کے اینڈ کا اندازہ ہو جاتا ہے اتنا تجربہ ہے ان کا اور اگر انہوں نے ایسا کیا بھی ہے تو یقیناً" تمہاری تحریر میں ہی کوئی کمی ہو گی تم دل چھوٹا مت کرو۔ انہیں کچھ اور لکھ کے بھجوا دو۔۔۔ ہو سکتا ہے انہیں تمہاری دوسری تحریر متاثر کر جائے۔" نیم جی نے نرمی سے اسے سمجھایا تو زرقا نے انہیں شاکی نظروں سے دیکھا۔

"پہلی تحریر انہوں نے ریجیکٹ کر دی دوسری تو وہ پڑھیں گے بھی نہیں۔"

"ایسا بالکل بھی نہیں ہو گا اس بات کا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔" وہ دھیرے سے مسکرائے۔

"کیوں۔۔۔ ایسا کیوں نہیں ہو گا؟" وہ ابھی بھی خائف تھی۔

"کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ زرقا خلیل اپنی دوسری تحریر زیادہ اچھی اور بہتر لکھ کر بھیجے گی اور اس میں وہ تمام لوازمات شامل ہوں گے جو اس کی پہلی تحریر میں نہیں تھے تمہاری دوسری تحریر میں پہلی تحریر سے زیادہ نکھار آئے گا۔۔۔ کیونکہ سیکھنے سے ہی لکھنا آتا ہے اور لکھنے سے ہی نکھار اور بہتری آئے گی اگر تم ہمت ہار دو گی تو آگے کیسے لکھو گی۔" انہوں نے رسان سے اسے سمجھایا تھا۔

"میں محنت سے نہیں گھبراتی نیم جی۔" زرقا نے گویا تڑپ کر اپنی صفائی دی۔

"میں جانتا ہوں اسی لیے تمہیں کہہ رہا ہوں تمہارے پاس اور کوئی تحریر ہے؟" زرقا نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"بہت خوب! اسے تم فوراً" سے پیشتر نوک پلک سنوار کر انہیں دوبارہ بھجوا دو۔"

"اور اگر انہوں نے وہ بھی ریجیکٹ کر دی تو؟" زرقا کے لہجے میں خوف تھا۔

"تو کوئی بات نہیں۔۔۔ انہیں تیسری تحریر بھیج دینا اور میرا دعوا ہے کہ تمہاری تیسری تحریر یقیناً" پہلی دو تحریروں سے بہتر اور پختہ ہوگی مگر تم ہمت نہیں ہارو گی اور مسلسل محنت کرو گی۔ کیونکہ زندگی میں کوئی بھی

مقام — محنت اور مسلسل جدوجہد کے بغیر نہیں ملتا! اور آج میں تمہیں زندگی میں کچھ کرنے کا ایک گر سکھاؤں گا اسے ذہن نشین کرلو ساری زندگی کے لیے پھر دیکھنا اس پر عمل کروگی تو کامیابی ہمیشہ تمہارے قدم چوما کرے گی۔" انہوں نے رسان و متانت سے کہتے اس کے سر پہ پیار سے ہاتھ رکھا تھا زرقا خلیل غور سے ان کا بتایا گر سمجھنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"دکھیا' پرکھیا' سکھیا' پرکھیا' دکھیا۔"

زرقا نے اپنے سامنے کاغذ پر لکھے اس جملے کو غور سے پڑھا اور اس کی گہرائی کو دل سے جانچا نیم جی نے بالکل ٹھیک کہا تھا کسی بھی کام کو کرنے سے پہلے اس کا طریقہ کار دیکھ کر اسے پرکھنے کے بعد ہی سیکھا جاتا ہے اور سیکھ کر اپنا کیا کام پرکھ کر دنیا کے سامنے لایا جائے تو ناکامی کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ زرقا خلیل نے ایک توانائی سی اپنے پورے وجود میں دوڑتی محسوس کی — اس ایک جملے میں اس کے لیے کامیابی کا راز چھپا تھا جس کا تاثر بہت گہرا اور دیرپا تھا۔

"میں زندگی میں خود کو منوانے کے لیے بہت زیادہ محنت کروں گی زندگی کی کوئی آزمائش میرا راستہ کھوٹا نہیں کرسکے گی میں مسلسل جدوجہد اور استقامت سے اس ملک کی بہترین مصنفاؤں کی صف میں جگہ بناؤں گی ان شاءاللہ آج کے بعد مجھے کبھی نہیں رونا نہ ہی کبھی ہمت ہارنی ہے کیونکہ مجھے آگے بڑھنا ہے اور اپنا نام بنانا ہے۔" اس جملے کو اس نے غور سے پڑھتے دل ہی دل میں خود سے عہد لیا تھا۔

اس نے نئے سرے سے ایک آئیڈیے پر کام شروع کیا اور اس کے کرداروں' پلاٹ اور ڈائیلاگز پر پوری توجہ دی تھی تمام جزئیات کے ساتھ اس نے اس ناول کو پینتیس دنوں میں مکمل کیا تھا اس نے خود کو ایک ناقد کی نظر سے جج کیا اور جہاں جو کمی یا غلطی لگی اس نے اسے دوبارہ لکھ کر سنوارنے کی کوشش کی تھی۔ ایک ناول کو اس نے کم از کم تین مرتبہ ری رائٹ کیا مگر اسے کوئی افسوس نہیں تھا اس نے ہر مرتبہ اپنی غلطیاں نکال کر سدھارتے ایک طاقت اپنے اندر اترتی محسوس کی تھی نیم جی کا سکھایا گر بار بار اس کے ذہن کے پردوں پر موتیوں کی مانند جگمگاتا تو اسے اپنا آپ بے حد ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگتا۔ ناول مکمل کرنے کے بعد وہ اسے نیم جی کے پاس لے آئی تھی اور اس نے انہیں ناول پڑھ کر — اصلاح کے لیے اور کمی بیشی دور کرنے کے لیے کہا تھا مگر نیم جی نے صاف انکار کردیا تھا زرقا کا منہ لٹک گیا۔

"آگے بڑھنے کے لیے کسی کے سہارے کی متلاشی مت بنو— خود ہی اپنی ناقد بنو اور خود ہی اپنی تجزیہ نگار ..... تمہارے اندر صلاحیت ہے تو پھر دوسروں پر تکیہ کرنا زیب نہیں دیتا۔" اور زرقا خلیل نیم جی کی بات سے سخت اختلاف رکھنے کے باوجود بھی خاموش ہوگئی تھی حالانکہ وہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ میرے استاد اور محسن ہیں آپ کی دکھائی راہ میرے لیے بہت سے راستے روشن کردے گی مگر وہ چپ رہی تھی اور ناول اٹھا کر ٹیپو کے پاس لے آئی۔

"نیم جی! میں آپ کو ثابت کرکے دکھاؤں گی کہ میں بہت کچھ کرسکتی ہوں۔" جاتے جاتے وہ ان سے کہنا نہیں بھولی تھی نیم جی نے جواباً یوں کندھے اچکائے گویا کہہ رہے ہوں۔

"اچھا— ایسا ہے تو پھر کچھ کرکے دکھاؤ—" زرقا ایک عزم لیے پلٹ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات بارش کھل کے برسی تھی ہر چیز نکھر کر صاف اور چمکدار دکھ رہی تھی مگر بھلا ہو زرقا کی کچی یادداشت کا جو یاسمین کی تنبیہہ کے باوجود بھی بارش برسنے سے پہلے خشک بالن رکھنا بھول گئی تھی۔ کچن تو ان کا کوئی تھا نہیں بس چار ہلا کھڑے کرکے چھت ڈال کے اسے برساتی کا نام دے دیا گیا تھا۔ صبح نماز فجر کے بعد یاسمین بی بی ناشتا کرکے بھینسوں کو لے کر چرانے لے جایا کرتی عتیق علی کی زمینوں پر ہی ایک ڈیری فارم

ٹائپ احاطہ بنا ہوا تھا یاسمین بی بی بھینسیں چرانے کے بعد انہیں اسی احاطے میں باندھ دیا کرتی تھی ایسی خصوصی پیش کش اسے عتیق علی کی طرف سے ہی ہوئی تھی۔

عتیق علی خاصا دردمند انسان تھا جو اپنے مزارعوں اور رعایا کو ایسی چھوٹی موٹی سہولتیں اور فوائد دے دیا کرتا تھا۔ زرقا رات کو خشک بالن رکھنا بھول گئی تھی اور اب یاسمین بی بی کے عتاب کا نشانہ بنی گیلی لکڑیوں سے آگ جلانے کی کوشش میں ہلکان ہورہی تھی اسے آگ جلانے سے ویسے ہی سخت چڑ تھی۔

آدھ پون گھنٹے کی جان لیوا مشقت کے بعد اس سے بمشکل آگ جلی تھی یاسمین بی بی نے فوراً ہی دو پراٹھے پکا کر چائے بنائی زرقا اندر سے اچار لے آئی۔ ابھی اس نے پہلا نوالہ توڑا ہی تھا کہ ٹیپو چلا آیا۔

"السلام علیکم خالہ ..... کیسی ہیں؟" اس نے یاسمین بی بی کے سامنے سر جھکاتے پیار لیا تو زرقا نے اسے بے تابی سے دیکھا جو خالی ہاتھ نظر آرہا تھا۔

"جیتے رہو— ناشتا کروگے؟" یاسمین بی بی کو ٹیپو ہر لحاظ سے بہت پسند تھا بہت ہی فرماں بردار اور سلجھا ہوا لڑکا تھا۔ نیم جی نے ہمیشہ ہی خلیل احمد کے بعد ایک بڑے بھائی کی حیثیت سے ان کا خیال رکھا تھا کچھ اس لحاظ سے بھی وہ ٹیپو کو چاہتی تھی زرقا اور اس میں دو ماہ کا فرق تھا وہ زرقا سے دو ماہ چھوٹا تھا۔

"نہیں خالہ— ناشتا نہیں کروں گا ابھی کرکے آیا ہوں زرقا سے کچھ کام تھا بس اسی سے ملنے آیا ہوں؟" اس نے مسکراتے ہوئے اپنے آنے کا مقصد بتایا جبکہ زرقا نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا تھا۔

"مجھ سے کیا کام ہوسکتا ہے تمہیں؟" زرقا نے چبا چبا کر ایک ایک لفظ ادا کیا۔

"مجھے معلوم ہے تم مجھ سے ناراض ہو لیکن سچ پوچھو تو اس روز میرے پاس پیسے نہیں تھے ورنہ تمہاری مطلوبہ چیزیں ضرور لے کر آتا۔ خیر آج اگر پیسے ہیں تو دے دو لے آؤں گا پھر دو دن تو کالج جا نہیں پاؤں گا اور یہ رہی تمہاری رسید رجسٹری تو تین دن پہلے ہی بھیج دی تھی۔" اس نے جیب میں سے رسید نکال کر اسے تھمائی تو زرقا نے امید بھری نظروں سے یاسمین بی بی کی طرف دیکھا۔

"میں تمہیں ایک روپیہ بھی نہیں دوں گی ان اللوں تللوں کے لیے۔" یاسمین بی بی نے اس کی آنکھوں میں لکھا سوال پڑھ کر ہری جھنڈی دکھائی تھی۔

"اماں ..... صرف دو سو روپے۔" زرقا کا منہ لٹک گیا۔

"کمانا ایک روپیہ بھی نہیں ..... کوئی کام کی چیز ہو تو دے بھی دوں ..... صرف کاغذ منگوائی رہتی ہے انہیں لکھ لکھ کے کالے کرتی رہتی ہے جیسے کسی پڑھے لکھے خاندان کی ہے نا۔" یاسمین بی بی کو غصہ کم ہی آتا تھا مگر جب آتا تھا تو—

"اماں ..... میں اپنی ضرورت کے لیے اور کس سے کہوں' کس سے مانگوں؟" زرقا کا دل چاہا دھاڑیں مار مار کے رو دے خدا غریبی بھی کسی کو نہ دے جہاں ہر خواہش کے لیے سسکنا پڑتا ہو۔

"زرقا—" اچانک ٹیپو نے اسے پکارا اور ہاتھ سے اشارہ کیا خاموش رہنے کا۔

"میں لے آؤں گا۔ تم جھگڑا مت کرو۔" زرقا نے ڈبڈبائی آنکھوں سے پہلے یاسمین بی بی کو اور پھر ٹیپو کو دیکھا۔ جو واپس جانے کو مڑنے لگا تھا۔

"ٹھہرو ٹیپو— دیتی ہوں پیسے مگر تمہیں بتا رہی ہوں آخری بار دے رہی ہوں بس— تم اپنے لیے مانگو میں تمہیں انکار بھی کروں تو کہنا۔" یاسمین بی بی زرقا کی آنکھوں میں نمی نہیں دیکھ پائی ۔

"تو یہ بھی تو میں اپنے لیے ہی مانگ رہی ہوں اماں؟" زرقا کی زبان میں کھجلی ہوئی۔

"اپنی ذات پر خرچ کرو نا پھر— ان موئے کاغذوں پر کیوں کرتی ہو جہاں سے جواب ہی نہیں آتا پیسہ اور وقت کا الگ نقصان ..... صاف بتا رہی ہوں تجھے ان فضولیات کے لیے میرے پاس کوئی پیسہ نہیں۔" غصے کا اظہار کرتے وہ اندر سے دو سو روپے نکال کر لاتے

ہوئے اسے تنبیہہ کرنا نہیں بھولی۔

زرقا کی خودی پر کڑا تازیانہ لگا تھا جی چاہا واپس کر دینے لینے سے انکار کر دے مگر۔۔۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی وہ اس پوزیشن میں بالکل بھی نہیں تھی کیونکہ اس کے پاس پیسے حاصل کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا۔ اس لیے خاموش رہی اور خاموشی سے ٹیپو کو اشیاء کی لسٹ بنا کر دینے لگی تھی البتہ چہرے پر ابھی بھی دکھ کی تحریر رقم تھی۔

☼ ☼ ☼

بالآخر تین ماہ کے جان لیوا انتظار کے بعد اسے ادارے کی جانب سے ڈائجسٹ کے ساتھ منی آرڈر ملا تھا خاکی لفافہ چاک کیے بغیر بھی اس کا دل جان گیا تھا کہ اس کی تحریر اس ماہ کے پرچے میں شامل اشاعت ہے۔ اس نے بے تابی سے خاکی لفافہ چاک کیا خوب صورت سرورق سے سجا نیا تازہ شمارہ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اس نے بے تابی سے فہرست پر نگاہ دوڑائی تو جگمگاتے حروف کے ساتھ اسے اپنے ناول کا نام نظر آیا۔ بے اختیار اس کا جی چاہا وہ بھنگڑا ڈالے بالآخر وہ کامیاب ٹھہری تھی۔

وہ ننگے سر اور پاؤں بھاگتے ہوئے نیم جی کے گھر گئی تھی پھولی سانسوں سمیت ہاتھ میں پکڑے ڈائجسٹ کے ساتھ اپنی بے ہنگم سانسوں کو اس نے دہلیز پر رک کر ہموار کیا۔

"نیم جی۔" نیم جی نے اسے دہلیز پہ کھڑے لمبے لمبے سانس لیتے دیکھا تو لمحہ بھر کو چونک سے گئے نگاہ اس کے ننگے پیروں پر ٹھہری تو ایک عجیب سی بے چینی نے کسی انہونی کے خوف سے ان کا دامن پکڑ لیا۔

"خیریت بیٹا!" بے ساختہ انہوں نے خود کو یہ جملہ کہنے کے لیے تیار کیا تو زرقا آگے بڑھی اور رسالہ ان کے سامنے کر دیا۔

"دیکھ لیں نیم جی۔۔۔" پاکستان کے اول نمبر خواتین کے ڈائجسٹ میں میرا ناول چھپا ہے یہ دیکھیں زرقا خلیل لکھا ہوا۔۔۔ کیسا پیارا لگ رہا ہے نا میرا نام۔"

اپنے نام کے حروف پہ انگلی پھیرتے اس نے بے حد خوشی و جوش سے بتایا تھا۔

"ہاں بہت پیارا لگ رہا ہے اللہ کرے اس نام ہی کی طرح تمہارا نصیب بھی جگمگائے۔"

"آمین۔" زرقا اور نیم جی کے لبوں سے ایک ساتھ آزاد ہوا تھا۔

"میں سب سے پہلے ننگے پیر بھاگتی آپ کے ہاں آئی ہوں۔ میں نے خود کو ثابت کر کے دکھا دیا کہ میں بھی کچھ کر سکتی ہوں۔" نیم جی دھیمے سے مسکائے۔

"اور مجھے لگا کہ آج تو کوئی انہونی ہو گئی ہے۔ جو زرقا خلیل بھاگتی ہوئی ننگے پیر میرے پاس آئی ہے۔" انہوں نے اس کی جذباتیت دیکھتے اسے چھیڑا۔

"انہونی تو ہوئی ہے نا نیم جی! ملک کے اتنے نامور ڈائجسٹ میں ایک پسماندہ دیہات کی میٹرک پاس لڑکی کی کہانی چھپی ہے اس سے بڑی انہونی اور کیا ہو گی!" زرقا خلیل کے لہجے میں سادگی تھی۔

"ذہانت اور خداداد صلاحیت کا تعلق اگر کسی مخصوص شہری طبقہ سے جڑا ہوتا تو پھر کبھی بھی غریب و مفلس کا بچہ دنیا کے اتنے بڑے بڑے میدان نہ مار لیتا۔ دنیا بھری پڑی ہے ایسے ناموں سے جنہیں اپنے شوق کی تکمیل اور جنون نے فرش سے عرش تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ بے تحاشا عزت دولت اور شہرت بھی بخشی اور یہ وہ نام تھے جنہیں ایک وقت پیٹ بھر روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ تم نے کبھی غالب کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کے بارے میں سنا ہے۔ ان کا گھر نیم پختہ اور بے حد خستہ حال تھا برسات کے موسم میں پانی کمروں میں جل تھل کر دیتا تھا مگر شاعری میں ان کا کوئی ثانی آج تک پیدا نہیں ہو سکا۔

چلو تم برصغیر کے شاعروں اور لکھاریوں کو رہنے دو میں تمہیں آج کی سپر پاور امریکہ کے پریذیڈنٹ کے بارے میں بتاتا ہوں اس کا باپ ایک لکڑہارا تھا۔ اس بات سے اندازہ لگا لو کہ ان کے گھریلو حالات کیسے ہوں گے اور ابراہیم لنکن جیسی نامور اور مشہور شخصیت نے اپنی پڑھائی کیسے مکمل کر کے وہ عہدہ حاصل کیا ہو گا

جس کا خواب کسی عام امریکی شہری کے بس کی بات بھی نہیں ہے کہ وہ اس کا خواب ہی دیکھ لے۔

اس لیے میں تم سے ایک آخری بات کروں گا کہ خود کو کبھی بھی دوسروں سے کم نہ سمجھنا خود پر اور اپنی صلاحیتوں پر بھرپور یقین رکھنا تم ان لوگوں سے زیادہ آگے بڑھ سکتی ہو جن کے پاس ساری سہولتیں موجود ہیں اور جو اچھے شہروں میں مقیم ہیں۔" "نہیں سنتی زرقا کی آنکھیں پانیوں سے لبریز ہو گئیں۔

"تم جانتی ہو نا کہ تمہیں آگے کیا چیز لے جا سکتی ہے۔" ان کا انداز سوالیہ مگر لہجہ و انداز بے حد مشفق تھا زرقا نے ڈبڈبائی نظروں سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"تمہاری لگن، شوق اور جنون۔۔۔ کبھی بھی احساس کمتری کو زندگی میں شامل نہ ہونے دینا۔" زرقا خلیل نے ان سنہری اقوال زریں کو کسی قیمتی متاع کی طرح سے اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا یہ منزل تک پہنچنے کے لیے اس کا زاد راہ تھا۔

اس نے مٹھی میں بھرے ان نیلے نوٹوں کو دیکھا ایک سرخوشی کی لہر پورے وجود میں سرایت کر گئی تھی یاسمین بی بی صبح سے کھیتوں پر گئی ہوئی تھی اور ابھی تک نہیں لوٹی۔۔۔ زرقا کو بے حد انتظار تھا یاسمین بی بی کا۔۔۔ تاکہ وہ انہیں اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی بتا سکے۔ اس کو دو ہزار ملے تھے یہ اس ناول کا اعزازیہ تھا جو زرقا کو ملا تھا اس کی پہلی کمائی کی صورت زرقا بار بار پرچے میں اپنا نام پڑھتی اور بار بار ہی ان مٹھی میں دبے پیسوں کو دیکھتی۔۔۔ بالآخر اس سے صبر نہیں ہوا اور مٹھی میں پیسے داب کے دوپٹہ سر پہ اچھی طرح سے اوڑھ کر کھیتوں کی جانب چل پڑی۔

پھلوں کی چنائی کا موسم تھا شاید کینو اور امرودوں کے اس باغ میں اس کی ماں بھی کام پہ لگی ہو۔۔۔ اس کا اندازا صحیح نکلا تھا اس کی ماں پھلوں کے ٹوکرے بھر بھر کے منشی کے پاس حساب کتاب کے لیے آئی تھی اسے دیکھ کے یکدم چونک اٹھی۔

"زرقا! تو ادھر کیا کرنے آئی ہے؟" مگر زرقا جوش جذبات میں ماں کے گلے سے لگ گئی اور مٹھی میں دبے نیلے دو نوٹ ماں کے ہاتھ میں تھما دیے۔۔۔ یاسمین بی بی نے اپنی بند مٹھی کو کھولا تو حیران رہ گئی۔

"یہ اتنے سارے پیسے۔۔۔ تو نے کہاں سے لیے زرقا؟" ان کے لہجے میں حیرت سے زیادہ خوف تھا یا سراسیمگی زرقا اندازا نہیں کر پائی مگر ایک جوان بچی کے ہاتھ میں تھامے پیسے انہیں کچھ اور اچھا سوچنے ہی نہیں دے رہے تھے۔

"وہیں سے اماں۔۔۔ جن کے بارے میں تو کہا کرتی تھی کہ ان کا تو جواب نہیں آتا۔" زرقا نے نرمی سے ماں کے گلے میں بازو حمائل کیے دھول اڑاتی پراڈو سے اترتے سردار عتیق علی نے اس منظر کو کسی قدر حیرت سے دیکھا۔

"تیری کہانی چھپی ہے کیا؟" یاسمین بی بی کے لہجے میں اشتیاق در آیا۔

"ہاں اماں۔۔۔ اور انہوں نے اس کہانی کا معاوضہ بھی دیا ہے مجھے۔۔۔ رکھ لو ان پر تیرا بہت حق ہے اماں"

اس سے پہلے کہ یاسمین بی بی کوئی جواب دیتی کاٹن کے کڑکڑاتے سفید سوٹ میں پوری آب و تاب کے ساتھ دھرتی کے سینے پر پاؤں رکھتے سردار عتیق علی ان کے نزدیک چلے آئے۔

"سلام سائیں؟" یاسمین بی بی نے ہڑبڑا کر سلام جھاڑا تو زرقا بھی خود میں سمٹی نگاہیں جھکا گئی سرسری مگر در حقیقت گہری نگاہ میں زرقا کا پوسٹ مارٹم کرتے انہوں نے یاسمین بی بی کے سلام کا جواب دیتے ہی پوچھا تھا۔

"یہ تمہاری بیٹی ہے نا؟" یاسمین بی بی نے بے اختیار خود میں سمٹی زرقا کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا

"اچھا۔۔۔" سردار عتیق علی کے لہجے میں اچنبھا تھا۔

"کہاں چھپائے رکھتی ہو اسے پہلے تو کبھی دکھائی نہیں دی؟" سردار عتیق علی نے اس چھوئی موئی سی گلاب کے پھول جیسی نزاکت رکھنے والی لڑکی کو دیکھا

اور پھر میلی کچیلی گہرے سانولے رنگ کی حامل یاسمین بی بی کی طرف جس کے ہاتھوں پہ کالے گٹے کام کی زیادتی کو ظاہر کر رہے تھے۔

"پڑھی لکھی ہو کیا؟" اب کی بار اس نے براہ راست زرقا خلیل کے نوخیز سراپے پر نگاہ جمائے پوچھا۔

"میٹرک پاس ہے جی.... نیم جی سے پڑھا ہے اس نے۔" زرقا کے کچھ بھی کہنے سے پہلے ہی یاسمین بی بی نے جان چھڑانے والے انداز میں اس سے کہا۔

"اچھا.... بہت خوب.... آگے کیوں نہیں پڑھایا اسے۔" وہ اب دلچسپی سے باتوں میں مصروف ہو گئے مالی کے پاس حساب کتاب کرتے مزارعوں نے معنی خیز انداز میں اس منظر کو دیکھا یاسمین بی بی ان نگاہوں سے لرز اٹھی۔

"ہم غریبوں نے کیا پڑھنا ہے سائیں۔ پڑھ لکھ کر بھی تو آپ کی نوکری ہی کرنی ہے نا۔" یاسمین نے بات کو ختم کرنے کی غرض سے جلدی سے کہا زرقا نے بے زار سے انداز میں ادھر سے ادھر دیکھنا شروع کر دیا وہ سردار عتیق علی کی جانب متوجہ تھی نہ ہی پروا کر رہی تھی۔

"پھر بھی بی بی! تعلیم تو ہر ایک کے لیے ضروری ہے بالخصوص لڑکی ذات کے لیے عورت کا پڑھا لکھا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے اس نے ایک نئی نسل کو جنم دے کر اس کی تعمیر کرنی ہوتی ہے کہیں بات دات طے کی اس کی یا نہیں؟" سر پہ لگائی عینک آنکھوں پر جمائے انہوں نے بہ ظاہر بہت سرسری سے انداز میں پوچھا۔

"جی.... جی۔" یاسمین نے بے اختیار زرقا کو اپنے پیچھے چھپانے کی موہوم سی کوشش کی۔

"اچھا کس کے گھر؟" یاسمین کی سانس اٹک گئی اس بات کا جواب اس کے پاس نہیں تھا پھر کچھ سوچ کے کہہ اٹھی۔

"نیم جی کے بیٹے.... ٹیپو کے ساتھ۔" اس کی بات پر سردار عتیق علی تو پتا نہیں چونکا تھا یا نہیں مگر زرقا خلیل ضرور چونک اٹھی تھی اس نے بے اختیار اپنی ماں کی طرف حیرت سے دیکھا۔

"تجھے میرے پیچھے باغ میں نہیں آنا چاہیے تھا زرقا۔" یاسمین بی بی نے گھر آ کے گٹھری زمین پر پھینکتے ہی کہا تھا۔

"اماں.... مجھے زندگی کی اتنی بڑی کامیابی ملی اور میں تمہیں بتانے نہ آتی.... کمال ہے؟" زرقا نے ناسمجھی سے ناراض سے لہجے میں کہا۔

"میں نے یہ کب کہا بس حالات بڑے خراب ہیں اسی بات سے ڈرتی ہوں۔"

"تو حالات خراب ہیں اماں.... مگر ہم تو نہیں نا۔" اس نے کھلکھلا کے ہنستے ذو معنی انداز اپنایا تو یاسمین بی بی اپنا سر پیٹ کے رہ گئی۔

"تو نہیں سمجھے گی نہ ہی کبھی سدھرے گی۔" یاسمین بی بی نے جیسے اس کی عقل پر ماتم کیا۔

"سب سمجھتی ہوں اماں.... اس لیے تو تجھ سے کہا ہے سب اور پھر تم نے جھوٹ کیوں بولا عتیق علی سے.... ٹیپو اور میرا کیا جوڑ ہم دونوں تو بہن بھائی ہیں اس نے تمہارا دودھ پی رکھا ہے۔" زرقا کے لہجے میں حیرت سے زیادہ دکھ تھا کیا اس کی اماں کو اس پر اعتماد نہیں تھا جو اس نے ایسی بات اپنے سردار کے سامنے کہہ دی۔

"جن بیٹیوں کے سر پہ باپ کا سایہ نہ ہو وہ مائیں یونہی جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتی ہیں اس بات کی سمجھ تمہیں نہیں آسکے گی۔" یاسمین بی بی نے بات ختم کر کے اٹھتے ہوئے کہا تھا زرقا بس منہ دیکھ کر رہ گئی

☼ ☼ ☼

اس واقعے کے ٹھیک دو دن بعد زرقا حویلی پروین ادی سے ملنے کے لیے آئی تھی۔ وہ جب گھر میں داخل ہوئی تو سردار عتیق علی گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے بادامی رنگ کے کڑکڑاتے لٹھے کے سوٹ میں وہ پوری شان کے ساتھ اس کی طرف دیکھ کر خیر مقدمی مسکراہٹ اچھالتے مسکرائے تھے زرقا انہیں دیکھ کر لمحے بھر کو ٹھٹک سی گئی اس وقت وہ حویلی میں موجود نہیں ہوتے تھے اور زرقا اس یقین کے بعد ہی یہاں آئی تھی۔

"کیسی ہو زرقا؟" وہ ان کے پاس سے کترا کے نکلنے لگی تھی جب انہوں نے اس کے گریز کو بھانپنے کے باوجود بھی اسے پکارا تھا زرقا بے ساختہ رک گئی۔

"ٹھیک ہوں سائیں!" زرقا کی نگاہیں جھک گئیں شرم و حیا کو سردار عتیق علی نے بڑے غور سے اس کے چہرے پر بکھرا دیکھا تھا۔

"پروین ادی ہیں گھر پر؟" زرقا نے ان کی نگاہوں سے خائف ہوتے سوال کیا وجہ صرف ان کا دھیان بٹانا تھا۔

"اچھا تو تم اس سے ملنے آتی ہو یہاں؟" وہ جیسے اس کا سوال سن کر محظوظ ہوئے۔

"وہ میری بہت اچھی دوست ہیں۔" زرقا نے آہستگی سے بتایا۔

"اچھی بات ہے آتی جاتی رہا کرو.... وہ بھی گھر میں اکیلی بور ہوتی ہے۔" انہوں نے اس کی طرف دیکھتے بات کرنے کے ساتھ ساتھ گاڑی کا دروازہ کھولا۔

"اکیلی تو نہیں ہوتیں آپ کی بیوی بھی تو ساتھ ہوتی ہیں ان کے۔" زرقا نے جانے کس احساس کے تحت انہیں جتلایا تو سردار عتیق علی بے ساختہ مسکرا دیے۔

"تمہاری عمر کتنی ہے؟" زرقا نے ان کے لبوں کے کونے میں مسکراہٹ دبی دیکھی۔

"اگلے مہینے پورے بیس کی ہو جاؤں گی"

"اچھا.... باتیں تو عمر سے زیادہ بڑی کرتی ہو۔" سردار عتیق علی نے اب کی بار مسکراہٹ دبانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"میں نے کون سی آپ کے ساتھ گفت و شنید کر لی جو آپ ایسا کہہ رہے ہیں۔" زرقا بے ساختہ چونکی پھر روانی میں بول گئی۔

"تھوڑا مناسب وقت کا انتظار کر لو.... اس بات کا جواب بھی ضرور دوں گا۔" اتنا کہہ کر زرقا کو ورطہ حیرت میں ڈالا اور گاڑی بڑھا کے یہ جا وہ جا۔ زرقا اپنی جگہ جمی کھڑی رہ گئی۔

کمرے کی کھڑکی سے سارا منظر دیکھتی پروین نے کچھ عجیب سی بے چینی محسوس کی وہ اپنے بھائی کی رنگین فطرت سے بخوبی آگاہ تھی اور زرقا جیسی پاکیزہ لڑکی کی شرافت سے بھی.... رابعہ بھابھی اس کی پھوپھی کی بیٹی تھی اکلوتی تھی اور پندرہ مربعے زمین اور بھاری جہیز کے ساتھ اس گھر میں اپنی مستحکم حیثیت کے ساتھ موجود تھی۔ دوسری شادی کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا اور باندی بن کر رہنا زرقا خلیل جیسی لڑکی کے بس کی بات نہیں تھی مگر....

پروین ادی کا اندازا غلط تھا عتیق علی نے رابعہ بھابھی سے دوسری شادی کی اجازت مانگی وہ دوسری شادی کس سے کر رہے تھے اس بات پر دھچکا رابعہ
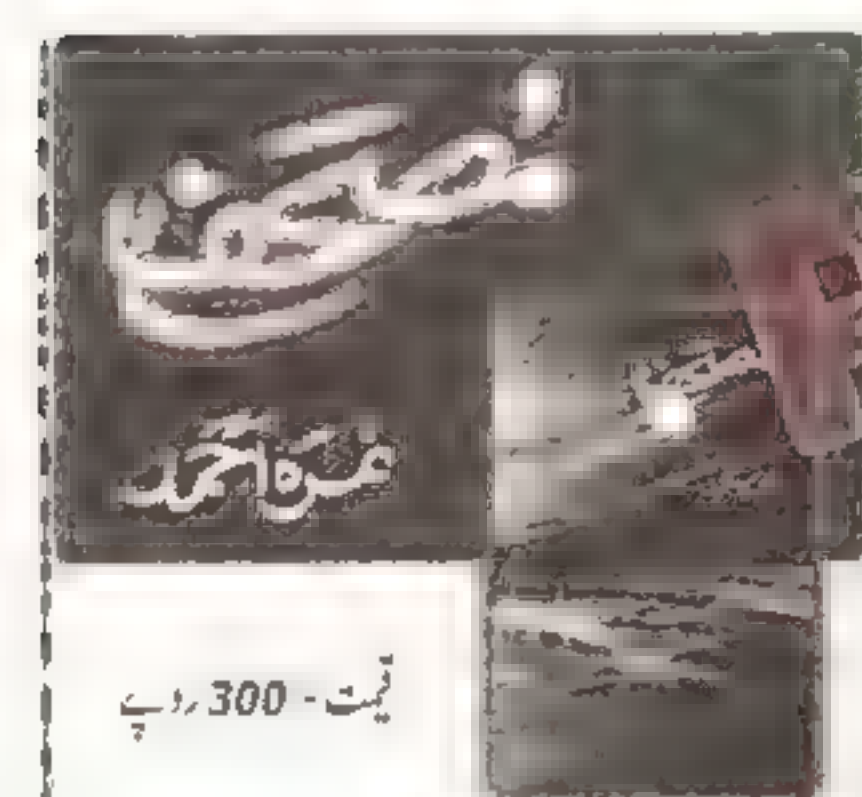
بھابھی کو لگا تھا۔ وہ دوسری شادی زرقا خلیل سے کر رہے تھے۔ جو ان کے معمولی سے مزارعے کی بیٹی تھی جس کی ماں یاسمین بی بی کی ساری زندگی رابعہ خاتون اور اس کی ماں کی اترن پہنتے گزری تھی۔ ہتک و اہانت کا لاوا پھوٹا تھا جو رابعہ خاتون کے وجود کو پل کے پل میں راکھ کا ڈھیر بنا گیا تھا۔

"تم اس دو ٹکے کی لڑکی کو میرے مقابل لا رہے ہو ۔۔۔ میری سوتن بنا رہے ہو عتیق علی۔" رابعہ خاتون کسی سانپ کی مانند پھنکارتے ہوئے عتیق علی کی آنکھوں میں دیکھ کر غرائی۔

"جس پر عتیق علی کی نظر پڑ جائے وہ پھر دو ٹکے کا کہاں رہتا ہے اس کی قدر و قیمت تو عتیق علی کی نظر پڑتے ہی لاکھوں میں ہو جاتی ہے۔" رابعہ خاتون کی غراہٹ کے جواب میں سردار عتیق علی نے بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"تم غلط کر رہے ہو عتیق علی ۔۔۔ تم پچھتاؤ گے۔ تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے؟" وہ غصے و بے بسی سے چلائی تھی مگر لہجہ پسپائی لیے ہوئے تھا۔

"غلط کیا کر رہا ہوں ۔۔۔ تم سے اجازت مانگ رہا ہوں تم میری پہلی بیوی ہو تمہاری حیثیت اس گھر میں مضبوط و مستحکم ہے تمہیں کس بات کا ڈر ہے؟ ہر چیز پر تمہاری اجارہ داری ہے اور رہے گی۔" سگریٹ کا گہرا کش فضا میں چھوڑتے انہوں نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کہا تھا مگر رابعہ خاتون کو ان کا ٹھنڈا ٹھار لہجہ دہکا گیا وہ بھڑ بھڑ جلنے لگی۔

"مجھے اس گھر پر اجارہ داری نہیں چاہیے عتیق علی! مجھے تم پر اپنی اجارہ داری چاہیے جو میرا حق بھی ہے۔" عتیق علی اس کی بات سن کے مسکرائے یوں جیسے کوئی کسی کی بے وقوفی کو نظر انداز کرتے مبہم انداز میں مسکراتا ہے۔

"اجارہ داری انسانوں پر نہیں کی جاتی رابعہ بیگم ۔۔۔ نا ہی حقوق کی لڑائی اس طرح سے لڑی جاتی ہے۔ تم اچھی طرح سے جانتی ہو ہمارا رشتہ بچپن سے طے تھا اور صرف برادری کی مجبوری میں میں نے تمہیں اپنایا ہے ان گزرے برسوں میں ایک دن بھی ہم ایک دوسرے کو خوش نہیں رکھ پائے دوسری شادی میرا حق ہے کیونکہ میں دو بیویوں کے درمیان انصاف کر سکتا ہوں۔" سگریٹ کا خالی پف ایش ٹرے میں مسل کر پھینکتے انہوں نے اٹھتے ہوئے سرسری سے لہجے میں کہا تھا۔

"یاسمین بی بی کے گھر رشتہ لے کر جا رہی ہو نا پھر۔" آئینے کے سامنے کھڑے ہو کے بال سنوارتے انہوں نے بڑے لاڈ سے پوچھا تھا۔

"میں ہرگز نہیں جاؤں گی اس دو ٹکے کی لڑکی کے گھر۔" ضبط کرتے کرتے بھی وہ چلا اٹھی تھی۔

"ٹھیک ہے مت جانا ۔۔۔ کوئی تمہیں مجبور نہیں کرے گا!" دوسری طرف انہیں تو جیسے کوئی پروا ہی نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

باقی کے معاملات تو جیسے منٹوں میں طے ہو گئے تھے جب عتیق علی کے فیصلوں سے گھر والے انحراف نہیں کر پائے تھے تو یاسمین بی بی کی کیا جرات ۔۔۔ پروین ادی کو زرقا سے صحیح معنوں میں پیار تھا تب ہی تو اس کے گھر سمجھانے آئی تھیں۔

"اپنے ساتھ ایسی دشمنی کیوں کر رہی ہو زرقا! ادا سائیں کو تم نہیں جانتیں ان کا ساتھ تمہارے خواب کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ کہانیاں پڑھنے والوں کو کتنا ناپسند کرتے ہیں تو پھر سوچو کہ کہانی لکھنے والے کا کیا حشر کریں گے پھر۔ بھابھی تمہارا جینا اس گھر میں محال ہو جائے گا۔" زرقا پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

"جانتی ہوں ادی! مگر کچھ کر نہیں سکتی سر پہ باپ کا سایہ ہے نہ ہی معاشرے میں مضبوط مقام جو سردار عتیق علی سے ٹکرا جاؤں ۔۔۔ مجھے اس کی کٹھ پتلی بننے کے بجائے اس کی دوسری بیوی بن کے حویلی میں قید ہونا منظور ہے مگر میں وہ سب نہیں کر سکتی جو میرے انکار کی صورت میں سردار عتیق علی مجھ سے کروائیں گے۔

گئے۔" اپنی ہاتھوں کی لکیروں پر نگاہ جمائے اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا تھا۔

"تو کیا اپنے خواب کی قربانی دے دو گی؟" پروین ادی کے لہجے سے دکھ و حیرت مترشح تھے۔

"نہیں ادی! میں سردار عتیق علی کی زندگی میں رہ کر اپنے خواب کی تکمیل کروں گی! اور میرا ساتھ عتیق علی بھی دیں گے۔" پروین ادی دھیرے سے اس کی بات سمجھتے مسکرائی۔

"اور مجھے یقین ہے کہ تم ایسا کر لو گی۔" پروین ادی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کے اسے اپنے ساتھ کا یقین دلایا تھا۔

☼ ☼ ☼

گہرے میرون رنگ کے عروسی لباس میں ڈھیروں ڈھیر زیورات پہنے وہ صحیح معنوں میں اپنی کسی کہانی کی ہیروئن لگ رہی تھی کمرے میں سرخ گلابوں کی بہار اتری ہوئی تھی سردار عتیق علی نے بے حد شان و شوکت سے اسے اپنا نام دیا تھا کچھ ہی دیر میں وہ کمرے میں آئے تھے زرقا کی نگاہیں سینے سے جا لگیں۔ سردار عتیق علی نے اسے دھیرے سے سلام کیا مگر وہ جواب نہیں دے سکی۔

"بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ بالکل ویسی ہی جیسا میں نے تصور میں سوچا تھا؟" وہ اس کی چوڑیوں سے کھیل رہے تھے۔

"ایک بات پوچھوں سائیں!" کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے بات کا آغاز کیا تھا۔

"دس پوچھو ۔۔۔ صرف ایک کیوں؟" وہ جانثار ہوئے۔

"آپ نے میرے ساتھ شادی کیوں کی ۔۔۔ میں تو کسی بھی لحاظ سے آپ کے قابل نہیں؟"

"یہ تو صرف میں جانتا ہوں کہ تم کس قابل ہو۔" انہوں نے محبت سے جواب دیا۔" زرقا نے اس بات کا جواب نہیں دیا ایک نئی بات بتائی۔

"سائیں! میں نے ایک کہانی پڑھی تھی اس میں اس طرح ایک سردار یونہی اپنی مزارع کی بیٹی سے محبت کی شادی کرتا ہے اس طرح میرے ساتھ ہوا تو مجھے یقین آ گیا۔" سردار عتیق علی کے لب مسکراتے یکدم سمٹے تھے۔

"تم کہانیاں پڑھتی ہو؟" انداز میں اچنبھا تھا۔

"لکھتی بھی ہوں۔" زرقا کا جواب بے ساختہ و برجستہ تھا۔

"مگر مجھے تو کہانیاں لکھنے پڑھنے والی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔" سردار عتیق علی کا انداز اب کی بار سنجیدہ تھا۔

"تو پھر محبت کا دعوا ایک کہانی کار کے ساتھ کیوں ۔۔۔ بات کچھ جم نہیں رہی۔" وہ بھی بحث پر اتر آئی وہ خاموش رہے۔

"سچ جانیں سائیں! اگر آپ کو اس بات کا پتا شادی سے پہلے لگ جاتا کہ میں کہانی کار ہوں تو کیا آپ کو پھر مجھ سے محبت نہ ہوتی؟" وہ گھونگھٹ الٹے اب شرم و لحاظ بالائے طاق رکھے اپنے سامنے بیٹھے عتیق علی سے پوچھ رہی تھی

"محبت تو ہو جایا کرتی ہے سائیں' بالکل ویسے ہی جس طرح مجھے آپ سے ہو گئی یہ بات جانتے ہوئے بھی کہ آپ کو رسالے پڑھنے والی لڑکیوں سے کتنی چڑ محسوس ہوتی ہے۔" اس کی آخری بات پر سردار عتیق علی کھلے دل سے مسکرائے۔

"اچھا ۔۔۔ خبریں تو بڑی رکھتی ہو میرے متعلق۔" وہ اس کے ماتھے کا جھومر اتارتے دھیرے سے ہنسے۔

"وہ تو مجبوری تھی میری سائیں آپ بالکل ہیرو لگتے تھے میری کہانیوں کے تا سچ کہہ رہی ہوں سائیں آپ میری کہانیاں پڑھ کے دیکھنا۔ آپ کو اس میں اپنا ہی عکس نظر آئے گا۔" زرقا نے سادگی سے بتایا تھا۔ سردار عتیق علی اس کی معصومیت و محبت کے اس اظہار پر والہانہ و وارفتہ سے ہنسے۔

☼ ☼ ☼

وہ سردار عتیق علی کے ہمراہ ڈائننگ ٹیبل پر ناشتے

کے لیے آئی تو رابعہ خاتون کی تیوری چڑھ گئی۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھنے ہی لگی تھی کہ رابعہ خاتون کا ضبط کا پیمانہ ایک دم سے چھلکا تھا۔

"عتیق علی! شاید تم بھول رہے ہو کہ اس گھر پر اجارہ داری صرف میری ہے تو پھر اسے کیوں یہاں اپنے ساتھ لے آئے۔" لمحے کے ہزارویں حصے میں زرقا کے چہرے کا رنگ فق ہوا تھا۔

"یہ میرے ساتھ آئی ہے اور یہ ہر اس جگہ جائے گی جہاں میں جاؤں گا۔ زرقا بیٹھو اور ناشتا شروع کرو۔"

"نہیں سائیں! میں بعد میں ناشتا کروں گی آپ پہلے رابعہ ادی کے ساتھ ناشتا کریں۔" زرقا نے فوراً ہی پلٹتے کہا تھا رابعہ خاتون نے اس کے گیلے بالوں سے ٹپکتے پانی کو نفرت انگیز انداز میں دیکھا اور پھنکاری۔

"اپنی اوقات ہمیشہ یاد رکھنا زرقا خلیل۔۔۔ عتیق علی کے نکاح میں آکے یہ مت سمجھنا کہ تمہیں دنیا پہ حکمرانی کرنے کا پرمٹ مل گیا ہے اس گھر پہ تمہارا کوئی حق نہیں ہے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔" زرقا واپس پلٹ کر ان کے مقابل آئی۔

"یہ گھر آپ کا ہی ہے ادی۔۔۔ اور ہمیشہ آپ کا ہی رہے گا اور مجھے اس گھر میں نہیں صرف عتیق علی کے دل میں جگہ چاہیے ان کے دل پہ حکمرانی چاہیے باقی کسی چیز کی تمنا نہیں مجھے!" زرقا خلیل کے اس واضح اظہار پر عتیق علی نے اپنا روم روم شانت ہوتا محسوس کیا تھا جو محبت وارفتگی انہیں زرقا خلیل کی ذات سے مل رہی تھی ویسی محبت و راحت انہیں رابعہ خاتون کبھی بھی نہیں دے پائی ــــ وہ اٹھ کے زرقا کے پاس آئے پھر نوکرانی کو آواز لگائی۔

"خیراں بی بی۔" وہ کسی بوتل کے جن کی مانند فوری حاضر ہوئی۔

"ہمارا ناشتا بیڈ روم میں لے آؤ۔۔۔ اور آج کے بعد ہمارا ناشتا اور کھانا وہیں لے کر آیا کرنا۔" اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ باہر کی طرف بڑھ گئے رابعہ خاتون اسی ٹیبل پر ناشتے کے لوازمات کے ڈھیر کے قریب سر رکھے پھوٹ پھوٹ کے رودی تھی۔

اس کے بعد اس نے خود سے ایک عہد لیا تھا۔۔۔ جان لیوا عہد۔

☼ ☼ ☼

وہ نہا کر کمرے سے باہر نکلی تو سامنے ہی عتیق علی کو اپنے کاغذات سے الجھتے ہوئے پایا زرقا کو یاد آیا وہ نہانے سے پہلے اپنے کمرے میں بیٹھی لکھ رہی تھی پھر عتیق علی کے آنے کا وقت ہوا تو وہ نہانے چل دی اور اپنا مسودہ سنبھال کر رکھنا بھول گئی اور اب وہی مسودہ عتیق علی بڑے شوق سے پڑھ رہے تھے۔

"آ۔۔۔ آپ کب آئے؟" اسے ڈر تھا کہیں عتیق علی اس کا مسودہ پھاڑ ہی نہ دیں۔

"ابھی کچھ دیر پہلے۔" وہ اس کی طرف دیکھ کے مسکرائے۔

"ابھی تم لکھ رہی تھیں کیا؟" زرقا کی سانس اٹک سی گئی بمشکل تھوک نگلا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اتنی بڑی بڑی باتیں اور اتنے کام کی معلومات کہاں سے لیتی ہو تم؟"

"میم جی کہتے ہیں کہ یہ صلاحیت اللہ کی طرف سے میرے لیے انمول تحفہ ہے۔ لفظوں سے کھیلنا اور انہیں تتلیوں کی مانند پکڑ پکڑ کر صفحہ قرطاس پر موتیوں کی مانند چمکانا صرف اسی کے کرم کی بدولت ہے اور اچھا لکھنے کے لیے اچھے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے اچھی ڈگری کی نہیں۔ آپ پلیز میری اس کہانی کو پڑھیں نا۔۔۔ سچ میں نے بہت اچھی لکھی ہے آپ پڑھیں میں تب تک آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" ان کے ہاتھ میں مسودہ تھماتے وہ ان کے لیے چائے بنانے کچن کی جانب لپکی تھی تبھی بالکل اچانک بغیر بتائے رابعہ خاتون کمرے میں داخل ہوئی ــــ انہیں مسودہ پڑھتے دیکھ کر ان کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔

"یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں عتیق علی! آپ تو ڈائجسٹ کو سخت ناپسند کرتے تھے پھر آج خود ہی اس کی لکھی کہانی کو پڑھ رہے ہیں کیا صرف اس لیے کہ یہ آپ کی چہیتی نے لکھی ہے؟"

"میں مانتا ہوں کہ میں غلط تھا بلکہ صرف میں کیا میری طرح اس معاشرے کا ہر وہ مرد غلط ہے جو اس طرح بغیر جانے پرکھے اپنی بیوی بیٹیوں کو اصلاحی اور سبق آموز کہانیاں پڑھنے سے روکتے ہیں۔"

"ہونہہ۔۔۔ آپ کا تو خیال تھا کہ ڈائجسٹ عشق عاشقی والی کہانیاں چھاپتے ہیں اور کہانیاں پڑھنے والی لڑکیاں بدکردار ہوتی ہیں تو سوچیں عتیق علی کہ عشق عاشقی کی کہانی لکھنے والیاں کیسی ہوتی ہوں گی۔" رابعہ خاتون زخمی شیرنی بنی ہوئی تھی اس لمحے ایک دو ٹکے کی لڑکی اسے مات دے گئی تھی۔

"بہت اچھی ہوتی ہیں۔" انہوں نے اسے آگ لگاتے پھر سے نگاہ مسودے پر جمائی۔

"وہ صرف آپ کو بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کر رہی ہے عتیق علی! اور تم اپنی عمر اور رتبے کا لحاظ کیے بغیر اس کے ہاتھوں کھلونا بنے ہوئے ہو۔" اس نے ایک اور زہر میں بجھا تیر کمان سے نکالا۔

"ضروری نہیں کہ تمہاری سوچ صحیح ہو۔ وہ کیسی ہے میں اچھے سے جانتا ہوں۔" انہوں نے اب کی بار ناچاہتے ہوئے بھی تحمل کا مظاہرہ کیا۔

"آپ کا یہی یقین ایک دن آپ کو پچھتانے پر مجبور کرے گا چھوٹی عمر کی لڑکیاں بڑے عمر کے مردوں کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہتیں۔"

"جس روز ایسا ہوا اس روز یا تو میری زندگی کا آخری دن ہوگا یا اس کی۔" انہوں نے انتباہ کرتے بات ختم کی تھی۔

"بات سے مکر مت عتیق علی۔" جاتے جاتے بھی وہ یاددہانی کروانا بھولی نہیں۔

"میں اپنے قول و فعل کا پکا ہوں!" انہوں نے کہا تھا مگر اپنے کہے پر دھیان نہیں دیا تھا۔ دوسری طرف زرقا عتیق علی کے لیے کچن میں چائے بناتے پروین ادی کو مسرور سی ساری صورت حال بتا رہی تھی۔

"یہ تو کمال ہی ہو گیا زرقا۔۔۔ ادا سائیں نے خود تمہاری کہانی پڑھی ہے۔"

"ہاں ادی۔۔۔ یقین تو مجھے بھی نہیں تھا کہ میں انہیں یوں محبت کی چھری سے رام کرلوں گی۔ سچ محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور محبت کے یقین میں آپ کچھ بھی کروا سکتے ہیں اگلے بندے سے۔" دروازے کی اوٹ میں چھپ کے سنتی رابعہ خاتون نے اس کے الفاظ کو اپنے مطلب کے معنی پہناتے نتیجہ اخذ کیا تھا۔

"بس جلدی سے اپنا ناول پوسٹ کردو تاکہ جلدی شائع ہو سکے۔" پروین ادی اسے نیا مشورہ دے رہی تھی۔

"ہاں میں صبح ہی ٹیپو سے کہوں گی۔" چائے پیالیوں میں ڈالتے اس کا انداز مصروف سا تھا۔

"ٹیپو۔۔۔ میم جی کا بیٹا۔" کچھ سوچ کر مکروہ ہنسی دباتے رابعہ خاتون اپنے کمرے کی طرف بڑھی تھی

☼ ☼ ☼

"کہاں ہو عتیق علی ــــ اور کدھر سو رہی ہے تمہاری غیرت۔" الفاظ تھے یا پگھلا ہوا سیسہ۔ عتیق علی نے اس وقت کو کوسا جب انہوں نے رابعہ خاتون کی کال ریسیو کی تھی۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟" وہ ایک اہم پنچائیت میں بیٹھے تھے دبی دبی آواز میں چلائے۔

"بکواس نہیں کر رہی سچ کہہ رہی ہوں۔۔۔ آپ کی چہیتی اس وقت اپنے پرانے یار کے ساتھ بیٹھی پیار محبت کی تجدید کر رہی ہے مگر آپ کو یقین کیوں آئے گا آپ اسے بہت اچھے سے جانتے ہیں نا۔" رابعہ خاتون کے لہجے میں زہر ہی زہر تھا۔

"کس کے ساتھ ہے وہ!" انہوں نے بمشکل خود پر ضبط کیا۔

"ٹیپو کے ساتھ۔۔۔ میم جی کا بیٹا اور اس کا بچپن کا ساتھی ایک ساتھ ہی پلے بڑھے ہیں تو سوچیں کیا محبت

نہیں ہو گی درمیان۔" رابعہ خاتون کے ایسا کہنے پر عتیق علی کو شادی سے پہلے کہی جانے والی یاسمین بی بی کی بات یاد آئی۔

"بات تو طے کر رکھی ہے سائیں۔ نیم جی کے بیٹے کے ساتھ۔" عتیق علی نے لب بھینچے۔

"ایسی کون سی قیامت آگئی رابعہ اگر اس نے اس کے ساتھ بات کر بھی لی ہے تو۔"

"ٹھیک کہا قیامت تو تب آئے گی عتیق علی! جب تمہیں معلوم ہو گا کہ تمہاری ناک کے نیچے وہ کون سا کھیل رچا کے تمہیں الو بنا رہی ہے۔" عتیق علی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ فون آف کر دیا تھا ہاں مگر ان کا ذہن الجھ گیا تھا۔

"آج کہاں گئی تھیں تم؟"

"اماں کے گھر..... کیوں؟" زرقا نے ابرو اچکاتے پوچھا شادی کو چھ ماہ ہو چکے تھے مگر عتیق علی نے یوں اس طرح پوچھ تاچھ نہیں کی تھی۔

"اس کے بعد کہاں گئی تھیں کیا کسی سے ملی تھیں تم؟"

"ہاں میں نیم جی کے گھر گئی تھی۔ ہمیشہ جاتی ہوں لیکن آپ کیوں اس طرح سے پوچھ رہے ہیں خیریت؟" اس نے ناسمجھی سے ان کی طرف دیکھا۔

"آج کے بعد تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ اماں سے ملنا ہو تو اسے یہیں بلوا لیا کرو۔" اتنا کہہ کے بیڈ پر لیٹے لیٹے کروٹ بدلی۔

"لیکن میں ٹیپو کو اپنی کہانی پوسٹ کروانے کے لیے دینے گئی تھی!" بالآخر کھلی تھیلی سے خود ہی باہر آگئی تھی۔

"آج کے بعد اس سے کبھی بھی مت کہنا!"

"تو پھر میری کہانیاں کون پوسٹ کروائے گا آپ کے پاس تو ٹائم نہیں ہوتا نہ ہی آپ کے کسی نوکر کو ان کاموں کی ..... سمجھ ہے؟" زرقا ان کے رویے سے انجان اپنی پریشانی میں تھی۔

"تو ٹھیک ہے پھر لکھنا چھوڑ دو۔ لکھنا کوئی اتنا ضروری بھی نہیں جس کے لیے اتنے کشٹ اٹھائے جائیں۔" ..... رکھائی سے کہہ کے پھر کروٹ بدل لی تھی۔

"مگر سائیں..... لکھنا پڑھنا تو میں نہیں چھوڑ سکتی یہ تو میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔" پہلی بار زرقا کو بات کی سنگینی کا احساس ہوا تھا۔

"بس میں نے کہہ دیا آج کے بعد میں تمہیں کبھی لکھتا ہوا نہ دیکھوں جتنا لکھنا تھا لکھ لیا۔" زرقا خلیل اس سزا پر حیران پریشان ساکت ان کے پہلو میں بیٹھی رہ گئی دوسری صبح وہ پروین ادی کے سامنے بیٹھی تھی۔ پروین لوی ساری بات سن کے ہلکے سے انداز میں مسکرائی تھی یوں جیسے اسے خبر تھی کہ کبھی نہ کبھی ایسا ہونا ہے۔

"یہ تو ہونا ہی تھا زرقا! عشق کا بھوت ہمارے وڈیروں کے سر پر جتنی جلدی چڑھتا ہے اس سے زیادہ جلدی اترتا بھی ہے اور پھر تم تو سوتن والی بھی ہو۔"

"کیا مطلب ادی؟"

"کوئی مطلب نہیں سوائے اس کے کہ تم کچھ عرصے کے لیے لکھنا چھوڑ دو۔" پروین ادی نے ایسی راہ نکالی تھی جس پر ..... عمل کرنا زرقا خلیل کے لیے ناممکن تھا تبھی تو چیخ پڑی۔

"پر ادی..... میں ایسا کیسے کر سکتی ہوں..... تم جانتی ہو میں نے بہت کم وقت میں اپنا ایک مقام بنا لیا ہے اور اب میرا وہاں سلسلہ وار ناول شروع ہو چکا ہے ہر ماہ مجھے اپنی قسط وہاں ٹائم پر بھجوانی ہوتی ہے۔ میری کیا مجبوریاں ہیں اس بات سے انہیں کیا فرق پڑے گا انہیں صرف اپنے ڈائجسٹ کی ساکھ کو متاثر ہونے سے بچانا مقصود ہو گا اور پھر یہ کہاں کا انصاف ہوا بھلا ..... ؟"

"اس کے سوا اور کوئی حل نہیں تمہارے پاس..... تمہیں ایسا کرنا ہی پڑے گا۔" پروین ادی نے اس کو غصے سے چلاتے دیکھا تو کہے بغیر وہ نہ رہ سکی تھی۔

"میں نکال لوں گی کوئی نہ کوئی حل۔" اس کے لہجے میں ایک ضد بھرا عزم تھا۔

"کیا کرو گی..... کیا اداسائیں سے ضد لگاؤ گی؟"

"نہیں..... مگر ان کی بات بھی نہیں مانوں گی بلکہ درمیانی راہ اپناؤں گی آپ بتائیں میرا ساتھ دیں گی۔" اس نے بڑی آس سے پروین ادی کی طرف دیکھا تو اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتے اپنے ساتھ کا یقین دلایا تھا اور پھر قریب آکے اس کی بات سمجھنے لگی۔

"اور اگر اداسائیں کو پتا چل گیا تو.....؟" ساری بات سننے کے بعد وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔

"میرے اور آپ کے علاوہ کسی تیسرے کو خبر ہوگی تو انہیں پتا چلے گا نا۔"

"ٹھیک ہے..... تم کہانی لکھ کر مجھے دے دیا کرو میں اسے ٹیپو تک پہنچا دیا کروں گی۔" پروین ادی نے سارا پلان سمجھنے کے بعد اس سے وعدہ کیا تھا۔

اپنے شوق کی تکمیل کی خاطر اس نے بہت سی قربانیاں دینی ہیں اس نے یہ بات جلد ہی سمجھ لی تھی اور کچھ مقام حاصل کرنے کے لیے کشٹ تو اٹھانے ہی پڑتے ہیں۔ خود سے کیا وعدہ اور نیم جی سے کیا گیا عہد قارئین کی محبت ادارے کی جانب سے ملی عزت و پذیرائی اسے آگے بڑھنے کے لیے بے تحاشا ہمت و عزم بخش رہے تھے اسے آگے ہی آگے بڑھنا تھا۔ ہار نہیں ماننی تھی۔

وہ اب ایسا ہی کرتی تھی عتیق علی کی غیر موجودگی میں اپنے کمرے میں چھپ کر لکھتی اور پھر خاموشی سے پروین ادی کے کمرے میں جاکے انہیں مسودہ ٹیپو کو بھجوانے کے لیے کہہ دیا کرتی ٹیپو اسی راز داری سے اس کا مسودہ ادارے کو بھیج دیتا یوں بغیر کسی رکاوٹ کے اس کا ادبی سفر جاری رہا اپنا اعزازیہ وہ اپنی ماں کو بھجوانے لگی تھی پروین ادی اور زرقا خلیل دونوں ہی مطمئن تھیں کہ کوئی نہیں جانتا مگر..... وہ دونوں غلط تھیں ایک تیسرا فرد بھی تھا جو یہ سب جانتا تھا اور وہ اور کوئی نہیں اس کی سوتن تھی.....!

☼ ☼ ☼

اگلے تین ماہ راوی چین ہی چین لکھتا رہا۔ عتیق علی اس کی فرماں برداری دیکھ کر اس پر ویسے ہی فدا رہتے تھے اس نے ماں کے گھر جانا چھوڑ دیا۔ نیم جی کے بلاوے کو نظر انداز کر دیا..... اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس نے دل کی مرضی و خوشی کو پس پشت ڈال دیا اصل مسئلہ تو تب ہوا جب پروین ادی کو چند روز کے لیے اچانک پنجاب اپنی بڑی بہن کی بیٹی کی پیدائش پر جانا پڑا تھا..... پندرہ روز ہو گئے تھے وہ آ نہیں سکی ایک دن وہ لاؤنج میں بیٹھی تھی جب رابعہ خاتون اس کے پاس آئی تھی۔

"کیا بات ہے زرقا! خاموش کیوں ہو کیا عتیق علی سے جھگڑا ہوا؟" زرقا چونک کے اس کی طرف پلٹی ان دونوں کے درمیان بات چیت تو نہ ہونے کے برابر تھی پھر آج وہ کس طرح اس کے ساتھ دوستانہ انداز میں بات کر رہی تھی۔

"کچھ نہیں ادی! بس یونہی....." زرقا نے صاف نظر انداز کیا اور اختصار سے کام لیا۔

"چلو یونہی سہی..... ناول کی قسط بھجوا دی تم نے؟" اب وہ بڑے آرام سے کسی گہری سہیلی کی مانند اس کے پاس آبیٹھی تھی۔

"ک..... کہانی..... کیسی کہانی ادی..... میں نے تو لکھنا چھوڑ دیا ہے۔" پہلی بار وہ گڑبڑائی تو رابعہ خاتون مسکرائی۔

"اچھا کب..... ابھی پندرہ روز پہلے تو پروین تمہاری کہانی پوسٹ کروانے کے لیے نیم جی کے گھر بھجوا کے گئی ہے مجھ سے کیوں چھپا رہی ہو۔ مجھے سب خبر ہے اور بے فکر رہو میں عتیق علی کو نہیں بتانے والی۔" زرقا کا رنگ ساری حقیقت سننے کے بعد فق ہوا اسے کیسے اور کس نے خبر دی تھی۔

"دیکھو زرقا..... قسمت کا جو بھی فیصلہ تھا میں نے اسے مان لیا ہے اور پھر عتیق علی کی تم چاہت ہو۔ میری

عزت کرتی ہو مجھے تمہارے وجود سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تو پھر میں نے بھی سوچا — میں تم سے کیوں اختلاف رکھوں ہم سمجھوتہ کرکے اچھی زندگی بھی تو گزار سکتی ہیں نا..... کچھ ہی مہینوں میں پروین کی شادی ہو جائے گی پھر تو اس گھر میں میں اور تم بالکل اکیلے ہو جائیں گے تو کیوں نہ ایک دوسرے کی طاقت بنیں ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔" وہ محبت سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتی زرقا کے چہرے کو دیکھتے نرمی سے بولی تھیں۔

"عتیق علی غصے کے تیز ہیں میں خود ان سے بات کروں گی کہ تمہیں لکھنے کی دوبارہ سے اجازت دیں اور تمہاری صلاحیتوں کو زنگ نہ لگنے دیں۔"

"وہ ہرگز نہیں مانیں گے۔" پہلی بار زرقا نے لب کشائی کی۔

"محبت کرتے ہیں وہ تم سے..... کیوں نہیں مانیں گے آخر۔" رابعہ خاتون نے فوراً کہا۔

"کچھ بھجوانا ہے تو بتا دو..... میں ٹیپو کو بلوا کے اسے دے دیتی ہوں ٹھیک ہے!"

"نہیں ادی..... ٹیپو کو یہاں نہ بلائیں سائیں آنے والے ہوں گے اگر انہیں پتا چل گیا تو.....؟" زرقا کو ازحد خوف محسوس ہوا۔

"بے فکر رہو..... ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی ویسے بھی وہ آج شہر گئے ہیں آدھی رات سے پہلے نہیں لوٹیں گے ابھی تھوڑی دیر پہلے میری بات ہوئی ہے ان سے..... میں خیراں کو بھیج کے ٹیپو کو بلواتی ہوں۔"

وہ اس کا جواب سنے بغیر تیزی سے باہر نکلی تھی زرقا کچھ دیر وہیں کھڑی رہی پھر مسودہ لینے اپنے کمرے کی طرف بڑھی ایک لمحے کے لیے بھی وہ رابعہ خاتون کے میٹھے لہجے میں چھپی مکاری کو محسوس نہیں کر پائی تھی۔ دوسری جانب رابعہ خاتون نے خیراں کو ٹیپو کو بلا کر لانے کو کہا تھا عتیق علی کے آنے کا وقت ہو چلا تھا اور وہ یہ کام جلد از جلد کر لینا چاہتی تھی۔

"ٹیپو سے کہنا کہ زرقا بی بی نے کہا ہے کہ میں سخت مشکل میں ہوں فوراً آ کے میری بات سن جاؤ۔" خیراں اثبات میں سر ہلاتی پلٹ گئی تھی۔ خیراں کے کہنے پر ٹیپو فوراً ہی چلا آیا تھا وہ اس قدر پریشان ہو گیا تھا کہ کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر حویلی کی جانب چل دیا تھا۔ خیراں اسے اپنے ساتھ ہال کمرے میں ہی لے آئی تھی جہاں رابعہ خاتون بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ ٹیپو نے دھیرے سے سلام کیا۔

"کیسے ہو ٹیپو..... کیسے آنا ہوا؟" وہ بہت نرمی و حلاوت سے اس کی آمد کے متعلق دریافت کر رہی تھی پھر جیسے کچھ یاد آنے پر خود ہی بولی تھی۔

"اچھا اچھا..... زرقا سے ملنے آئے ہو وہ اپنے کمرے میں ہے وہیں چلے جاؤ۔"

"نن..... نہیں آپ انہیں ادھر ہی بلا دیں جی!" ٹیپو کو اچھا نہیں لگا اس کے کمرے میں جانا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو ٹیپو..... تم کون سا غیر ہو اس کے لیے، جو یوں جھجک رہے ہو وہ اپنے کمرے میں اکیلی ہی ہے..... تم آرام سے اس سے باتیں کرو میں چائے بھجواتی ہوں تم لوگوں کے لیے۔ خیراں تم ٹیپو کو بی بی کے کمرے میں لے جاؤ۔" ٹیپو دل ہی دل میں ان کے اچھے اخلاق سے متاثر ہوتا خیراں کے ساتھ زرقا کے کمرے کی جانب چل دیا۔

رابعہ خاتون پلان کے مطابق ٹیپو کو کمرے میں جاتا دیکھ کر مسکرائی تقدیر آج بھرپور طریقے سے اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ زرقا کمرے میں ٹیپو کو کھڑا دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"ارے ٹیپو..... تم یہاں۔" اس کے لہجے میں اچنبھا تھا وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت میں مصروف ہو گئے جبھی خیراں نے رابعہ خاتون کے پلان کے مطابق آہستہ سے دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی تھی۔

"تمہارے بلاوے نے مجھے اس قدر پریشان و ہراساں کر دیا کہ مجھے کچھ اور سوجھا ہی نہیں فوراً چلا

آیا اور پھر تم تو جانتی ہی ہو کہ میں تمہیں کسی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا!"

"میرے بلاوے نے تمہیں اتنا ہراساں کیوں کر دیا آخر؟" وہ ہلکے سے مسکرائی۔

"تم نے خود ہی تو کہہ کے بھیجا تھا کہ میں کسی مشکل میں ہوں میری مدد کرو۔" ٹیپو نے حیرت سے اسے بتایا تو زرقا چونکی۔

"تم پاگل ہو ٹیپو..... میں تمہیں بھلا کیوں اس طرح بلانے لگی میں تو یہ مسودہ....." اچانک بات کرتے کرتے وہ چونکی تھی پہلے اس نے ٹیپو کو اور پھر بند دروازے کو دیکھا تھا وہ مسودہ وہیں پھینک کر دروازے کی جانب دیوانہ وار بھاگی تھی بند دروازہ زرقا خلیل کے بدترین خدشات کی تصدیق کر رہا تھا اس نے بغیر سوچے سمجھے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

سردار عتیق علی کی گاڑی جیسے ہی ڈرائیو وے پر رکی وہ فوراً باہر آ کے اپنے کمرے کی جانب بڑھے تھے رابعہ خاتون اپنے کمرے میں اس وقت آرام کیا کرتی تھی۔

عتیق علی اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگے تھے جبھی خیراں ان کے راستے میں آن کھڑی ہوئی۔

"اپنے کمرے میں مت جائیں سائیں..... ابھی فی الحال۔" خیراں اس گھر کی پرانی اور وفادار ملازمہ تھی عتیق علی اسے یوں ہراساں دیکھ کر چونکے۔

"زرقا بی بی کدھر ہیں؟"

"وہ..... وہ اپنے کمرے میں۔" خیراں نے ان کا تجسس بڑھانے کو خوب ایکٹنگ کی۔

"تو پھر تم مجھے اندر جانے سے کیوں روک رہی ہو؟" خیراں نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا بغل والے کمرے سے رابعہ خاتون نکل کر ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی

"آؤ..... آؤ عتیق علی..... اپنی چہیتی کا کارنامہ تم بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لو تمہاری غیر موجودگی میں یہ کیسے کیسے گل کھلاتی رہی ہے یہاں پر۔" عتیق علی کو کمرے کی طرف آتا دیکھ کر وہ زہر خند لہجے میں کہتی عتیق علی کو کسی انہونی کا احساس دلا گئی تھی وہ فوراً سے پیشتر کمرے کی جانب بڑھے اور کمرے کا دروازہ دھکیلا جو خلاف توقع اب باہر سے بند تھا نہ ہی کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔ عتیق علی نے دروازہ کیا کھولا گویا اپنی تقدیر کا دروازہ اپنے ہاتھوں سے بند کر دیا دروازہ کھلتے ہی زرقا بے تابی سے دروازے کی جانب بڑھی مگر سامنے کھڑے عتیق علی کو دیکھ کر اس کا رنگ لمحے کے ہزارویں حصے میں فق ہوا تھا ساتھ ہی رابعہ خاتون چہرے پر عجیب سے تاثرات سجائے کھڑی تھی۔ عتیق علی اندر آیا اور بغیر کچھ کہے زرقا کے چہرے پر تھپڑ مارا۔

"جیسا آپ سمجھ رہے ہیں ایسا کچھ نہیں سائیں ہمارے خلاف کوئی سازش ہوئی ہے۔" فق رنگ کھڑا ٹیپو سامنے آیا عتیق علی نے اسے نفرت سے دیکھتے پرے دھکیلا۔

"میں نے تو کہا تھا تمہیں عتیق علی..... مگر تم ہی نہ مانے دیکھ لو..... آج اپنی آنکھوں سے کہ کس طرح تمہارے گھر میں تمہارے ہی کمرے میں اپنے معشوق کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہے۔ چھوٹی عمر کی لڑکیاں بڑی عمر کے مردوں سے نباہ کب کرتی ہیں ایسی شادیوں کا ایسا ہی انجام نکلا کرتا ہے۔" رابعہ خاتون جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام بخوبی سرانجام دے رہی تھی۔

"یہ..... یہ جھوٹ ہے سائیں۔ آپ جانتے ہیں میں ایسا نہیں کر سکتی میں صرف آپ سے محبت کرتی ہوں ٹیپو میرے لیے بالکل بھائیوں جیسا ہے۔" وہ ان کے قدموں میں گرتے سسکی عتیق علی نے اپنے قدم پیچھے ہٹا لیے۔

"تو یہ یہاں کر کیا رہا ہے پھر؟" پہلی بار عتیق علی نے ذہن میں اودھم مچاتے سوالوں میں سے ایک سوال کو باہر آنے کا راستہ دیا تھا۔

"میری کہانی کا مسودہ لینے..... اور کچھ بھی نہیں

افسوس کہ میں کسی آستین کے سانپ سے دھوکا کھا بیٹھی۔" مگر عتیق علی پتہ کہاں رہے تھے ان کی تو مردانگی پر چوٹ پڑی تھی

"میں نے روکا تھا نا تمہیں لکھنے سے پھر کیوں لکھا تم نے؟" وہ اس پر برس پڑے۔

"ارے لکھنا تو بہانہ ہے عتیق علی اصل میں تو صرف اپنے یار سے ملنا مقصد ہوتا تھا اس کے لیے۔۔۔ اور ایک دن بھی اس نے لکھنا نہیں چھوڑا پوچھیں اس سے کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟" رابعہ خاتون چہرے پر فاتحانہ چمک سجائے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

"بولو۔۔۔ جواب دو؟" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے جواب مانگ رہی تھی اور زرقا خلیل کے پاس الفاظ ختم ہو گئے تھے۔

وہ جس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ تھا جس کے الفاظ کے سحر میں ایک دنیا کھو جایا کرتی تھی اس کے پاس لفظ ختم ہو گئے اس کا سب کچھ ختم ہو گیا ایک ذرا سی غلطی میں اس کا سب کچھ ختم ہو گیا اس کا گھر اجڑ گیا اس کا دل اجڑ گیا اس کی زندگی ویران ہو گئی زرقا خلیل گنگ زبان سے اپنے اجڑنے کا منظر بے جان آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

"سائیں ایسا کچھ نہیں ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" بالآخر اس سارے ڈرامے میں خاموش کھڑے اہم کردار نے بھی بولنا چاہا اگر اسے ذرا سا بھی اندازا ہوتا تو شاید آج حویلی آنے کی غلطی کبھی نہ کرتا اسے کیا خبر تھی کہ کیسا طوفان اس کا منتظر ہے جو ان دونوں کا سب کچھ بہا کر لے جانے والا ہے۔

"سائیں میرا یقین کریں زرقا بالکل میری بہنوں جیسی۔۔۔" عتیق علی کے تھپڑ نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی تھی۔

"بس۔۔۔ چلے جاؤ دونوں یہاں سے ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔" وہ ضبط کی شدت سے چلائے کچھ اس طرح کہ کنپٹی کی رگیں تک پھول گئیں۔

"مخمل میں کبھی ٹاٹ کا پیوند نہیں سجتا۔۔۔ سیانے ٹھیک ہی کہہ گئے ہیں میں ہی غلط تھا جو مات کھا گیا۔ چلی جاؤ یہاں سے تم۔۔۔ آج کے بعد تم میری طرف سے آزاد ہو میں نے تمہیں طلاق دی۔۔۔ زرقا خلیل میں نے تمہارے جیسی بدکردار لڑکی کو طلاق دی طلاق دی۔" طوفان آکے گزر گیا مگر زرقا خلیل کے ساکت وجود میں کوئی جنبش نہیں ہو پائی وہ بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی بربادی کا تماشا دیکھتی رہی۔

☆ ☆ ☆

سب کچھ ختم ہو گیا زرقا خلیل کا دل اور گھر دونوں اجڑ گئے بدنامی الگ ہوئی ماں بستر سے جا لگی فہیم جی نے اس کڑے وقت میں اسے سہارا دیا۔

"تیری وجہ سے میرا گھر اجڑ گیا اماں۔۔۔ تو نے سائیں کو بتایا کیوں نہیں تھا کہ ٹیپو میرا دودھ شریک بھائی ہے۔۔۔" زرقا بکھری بکھری حالت میں اکثر ماں سے شکوہ کر ڈالتی یاسمین بی بی کی نظریں زمین میں گڑ جاتیں جس وقت اس نے عتیق علی سے یہ سب کہا تھا اس وقت حالات اور اس کا مقصد اور تھے۔ اگر اسے ذرا بھی اندازا ہوتا تو کیا وہ اپنی بیٹی کے لیے ایسا گڑھا خود اپنے ہاتھوں کھودتی۔۔۔!

اس واقعے کے تین روز بعد انہیں عتیق علی کی جانب سے گاؤں کو راتوں رات چھوڑنے کا حکم ملا تھا فہیم جی پچیس برس بعد اپنے آبائی گھر کی جانب روانہ ہوئے ان کے ہمراہ یاسمین بی بی اور زرقا خلیل بھی تھیں زرقا کو کیسے منایا یہ الگ قصہ تھا۔

اس رات وہ لوگ چلے گئے تھے کہاں۔۔۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کیونکہ فہیم جی نے اپنے آبائی گاؤں کا ذکر کبھی کسی سے کیا ہی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک ماہ گزرنے کے بعد جب حویلی میں پروین ادی کی آمد ہوئی تو ایک قیامت اس کی منتظر تھی اسے بھی

سب کچھ بتایا گیا مگر زرقا خلیل کی پارسائی کی سب سے بڑی گواہ تو وہ خود تھی وہ بھلا کیسے کسی کی جھانسے میں آسکتی تھی رابعہ خاتون بڑے کروفر کے ساتھ حویلی کے ساتھ ساتھ عتیق علی کو سنبھالے ہوئے تھی۔ عتیق علی تو جیسے اس واقعے کے بعد ٹوٹ سے گئے تھے۔

"آپ نے یہ ظلم کیوں کیا بھابھی؟" سارا واقعہ سننے کے بعد پروین ادی نے دکھ سے رابعہ خاتون کی طرف دیکھتے سوال کیا تھا۔

"مخمل میں ٹاٹ کا پیوند بہت بھدا لگتا ہے پروین! اسے مخمل میں جوڑنا ہی نہیں چاہیے اور اگر غلطی سے جڑ جائے تو جتنی جلدی اسے اتار آجائے اتنا ہی بہتر ہوتا ہے۔"

"تو پھر اب کیا مل گیا آپ کو ادا سائیں کا دل اجاڑ کے۔۔۔ انہیں مخمل میں نہیں ٹاٹ کے پیوند میں سکون ملتا تھا آپ یہ کیوں بھول گئیں۔"

"بڑی ہوئی چیزیں عتیق علی کا معیار ہیں نا ہی ترجیح۔۔۔ اور زرقا خلیل ایک بدکردار عورت تھی۔" رابعہ خاتون کے لہجے میں سارے جہان کی نفرت و تلخی سمٹ آئی تھی۔

"ٹیپو اس کا دودھ شریک بھائی تھا بھابھی۔۔۔ آپ نے ظلم کرتے وقت کچھ تو سوچا ہوتا۔" وہ روتے ہوئے اس پر چیخی تھی۔ رابعہ خاتون لمحہ بھر کو حیران ہوئی۔

"میں ادا سائیں کو سب سچ بتا دوں گی۔" رابعہ خاتون اس کی دھمکی سن کے مسکرائی۔

"اس کا کوئی فائدہ نہیں۔۔۔ عتیق علی اسے طلاق دے چکا ہے؟" رابعہ خاتون نے کوئی بم گرایا تھا پروین ادی کے وجود کے پرخچے ہوا میں اڑے۔

"تو پھر اب آپ بھی اس گھر میں نہیں رہیں گی یہی آپ کی بھی سزا ہے۔" رابعہ خاتون نے اس کی جذباتیت کو چٹکی میں اڑایا مگر جب شام کو عتیق علی گھر آیا تو پروین ادی نے ساری حقیقت اس کے سامنے کھول کے رکھ دی تھی۔

"ٹیپو اس کا دودھ شریک بھائی تھا ادا سائیں جس سے وہ بے تکلف تھی ورنہ اس گاؤں میں کون ایسا مرد ہے جس نے کبھی زرقا خلیل کی شکل بھی دیکھی ہو گی آپ تو اس سے محبت کے دعوے دار تھے آپ نے تو اس کا یقین کیا ہوتا۔" ساری حقیقت جاننے کے بعد اور خیراں کی تصدیق کے بعد عتیق علی نے اپنا وجود بے جان پڑتا محسوس کیا تھا وہ نفرت سے رابعہ خاتون کی جانب بڑھے تھے رابعہ خاتون کی بساط کے سارے مہرے اس کے خلاف چلی چال میں استعمال ہو گئے تھے

عتیق علی نے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا اور وہ اسے بھی ویسے ہی ننگے سر اور ننگے پیر گھر سے نکالا تھا جیسے زرقا خلیل کو نکالا گیا تھا۔ حسد اور نفرت کی آگ نے رابعہ خاتون کا گھر بھی ویسے ہی جلایا تھا جیسے اس نے زرقا خلیل کا گھر جلایا تھا۔ آس پاس کے تمام گاؤں اور نزدیکی شہروں میں عتیق علی نے ان کی تلاش کروائی تھی مگر کہیں پر بھی ان کا سراغ نہیں مل سکا تھا پچھتاوے دن رات عتیق علی کے وجود کا حصار کیے رکھتے تھے جبھی انہیں پہلا ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

دور آسمان پر شفق کی لالی بکھری ہوئی تھی نارنجی تھال کی زرد شعاعیں منڈیر پر کہنیاں ٹکائے خاموش اور اداس بیٹھی زرقا خلیل کے ویران چہرے پر پڑ رہی تھیں وہ صدیوں کی بیمار لگتی تھی ایسا لگتا تھا اسے ایسی بیماری لگی ہے جو اسے دیمک کی مانند چاٹ کر کھوکھلا کیے جا رہی ہے۔ اس کے ویران چہرے پر اداسی تھی۔ دکھ تھا۔

"زرقا۔" فہیم جی نے اسے یوں اداس ویران بیٹھے دیکھا تو نزدیک چلے آئے۔

"اٹھو بیٹی۔۔۔ شام ہو رہی ہے مغرب کی نماز ادا کر لو۔" وہ اس کے پاس آکر کھڑے ہو گئے زرقا نے انہیں مڑ کر دیکھا تو لمحہ بھر کو شرمندہ سی ہو گئی وہ کتنی مشکل سے چھت پر سیڑھیاں چڑھ کر آئے ہوں گے۔

"فہیم جی۔۔۔ آپ یہاں کیوں آئے۔۔۔ مجھے آواز دے لی ہوتی۔"

"دی تھی آواز بھی.... مگر تو نے سنی ہی نہیں ویسے بھی اب تو تو کافی بڑی ہو گئی ہے میری بھلا کہاں سنتی ہے۔"

"نیم جی.... ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔" زرقا نے تڑپ کر ان کے ہاتھ تھامے جو اس سے ناراض نظر آ رہے تھے۔

"تو اور کیا کہوں.... تو میرا کہنا مانتی ہی کہاں ہے.... کتنے مہینے ہو گئے تمہیں سمجھاتے نہ اپنا سوچتی ہے نہ ہی اس آنے والی نئی زندگی کا جو تیرے وجود میں پل رہی ہے۔"

"کیا کروں نیم جی! دل پر لگے زخم بھرنے کا نام ہی نہیں لیتے۔"

"زخم بھی بھر جائیں گے اگر انہیں بھولنے کی کوشش کرو گی تو.... بھول جاؤ جو ہوا۔"

"کیسے بھولوں.... کیسے بھولوں نیم جی.... میری روح پر تازیانے پڑتے ہیں سوچ سوچ کے۔ میں کیسے دوں عتیق علی کو اپنی صفائی کیسے یقین کریں گے وہ میرا۔"

"اسے یقین دلانے کے لیے تمہارا زندہ رہنا بے حد ضروری ہے بیٹا! اور اللہ تمہارا عدل ضرور کرے گا۔"

"مجھے زندہ رہنے کی خواہش نہیں رہی اب۔" وہ سسک اٹھی۔

"لیکن تمہیں زندہ رہنا ہے اپنے بچے کے لیے اور.... اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اور اس وعدے کو پورا کرنے کے لیے جو تم نے میرے ساتھ کیا تھا اور اس کی معافی میں ہرگز نہیں دوں گا۔"

"میرا دل نہیں چاہتا نیم جی اب کچھ بھی کرنے کو اور میں اب شاید کچھ کر بھی نہ پاؤں۔ عتیق علی نے مجھے بہت کمزور کر دیا ہے بے اعتبار کر کے۔" اس نے آنسو پونچھے۔

"ایک عورت کمزور ہو سکتی ہے زرقا مگر ایک ماں کبھی کمزور نہیں پڑتی۔ ماں بن کر سوچو تمہیں آگے بڑھنا ہے اور اپنے بچے کو ایک اچھا انسان بنانے کے لیے تگ و دو کرنی ہے۔" نیم جی نے اس کے سر پہ پیار سے ہاتھ رکھتے اسے سمجھایا۔

"ٹیپو بھی تو خود کو تمہارا گناہ گار سمجھتا ہے تم سے معافی کا خواستگار ہے اور عتیق علی کو سچائی بتانے کا خواہش مند بھی.... لیکن اس نے تو دنیاداری چھوڑ دی ہے نہ ہی خود کو کوئی اذیت دینے کا سوچا ہے.... خیر میں نے تمہارے لیے کتابیں منگوائی ہیں گھر پر رہ کر ایف اے کی تیاری کرو آگے بڑھنے کے لیے اچھی تعلیم کا ہونا بھی بہت ضروری ہے اور ہاں.... اپنے ادھورے ناول کو جلد از جلد مکمل کروا کے بھیجو۔ قارئین پچھلے دو ماہ سے تمہاری ناول کی اگلی قسط کا انتظار کر رہے ہیں جو محبتیں پاس ہیں ان محبتوں کی قدر کرو گی تو جو کھو گئی ہیں وہ بھی مل جائیں گی ان شاء اللہ۔" اس روز کے بعد زرقا خلیل نے جیسے نیا جنم لیا دوسرے ہی روز اس نے صبح ناشتے کے بعد اپنے ادھورے لکھے صفحات کو جھاڑ کر نکالا تھا رانے شمارے پڑھ کر کہانی کو ذہن میں تازہ کر کے خود کو لکھنے پر آمادہ کیا اور ایڈیٹر کو فون کر کے دو اقساط اکٹھی بھجوانے کا وعدہ کرتے ہی وہ دل جمعی سے کام میں جت گئی تھی۔ اگلے مہینے پروین ادی نے اس کی ناول کی قسط ڈائجسٹ میں شامل دیکھی تو ننگے پیر عتیق علی کے کمرے کی جانب بھاگی تھی۔

"اداسائیں.... یہ دیکھیں زرقا کی کہانی شائع ہوئی ہے۔" وہ جو آنکھیں موندے لیٹے تھے چونک کر اٹھتے بے تابی سے پروین تک پہنچے تھے اس کے لکھے الفاظ پر ہاتھ پھیر کر اس کا وجود محسوس کرتے انہوں نے نم آنکھوں سے ڈائجسٹ کی طرف دیکھا اور پھر پروین کی طرف۔

"میں کوشش کروں گی اداسائیں کے ادارے والے زرقا خلیل کا ایڈریس ہمیں بتا دیں۔" مگر آفس فون کرنے پر اسے پتا چلا تھا کہ زرقا خلیل نے اپنا ایڈریس کسی کو بھی دینے سے منع کرنے کے باوجود بھی ان کے ادارے کے اصول و قوانین کے خلاف ہے کہ وہ کسی بھی لکھاری کا نمبر یا ایڈریس کسی قاری کو دیں۔

چند ماہ اور گزرے اور اس کی گود ہری ہو گئی عتیق علی کی بیٹی ہوئی تھی اور وہ بالکل عتیق علی جیسی ہی تھی۔ اس کی پیدائش والے دن وہ دل کھول کے روئی تھی اور شاید آخری بار بھی.... اس کے بعد وہ پھر کبھی نہیں روئی کیونکہ نیم جی کہتے تھے۔

"ایک عورت کمزور ہو سکتی ہے مگر ایک ماں کبھی کمزور نہیں ہو سکتی؟" اور اسے بہادر بننا تھا اپنی بیٹی کے لیے اور اسے کم از کم ویسا نہیں بنانا تھا جیسی وہ خود تھی۔

ڈائجسٹ میں بے تحاشا نام کمانے کے بعد اس کے لیے ترقی کے مزید دروازے کھلے تھے وہ پرنٹ میڈیا سے سفر کرتی الیکٹرانک میڈیا کی جانب آئی تھی یہاں پر بھی اس نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کے ساتھ سب کا دل جیتا تھا اور پانچ سال کی کڑی مشقت کے بعد اسے مشہور چینل کی طرف سے پاکستان کی بہترین مصنفہ اور ڈرامہ رائٹر کا ایوارڈ ملا تھا۔

"بابا اگر آج زندہ ہوتے تو کتنا خوش ہوتے نا زرقا.... بالآخر تم نے ان کا خواب پورا کر ہی دکھایا۔" ٹیپو آسمان پر دمکتے اکیلے چاند کو دیکھ کر اداس ہوا۔

"وہ اب بھی ہمارے درمیان ہیں ٹیپو.... ہمارے پاس۔" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے تسلی آمیز لہجے میں کہتی مسکرائی۔

"ایک بات کہوں زرقا!" ٹیپو نے بہت آس سے اس کی جانب دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اب عتیق علی کی سزا ختم کر دو.... پلیز پانچ سال ہو گئے وہ تمہیں تلاش کر رہا ہے اپنی غلطی کا اسے احساس تبھی ہو گیا تھا۔"

"اس نے مجھے اپنی زندگی سے نکال دیا۔ ٹیپو تم جانتے ہو اچھی طرح؟" وہ آزردہ تھی۔

"تم اس کی بیٹی کی ماں ہو۔ جس وقت تمہاری طلاق ہوئی تم امید سے تھیں اور پریگننٹ عورت کو طلاق نہیں ہوتی۔" ٹیپو نے اسے سمجھایا۔

"مجھے نیند آ رہی ہے میں سونے جا رہی ہوں۔"

"ٹی وی پر تمہارا انٹرویو دیکھ کر وہ آفس گیا تھا تمہارا پتا کرنے.... میں نے تمہارا ایڈریس اسے دے دیا ہے زرقا.... وہ تمہارے پاس آئے گا تمہیں لینے کے لیے اور تم اسے انکار نہیں کرو گی۔" زرقا کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے۔

"وہ تم سے ملا تھا!" وہ اچانک پلٹ کر اس کے سامنے آئی تو اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"ہاں.... وہ بہت بدل گیا ہے زرقا.... تمہاری جدائی میں وہ ٹوٹ کر بکھر چکا ہے تم پر اعتبار نہ کر کے اس نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے اس بات کا پچھتاوا اسے دن رات ڈستا رہتا ہے۔" ٹیپو کی زبانی اس کے حالات سنتے زرقا نے اپنے سینے پر گھونسا پڑتا محسوس کیا تھا دل تو آج بھی اسی بے درد کے لیے دھڑکتا تھا۔

"وہ بہت بیمار رہنے لگا ہے۔" اس نے مزید بتایا۔

"ان گزرے پانچ برسوں میں تمہاری ایسی کوئی تحریر نہیں ہے جو اس نے نہ پڑھی ہو اور اس کے پاس موجود نہ ہو.... حویلی کے ایک کمرے میں اس نے صرف تمہاری پسند کی کتابیں اکٹھی کر کے لائبریری بنا رکھی ہے جس میں صرف تمہاری اپنی لکھی کتابیں اور تمہاری پسندیدہ کتابیں ہیں اور جانتی ہو اسے تمہاری پسند کا پتا کیسے چلا تھا۔" بات کے آخر میں وہ دھیرے سے مسکرایا۔

"تمہارے انٹرویوز پڑھ پڑھ کے....." زرقا خلیل کی آنکھ سے آنسو موتی بن کے گرنے لگے۔

"جس جاہ و حشمت اور حکمرانی کے لیے رابعہ خاتون نے تمہارے پاؤں زمین سے اکھیڑے تھے اس گھر کی

دلواروں نے انہیں بھی سائبانی مہیا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔۔۔ ٹھیک ایک ماہ بعد وہ بھی اسی طرح ننگے سر اور پیر اس گھر سے نکلی تھیں جس طرح سے تم۔۔۔ کھوئی ہوئی محبتیں مل جائیں تو زندگی سے کسی اور چیز کی تمنا بھلا کہاں رہتی ہے اور پھر تمہیں تو رب نے نوازا بھی خوب ہے اور معاف کر دینے والا اللہ اور اس کے رسولؐ کو بہت پسند ہے زرقا خلیل۔۔۔ مشال اپنے بابا کو بہت مس کرتی ہے۔"

"تم جانتے ہو ٹیپو ان گزرے سالوں میں ایک دن بھی میں سکون سے سو نہیں پائی میری روح پر آبلے پڑے ہیں عتیق علی کی بے اعتباری کے۔" وہ گھٹی گھٹی آواز میں چلائی مگر آنسوؤں پہ بند باندھ لیا۔

"سکون تو اسے بھی نصیب نہیں ہوا زرقا۔۔۔ تم جانتی ہو اس نے تمہیں کتنا تلاش اور در در کی ٹھوکریں کھائی ہیں اس نے۔۔۔ زندگی تمہاری کھوئی ہوئی خوشیاں تمہیں لوٹا رہی ہے بانہیں وا کر کے ان خوشیوں کا استقبال کرو۔۔۔ اپنی بیٹی کی خاطر۔" ٹیپو نے نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے اسے سمجھایا تو زرقا بہت سالوں کے بعد اس کے کندھے پر سر رکھ کے رو دی تھی مگر ان آنسوؤں نے اس کے زندگی کا ہر غم و دکھ دھو ڈالا تھا۔

☼ ☼ ☼

پورے پانچ سال ایک ماہ اور سترہ دن بعد زرقا خلیل نے مشال عتیق علی کے ہمراہ اس گاؤں کی سرزمین پر قدم رکھا تھا جہاں سے انہیں راتوں رات نکل جانے پر مجبور کیا گیا تھا۔۔۔ مشال اپنے باپ کی گود میں چڑھی ہوئی تھی جو بار بار پیچھے مڑ مڑ کر زرقا خلیل کے چہرے کی طرف دیکھ کر اس کی موجودگی کا یقین کرنے کی کوشش کرتا تھا اور یقین تو آ ہی نہیں رہا تھا۔۔۔ زرقا خلیل نے اس کے حق میں فیصلہ کر کے اسے معاف کر کے اسے دنیا کی سب سے بڑی اور بے پایاں خوشی سے نواز دیا تھا حویلی میں سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا ہاں اس کی ویرانی ضرور پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ وہ گاڑی سے اتری تو پروین ادی بھاگ کر اس کے گلے سے آ لگی تھی۔

"میرے بھائی کو معاف کر کے تم نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے زرقا تم واقعی بہت ظرف والی ہو۔" زرقا نے جواب نہیں دیا بلکہ پروین ادی کو دوبارہ گلے لگا لیا تھا۔

"تم نے ثابت کر دکھایا ہے زرقا خلیل! کہ عورت کے عزم و ہمت کے سامنے دنیا کی ہر طاقت ہیچ ہے آج پورے گاؤں میں صرف تمہاری وجہ سے لڑکیوں کو اچھا تفریحی ادب پڑھنے کو مل رہا ہے کیونکہ سب لوگ جان گئے ہیں کہ ڈائجسٹ معاشرے کی اصلاح کرنے میں پیش پیش ہیں۔ یہ گھروں کو ٹوٹنے سے بچاتے ہیں شعور و آگہی دیتے ہیں برائی سے روکتے ہیں انسان کو انسان بناتے ہیں آج اس گاؤں کے ہر بچے ہر بوڑھے کو زرقا خلیل پر فخر ہے جس نے کڑی محنت کر کے عورت کے لیے ایک حد اور مقام متعین کیا ہے اور جانتی ہو گاؤں والوں کی سوچ کس نے بدلی؟" وہ اس کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولی۔

"ادا سائیں نے۔" اور وہ نہ بھی بتاتی زرقا خلیل تب بھی جانتی تھی۔

"مجھے بہت خوشی ہے اس بات کی کہ میری ایک قربانی دینے سے باقی عورتوں کے لیے راہیں ہموار ہو گئیں اور ہمارے معاشرے کے مرد اس بات کو جان گئے کہ عورت کی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے اس کا بھی کوئی مقصد ہوتا ہے۔" زرقا خلیل نے بات کے اختتام پر بے ساختہ آسمان کی جانب دیکھا تھا دور کہیں آسمان پر اسے نیم جی کا مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دے رہا تھا مسکراہٹ نے بے اختیار اس کے لبوں کو چھوا تھا تبھی اس نے دیکھا عتیق علی وارفتگی سے ہاتھ پھیلائے اندر لے جانے کے لیے اس کے منتظر تھے۔۔۔ زرقا خلیل نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ ان کی چوڑی ہتھیلی پر رکھ دیا تھا کہ اب وہ جانتی تھی اوپر والے نے اس کے ہر دکھ کا مداوا کر دیا تھا۔

☼ ☼

تیری ابتدا کوئی اور ہے' تیری انتہا کوئی اور ہے
تیری بات ہم سے ہوئی تو کیا' تیرا ہم سفر کوئی اور ہے
مجھے شوق تھا بڑی دیر سے کہ تیری شریک سفر بنوں
تیرے ساتھ چل کے خبر ہوئی تیرا راستہ کوئی اور ہے
تجھے فکر ہے کہ بدل دیا مجھے گردش شب و روز نے
کبھی خود سے بھی تو سوال کر تو وہ ہی ہے یا کوئی اور ہے

چھک چھک چھک..... ٹرین کی آواز کا ردھم عجیب لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی ماہر موسیقار رات کے اندھیرے پر تھاپ لگا رہا ہو۔ کھڑکی سے باہر اندھیرا بھاگ رہا تھا۔ کمپارٹمنٹ کے مسافر سو رہے تھے۔ ٹرین جب کسی چھوٹے سے اسٹیشن سے گزرتی تو روتی ہوئی روشنیاں اور ٹرین کی وسل ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو جاتی اور اس کے دل میں ایک امنگ جل اٹھتی۔

"ساری زندگی تاریکیوں میں گزاری ہے۔ باقی عمر کی روشنیاں میں خود تلاش کروں گی۔ ہاں روشنیاں تلاش کرنی پڑتی ہیں' چراغ جلائے جاتے ہیں وہ کبھی خود سے نہیں جلتے۔

میں نے کسی کو اپنی ذات میں خدا سمجھ لیا۔ میرا خدا صرف وہ ہے جس نے کچھ مقاصد لے کر اس کائنات میں بھیجا۔ ہاں وہ ہی خدا ہے۔"

ریان کی محبت کی وہ چھوٹی سی چنگاری اس کی بے رخی' لاتعلقی شعلے میں بدل گئی تھی۔ حالانکہ یہ محض اس کے شدید احساسات تھے۔ ورنہ ریان کی طرف سے کبھی اسے ایسا کوئی تاثر نہیں ملا' آنکھوں سے' باتوں سے اور نہ مسکراہٹوں سے اور وہ اکثر اس کی بے نیازی سے جھنجلا جاتی تھی۔

اس وقت وہ بہت بڑی تو نہیں تھی مگر اس کی نگاہ ہر چیز پر گہری پڑتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے والدین کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا اور وہ تائی' چچی اور پھوپھو کے رحم و کرم پر ڈال دی گئی تھی۔ اس کی دادی نابینا اور دادا بوڑھے ہو گئے تھے۔ جوان بیٹے کی موت نے ان سے آنکھوں کی روشنی چھین لی تھی۔ دادی امی آہستہ آہستہ بے دار ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انعم کی

اسے بہت چاہتی تھیں زیادہ تر دادی امی کی گود میں رہتی تھی۔ دادا کا گھر بہت بڑا تھا۔ انہوں نے درمیان سے دو دیواریں اٹھا کر اس کے تین پورشن بنا دیے تھے۔ ہر پورشن میں چار کمرے' دو باتھ روم' ایک اسٹور اور ایک بڑا سا کچن تھا۔

مکان کے آگے بڑا سا لان مشترکہ تھا۔ جہاں نیم' آم' جامن' امرود کے درخت کنارے کنارے کسی پاسبان کی طرح سر اٹھائے کھڑے تھے۔ اس کے بعد پھولوں کی کیاریاں اور نرم ریشمی سبزہ تھا۔ نیچے چچی اور دادا رہتے تھے اور پر تایا اور پھوپھو تھے۔ انعم' دادا' دادی کا پورشن آخر میں تھا۔

بھرا ہوا گھر' بچوں کی فوج اور ملازمین سے ہر وقت خوشگوار ہلچل رہتی تھی۔ لان سے گلاب' موتیا اور رات کی رانی کی خوشبو سے پوری کوٹھی مہکتی رہتی تھی۔ جب موسم آتا تو دادا پھولوں کی کیاریوں کے آگے سبزیاں لگا دیتے تھے۔ گھر کے آگے ایک پختہ اور چوڑی سڑک تھی۔ جس پر ہر لمحہ ٹیکسیاں اور بسیں دوڑتی بھاگتی رہتی تھیں۔ شام کو دادا ابا اور دادی جان لان میں آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ وہیں پر چائے پیتے تھے اور وہ گھر کے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتی شور مچاتی پھرتی تھی۔ پھوپھو کی اپنے سسرال میں نہ بن سکی اور چند ماہ بعد ہی وہ لڑ جھگڑ کر آ گئیں پھر واپس نہ گئیں۔ شریف لوگ تھے بیٹے کو بھی بھیج دیا۔ دادا نے اوپر کا پورشن پھوپھو کو دے دیا۔ دادا کی دکانوں اور مکانوں کا کرایہ بھی آتا تھا۔ جس سے ان کا خرچ چل رہا تھا۔ وہ کسی بیٹے کے محتاج نہیں تھے۔ ایک ملازمہ رکھی ہوئی تھی جو سارا کام کرتی تھی۔ کھانا البتہ ایک ساتھ ہوتا تھا اور سب ایک ساتھ ہی ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ اتنی رواداری ابھی باقی تھی۔

انعم کی ٹریجڈی یہ تھی کہ اس کی پیدائش پر ماں کا انتقال ہو گیا۔ وہ ابھی چار سال کی تھی کہ والد صاحب بھی ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔ اس طرح وہ تنہا رہ گئی۔ جوں جوں وقت آگے جا رہا تھا اس کا شعور آہستہ

آنکھیں بھی اچھی بری چیز میں تمیز کرنے لگی تھیں۔ اس نے اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے اس دنیا اور اس کے اطراف کے ماحول کو دیکھا تھا۔ اپنی پھوپھو' چچی' تائی کی مصلحت آمیز نظریں بھی دیکھی تھیں۔ فی الحال تو اسے ان کی دانستہ یا نادانستہ توجہ مل ہی رہی تھی۔ وہ بھی مصلحت میں لپٹی ہوئی۔ ورنہ محبت تو اسے صرف اپنے دادا جان اور دادی جان کی ملی تھی یا پھر وہ ننھے منے دوست' کینہ اور غرض سے پاک فرشتے۔

پھوپھو' چچی اور تایا کی معصوم اولادوں کی سنگت جن کا کھیل اور مصروفیت اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی یا کبھی کبھی اس کے رشتے کی عم زاد صوبیہ عارف آجاتی تھی۔ وہ اس کی ہم مزاج' مخلص اور محبت کرنے والی لڑکی جو اس کی گہری سہیلی بن گئی۔

جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی' سب کا رویہ بدلتا گیا۔ ان کی توجہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ خصوصاً" ان کے جوان ہوتے بیٹے ان کی نگاہوں کے حصار میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ تب ہی اسے معلوم ہوا کہ چچا کے منجھلے بیٹے ریان سے وہ منسوب تھی اور یہ انتخاب دادا جان نے بیٹے' بہو کی خواہش پر کیا تھا۔ ریان ایک خوبرو اور ہنس مکھ لڑکا تھا جو بچپن سے اس کا ساتھی اور دوست تھا۔ اس وقت سے جب وہ جانتی بھی نہ تھی کہ رشتہ اور نسبت کیا چیز ہوتی ہے۔ مگر جب معلوم ہوا تب سے اس کی قربت اسے اچھی لگنے لگی تھی۔ پتا نہیں یہ بات اسے بھی معلوم تھی کہ نہیں۔ مگر اس نے محسوس کیا کہ گھر میں سب کی نگاہوں کے زاویے بدل گئے تھے۔ ہر لمحہ اٹھتے' بیٹھتے' چلتے پھرتے ان کی نگاہیں انعم کی طرف نگراں رہنے لگی تھیں اور انہوں نے اپنے بیٹوں کو اتنا مصروف اور مشغول کر دیا تھا کام اور پڑھائی میں کہ انہیں کسی طرف دیکھنے کی بھی فرصت نہ تھی۔ یہ محض اس لیے تھا کہ کہیں ان کے جوان ہوتے بچے اس کی طرف مائل نہ ہو جائیں۔ کیونکہ وہ اپنی ماں کی طرح خوب صورت اور معصوم تھی۔ جس کا احساس کئی بار اسے صوبیہ نے دلایا تھا اور یہ کہ اس کا کوئی بڑا بھائی نہیں تھا ورنہ وہ اسے اپنی بھابھی بنا لیتی۔

اس کا اظہار وہ کئی بار کر چکی تھی۔ وہ صرف مسکرا کر رہ جاتی۔ کیونکہ اس کی نگاہیں ان دنوں زمین پر نہیں آسمانوں پر تھیں اور وہ اپنے لیے ایک روشن ستارہ منتخب کر چکی تھی۔ معلوم نہیں وہ اس کے مقدر کا ستارہ تھا بھی کہ نہیں بہر حال ایسا سمجھنا اس کا حق بھی تھا۔ کیونکہ یہ نسبت اس کے مرحوم پاپا' دادا جان' دادی جان' چچا اور تایا جان کی موجودگی میں قرار پائی تھی' پھر وہ اس سے کس طرح دستبردار ہو سکتی تھی۔

ریان اس کا بڑا خیال رکھتا۔ اسٹڈی میں اس کی مدد کرتا۔ اسے اچھے طریقے سے پڑھاتا' کتابیں لا کر دیتا' نوٹس تیار کراتا۔ انعم ایف ایس سی کر رہی تھی اور ریان نے بی اے کا امتحان دیا تھا۔

پتا نہیں کیوں ان دنوں وہ بد مزاج سا ہو رہا تھا۔ اس کا سبب شاید یہ تھا کہ وہ کچھ کمپیوٹر کورسز کر رہا تھا اور جم خانہ جوائن کر لیا تھا۔ کیونکہ چچی جان نے اسے بہت زیادہ مصروف کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ چڑچڑا ہو گیا تھا۔ انعم کے دل میں اسے دیکھتے ہی ابال سا اٹھنے لگتا۔ کبھی غصہ آ جاتا اور کبھی اس کی باتوں پر پیار آنے لگتا۔

☼ ☼ ☼

مہربانو (انعم کی دادی) کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ وہ وحید عالم کی دوسری بیوی تھیں۔ انہوں نے سب کو بے بہا محبتیں بانٹی تھیں۔ جب وہ بیاہ کر آئی تھیں تو بہت پیاری تھیں۔ سب کہتے تھے کہ ان کی آنکھیں بڑی حسین تھیں۔ سارا خاندان انہیں پسند کرتا تھا۔ مگر بچے ہر لمحہ ناک بھوں چڑھاتے رہتے تھے۔ وحید عالم بڑے صلح جو تھے۔ مہربانو کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہتے کہ نیک بخت ان کی باتوں کا برا نہ ماننا ان کے ساتھ ماں جیسا سلوک کرنا۔ وحید عالم نے اس وقت دوسرا عقد کیا۔ جب بیٹی کو رخصت کر دیا تھا اور بیٹوں کی شادیاں کر دی تھیں۔ مہربانو نے ان بچوں کو اپنی کوکھ سے جنم تو نہیں دیا تھا۔ مگر وہ انہیں اپنی ہی اولاد سمجھتی تھیں۔ مہربانو کو خدا نے صرف ایک بیٹا دیا تھا۔ بڑے چاؤ سے اس کی شادی کی مگر اپنے بہو بیٹے کی

بہار نہ دیکھ سکیں۔ انعم کی پیدائش کے دو گھنٹے بعد بہو نے دنیا سے منہ موڑ لیا اور جب انعم چار سال کی ہوئی تو بیٹا ایک حادثے میں دو دن بے ہوش رہنے کے بعد تیسرے دن سائرہ بیگم سے جا ملا۔ تابڑ توڑ دو جوان اموات نے مہربانو کی بینائی چھین لی۔ ان کی اتنی حسین آنکھوں کے مے خانے چھلک چھلک کر خشک ہو گئے اور چراغ بجھ گئے۔ وہ گم سم ہو کر رہ گئیں۔ وحید عالم نے پانی کی طرح پیسا بہایا۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا مگر بے سود۔ اس طرح وہ صرف اپنے کمرے یا لان کی ہو کر رہ گئی تھیں۔

وحید عالم بیوی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ بڑی ہمت والے تھے۔ اتنے صدمے اٹھانے کے باوجود ہر وقت ہنستے مسکراتے رہتے۔ کیونکہ ان کے سامنے ایک بیٹی تھی جو آج اگر بچہ تھی تو کل جوان بھی ہوگی۔ اس کی شادی اور مستقبل کے لیے انہیں اپنوں ہی سے آس تھی کہ شاید کوئی ہاتھ ان کی بیٹی کے لیے سوالی بن جائے۔ مگر ایسا ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ رشتے ناتے جو سادہ لوح والدین اور خوش فہم بزرگ حضرات بچپن میں باندھ دیتے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ آگے چل کر پروان چڑھیں گے۔ خاندان کا وقار بلند ہوگا تو وہ انتہائی گھاٹے میں رہتے ہیں' انعم کے دادا جان اور مرحوم بابا کی طرح اب اپنی کھلی آنکھوں سے چہرے اور حالات پڑھنے کے بعد اسے یہ سودا منظور نہیں تھا اور وہ یہ دادی امی اور دادا جان کے ذہن میں بھی ڈال دینا چاہتی تھی۔ چنانچہ ایک دن اس نے دادی امی کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے پیار سے کہا۔

"دادی امی یہ بات تو آپ نے کتابوں میں پڑھی ہوگی اور بزرگ بھی کہتے ہیں کہ جوڑے آسمان پر بنتے ہیں۔ پھر لوگ بیٹیوں کی شادی کی فکر میں اپنی جان کیوں گھلا دیتے ہیں؟"

"بیٹا یہ آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔ ماں' باپ اسی لیے فکر کرتے ہیں۔ اللہ انہیں اچھا گھر' اچھا شوہر دے' جو اسے خوش رکھے۔ یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ تم کیوں پریشان ہوتی ہو؟"

انہوں نے اسے چوم کر کہا۔

"نہیں دادی امی یہ مسئلہ میرا بھی ہے۔ آج آپ اچھی طرح سوچ لیں کہ میرا جوڑا اللہ تعالیٰ نے اس گھر میں نہیں اتارا ہے۔ یہ آس اور امید آپ چھوڑیں' جس گھر' جس دل میں آپ کی کوئی عزت نہیں' کوئی جگہ نہیں' وہاں میرے لیے کیا گنجائش نکل سکتی ہے؟" انہوں نے انعم کو لپٹا لیا اور ہنس کر بولیں۔

"ابھی تم بچی ہو نہیں سمجھ سکتیں اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں کچھ تو خیال کریں گے۔"

"ہائے دادو' آپ کتنی بھولی ہیں۔ یہ اپنے ہی تو کلیجے میں گھس کر وار کرتے ہیں۔" اس نے کہا اور اٹھ کر چلی آئی۔ دادی امی پریشان ہو گئیں۔ ہرچند کہ ریان کی انعم سے کوئی بات چیت اور آنا جانا نہیں تھا ایک طرح سے جیسے ان کے درمیان — سارے تعلقات ختم ہو گئے تھے۔ چچی جان نے اسے بے حد مصروف کر دیا تھا اب کبھی اس سے سامنا بھی ہو جاتا تو نگاہیں چرا لیتا تھا۔ جیسے اس نے ہمیشہ کے لیے تعلق ختم کر لیا ہو اس سے۔ اس کے اندر — آگ سی اتر کر اسے جلانے لگی تھی۔

اسے اپنے سے زیادہ ان بزرگوں پر غصہ آتا تھا۔ جنہوں نے ان کی تقدیر کا فیصلہ کرنے میں اتنی عجلت سے کام لیا تھا۔ اس کے دل کے اندر اس خیال کو بٹھا کر حالات کو اپنی مرضی پر موڑ دیا تھا۔ یہ نہیں سوچا وقت ہمیشہ یکساں نہیں رہتا' بچے جوان بھی ہوتے ہیں۔ ان کے مزاجوں میں تبدیلیاں بھی آتی ہیں اور یہ تبدیلی آگئی تھی۔

گھر کے ہر فرد کی طرح ریان کی بھی نگاہیں بدل گئی تھیں۔ اس نے سنا تھا۔ اس کے لیے لڑکی تلاش کی جا رہی تھی۔ اب تو وہ انعم کا دشمن بن گیا تھا۔ لیکن وہ دشمن جاں پھر بھی دل کے بہت قریب تھا۔ جانے کیوں وہ اس کے لیے اتنا مضطرب رہتی تھی۔ آخر اس نے اپنے آپ کو کتابوں اور دادی امی کی ٹھنڈی پرسکون آغوش میں غرق کر لیا۔ دل کا کیا ہے' پاگل ہے۔ مگر انا بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

ایک دن دادی اس کا ہاتھ پکڑ کر نہایت رازداری سے پوچھنے لگیں۔

"بیٹے کیا بات ہے' آج کل ریان نہیں آرہا۔ وہ تو بہت اچھا لڑکا تھا۔ باادب' محبت کرنے اور رشتوں کو جوڑنے والا۔" وہ چپ ہو کر اس کی طرف منہ کیے جواب کی منتظر تھیں۔

"ہاں دادی امی' وہ بہت اچھا لڑکا تھا۔ باادب بھی' محبت کرنے اور رشتوں کو جوڑنے والا بھی۔ مگر اب نہیں ہے۔ یہ ساری خوبیاں اس کے ماضی کا حصہ بن چکی ہیں۔ آخر ہے کس ماں کا بیٹا۔" وہ ہنس پڑی۔

"کیوں بیٹا' خیریت تو ہے' کیا تمہاری اس سے لڑائی ہو گئی ہے؟"

"ہماری اس کی دوستی بھی کب تھی۔ لڑائی بھی تو اپنوں سے کی جاتی ہے۔" وہ بڑی مایوس تھی۔ دادی امی دہل سی گئیں۔

"خدانخواستہ کسی نے کچھ کہہ دیا بیٹی؟"

"افوہ دادی امی۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور ان سے لپٹتے ہوئے بولی۔

"آپ تو خوامخواہ وہم میں پڑ گئیں' میں تو آپ کو یوں ہی ستا رہی تھی۔"

"ارے میری جان' کیوں اپنی اندھی بوڑھی اور مجبور دادی سے مذاق کرتی ہے۔"

"دیکھیے دادو جی۔" اس نے منہ پھلا کر کہا۔

"اب آپ بالکل خود کو اندھی اور بوڑھی نہیں کہیں گی۔ میں جو آپ کی آنکھیں ہوں۔ آپ میری آنکھوں سے دیکھیں۔ یہ دنیا کتنی خوب صورت ہے اور میں جو آپ کی طاقت ہوں۔ جن کے بچے جوان ہوں وہ ماں' باپ کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔" اس نے دادی امی کے گال چوم لیے۔

"میں صدقے' میں واری' اللہ تجھے ہمیشہ خوش رکھے۔ میری عمر تجھے لگ جائے۔ تو نے سچ کہا' میں تیری ہی آنکھوں سے تو دیکھتی ہوں' ہاں یہ دنیا بڑی حسین ہے۔ بالکل تیری طرح' میری طاقت' میرا مان تو ہے۔" وہ اسے بڑی دیر تک سینے سے لگائے تھپکتی رہیں اور پھر وہ اپنے کمرے میں جا کر تکیے میں منہ گھسائے دیر تک روتی رہی۔ وہ اپنی بھولی بھالی انتہائی خوش فہم دادی سے کیا کہتی کہ وہ یہ خواب دیکھنا چھوڑ دیں کہ ان کی لاڈلی بن ماں' باپ کی بچی کے لیے تائی' چچی' پھوپھو کا دل پھڑکے گا اور وہ اسے اپنی بہو بنا کر لے جائیں گے۔ پھر اسے ریان کی باتیں یاد آنے لگیں۔

"میں کسی یتیم و یسیر لڑکی سے شادی کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ کن انکھیوں سے دیکھنے لگتا۔

"یا وحشت ریان اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا۔" وہ گھبرا کر پوچھتی۔

"اس سے میری زندگی میں بہار آجائے گی' وہ مجھ سے ٹوٹ کر محبت کرے گی وہ صرف میری ہوگی۔ اس نے بڑے دکھ اور غم جھیلے ہوں گے۔ میں اسے اتنی خوشیاں' اتنی محبت دوں گا کہ وہ نہال ہو جائے گی۔ وہ میری قدر کرے گی جان دے گی مجھ پر۔"

"مگر وہ یتیم و یسیر لڑکی اپنے ساتھ بھاری جہیز تو نہیں لائے گی۔" انعم نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"ہمیں جہیز کی کیا ضرورت ہے ہمارے گھر کیا نہیں ہے۔"

"تمہیں نہیں' تمہاری ممی کو تو ضرورت ہوگی جہیز کی تاکہ خاندان میں ان کی عزت ہو واہ واہ ہو۔" وہ اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھنے لگتی۔

"ارے نہیں ایسی بات نہیں ہے انعم۔ میری ممی بڑے دل کی مالک ہیں۔" اور اب وہ ہی بڑے دل بڑے حوصلے کی مالک خاتون کوئی بڑا گھر' بڑے لوگ کھوج رہی تھیں۔ ایک رات اس نے راہداری میں دادا جان اور چچا جان کو زور' زور سے باتیں کرتے سنا۔ موضوع بحث وہ تھی۔ دادا جان بڑے غصے میں ان سے پوچھ رہے تھے۔

"کیوں عرفان' میری بیٹی میں کیا خامی ہے۔ جو تم بچپن کی مانگ کو پشت ڈال کر ریان کے لیے لڑکیاں تلاش کرنے لگے۔ ارے تم نے کیا مجھے کنگلا سمجھ رکھا ہے۔ کتنی ڈیمانڈ ہے تمہاری' بولو کتنا جہیز چاہیے تمہیں۔ سونے میں تول دوں گا۔ ایسی شادی کروں گا

دنیا دیکھے گی۔ بارات میں کتنے آدمی لاؤ گے۔ دو ہزار' چار ہزار' کتنے ہزار۔۔۔ مینیو کیا ہونا چاہیے اس کا انتخاب بھی تم ہی کرو گے۔ خاندان بھی دیکھا بھالا' شکل و صورت بھی میری بچی کی لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ایک ہوگی۔ محفل میں بٹھا دو تو اس کا عکس محفل کو روشن کردے آگے بتاؤ کیا اعتراض ہے' جو تم نے مرنے والے سے اپنا کیا ہوا وعدہ بھلا دیا' جواب دو؟" چچا جان کچھ دیر سر جھکائے سنتے رہے' پھر انہوں نے خجالت آمیز نظروں سے بوڑھے باپ کو دیکھ کر کہا۔

"بابا جان دراصل ہمارے گھر کی خواتین کے دل میں گنجائش نہیں ہے۔ مجھے سب یاد ہے' بلکہ افسوس بھی۔ انعم کی ماں کو بھابھی نہیں اپنی بہن کا درجہ دیا تھا اور اس رشتے کی بنیاد بھی یہی تھی کہ کوئی نہ کہے کہ ہم سوتیلے بھائی تھے۔ مگر جب بیٹے جوان ہوئے تو ماں نے ان کا برین واش کردیا۔ اس کی نگاہیں خوب سے خوب تر کی تلاش میں آسمان کے چاند ستاروں پر جاکر رک گئیں۔ اب اسے زمین پر دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ ریان' انعم کو پسند نہیں کرتا اور میں اس پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرسکتی۔ میں اپنے بچوں کی خواہش کا احترام کروں گی۔ میں نے اسے بڑا قائل کرنے کی کوشش کی' مگر یہ عورتیں اپنے آگے کسی کی سنتی بھی کب ہیں۔ بیٹے جوان ہوجائیں تو مائیں اور شہ زور ہوجاتی ہیں۔ اب تو ہماری عزت اسی میں ہے کہ جو وہ کہے خاموشی سے مان لیں' آگے آپ خود سمجھ دار ہیں۔ ہوا کا رخ دیکھ سکتے ہیں۔" وہ چپ ہوگئے۔

دادا جان کی زبان جیسے تالو سے لگ گئی اور آنکھیں زمین سے' کچھ دیر بعد بولے تو لہجے میں بڑی شکست و ریخت تھی۔

"ہاں بیٹا میں سمجھ گیا' تم نے ٹھیک کہا کہ اس گھر کی عورتوں کے سینے میں دل ہی نہیں' تو گنجائش کہاں ہوگی۔ ہم صرف تم ہی سے اپنا دکھ سکھ کہہ سکتے تھے۔ پتا چلا کہ تم بھی ہماری طرح مجبور اور بے بس ہو۔"

انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر جیسے راہداری میں سناٹا چھا گیا۔ وہ کھڑکی کے پٹ سے لگی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ چچا جان چلے گئے تھے اور دادا جان اندر آگئے۔

دادی جان کی آنکھیں بے نور ہوئی تھیں کان اور زبان گونگے نہیں ہوئے تھے۔ وہ ساری باتیں انہوں نے بھی سنی تھیں۔ آنکھیں چھت سے لگ گئی تھیں۔ ان کا دل لہولہان ہوگیا۔ انعم کو ان کے دکھ کا احساس تھا۔ اس رات اس کی رہی سہی امیدیں اور دادی امی کی خوش فہمیاں پر لگا کر اڑ گئی تھیں حالات کا رخ بدلتے دیکھ رہی تھی۔ تائی' چچی اور پھوپھو نے اس کے پورشن میں آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے باوجود دادی امی کے کان آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ جب انہوں نے اپنے دل کے دروازے ان کے لیے بند کردیے تھے تو انہیں بھی دستک دینے کی ضرورت نہ تھی۔ وقت سرکتا رہا اس نے مقامی کالج میں جاب کرلی تھی۔ آخر جینے کے لیے اسے کوئی مصروفیت چاہیے تھی۔

✻ ✻ ✻

آج کل ریان کی شادی کی زور و شور سے تیاریاں ہورہی تھیں۔ آوازوں اور قہقہوں کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ وہ کتاب لے کر پچھلی طرف لان میں نکل جاتی اور گھنٹوں خاموشی سے کتاب پر نگاہ جمائے رہتی۔ بے مقصد ورق پلٹتی رہتی تھی۔

تب ایک دن چچی جان پھوپھو کے ساتھ آکر دادی امی سے شکوہ کرنے لگیں۔

"ماں جی اب ایسی بھی کیا ناراضی کم سے کم انعم کو تو بھیج دیجیے۔ آخر اس کے بھائی کی شادی ہے' ساری رشتے کی بہنیں جمع ہوں گی۔ انعم نہیں ہوگی تو لوگ کیا کہیں گے؟"

اور انعم کے اندر جیسے ایک دم سے الاؤ سا بھڑک اٹھا۔

"بھائی۔۔۔" چچی جان اور پھوپھو نے ناک کریعن

اس کے دل پہ نشانہ لگایا تھا۔ اس کا سر کتاب پر جھکتا چلا گیا۔ دادی امی نے بڑے پیار اور نرمی سے کہا۔

"بات یہ ہے دلہن انعم نے کالج جوائن کرلیا ہے۔"

"ہائے تو کس نے کہا تھا نوکری کرنے کو۔ گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ پھر اسے نوکری کی کیا ضرورت تھی۔ لوگ تو یہی کہیں گے کہ بن ماں' باپ کی بچی کے سر پہ کوئی ہاتھ رکھنے والا نہیں تھا۔ دنیا کی زبان کس نے روکی ہے۔" چچی جان کی ممتا پھڑک اٹھی۔

"ٹھیک تو ہے امی جان بھلا ہمارے ہوتے ہوئے اسے نوکری کا مشورہ کس نے دیا؟" پھوپھو جان نے بھی محبت جتائی' جب ہر طرف سے سنسناتے ہوئے تیر اس کی طرف لپکے تو وہ جلدی سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بھاگی تھی۔ پھوپھو جان نے ہنس کر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے انعم ہم سے ناراض ہے امی جان؟"

"نہیں بیٹا وہ ناراض کس سے ہوگی۔ لیکچر کی تیاری کررہی تھی۔ ہماری باتیں اسے ڈسٹرب کرنے لگیں تو وہ چلی گئی۔ رہ گئی نوکری کی بات تو کسی کے پاس کچھ ہو نہ ہو مگر اس کا باپ اتنا چھوڑ گیا ہے کہ اسے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں اور اللہ کے فضل سے دادا کے پاس جو ہے وہ بھی اسی کا ہے۔ مگر انسان کو روٹی کپڑے اور پیسے ہی کی ضرورت نہیں ہوتی زندہ رہنے کے لیے' محبت' چاہت' اپنائیت' خلوص اور غم گساری کے بغیر انسان کا وجود بے روح جسم کے برابر ہوتا ہے اور یہ چیزیں اس کے نصیب میں نہیں۔ میں اندھی' دادا بوڑھا اور لوگ مادہ پرست اور دل آزار مذاق اڑانے والے۔ بیٹا دنیا نے تجھے یا میری بچی کو کیا دیا۔ جو میں پروا کروں۔ میں نے ہی اس کی تنہائی دیکھ کر اسے یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ کالج میں نوکری کرلے۔ اس طرح اس کا دل بہلا رہے گا۔ شادی میں وہ ضرور آئے گی۔ جیسے اور لوگ شریک ہوں گے۔ ویسے میرے ساتھ وہ بھی

شریک ہو جائے گی۔ تم اپنا دل میلا نہ کرو۔ دنیا میں رہ کر دنیا والوں سے کب الگ رہا جاتا ہے۔"

وہ دونوں بڑی بددل ہو کر گھر سے گئی تھیں۔ کیونکہ ان کی حسب خواہش یہاں پذیرائی نہیں ہوئی تھی۔ ان کے جانے کے بعد دادی امی نے اسے گلے سے لگا کر کہا تھا۔

"بیٹی کسی کی باتوں کا برا نہیں مناتے' ہر شخص اپنی سوچوں اور ظرف کے مطابق بات کرتا ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے۔ مگر وہ بہرحال ہمارے عزیز ہیں' رسماً" سہی ان کے دکھ سکھ میں ہمیں شریک ہونا ہے۔ اگر تم نے ان کی نفرتوں کا جواب نفرت سے دیا تو پھر ان میں اور تم میں فرق کیا رہ جائے گا۔"

مہربانو بہت معصوم اور نیک دل خاتون تھیں۔ ان کے پاس اس کے سوا کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کی پناہ میں سونپ کر صبر کی ڈور تھام لیتیں۔

آخر اس کی شادی ہو گئی۔ حمنی چاند ستاروں سے سجی سنوری چچی جان کے پھولوں بھرے آنگن میں بہاروں کی نوید لے کر آ گئی۔ وہ بھی دادی امی کے ساتھ کچھ دیر کے لیے شادی میں شریک ہو گئی تھی۔ بڑا شور شرابا' ہنسی قہقہوں کے طوفان تھے۔ روشنیوں' رنگوں اور خوشبوؤں کا باد و باراں تھا۔ جو ہر سمت سے امنڈ رہا تھا۔ ریان دولہا بنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر عورتوں' لڑکیوں کے ہجوم میں چھپی کھڑی اسے دیکھتی رہی تھی۔

ولیمہ میں صرف دادا جان اور دادی جان شریک ہوئے تھے۔ اس دن وہ بخار میں دھت پڑی تھی۔ اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ صوبیہ بار بار اسے دیکھنے آ رہی تھی کبھی ٹمپریچر لیتی' کبھی ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی۔ ملازمہ اس کے پاس تھی۔

☼ ☼ ☼

ریان کی دلہن حمنی اپنے جہیز میں ملی ہوئی زندگی کی تمام و کمال آسائشوں سے آراستہ کوٹھی میں شفٹ ہو گئی تھی اور ریان اس کی ناز برداریوں کا فرض ادا کر رہا تھا۔ چچی جان خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں' ہر آنے والے کو بہو کے جہیز کا وہ سامان جو جانے سے بچ گیا تھا۔ دکھا رہی تھیں۔ باقی فہرست میں درج ذیل چیزیں پڑھ کر سنا دیتیں۔ دیکھنے اور سننے والی خواتین کی آنکھوں میں چاند اور سورج اتر آتے۔ آخر وہ ڈی آئی جی کی بیٹی کو بیاہ کر لائی تھیں۔

"سبحان اللہ' آپ کی بہو تو پری جمال ہے۔ دسوں انگلیاں دسوں چراغ۔" اور چچی جان کی گردن فخر سے بلند ہو جاتی۔ بڑے دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا پھر اس پر مصیبتوں کے پہاڑ یکے بعد دیگرے ٹوٹنے لگے۔

پہلے دادا جان معمولی بخار سے چل بسے اور پھر ان کے پیچھے پندرہ دن بعد دادی امی بھی چلی گئیں۔ سارے لوگ جمع ہو گئے اور ان کی اولادیں' سب نے اپنی محبتوں اور حقوق کا بڑھ چڑھ کر اظہار کیا آنسو بھی بہائے۔ انعم کے آنسو بھی پونچھے اور یہ اجتماع چالیسویں کے بعد اختتام پذیر ہوا۔ سب اس کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ پھوپھو نے کہا۔

"آخر تم میرے مرحوم بھائی کی اولاد ہو وہ سوتیلا سہی مگر باپ کی طرف سے خون تو ایک ہی ہے' میرے ساتھ چلو۔"

چچی نے کہا۔ "میں نے ہمیشہ تمہیں اپنی عائشہ کی طرح سمجھا ہے۔ تم میری اولاد کی طرح ہو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کا حق رکھتی ہوں۔ تمہیں ماں کی بھرپور محبت دوں گی۔ میں اپنے حمزہ کی دلہن بناؤں گی تمہیں۔" تائی نے گلے لگا کر مگرمچھ کے آنسو بہائے اور بولیں۔

"تم میری بیٹی ہو کہیں نہیں جاؤ گی میرے پاس رہو گی۔ میرے فہد کی دلہن بن کر۔" سب لوگ حیرت سے ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے اور اس کے اندر جیسے بم پھٹ پڑا اور وہ روتی ہوئی اندر بھاگ گئی تھی۔

"نہیں' نہیں' نہیں۔" صوبیہ اس کے پیچھے لپکی تھی۔

"کیا ہوا میری جان! تائی نے کیا کہہ دیا؟" اس نے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

"صوبی ان سب سے کہہ دو مجھے کسی کی ہمدردی اور محبت کی ضرورت نہیں۔ کوئی مجھ پر ترس نہ کھائے' میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ مجھے تائی چچی کے کسی بیٹے کی دلہن بننا منظور نہیں' مجھ پر کوئی رحم نہ کرے۔" اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ صوبیہ اسے پیار سے تھپکتی رہی' سمجھاتی رہی' پھر اس نے چچا' تایا اور پھوپھو سے کہہ دیا کہ انعم کا ٹرانسفر رحیم یار خان ہو گیا ہے۔ وہ وہیں ہاسٹل میں رہے گی۔ وہ یہاں رہنا نہیں چاہتی اور نہ اسے تائی اور چچی جان کی کوئی پیش کش قبول ہے۔

اس کے بعد آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کی طرح سب چھٹ گئے کسی نے بھی پلٹ کر نہ دیکھا۔ ایک دن وہ اپنا ضروری سامان پیک کر رہی تھی۔ صوبیہ اس کی مدد کر رہی تھی کہ اچانک ریان آ گیا۔

"کیسی ہو انعم خیر تو ہے' کہاں کی تیاریاں ہو رہی ہیں؟"

وہ تو اسے دیکھ کر گنگ رہ گئی۔ صوبیہ نے جواب دیا۔

"رحیم یار خان انعم کا ٹرانسفر ہو گیا ہے۔"

"اچھا مگر کہاں رہو گی تم؟" اس نے براہ راست انعم کی طرف دیکھا۔

"ہاسٹل میں۔" اس نے مختصراً" کہا۔

"کیا ٹرانسفر رک نہیں سکتا۔"

"کیوں۔۔؟" اس نے تیکھی نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ وہ کچھ گڑبڑا گیا۔

"میرا مطلب ہے اب تمہیں نوکری کی کیا ضرورت ہے۔" وہ مسکرایا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پھر بولا۔

"میں سمجھتا ہوں دادا جان اور دادی امی کی موت نے تمہیں کافی ڈسٹرب کیا ہے۔ میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں انعم۔ تم اپنے آپ کو تنہا نہ سمجھنا۔"

"شکریہ ریان مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔"

"ریان' انعم سے کچھ مت کہو وہ بہت بڑے غم میں گھری ہوئی ہے۔" صوبیہ نے کہا۔

"ہم سب اس کی تنہائیوں کو شیئر کرنا چاہتے ہیں صوبیہ۔ میں اسے یہی سمجھانے آیا ہوں۔ ممی کی آفر پر غور کرے۔ حمزہ امریکہ سے آنے والا ہے۔ ہماری سب کی یہی خواہش ہے کہ وہ اس گھر کی عزت بن کر رہے' ہماری خوشیاں دوبالا ہو جائیں گی۔"

"کیا؟" انعم کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ ایک لفظ صرف ایک لفظ' کبھی کبھی ساری کائنات کو اتھل پتھل کر دیتا ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ غیر اختیاری طور پر اس کے قدم آگے بڑھے اور دوسرے لمحے اس نے ریان کا گریبان پکڑ لیا۔ پھر اس کے حلق سے غرائی ہوئی آواز نکلی۔

"کیا سمجھا ہے تم نے مجھے' کیا ہوں میں' بتاؤ گے' زر خرید ہوں تمہاری۔ مالک ہو تم میرے کہ جہاں دل چاہے مجھے پھینک دو۔ کیوں توہین کی تم نے میری۔ بتاؤ' بکاؤ مال ہوں میں' جہاں چاہے پھینک دو' میں نے تم سے محبت کی تھی۔ دو لفظ ہیں اس کائنات میں' محبت اور نفرت اور اب اس کائنات میں' میں سب سے زیادہ تم سے نفرت کرتی ہوں' ریان صرف تم سے۔" اس نے ریان کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ اور جھٹک کر نفرت سے منہ موڑ کر باہر نکل گئی۔ صوبیہ حیران سی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی اور ریان کے حواس گم ہو گئے تھے۔

محبت اور نفرت میں بہت مختصر فاصلہ ہے' کسی کی محبت کو اس طرح نہ کچلو کہ وہ لمحوں میں نفرت میں بدل جائے۔

☼ ☼

فوزیہ یاسمین

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ مگر وہ اس سے بات نہیں کرتی۔۔۔ مگر زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے حس ہے۔ میں اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو اس کے کالج میں ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے۔۔۔ رخسار اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے۔۔۔ اور روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رگو میلہ، بسمل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے۔۔۔ اور اسی خوشی میں نمل ان دونوں کو پیلس میں لنچ کی دعوت دیتی ہے۔۔۔ اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم، ذکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول کرلیتا ہے۔ اور انہیں پیلس میں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے۔۔۔ رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے۔۔۔ وہ دونوں واپس جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے۔۔۔ اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کردیتا ہے۔۔۔ اب آگے پڑھیں۔

—۴۵—
پینتالیسویں قسط

ریاض غفار اور شگفتہ غفار' عائشہ اختر کے گھر سے خاصے دلبرداشتہ ہو کر لوٹے تھے۔
ایک تو عائشہ اختر کی حالت ایسی تھی کہ ان دونوں کو ہی اندازہ ہونے کے باوجود اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھ کر شدید افسوس ہوا۔
اس پر بلال اختر کے رویّے نے انہیں بڑا مایوس کیا اب اتنے سال بعد ان لوگوں نے پہل کرتے ہوئے ان کے گھر میں قدم رکھ ہی دیا تھا تو کم از کم اس وقت بلال اختر کو اپنی انا اور ضد کو ایک طرف رکھتے ہوئے تھوڑی بہت گفتگو تو کر ہی لینی چاہیے تھی۔
بہت زیادہ مہمان نوازی کی تو بلال اختر سے انہیں امید بھی نہیں تھی اور نہ ہی یہ کوئی موقع تھا خوش گپیوں کا۔ لیکن بلال اختر نے معافی تلافی تو بعد کی بات تھی سرے سے انہیں مخاطب ہی نہیں کیا۔
وہ تینوں کافی دیر عائشہ کے پاس رکے لیکن بلال اختر ایک بار کمرے سے جانے کے بعد دوبارہ پلٹ کر بھی نہیں آئے۔
انہوں نے بھی عائشہ اختر سے بلال اختر کی بابت کوئی استفسار نہیں کیا ان کی بہن بہت دکھی اور شرمندہ تھی بلال اختر کے سرد اور بدتمیزی سے بھرپور رویّے کو انہوں نے بھی یقینی طور پر محسوس کیا ہوگا پھر کیا ضرورت تھی انہیں کچھ جتلا کر عائشہ اختر کو مزید افسردہ کرنے کی۔ وہ اس معاملے میں کر ہی کیا سکتی تھیں اگر ان کے اختیار میں ہوتا تو شاید وہ کافی عرصے پہلے ہی بلال اختر کو سمجھا بجھا کر بھائی کے پاس جا کر اپنی غلطی کی معافی مانگ لیتیں۔
لیکن انہوں نے بھی ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا لہٰذا اس سے صاف ظاہر تھا کہ بلال اختر ان کی چاہے جتنی بھی ناز برداریاں اٹھالیں چلاتے وہ اپنی ہی ہیں۔
ریاض غفار تو چاہ رہے تھے کہ عائشہ اختر کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے جائیں تاکہ ان کا ماحول تبدیل ہو جائے، وہ کافی کمزور بھی ہو گئی تھیں وہ سوچ رہے تھے کہ اپنے گھر لے جا کر ان کے کھانے پینے کا بھی کچھ خیال کر لیں گے۔
مگر عائشہ اختر' بلال اختر کو تنہا چھوڑ کر جانے کے لیے رضامند نہ ہوئیں پھر بھی ریاض غفار نے اصرار کر کے انہیں ان ہی کے گھر میں کچھ نہ کچھ کھلا پلا ہی دیا۔
ان کا ارادہ تھا وہ اگلے دن پھر عائشہ کے پاس چلے جائیں گے اس طرح عائشہ اختر کو ذہنی اور جذباتی طور پر کافی سہارا مل جائے گا۔
شام تک جب وہ سب عائشہ اختر کے گھر سے واپس آئے تو وہ سب ہی بالکل نڈھال ہو گئے تھے گاڑی میں بھی وہ تینوں عائشہ اختر کے ساتھ ہوئے سانحہ پر تاسف کا اظہار کرتے رہے لہٰذا گھر آتے ہی الیان نے فوراً" شگفتہ غفار کو زبردستی ان کے کمرے میں بھیج دیا کہ وہ کچھ آرام کر لیں دکھ چاہے جتنا بھی بڑا ہو اس پر تسلسل سے ایک ساتھ بیٹھ کر دل جلانا کوئی حل نہیں ہے بلکہ ایسا کرنے سے تو حالات سے لڑنے کی رہی سہی قوت بھی ختم ہو جائے گی چنانچہ کچھ دیر کی نیند اور آرام سخت ضروری تھا۔
الیان نے جب ریاض غفار کو بھی یہی مشورہ دیا تو وہ تھکے ہوئے لہجے میں کہنے لگے۔
"میں اگر بستر پر لیٹ بھی جاؤں گا تب بھی میری تھکن جوں کی توں رہے گی۔ زوبیہ یا عائشہ کے ساتھ جو ہو رہا ہے اس میں سراسر دخل قسمت اور حالات کا ہے۔ لیکن رومیلہ کے ساتھ جو ہوا ہے اس میں ہم سب مجرم کے کٹہرے میں کھڑے ہیں۔
تقدیر کی ستم ظریفی پر صبر کیا جا سکتا ہے لیکن خود ظالموں کی فہرست میں کھڑے ہونے کے بعد تو ضمیر ایک پل بھی سکون سے رہنے نہیں دیتا" الیان خاموشی سے انہیں دیکھے گیا جن کے چہرے پر شدید ملال پھیلا تھا۔
"کاش رومیلہ بھی اپنے بھائی کی طرح ایک گری ہوئی لڑکی ہوتی تو آج میں اتنا مضطرب نہ ہوتا بلکہ تمہارے

اقدام پر مجھے خوشی ہوتی۔
لیکن سارا مسئلہ یہی ہے کہ وہ بہت اچھی لڑکی تھی جس کا اس سارے معاملے میں کوئی قصور نہیں تھا ابھی بھی بلکہ اس گھر کے لوگوں نے اس کے ساتھ ذرا نرمی نہیں برتی وہ اس گھر کے مکینوں کو بچانے کے لیے سارا الزام اپنے سر لے رہی ہے۔
حالانکہ اسے پتا ہے اسے اس اچھائی کا کوئی صلہ نہیں ملنے والا جو نقصان اس کا ہونا تھا وہ ہو چکا پھر بھی اس کی کوشش ہے کہ اگر وہ برباد ہوئی ہے تو کم از کم کوئی اور اس تکلیف سے نہ گزرے۔ ایسے لوگ اور ایسی سوچ رکھنے والے بہت کم ہوتے ہیں اس کے ساتھ بہت برا ہوا ہے اور صدمے کی بات یہ ہے کہ یہ سب تم نے کیا ہے" وہ تاسف بھری نظروں سے الیان کو دیکھنے لگے۔
"میں جانتا ہوں تم ہمیشہ سے ضدی ہو بزنس میں بھی تم نے اپنی ضد کی وجہ سے بڑے بڑے نقصان اٹھائے ہیں لیکن پھر بھی تم پر مجھے بھروسہ تھا کہ تم کبھی کوئی غلط فیصلہ نہیں کر سکتے۔
پیسے کے نقصان کو میں نے کبھی اہمیت نہیں دی مگر اس طرح کسی کی زندگی خراب ہو وہ بھی میرے بیٹے کی وجہ سے میں۔۔۔" ریاض غفار کو جیسے الفاظ نہیں مل رہے تھے اپنے دکھ کا اظہار کرنے کے لیے۔
"ڈیڈی آپ بیٹھ جائیں۔" الیان نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے صوفے کی طرف اشارہ کیا تو انہیں ایکدم غصہ آگیا اور انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
انہیں اتنا غم تھا اس سانحہ پر اور الیان کے رویّے سے ذرا بھی شرمندگی ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔
ان کی اتنی ساری باتوں کے جواب میں بھی وہ کتنے اطمینان سے انہیں بیٹھنے کا مشورہ دے رہا تھا وہ سلگ اٹھے تھے اس کے انداز پر۔
"میری فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم اپنے فیصلے پر چاہے جتنے بھی مطمئن ہو کم از کم اپنی نانی کے سامنے تھوڑے سے پچھتاوے کا اظہار کر دو۔
میری تو ہمت نہیں ہو رہی ان کا سامنا کرنے کی۔ کیا سوچتی ہوں گی وہ ہم سب لوگوں کے بارے میں۔ ان کا زیادہ دن یہاں رہنے کا ارادہ بھی نہیں ہے شاید وہ کل صبح ہی واپس چلی جائیں۔
اب اس معاملے میں کوئی کچھ کر تو نہیں سکتا لیکن اگر تم تھوڑے سے دکھ کا اظہار کر دو گے تو ہو سکتا ہے وہ اسے تمہاری نادانی سمجھ کر صبر کر لیں ورنہ خوامخواہ ان کا دل بھی میری طرح تمہاری ڈھٹائی پر دکھتا رہے گا۔"
ریاض غفار بر ہمی سے بولے تو بہت ضبط کے باوجود الیان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔
"آپ تو مجھ سے کچھ زیادہ ہی خائف ہو گئے ہیں ڈیڈی" ریاض غفار اس کی مسکراہٹ دیکھ کر تپ گئے ہو گئے۔
"طلاق کس قدر ناپسندیدہ فعل ہے اور ہماری سوسائٹی میں کس بری نظر سے دیکھی جاتی ہے یہ تم آج کل کی نئی نسل اندازہ بھی نہیں لگا سکتی۔
تم لوگ جو خود کو بدل نہیں سکتے ذرا سا کمپرومائز نہیں کر سکتے شریک حیات میں ذرا سی کمی برداشت نہیں کر سکتے۔ آئیڈیل کے چکر میں رہتے ہو اور یہ نہیں سوچتے کہ ہم خود بھی کسی کا آئیڈیل بننے کے قابل ہیں یا نہیں۔
تم لوگوں کو تو شادی کرنی ہی نہیں چاہیے کیا تھا اگر وہ ابرار کی بہن تھی اس کی اس ایک خامی کو برداشت کر لیتے اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تھے تو اسی وقت خود غرض بن کر انکار کر دیتے۔ شادی جیسے مقدس رشتے کی بے حرمتی کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ جب چاہا کر لی اور جب چاہا چھوڑ دی۔" ریاض غفار انگارے چبا رہے تھے۔
الیان بڑے سکون سے سینے پر ہاتھ باندھے انہیں دیکھتا رہا اور جب وہ خاموش ہوئے تبھی بھی بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تنقید... تنقید اور بس تنقید...
میں رومیلہ کو گھر میں رکھ کر اس کے ساتھ کمپرومائز کرنے کی کوشش کرتا تو ممی کا موڈ ہر وقت خراب رہتا وہ اٹھتے بیٹھتے مجھے اور رومیلہ کو تنقید کا نشانہ بناتیں۔ تب آپ بھی میری طرف داری کرنے کی بجائے ممی کا ساتھ دیتے اور ان کی نفرت اور غصے کو ایک دم جائز قرار دیتے۔
اب جبکہ میں نے سرے سے اس مسئلے کو ہی حل کر دیا ہے تو بھی آپ کو میرے فعل پر اعتراض ہے اب بھی آپ مجھے تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں۔
ڈیڈی میں پوچھتا ہوں کیا شادی کے بعد صرف لڑکے اور لڑکی کو کمپرومائز کرنا ہوتا ہے۔
گھر کے دیگر افراد' جو جوائنٹ فیملی کی حمایت میں ایک لیکچر تو دے سکتے ہیں ساتھ مل جل کر رہنے کی برکات پر تقریر جھاڑ سکتے ہیں انہیں بھی تو خود میں تبدیلی لانی چاہیے۔
انہیں بھی تو اس بات کو تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ بیٹا جو اب تک صرف ان کی اولاد تھا اب کسی کا شوہر کسی کا باپ بھی ہے اس کی اپنی زندگی کی ترجیحات ہیں انہیں بھی اس کی زندگی میں آنے والی تبدیلی پر کمپرومائز کرنا چاہیے۔
جس دن میں نے رومیلہ سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا اسی دن ممی نے کہہ دیا تھا کہ ایک دن میں سب کچھ بھول بھال کر اس کے ساتھ ایڈجسٹ ہو جاؤں گا۔ یعنی ایک طرف تو میں شادی جیسے مقدس رشتے کی بے حرمتی نہ کروں اور ساری زندگی اسے ساتھ رکھوں دوسری طرف میں اس کے ساتھ خوش بھی نہیں رہ سکتا۔
اگر میں اس کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے یا اسے سمجھنے کی کوشش کروں تو بھی یہ طعنے سنوں کہ اس نے مجھے پٹا لیا اور میں سب بھول کر اس کی زلف کا اسیر ہو گیا۔
اب آپ خود بتائیں ان حالات میں میں وہی کر سکتا تھا جو میں نے کیا' دیٹس اٹ۔" الیان کہتا چلا گیا۔
ریاض غفار بڑے غور سے اس کی بات سنتے رہے وہ اسے جھٹلا نہیں سکتے تھے وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا ذہنی طور پر وہ اس سے پوری طرح متفق تھے۔
مگر جو ہوا تھا اس پر انہیں افسوس اتنا تھا کہ الیان کی تمام باتیں صحیح ہونے کے باوجود ان کے دل کو نہیں لگ رہی تھی تبھی جب وہ بولے تو ان کا لہجہ بڑا گلوگیر تھا۔
"مجھے تمہاری بات سے اختلاف نہیں ہے شگفتہ نے واقعی رومیلہ کے ساتھ ساتھ تمہارا بھی جینا دوبھر کر دیا تھا اور میں اسے بھی غلط نہیں کہتا جو بریرہ کے ساتھ ہوا اسے بھلانا اتنا آسان نہیں۔
شگفتہ کے اندر واقعی یہ ڈر موجود تھا کہ رومیلہ تمہیں اپنا اسیر کر لے گی اور سچ پوچھو تو اس کا یہ ڈر بھی بالکل بجا تھا خود مجھے بھی یہی لگتا تھا کہ رومیلہ کو تم پسند کرنے لگے ہو اور میں بھی اسی لیے پریشان تھا کہ شگفتہ کو یہ بات سخت ناگوار گزرے گی۔ پہلے ہی گھر میں اتنی ٹینشن ہے اگر ایسا ہوا تو شگفتہ تو گھر کو بالکل جہنم بنا دے گی۔
لیکن تم نے تو ہم سب کی توقع کے بالکل برعکس قدم اٹھا لیا اور وہ بھی اتنے اچانک کہ مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آ رہا ہے ابھی بھی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یہ سب کوئی بھیانک خواب ہے جو آنکھ کھلنے پر ختم ہو جائے گا۔"
ریاض غفار بڑی کھوجتی نظروں سے الیان کے تاثرات دیکھ رہے تھے تبھی وہ بڑے وثوق سے کہہ سکتے تھے کہ ان کی بات پر الیان نے اپنی مسکراہٹ روکنے کی کوشش کی تھی۔
"کیا بات ہے الیان کیا تم کچھ چھپا رہے ہو۔" انہوں نے جانچتی نظروں سے الیان کو دیکھا تو الیان کچھ دیر انہیں دیکھتے رہنے کے بعد بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا۔
"میں کیا چھپاؤں گا طلاق نامہ آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ کوئی جھوٹ نہیں تھا۔"
"ہاں وہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور مجھے پتا ہے کہ وہ کوئی جھوٹ نہیں تھا مگر تمہارا یہ قابل رشک

اطمینان جتا رہا ہے کہ اس سچ اور جھوٹ کے بیچ میں کچھ ہے جس سے ہم سب انجان ہیں" ریاض غفار اندازہ لگانے والے انداز میں بولے۔

"یہاں صرف سچ ہے جھوٹ کچھ بھی نہیں ہے ہاں اگر کچھ ہے تو آپ سب کی کم علمی ہے۔ دین کے معاملے میں یا تو آپ سب کی معلومات بہت کم ہے یا پھر ہمارے معاشرے میں دین کے طریقے سے ہٹ کر ایک ساتھ تین طلاقیں دینے کا رواج اتنا عام ہو گیا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک طلاق بھی دیتا ہے تب بھی سننے اور دیکھنے والوں کو یہی لگتا ہے کہ اب مصالحت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔" ریاض غفار بری طرح چونک اٹھے۔

ایک دم سے ان کی آنکھوں کے سامنے طلاق نامہ گھوم گیا جس میں الیان نے صرف ایک بار طلاق کا لفظ استعمال کیا تھا۔

"ت۔۔۔ تمہارا مطلب ہے۔۔۔" ریاض غفار حیرانی کے باعث کچھ بول نہ پائے مگر الیان ان کی بات بخوبی سمجھ گیا تبھی سر ہلکے ہلکے اثبات میں ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔

"آپ سب میرے اس اچانک کے فیصلے پر حیران ہیں حالانکہ میں نے جب رومیلہ سے شادی کی تھی تبھی کہہ دیا تھا میں اس طرح کی دھونس پر بلیک میل ہوتے ہوئے کسی لڑکی کو زندگی بھر اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا ایک دن میں ضرور اس سے چھٹکارا حاصل کر لوں گا۔ یہ بات میں نے آپ لوگوں کو سنانے کے لیے نہیں کہی تھی بلکہ یہ سب مجھے ابرار پر ثابت کرنا تھا۔

اس نے مجھے مجبور کر کے شادی پر آمادہ تو کر لیا مگر وہ مجھے ساری عمر شادی نبھانے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ لیکن رومیلہ سے شادی کرنے کے بعد جو حالات سامنے آئے ان میں بہت سارے انکشافات ہوئے۔

ایک کا تذکرہ تو میں نے آپ لوگوں سے کیا بھی تھا رومیلہ اس معاملے میں بے قصور ہے اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ اس کے بھائی نے یہ شادی کیسے کی ہے مگر آپ لوگوں نے میری بات پر یقین نہیں کیا۔

خیر اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ایک حقیقت مجھ پر یہ کھلی کہ ابرار نے یہ شادی ہمیں ٹارگٹ بنا کر نہیں کی۔ اس کا مقصد صرف ایک آئیڈیل گھر میں اپنی بہن کو بیاہنا تھا وہ بھی محض اپنے دشمن کو نیچا دکھانے کے لیے۔

اس کے پیچھے اس کا مقصد اپنی بہن کی بھلائی نہیں تھا بہن کے مستقبل کے بارے میں تو اس نے سرے سے سوچا ہی نہیں تھا یہ تو صرف ایک انا کی جنگ تھی جو اسے وقتی طور پر جیتنی تھی آگے بہن کے ساتھ جو بھی ہوتا رہے اس کی بلا سے۔

جب مجھے یہ پتا چلا تو میں نے اس لڑکے کے بارے میں معلوم کیا جو رومیلہ سے شادی کر رہا تھا وہ ایک پورا فراڈ گینگ تھا میں نے اس کے بارے میں ساری انکوائری کرا کر اسے اریسٹ کرا دیا۔

یہ کام ابرار چاہتا تو کر سکتا تھا لیکن میں نے کہا نا اسے تو صرف اپنی انا کی تسکین کرنی تھی اور یہ کام وہ ہمارے خاندان میں اپنی بہن کی شادی کروا کے کر چکا تھا۔

اب جبکہ اس کا دشمن بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا تو اب اسے کوئی پروا نہیں رہی تھی کہ ہم رومیلہ کو رکھتے ہیں یا چھوڑ دیتے ہیں۔

ممی کو لگتا ہے میں نے یہ قدم اٹھایا ہے اس کا مطلب ہے مجھے بریرہ کی کوئی پروا نہیں۔ میں اتنا خود غرض ہو گیا ہوں کہ بریرہ کا بسا بسایا گھر اجاڑتے ہوئے مجھے کوئی ڈر ہے نا دکھ۔

حالانکہ ایسی بات نہیں ہے جب مجھے یہ یقین ہو گیا کہ اب ابرار میرے کسی اقدام کا بدلہ بریرہ سے نہیں لے گا تب ہی میں نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنایا ہے۔

لیکن میں صرف اندازوں اور مفروضوں پر تو تکیہ کر کے نہیں بیٹھ سکتا تھا ایک بار تو ابرار کو آزمانا تھا نا آخر مجھے

بھی تو اس احساس کمتری سے باہر نکلنا تھا کہ میں کسی کے دباؤ میں آ کر اس رشتے کو نباہ رہا ہوں۔" الیان کہتا چلا گیا۔

ریاض غفار دم بخود کھڑے اسے سنتے رہے جب وہ خاموش ہوا تب بھی وہ کچھ بول نہ سکے آخر الیان کو ہی کہنا پڑا۔

"کیا آپ کو لگ رہا ہے میں کچھ غلط کہہ رہا ہوں۔" وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر عجیب سے لہجے میں بولے۔

"نہیں غلط تو نہیں کہہ رہے البتہ تمہیں ہمیں یہ سب پہلے بتا دینا چاہیے تھا کم از کم رومیلہ کو تو بتا دیتے۔"

"اگر میں کسی ایک کو بھی بتا دیتا تو ہم سب کی آزمائش ٹھیک طرح سے نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے صرف ابرار کو نہیں آزمانا تھا میں رومیلہ کو بھی پرکھنا چاہتا تھا۔ میں ممی کے سامنے اس کی بے جا حمایت نہیں کرنا چاہتا تھا میں واقعی یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وقت آنے پر وہ کس حد تک خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

اور آپ سب لوگوں کو یہ سب نہ بتانے کے پیچھے ایک بہت بڑی وجہ کارفرما تھی۔ یہ اندازہ تو ممی نے بھی لگا لیا کہ میں رومیلہ کو پسند کرتا ہوں لیکن اس بات کو خندہ پیشانی سے آپ سب قبول نہیں کر سکتے تھے یہاں تک کہ رومیلہ بھی ہر وقت اس خوف کے زیر اثر رہتی تھی کہ کہیں مجھے اس سے بات کرتے ہوئے ممی نہ دیکھ لیں اگر انہیں پتا چل گیا تو انہیں برا لگے گا۔

اپنی بیوی کے ساتھ اپنے ہی گھر میں میں چوروں کی طرح تو نہیں رہ سکتا مجھے آپ سب کو یہ احساس دلانا تھا کہ اگر اسے ساری زندگی اس گھر میں رکھنا ہے تو اسے اس کے سارے جائز حقوق بھی دینے ہوں گے۔

میں آپ لوگوں سے لڑ کر یہ سب نہیں منوانا چاہتا تھا بلکہ میں چاہتا تھا کہ آپ سب دل سے اس ساری حقیقت کو قبول کریں۔

رومیلہ کو گھر سے نکالے بغیر میں آپ لوگوں کو یہ احساس نہیں دلا سکتا تھا کہ اگر ہمارے ساتھ غلط ہوا ہے تو اس گھر میں رومیلہ کے ساتھ بھی ٹھیک نہیں ہو رہا وہ ایک اچھی لڑکی ہے اور اس قسم کے رویے اور مزاج کی مستحق نہیں ہے۔

اور مجھے خوشی ہے کہ میں جو کرنا چاہتا تھا اس میں کامیاب ہو گیا ممی تک کو اس بات کا احساس ہے کہ رومیلہ کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے وہ ایک اچھی لڑکی تھی" الیان کہتا چلا گیا اور اپنی آخری بات پر وہ خود ہی مسکرا دیا۔

ریاض غفار کو لگا جیسے وہ ایک دم ہلکے پھلکے ہو گئے ہوں جیسے کوئی بھاری پتھر کی سل ان کے سینے پر رکھی تھی جس سے ان کا دم گھٹ رہا تھا وہ اچانک ایک پل میں کسی نے سرکا کر انہیں ہر بوجھ سے آزاد کر دیا۔

جب وہ بولے تو ان کا لہجہ بہت پرسکون اور ہنستا ہوا تھا۔

"تو پھر کیا خیال ہے آج جا کر رومیلہ کو لے آئیں اب تو تمہاری ممی بھی انکار نہیں کریں گی۔"

"نہیں ڈیڈی اتنی جلدی نہیں" الیان ایک دم سنجیدہ ہو گیا ریاض غفار چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

"کیوں کیا ابھی بھی تمہیں کسی کو آزمانا ہے۔"

"ذرا ابرار کو موقع تو دیں کہ آیا وہ کچھ کرتا ہے یا نہیں۔"

"زیادہ مت آزماؤ الیان کہیں وہ واقعی کسی کمینے پن پر نہ اتر آئے۔" ریاض غفار کچھ متفکر نظر آنے لگے۔

"زیادہ اور کم کی بات نہیں ہے مجھے خود کو کوئی دھوکا نہیں دینا کہ سب کچھ کر کے میں یہ کہہ سکوں کہ میرا ضمیر مطمئن ہو گیا ہے بلکہ واقعی مجھے حالات کو پرکھنا ہے اور آپ بے فکر رہیں ابرار کچھ نہیں کرے گا میں اس کے مزاج اور اس کی نفسیات کو بخوبی سمجھ گیا ہوں۔"

"کم از کم گھر والوں کو تو بتا دو۔ خاص طور پر اپنی نانی سے ذکر کر دو وہ خواہ مخواہ تم سے خائف ہیں اور پھر یہ ان کی عمر نہیں ہے ایسے دکھ برداشت کرنے کی" ریاض غفار بضد تھے مگر الیان سر ہلکے ہلکے نفی میں ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔

"نہیں ڈیڈی وہ رومیلہ سے کافی اٹیچ ہیں اگر انہیں بتایا تو ہو سکتا ہے وہ رومیلہ سے بھی ذکر کردیں اور میں نہیں چاہتا کہ یہ سب رومیلہ کو ابھی سے پتا چل جائے وہ بھی کسی اور کے ذریعے۔ کیونکہ اس طرح وہ یہ نہیں سمجھ سکے گی کہ یہ سب میں نے اسے یا کسی کو دکھ دینے کے لیے نہیں بلکہ سب کے حق میں بہتری کے لیے کیا ہے یہ بات اسے صرف میں سمجھا سکتا ہوں اور کوئی نہیں۔" الیان فیصلہ کن انداز میں بولا۔

ریاض غفار ایک گہرا سانس کھینچ کر رہ گئے وہ قائل تو نہیں ہوئے تھے مگر جو کچھ انہیں پتا چل تھا اسے سن کر وہ اتنے پر سکون ہوگئے تھے کہ اس وقت الیان سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتے تھے تبھی بات سمیٹتے ہوئے کہنے لگے۔

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی لیکن اس معاملے کو زیادہ طول مت دینا کہیں واقعی سب بظاہر ٹھیک ہوتے ہوتے کچھ غلط ہی نہ ہو جائے" ریاض غفار کی بات پر الیان محض سرہلا کر رہ گیا۔

خود اسے بھی نانی اماں کے احساسات کا علم تھا شگفتہ غفار نے انہیں سب بتا کر بہت بڑی غلطی کی تھی لیکن اب الیان کے پاس سوائے خاموشی اختیار کرنے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا ہو سکتا تھا نانی اماں صبح ہوتے ہی گاؤں کے لیے روانہ ہو جاتیں الیان نے سوچا انہیں منانے کی ایک کوشش ہی کرلے مگر رسٹ واچ پر نظر ڈال کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا نانی اماں کے سونے کا وقت ہو رہا تھا اس وقت انہیں تنگ کرنا مناسب نہیں تھا لہٰذا وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

صبح خرم کے فون پر وہ اچانک آفس سے اٹھ کر نائشہ اختر کی طرف نکل گیا تھا اب اس کا ارادہ نیٹ کھول کر کچھ دیر کام کرنے کا تھا مگر ابھی وہ اپنے کمرے میں داخل ہی ہوا تھا کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔

اسکرین پر ایک بار پھر خرم کا نمبر دیکھ کر اس نے فوراً" کال ریسیو کرلی۔

"خرم خیریت تو ہے۔" اس نے بغیر سلام دعا کے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"الیان کیا تم اس وقت میرے گھر آسکتے ہو۔"

"اس وقت!" الیان نے تعجب سے دوہرایا۔

☼ ☼ ☼

بعض اوقات انسان کو چاروں طرف سے پریشانیاں گھیرے رکھتی ہیں وہ ایک طرف سے مطمئن ہوتا ہے تو دوسری الجھن سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔

نمل کا سارا دن خرم کی خیریت معلوم کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوتا گزر گیا۔

شام کے وقت کہیں جا کر خرم سے بات ہوئی تو اسے کچھ سکون محسوس ہوا اس نے فوراً" ہی سنبل کو بھی مطلع کردیا کہ سنبل بھی اس کی وجہ سے بہت پریشان تھی اور اس کا پورا دن بھی خرم کے متعلق پتا کرتے ہوئے گزر گیا تھا۔

مگر خرم کی خیریت کی اطلاع ملنے پر وہ کوئی خاص خوشی کا اظہار نہیں کرسکی کیونکہ اس کے پاس جو خبر تھی وہ تو نمل کے ہوش اڑا لے گئی تھی۔

"نمل، خرم کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا میں نے سوچا رومیلہ کا موبائل بھی مستقل بند ہے کیوں نہ اس کے گھر پر فون کرلوں کیا پتا وہ میکے آئی ہوئی ہو۔

بس اچانک ہی مجھے یہ خیال آیا اور میں نے اس کے بابا کے گھر پر فون کرلیا۔ فون اس کی بھابھی نے اٹھایا تھا اور ــــ اور ــــ نمل انہوں نے بتایا کہ ــــ"

"سنبل کیا بات ہے تم سے بولا کیوں نہیں جا رہا۔" اس کی رندھی ہوئی آواز اور ٹوٹا ہوا لہجہ نمل کو دہلانے لگا تو وہ ڈانٹنے والے انداز میں بول پڑی۔

"نمل ــــ الیان بھائی نے رومیلہ کو طلاق دے دی ہے۔"

"کیا؟" نمل تقریباً" چیخ پڑی تھی۔

"یہ ــــ یہ تم کیا کہہ رہی ہو سنبل ــــ یہ سب کب ہوا کہیں بھابھی کوئی جھوٹ تو نہیں بول رہیں۔" نمل کو اپنے ہاتھ پاؤں سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

دوسری طرف سنبل کی حالت بھی بہت بری تھی اس سے تو بات ہی نہیں ہو رہی تھی وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

"سنبل ــــ سنبل چپ ہو جاؤ میں تمہیں لینے آرہی ہوں ہم ابھی اور اسی وقت رومیلہ کے گھر جا رہے ہیں۔"

"نہیں نمل ــــ ابھی نہیں ــــ اس کی بھابھی بالکل جلادنی ہوئی ہیں ــــ اتنی بری زبان میں بات کر رہی ہیں وہ کہ ــــ" سنبل ان کی گفتگو یاد کرکے ایک بار پھر رو دی۔

"بھاڑ میں جائیں اس کی بھابھی اور ان کی زبان۔" نمل کا خون کھول اٹھا یہ سن کر۔

"اگر تم میں چلنے کی ہمت نہیں ہے تو کوئی بات نہیں میں امی کے ساتھ جا رہی ہوں۔ بلکہ مجھے امی کے ساتھ ہی جانا چاہیے میں رومیلہ کو اپنے گھر لے آؤں گی اسے وہاں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ابرار بھائی اور بھابھی پہلے کون سے اچھے تھے اب تو پتا نہیں ان کا رویہ کتنا برا ہوگا" نمل جیسے اچانک فیصلہ کرتے ہوئے بولی پھر اس نے سنبل کی بات سنے بغیر ہی فون بند کردیا۔

رشیدہ کے پاس آکر جب اس نے انہیں بتایا تو وقتی طور پر وہ بھی بری طرح ہراساں ہوگئیں۔ مگر نمل کی طرح انہوں نے بھی خود پر جلدی قابو پالیا اور بڑے مضبوط لہجے میں کہنے لگیں۔

"تمہارا فیصلہ بالکل صحیح ہے رومیلہ کو وہاں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس ماحول میں وہ اس صدمے سے باہر نکلنے کی بجائے اندر ہی اندر گھٹ کر رہ جائے گی چلو ہم ابھی چل کر اسے یہاں لے آتے ہیں۔

جانے اس بچی کی قسمت میں اور کتنی آزمائشیں لکھی ہیں۔" رشیدہ اور نمل رات ہو جانے کے باوجود اسی وقت رومیلہ کے گھر پہنچ گئیں۔

رومیلہ انہیں سامنے دیکھ کر جہاں حیران ہوئی تھی وہیں ایک دم ڈھے گئی۔

کب سے وہ اپنے اوپر مضبوطی کا خول چڑھائے ہوئی تھی مگر اب اچانک دو ہمدرد لوگوں کو سامنے دیکھ کر اس کی ساری ہمتیں جواب دے گئیں۔

وہ نمل کے گلے لگ کر پہلی بار کھل کر رو دی بھابھی اسی وقت بھی اپنی زبان کے نشتر چلانے سے باز نہ آئیں مگر اس پل ابرار بھائی کے سنجیدہ سے لہجے نے ان سبھی کو حیران کردیا۔

"رومیلہ ممانی ٹھیک کہہ رہی ہیں تم کچھ دنوں کے لیے ان کے گھر چلی جاؤ تمہارے لیے ماحول بدلنا بہت ضروری ہے۔" ابرار بھائی کے لہجے میں بہن کے لیے کوئی محبت یا ہمدردی نہیں تھی جب سے رومیلہ نے بتایا تھا کہ یہ طلاق اس نے اپنی مرضی سے لی ہے وہ اس سے سخت نالاں تھے۔

لیکن ایک بات ان کی بھی سمجھ میں آگئی تھی کہ جو ہونا تھا وہ ہوچکا تھا لہٰذا اب وہ کسی پر بھی دباؤ ڈال کر اپنی منوا نہیں سکتے تھے مگر گھر میں پھیلی تناؤ کی چادر بھی ان سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

جب تک رومیلہ کا کوئی اور بندوبست نہیں ہوتا تھا ان کی نظر میں گھر کی پر سکون فضا کو برقرار رکھنے کے لیے اسے کہیں اور بھیج دینا سخت ضروری تھا۔

ابرار بھائی کی طرف سے اجازت ملتے ہی نمل نے سامان اٹھایا اور اسے اپنے گھر لے آئی۔
ان دونوں ماں بیٹی نے الیان کے اس فیصلے کے متعلق اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ اسے تھوڑا وقت دینا چاہتے تھے جب وہ ذہنی طور پر آمادہ ہوگی تو خود ہی بتا دے گی۔
جبکہ رومیسہ اس موضوع پر تو کیا کسی بھی موضوع پر کوئی بات نہیں کر رہی تھی اس نے تو کھانا تک کھانے سے انکار کر دیا تھا جس پر رشیدہ نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا۔
رومیلہ کے چہرے پر اتنی پژمردگی تھی کہ وہ اسے زیادہ سے زیادہ پرسکون رکھنا چاہتی تھیں کوئی بھی خلاف مزاج بات کہہ کر وہ اسے مضطرب نہیں کرنا چاہتی تھیں۔
اسی لیے جب رومیلہ نے سونے کے لیے کمرے میں جاتے وقت رشیدہ سے التجائیہ انداز میں کہا کہ عظمت خلیل کو ابھی کچھ نہ بتایئے گا۔
تو رشیدہ نے فکر مند ہونے کے باوجود فوراً" سر اثبات میں ہلا دیا البتہ اس کے جانے کے بعد وہ کافی دیر سوچتی رہیں۔
عظمت خلیل ابھی تک گھر نہیں آئے تھے رات کو دیر سے آنے پر تو بات ٹل سکتی تھی لیکن صبح ہونے پر بھی اگر انہیں کچھ نہ بتایا تو جب انہیں پتا چلے گا تو وہ ہنگامہ ضرور کھڑا کریں گے۔
مگر قسمت کو ان کی آزمائش منظور تھیں تھی لہٰذا عظمت خلیل رات کو بھی بہت دیر سے گھر آئے اور صبح بھی بڑی عجلت میں نکل گئے کہ روز مرہ کی معمولی گفتگو بھی ان کے درمیان نہ ہو سکی کجا کے انہیں یہ پتا چلتا کہ رومیلہ ان کے گھر رہنے آئی ہے۔
البتہ رشیدہ نے سوچا تھا شام میں جب وہ گھر آئیں گے تب انہیں سب بتا دیں گی وہ نہیں چاہتی تھیں کہ عظمت خلیل کو رومیلہ کے سامنے کوئی تماشا کھڑا کرنے کا موقع ملے۔
مگر انسان کچھ سوچتا ہے اور ہوتا کچھ اور ہے قدرت اپنے ارادوں سے کسی کو آگاہ نہیں کرتی اس کے اٹل فیصلے وقت آنے پر سامنے آتے ہیں۔
صبح اٹھنے پر رومیلہ کی حالت کافی بہتر تھی رشیدہ کی پیار بھری ڈانٹ پر اس نے چائے کے ساتھ ایک عدد سلائس بھی لے لیا تھا۔
رات کو نمل کے کمرے میں سونے لیٹتے وقت اس نے نمل کو تو سب سچ سچ بتا دیا تھا مگر رشیدہ سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی اور نہ ہی کچھ کہنے کی ضرورت پڑی تھی رشیدہ نے دانستہ اس موضوع پر بات کرنے سے پرہیز کیا تھا۔
وہ یہ سوچ رہی تھیں کہ بعد میں بات کرلیں گی مگر بعد میں تو کچھ کہنے سننے کی مہلت ہی نہیں ملی دوپہر کے قریب ایک اور اندوہناک خبر ان کی منتظر تھی صرف رشیدہ اور نمل کے لیے ہی نہیں بلکہ شہر بھر میں یہ بریکنگ نیوز کے طور پر نشر ہو رہی تھی۔ عظمت خلیل کے اوپر ایک لڑکی نے ان کے آفس میں گھس کر تیزاب پھینک دیا۔
رشیدہ اتنے مضبوط اعصاب کی مالک ہونے کے باوجود یہ خبر سنتے ہی بے ہوش ہو گئیں نمل بھی اپنی جگہ سن رہ گئی عظمت خلیل کے سیکریٹری نے گھر آ کر انہیں بتایا تھا اور انہیں ہسپتال لے جانے آیا تھا۔
رشیدہ کے بے ہوش ہونے پر ان کے لیے گھر میں ہی ڈاکٹر بلوا لیا گیا جس نے بتایا کہ بی پی بے تحاشا ہو جانے کے باعث وہ غفلت میں چلی گئی تھیں لہٰذا اس نے ڈرپ لگا دی۔
نمل رومیلہ کو رشیدہ کے پاس گھر پر چھوڑ کر خود سیکریٹری کے ساتھ ہسپتال نکل گئی۔
عظمت خلیل کا آدھا چہرہ اور گردن سب بری طرح متاثر ہوئے تھے انہیں فوری امداد تو فراہم کر دی گئی تھی مگر

ان کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی منہ اور زبان بھی اسی طرح جلے تھے کہ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ مستقبل میں بولنے کے قابل بھی ہوں گے یا نہیں۔
نمل کا دل یہ سب سن کر خون ہو گیا تھا مگر جب اسے یہ پتا چلا کہ یہ سب حشام کی بہن شمائلہ نے کیا ہے تب وہ عجیب سے احساسات کا شکار ہو گئی۔
جو کچھ حشام کے ساتھ ہوا تھا اس پر جب نمل کو اتنا دکھ تھا تو اس کی بہن کے درد کا کیا عالم ہو گا ایسے میں اگر اس نے یہ قدم اٹھایا تھا تو نمل اگر اسے صحیح نہیں کہہ سکتی تھی تو غلط بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔
سب سے بڑھ کر اہم بات یہ تھی کہ شمائلہ نے یہ کارروائی کرنے کے بعد وہاں سے فرار ہونے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ وہیں کھڑے رہ کر وہ عظمت خلیل کے تڑپنے کا منظر دیکھتی رہی تھی۔
ایک کم عمر لڑکی ہونے کے باوجود اس نے سب کچھ کسی ظالم حکمران کی طرح بڑے سکون کے ساتھ دیکھا تھا بلکہ جب اسے گرفتار کیا گیا تو اس کے چہرے پر ایک تسکین تھی جیسے اب اس کے ساتھ کچھ بھی ہو اسے فرق نہیں پڑتا ہو وہ جو چاہتی تھی وہ کر چکی تھی آگے اپنے انجام کی اسے کوئی فکر نہ ہو۔
یہ تو صرف ایک شمائلہ تھی جو منظر عام پر آ گئی تھی اس جیسے اور نہ جانے کتنے لوگ ہوں گے جو عظمت خلیل کے لیے ایسے ہی جذبات رکھتے ہوں گے نہ جانے کتنے لوگوں کی بددعائیں تھیں جو آج عظمت خلیل اتنی تکلیف میں آپریشن تھیٹر میں پڑے تھے کہ سرجری ہونے کے باوجود ان کی ایک آنکھ کی بینائی واپس نہیں آ سکتی تھی اور نہ ہی چہرے کے خدوخال پہلے کی طرح ہو سکتے تھے۔
انسان کس بات پر اکڑتا ہے اور کس بات پر اتراتا ہے جب اسے پیدا کرنے والے خداوند کریم نے خود فرما دیا کہ نہ تو آسمان کو چھو سکتا ہے نہ زمین کو پھاڑ سکتا ہے تو پھر انسان اپنی اوقات کیوں نہیں پہچان لیتا۔
وہ یہ کیوں نہیں سوچتا کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی مخلوق پر ظلم کرے گا اور اس کا حساب بھی نہیں دینا پڑے گا۔
جس نے پوری کائنات بنائی ذرے سے لے کر پہاڑ تک ہر چھوٹی بڑی شے کا جو مالک ہے۔ جو ہر جاندار کو رزق دے رہا ہے اور ہر ظاہر اور پوشیدہ سے واقف ہے وہ اگر کسی کو گناہ کرنے کا موقع دے رہا ہے تو اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ وہ کبھی اسے اپنی پکڑ میں نہیں لے گا۔
یہ مہلت اس کی معافی نہیں ہے بلکہ ایک موقع ہے کہ اب بھی سنبھل جاؤ مگر انسان سدا کا ناشکرا ہے وہ تب تک گناہ کیے جاتا ہے جب تک اللہ تعالیٰ کا عذاب نہ آ جائے۔
عذاب آنے کے بعد وہ معافی مانگتا ہے اور تائب ہو کر رہنے کے وعدے کرتا ہے لیکن وہ یہاں بھی جھوٹ بول رہا ہوتا ہے کیونکہ اگر اسے دوبارہ موقع دیا جائے گا تو وہ دوبارہ اسی روش کو اختیار کر لے گا۔
اسی لیے دنیا کی سب سے بڑی نعمت راہ حق پر ہونا ہے۔ جس کے پاس ہدایت موجود ہے وہ اگر بھٹک بھی جائے تو توبہ کر کے پھر ان بندوں میں شامل ہو سکتا ہے جن پر اس کا خاص کرم ہوتا ہے۔
لیکن جس کا دل ہی منور نہ ہو جس کے اندر ایمان کی طاقت ہی موجود نہ ہو اس کا بینک بیلنس چاہے کتنا بھی ہائی ہو چاہے اس کے پاس دنیا کی ہر شے اور عیش و آرام موجود ہو حقیقت میں اس سے زیادہ غریب اور مفلس کوئی نہیں ہے۔
لیکن عظمت خلیل نے منافقت کا جو لبادہ اوڑھ رکھا تھا اس کے باعث کچھ لوگ ایسے تھے جو عظمت خلیل کی خاطر اپنی جان تک دے سکتے تھے۔
انہیں جب عظمت خلیل کے ساتھ ہوئے سانحہ کا علم ہوا تو وہ غم و غصے سے پاگل ہو گئے حالانکہ شمائلہ کو پولیس نے فوراً" اپنی حراست میں لے لیا تھا پھر بھی عظمت خلیل کے لیے جان دے دینے کا جذبہ رکھنے والے ان کے

رہنماؤں نے پولیس کی گاڑی پر حملہ کرتے شمائلہ کو بیچ سڑک پر کافی تشدد کا نشانہ بنایا کہ وہ خود جیل پہنچنے کی بجائے ہسپتال پہنچ گئی تھی۔

یہ سب جان کر نمل بس پتھرائے ہوئے انداز میں ہسپتال کے کوریڈور میں بیٹھی تھی۔

عظمت خلیل آئی سی یو میں تھے وہ ان سے مل نہیں سکتی تھی ہسپتال کے باہر بھی ان کے احسانوں تلے دبے لوگوں کا ایک بڑا ہجوم اور میڈیا سے تعلق رکھنے والے کئی لوگ موجود تھے لہٰذا جس جگہ نمل بیٹھی تھی وہی سب سے مناسب جگہ تھی جہاں اسے مکمل تنہائی اور خاموشی میسر تھی۔

اس جگہ بیٹھی وہ عظمت خلیل کے صحت یاب ہونے کی دعائیں مانگ رہی تھی حالانکہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ ان کے لیے پریشان ہو سکتی ہے ان کی زندگی کے لیے دعاگو ہو سکتی ہے ان کے لیے آنسو بہا سکتی ہے۔

مگر یہی زندگی ہے بعض اوقات وہ ہو جاتا ہے، جو انسان نے کبھی سوچا نہیں ہوتا۔

عظمت خلیل نے چاہے انہیں جتنی بھی اذیتیں دی ہوں، چاہے جتنے بھی دکھ دیے ہوں ان دونوں ماں بیٹی کے دل میں کبھی یہ خواہش نہیں ابھری کہ ان کا کیا ان کے آگے آئے۔ انہوں نے تو ہمیشہ یہی چاہا کہ اللہ تعالیٰ انہیں تائب کر دے، ان کا دل بدل دے۔

لہٰذا اس وقت ان کے لیے دعا کرنے کے ساتھ ساتھ نمل، شمائلہ کے لیے بھی بہتری مانگ رہی تھی۔ کیونکہ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کے لیے کیا مانگے۔ چنانچہ جو اس کے حق میں بہتر ہو اس کے ساتھ وہی ہو۔

☆ ☆ ☆

الیان پہلے جب خرم کو اس کے گھر چھوڑنے آیا تھا تب صرف ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر چلا گیا تھا۔ مگر آج وہ خرم کے کمرے تک آیا تھا۔ پھر بھی اسے اس گھر سے کسی قسم کی اپنائیت کا احساس نہیں ہوا۔

اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ بہت چھوٹا تھا۔ جب اس گھر سے دوسرے گھر میں منتقل ہو گیا تھا اس کی اتنی یادیں وابستہ نہیں تھیں جو اسے ستاتیں۔

دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ گھر کا نقشہ مکمل طور پر تبدیل ہو چکا تھا۔ بلال اختر نے ان کے گھر کو اپنے گھر کے ساتھ اس طرح جوڑا تھا کہ اس کا اصل نقشہ مسخ ہو گیا تھا۔

اس کے بعد فرقان حسن نے بھی گھر میں نیا پینٹ اور کچن وغیرہ کے ٹائلز تبدیل کر کے گھر کو بالکل نئے طرز کا بنا دیا تھا۔ چنانچہ اب اس گھر کو دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی گھر ہے۔

پھر سب سے بڑھ کر عائشہ اختر، زوبیہ کی وجہ سے جس ذہنی و جذباتی اذیت سے گزر رہی تھیں اس کے بعد ریاض غفار سمیت ان سب کے دل میں وہ ساری کدورتیں دھل گئی تھیں جو انہیں واپس اس گھر میں آنے پر اکساتی تھیں۔

بلکہ عائشہ اختر سے مل کر ان سب کو یہی احساس ہوا تھا کہ اچھا ہی ہوا جو وہ یہ گھر خرید کر دوبارہ اس میں شفٹ نہیں ہو سکے۔ اگر ایسا ہوتا تو خواہ مخواہ وہ خلیج جو ریاض غفار اور عائشہ اختر کے درمیان کچھ ماند پڑ گئی تھی دوبارہ پوری شدت سے ابھر آتی۔

الیان، خرم کے گھر آ کر مسلسل یہی باتیں سوچ رہا تھا کہ خرم کے ملازم نے اسے خرم کے کمرے میں ہی بلا لیا۔ لہٰذا جب وہ اس کے کمرے تک پہنچا تو اس کی توجہ اس گھر کی جانب سے مکمل طور پر ہٹ چکی تھی۔

اس لیے خرم پر نظر پڑتے ہی اس نے بڑے دوستانہ انداز میں اسے سلام کر کے اس طرح اچانک بلانے کی وجہ پوچھی تھی جس پر خرم پر سوچ نظروں سے ایسے الیان کو دیکھنے لگا جیسے سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ بات کہاں سے شروع کرے۔

"کیا بات ہے' زوبیہ کا کوئی سراغ مل گیا ہے؟" اس کے اتنے شارٹ نوٹس پر بلانے کا مطلب صاف تھا کہ ضرور کوئی اہم بات ہے اور فی الحال زوبیہ سے زیادہ اہم کچھ اور تھا نہیں۔

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" خرم کی نظروں کی طرح اس کا لہجہ بھی سوچتا ہوا تھا۔

الیان تیزی سے اس کے قریب آبیٹھا جو بیڈ پر مختلف کاغذات پھیلائے بیٹھا تھا۔

"کمال ہے زوبیہ؟" الیان نے بے چینی سے پوچھا۔ مگر خرم نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اس کے بستر پر جو کاغذات پھیلے تھے ان میں سے دو تین اس کے ہاتھ میں تھے اور وہ انہیں بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

الیان نے اس کا انہماک دیکھ کر کاغذات پر سرسری سی نظر ڈالی تو کچھ الجھ سا گیا۔ وہ مختلف اوراق پر بنائے گئے مختلف اسکیچز تھے۔

"کیا ہے یہ؟" خرم کی محویت دیکھتے ہوئے الیان نے تھوڑا سا چڑ کر پوچھا۔

"یہ زوبیہ کی بنائی ہوئی ڈرائنگز ہیں۔" خرم نے کہنے کے ساتھ ہی ہاتھ میں پکڑے کاغذات اس کی طرف بڑھا دیے۔

"جب ہم اس گھر میں شفٹ ہوئے تھے تب یہ کچھ کاغذات اس کمرے میں رہ گئے تھے۔ یہ زوبیہ کا کمرہ ہوا کرتا تھا۔"

اس وقت ان کاغذات کو میں نے یہ سوچ کر پھینکنے کی بجائے ملازموں سے گھر کے پچھلے کمروں میں ڈلوا دیے تھے کہ کہیں سامان پیک کرنے کی جلدی میں یہ ڈبا غلطی سے رہ نہ گیا ہو۔

اگر بلال اختر کی فیملی نے بعد میں ایسی کسی چیز کا تقاضا کیا تو ان کے دیگر سامان کے ساتھ یہ بھی پہنچا دیں گے مگر انہوں نے یہ سامان کباڑ سمجھ کر چھوڑا تھا۔ لہٰذا کبھی مطالبہ کیا ہی نہیں۔

اور ہم بھی روٹین لائف میں ایسا بزی ہوئے کہ پچھلے کمرے کی صفائی کا نمبر ہی نہیں آیا اور یہ سامان تب سے اب تک وہیں کا وہیں پڑا ہے جسے میں نے آج نکالا ہے۔" خرم بڑی تفصیل سے بول رہا تھا۔ مگر الیان کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔

اسے زوبیہ کے بارے میں جاننے کی اتنی جلدی تھی کہ اس نے پینٹنگز پر غور بھی نہیں کیا تھا اور مسلسل خرم کو سوالیہ نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔

اس کی بات ختم ہونے تک الیان کے چہرے پر بےزاری صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ البتہ وہ کافی تحمل سے بیٹھا تھا۔ جیسے اب بھی اس کی اگلی بات سننے کا منتظر ہو۔ کیونکہ اسے امید تھی کہ اگر خرم نے اسے اس طرح اچانک بلایا تھا تو وہ یقیناً "کوئی اہم بات کرنے والا ہوگا۔ تب ہی خرم اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"تم زوبیہ کو کتنا جانتے تھے؟"

"بالکل نا جاننے کے برابر۔ ہم تو کبھی ملے بھی نہیں۔" الیان فوراً بولا۔

"ہوں...." خرم نے ہنکارا بھرا' پھر کہنا شروع کیا۔

"زوبیہ نے ذکر کیا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے سے پہلے سے مجھے جانتی ہے۔ اس نے مجھے دیکھا تھا ایک بار' ایک

شخص کی جان بچاتے ہوئے حالانکہ وہاں بہت سارے لوگ تھے۔ کوئی بھی اس کی مدد کے لیے آگے نہیں بڑھا۔ صرف ایک میں تھا جس نے اس کی جان بچانے کی کوشش کی حالانکہ مجھے اس کی موت سے فائدہ بھی تھا پھر بھی میں نے یہ عظیم کام کیا۔ اسی لیے وہ مجھے ایک اچھا انسان سمجھتی تھی۔

میں نے ایسا کوئی قدم کبھی نہیں اٹھایا تھا۔ میں نے کبھی کسی کی جان نہیں بچائی تھی اور وہ بھی بھرے مجمع میں' جہاں بے تحاشا لوگ موجود ہوں۔

میں نے اس کی بات سن کر یہی سوچا تھا کہ اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔

لیکن آج صبح میری یونیورسٹی میں میرے ایک بات بڑے حریف کو گولی لگی۔ اس کے اپنے دوست تک اس کی مدد کرنے آگے نہیں بڑھے بلکہ سب اسے چھوڑ کر بھاگ نکلے تاکہ پولیس کے بیان وغیرہ سے بچ جائیں۔

تب میں اسے اپنے کندھے پر ڈال کر اپنی گاڑی تک لے کر گیا پھر میرے دوستوں نے بھی میرا ساتھ دیا اور ہم نے اسے اسپتال پہنچا دیا۔

اس کی حالت کافی سیریس تھی۔ اگر دیر ہو جاتی تو وہ مر سکتا تھا۔ لیکن وہ بچ گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ میں بھی پولیس کے شک کے دائرے سے باہر ہو گیا ہوں ورنہ ایک عام رائے ہے کہ میری منگنی اس کی وجہ سے ٹوٹی ہے۔

وہ میرا حریف بھی تھا۔ میری منگیتر کو بھی مجھ سے چھین چکا تھا۔ مجھے اس کی جان بالکل بھی نہیں بچانی چاہیے تھی مگر اس بھرے مجمع میں سوائے میرے کسی نے یہ قدم نہیں اٹھایا۔ البتہ ہماری تصویر کھینچ کر فیس بک پر ضرور ڈال دی وہ دیکھو۔" خرم کہتا چلا گیا۔

اس کے آخری جملے پر الیان نے پلٹ کر اس کی کمپیوٹر ٹیبل کی جانب دیکھا تو مونیٹر پر واقعی ایک تصویر نظر آئی۔

خرم کا چہرہ اس میں واضح طور پر نظر آرہا تھا جبکہ جس شخص کو اس نے کندھے پر اٹھایا ہوا تھا اس کی پیٹھ تھی مگر وجود اور خون میں لت پت قمیص ظاہر کر رہی تھی کہ وہ شدید زخمی ہے۔

الیان نے گردن موڑ کر واپس خرم کی جانب دیکھا تو خرم نے ایک کاغذ اس کی جانب بڑھا دیا۔ اب کی بار الیان کاغذ پر سرسری نظر نہ ڈال سکا بلکہ وہ ششدر سا کاغذ کو دیکھے گیا جہاں کمپیوٹر پر موجود تصویر کا ہو بہو منظر اسکیچ کی صورت میں مزین تھا۔ صرف خرم کی شکل واضح نہیں تھی یا یوں کہہ لیں کہ بنانے والے کی ڈرائنگ اتنی اچھی نہیں تھی کہ وہ شکل کی بخوبی تصویر کشی کر سکتا۔ البتہ اس نے منظر بالکل وہی دکھایا تھا۔ یعنی کندھے پر کسی زخمی کو ڈالے کوئی شخص دوڑ رہا تھا۔

"یہ تصویر زوبیہ نے بنائی تھی۔ یہ دوسری' بلکہ یہ تمام تصویریں زوبیہ کی ہی بنائی ہوئی ہیں۔" خرم نے ایک اور صفحہ اس کے آگے کیا۔ جس پر ایک زخمی لڑکی موجود تھی اور اس کے سر سے خون نکل رہا تھا۔

"زوبیہ نے بتایا تھا اس کے کالج میں ایک لڑکی ہوتی تھی نتاشا جس نے زوبیہ کو ایک زمانے میں کافی پریشان کیا تھا۔ پھر وہ اچانک غائب ہو گئی اور بعد میں اس کی لاش ملی تھی۔

زوبیہ کے والدین کا خیال تھا اسے بھی زوبیہ نے مارا ہے کیونکہ جب وہ غائب تھی اور اس کی تلاش جاری تھی زوبیہ نے تب ہی بتا دیا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔

اس کی موت پاؤں مڑ کر گٹر میں گر جانے کے باعث ہوئی تھی اور اسی لیے اس کی ڈیتھ باڈی دو دن بعد ملی۔ مجھے

لگتا ہے یہ تصویر اسی تماشا کی ہے۔" الیان پریشان نظروں سے خرم کو دیکھنے لگا۔ جیسے سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ کیا کہے۔

"الیان! زوبیہ نے بہت بار مجھ سے کہا تھا کہ اسے لگتا ہے کہ صرف میں ہوں جو اس کی مدد کر سکتا ہوں۔"

آج میری سمجھ میں آیا ہے کہ وہ ایسا کیوں کہتی تھی۔ ساری دنیا اسے پاگل سمجھتی تھی حتیٰ کہ اس کے ماں باپ بھی۔ لیکن وہ پاگل نہیں تھی اس میں کمی تھی تو صرف اعتماد اور فہم کی۔

کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ ایسی صلاحیت دیتا ہے کہ وہ لوگ وہ دیکھ لیتے ہیں جو مستقبل میں ہونے والا ہوتا ہے۔

لیکن ان کا یہ علم بڑا محدود ہوتا ہے۔ وہ مستقبل میں ہونے والے حادثے کو بدل سکتے ہیں نہ ہی اس کے وقوع پذیر ہونے کا صحیح وقت جانتے ہیں بلکہ بعض اوقات وہ سمجھ نہیں پاتے کہ انہوں نے کیا دیکھا تھا۔

زوبیہ بھی ان ہی لوگوں میں سے تھی اس نے مجھے بچتے دیکھا تھا مگر اسے پتا تھا کہ میں نے ایک شخص کی جان بچائی تھی۔

وہ اتنی ذہین نہیں تھی کہ ماضی اور مستقبل میں فرق کر پاتی۔ زوبیہ سوچتی تھی کہ اس نے مجھے دیکھا ہے تو اس کا مطلب ہے ماضی میں کہیں دیکھا ہوگا۔

جبکہ اس نے مجھے یا تو خواب میں دیکھا تھا یا نیم غنودگی میں۔ اسی عالم میں وہ یہ ساری پینٹنگز بنایا کرتی تھی۔

ڈاکٹر شکیلہ کی تشخیص صحیح تھی۔ وہ اسپلٹ پرسنالٹی تھی یعنی دوہری شخصیت۔

جب وہ زوبیہ ہوتی تھی تب بالکل نارمل ہوتی تھی۔ بلکہ کسی حد تک بودی اور کمزور سی لڑکی ہوا کرتی تھی۔

زوبیہ سے ہٹ کر جب وہ دوسری لڑکی بنتی تھی تب ہی وہ یہ سارے اسکیچز بناتی تھی۔ اسی عالم میں اس نے حمید پر حملہ بھی کیا تھا۔

اسی ٹرانس میں وہ جو کچھ بھی کرتی تھی اسے لگتا تھا وہ شائستہ خالہ کر رہی ہیں۔ حالانکہ وہ سب وہ خود ہی کر رہی ہوتی تھی جیسے اپنی ایک دوست پر اس نے اسی گھر کی چھت پر حملہ کیا تھا۔ جس کے بعد بلال اختر نے اس گھر کو بیچنے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ حملہ کسی شائستہ خالہ کی روح نے نہیں خود اس نے کیا تھا مگر یہ نیم غنودگی یا دورہ پڑنے کی کیفیت سے جب وہ ہر آئی تو اس نے یہی کہا کہ اس نے شائستہ خالہ کو ایسے کرتے ہوئے دیکھا۔" خرم کہتا چلا گیا۔

الیان ایک دم چپ بیٹھا بڑے غور سے اسے سن رہا تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر بھی وہ کچھ نہیں بولا تو خرم کو ہی کہنا پڑا۔ "تمہیں یقین نہیں آرہا نا۔

اب ایک اور بات سنو میں جب زوبیہ سے پاگل خانے ملنے گیا تھا تب اس نے بتایا تھا کہ شائستہ خالہ بھی اپنی زندگی میں پاگل خانے آئی تھیں۔ کیونکہ اس نے شائستہ خالہ کو بھی ہو بہو اسی حلیے میں دیکھا تھا۔

جبکہ سچ یہ ہے کہ اس نے خود کو ہی دیکھا تھا لیکن وہ جو میں نے پہلے کہا نا کہ وہ اتنی سمجھ دار نہیں تھی یا شاید اللہ تعالیٰ غیب کا علم کسی کو دیتا نہیں اگر کچھ دکھاتا بھی ہے تو انسان اپنی کم فہمی کی وجہ سے اسے سمجھ نہیں پاتا۔

یہی زوبیہ کے ساتھ ہوا اسے پتا تھا کہ وہ ایک دن پاگل خانے آئے گی اسی جگہ پر اسی یونیفارم میں مگر وہ یہ بات سمجھ نہیں سکی۔

کچھ اس کے ساتھ بچپن میں ایسے حادثے رونما ہوئے اور ایسی کہانیاں اسے سنائی گئیں کہ ایک ایسا کردار اس کی زندگی میں حاوی ہو گیا جو کبھی تھا ہی نہیں۔

اگر اس نے شائستہ خالہ کے بارے میں نہ سنا ہوتا تو ہو سکتا تھا وہ اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوئی ہوتی کہ یہ سب اس کی مرحومہ خالہ کی روح کر رہی ہے۔

لیکن شائستہ خالہ سے وابستہ کہانیوں کو جب اس نے اپنی سوچ کے مطابق جوڑا اور پھر اس کے ساتھ زندگی میں جو کچھ ہوتا رہا اس کے بعد اس نے اپنی ایک الگ کہانی بنائی۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ شائستہ خالہ کا کوئی سایہ کبھی تھا ہی نہیں اگر کچھ تھا تو صرف مستقبل کی وہ جھلکیاں جو زوبیہ کے ساتھ ہونے والی تھیں" خرم نے بستر پر پڑا ایک صفحہ اور اٹھالیا۔

جس میں دو لڑکے ایک لڑکی پر وحشیانہ طور پر حملہ آور تھے۔

"تمہارا مطلب ہے۔" الیان نے کتنی دیر بعد زبان کھولی مگر اب بھی وہ خود کو بولنے پر آمادہ نہ کر سکا۔

جو کچھ خرم کہہ رہا تھا وہ اس پر یقین نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر دماغ کا کوئی ایک کونا اسے کچوکے لگا رہا تھا کہ خرم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ لہٰذا وہ اسے جھٹلا نہیں پا رہا تھا۔

خرم صفحہ پر سے نظریں ہٹا کر عجیب سے انداز میں الیان کو دیکھنے لگا۔

"زوبیہ نے ایک بار میرے دوست حمید پر حملہ کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ یہ شائستہ خالہ کا قاتل ہے۔

بلکہ اس نے مجھے وہ جگہ تک بتائی تھی جہاں شائستہ خالہ کی لاش دفن ہے۔ وہ میرے دوست وکی کے فادر کا فارم ہاؤس تھا۔

میں نے زوبیہ کے ساتھ جا کر وہاں اس قبر کو کھود کر لاش تلاش کرنے کی کوشش بھی کی تھی مگر وہاں کچھ ہوتا تو ملتا نا۔

سب سے بڑھ کر جب میں آخری بار زوبیہ سے ملا تھا تب اس نے مجھے شائستہ خالہ کے قاتل کا نام تک بتایا تھا واجد۔

اس وقت میں اس کی بات کو اس کا پاگل پن سمجھ کر نظر انداز کر کے آ گیا تھا۔

لیکن آج کمپیوٹر پر اس تصویر کو دیکھ کر جیسے سارے بند دروازے ایک دم کھل گئے۔

جیسے ساری گتھیاں سلجھ گئیں۔

اس وقت واجد کا نام سن کر کوئی خیال نہیں آیا۔

مگر آج اچانک یاد آیا ہے کہ جسے ہم سارے دوست بلکہ اس کے ارد گرد موجود تمام لوگ وکی کہہ کر پکارتے ہیں اس کا اصل نام واجد ہے۔ جو شاید وہ خود بھی بھول گیا ہوگا۔" الیان سکتے کے عالم میں خرم کو دیکھ رہا تھا۔

خرم اب کیا کہنے والا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ مگر اس کا دل و دماغ اس بات کو قبول نہیں کر رہا تھا۔

کچھ ایسی ہی حالت خرم کی بھی تھی تب ہی وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا اور آگے کچھ نہیں بول رہا تھا۔ آخر کافی دیر گزرنے پر الیان کو ہی کہنا پڑا۔

"تمہارے دوست وکی اور حمید زوبیہ کو کیوں ماریں گے اور وہ انہیں مل کیسے گئی۔ وہ تو پاگل خانے میں تھی۔"

"وہ کیوں ماریں گے اس کا جواب تو ان صفحوں پر موجود ہے۔

مجھے زندگی میں کبھی یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ دونوں اس حد تک گر سکتے ہیں لیکن میں انہیں کافی قریب سے جانتا ہوں وہ خاصے گھٹیا اور آوارہ ہیں۔

زوبیہ انہیں کیسے مل گئی؟ یہ تو وہی بتا سکتے ہیں لیکن مجھے یہ یقین ضرور ہے کہ زوبیہ کی بنائی دوسری تمام ڈرائنگز کی طرح یہ سب بھی جھوٹی نہیں ہیں۔

اس قبر میں یہ دو لڑکے جس لاش کو دفنا رہے ہیں یہ زوبیہ کی ہے اور یہ دونوں لڑکے وکی اور حمید ہیں۔" الیان سارے صفحے بستر پر پھینکتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے سر کے بالوں کو مٹھیوں میں ایسے جکڑ لیا جیسے اس کا ذہن یہ سب سننے اور یقین کرنے کی تاب نہ لا رہا ہو۔

خرم کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر ہاتھ میں پکڑے کاغذات ایک طرف رکھتے ہوئے وہ بھی الیان کے روبرو کھڑا ہو گیا۔

"الیان اب ہمیں زوبیہ۔۔۔"

"خرم پلیز چپ ہو جاؤ بھلے ہی ہمارے گھرانوں میں لڑائی رہی ہے' لیکن وہ ہے تو میری کزن' ہمارے خاندان کی عزت' ہماری عزت۔۔۔

میں اس کے بارے میں یہ سب۔۔۔" الیان کے لہجے اور انداز میں بے تحاشا بے چینی تھی۔

"میں سمجھ سکتا ہوں۔ میری تو وہ کزن تھی' نہ غیرت ایک مطلب کے تحت میں نے اس سے دوستی کی تھی۔ لہٰذا اسے کبھی دوست بھی نہیں سمجھا۔

لیکن کسی بھی لڑکی کے لیے یہ سب سننا آسان نہیں چاہیے اس سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔

لیکن اگر زوبیہ کے ساتھ یہ سب ہوا ہے تو اس کے مجرموں کو سزا تو ملنی چاہیے۔ ان کا جرم تو سامنے آنا چاہیے اور یہ کام ہمیں آج ہی کرنا ہے۔

میں ڈیڈ کے دوست کو فون کر رہا ہوں، جو پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ڈی آئی جی ہیں۔

وکی اور حمید جن گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں ان پر اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا' ہمیں پوری تیاری کے ساتھ جانا ہو گا۔ اگر وہ پہلے ہوشیار ہو گئے تو وہ شواہد مٹا بھی سکتے ہیں۔"

"تمہارے ارادے کیا ہیں؟" الیان ٹھٹک کر خرم کو دیکھنے لگا۔ جس کے چہرے پر صاف لکھا تھا کہ وہ سب کچھ سوچ بچار کیے بیٹھا ہے۔

مگر خرم نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے کسی غیر مرئی نقطہ کو دیکھتے ہوئے یاسیت بھرے انداز میں کہا۔

"زندگی میں پہلی بار میں یہ چاہ رہا ہوں کہ میں غلط نکلوں۔

جو اندازے لگائے اور جو نتائج میں نے اخذ کیے ہیں اللہ کرے وہ سب غلط نکلیں' بھلے ہی مجھے سب کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے' مگر زوبیہ وہاں سے برآمد نہ ہو جہاں سے مجھے یقین ہے کہ وہ مل جائے گی۔"

☆ ☆ ☆

وکی کے فارم ہاؤس پر پولیس لے کر پہنچنا اتنا آسان کام نہیں تھا' وہ بھی محض شک کی بنیاد پر مگر فرقان حسن کے دوست ڈی آئی جی صاحب نے فرقان حسن کے کہنے پر اپنا سارا اثر و رسوخ استعمال کر ڈالا اور کورٹ کے آرڈر لے کر وکی کے والد کے پاس پہنچے تاکہ وہ بالکل بے بس ہو جائیں۔

کیونکہ اگر انہیں پہلے سے اندازہ ہو جاتا تو نہ صرف وہ آرڈر رکوا سکتے تھے بلکہ وکی کو بچانے کے لیے پہلے ہی فارم ہاؤس سے شواہد مٹا سکتے تھے۔

پولیس کے عملے کے ساتھ ڈی آئی جی صاحب' الیان' خرم اور وکی کے والد تک فارم ہاؤس آئے تھے۔

بلال اختر کو ابھی کسی قسم کی کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ الیان نے تو اپنے گھر میں بھی ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ سب کو پہلے سے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ابھی بھی وہ دعا گو تھا کہ خرم کے سارے شکوک غلط ثابت ہوں۔

حالانکہ وکی کے والد نے پولیس کا لحاظ کیے بغیر خرم کو خوب کھری کھری سنائی تھی۔ جسے خرم نے بڑی خاموشی سے سنا تھا۔

اپنی جگہ وہ اسے صحیح لگ رہے تھے۔ بیٹے کے دوست نے ان کے بیٹے کے اوپر کیس فائل کر دیا تھا۔ وہ جو بھی کہتے کم تھا اور سب کچھ اتنے اچانک کیا تھا کہ وہ اپنا بچاؤ بھی نہیں کر پائے تھے۔ اس میں ان کا تلملانا غلط نہ تھا۔

جب وہ فارم ہاؤس کے پچھلے حصے میں پہنچے تو خرم کی بے چینی سکتے میں تبدیل ہونے لگی۔

دیوار کے پاس لگے ایک درخت کے قریب جہاں زوبیہ نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ شائستہ خالہ کی قبر کی نشاندہی کی تھی اور جہاں خرم نے اپنی پوری جان مار کر اچھا خاصا گڑھا کھود لیا تھا۔ وہاں اب کوئی کھدائی کے آثار نہیں تھے بلکہ گڑھے کو بھر دیا گیا تھا۔ لیکن مٹی کی شکل دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ گڑھا ابھی کچھ دن پہلے ہی بھرا ہے۔ اسی لیے زمین ابھی تک پوری طرح ہموار نہیں ہوئی تھی اور کسی قبر کی طرح تھوڑی سی ابھری ہوئی تھی۔

پولیس کے ساتھ آئے مزدوروں کو جب خرم نے اس مخصوص جگہ کی کھدائی کرنے کو کہا تب اسے اچھی طرح احساس تھا کہ کئی ماہ پہلے زوبیہ نے جب اسے کھدائی کرنے کے لیے کہا تھا تو اس وقت زوبیہ کے کیا محسوسات ہوں گے۔

مزدوروں نے زمین کھودنی شروع کی تو خرم سن ذہن کے ساتھ ہاتھ باندھے انہیں دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ ان لوگوں نے اتنا ہی گڑھا کھود لیا جتنا خرم نے ان سے چار گنا زیادہ وقت میں کھودا تھا۔ تب مزدور کی کدال کے ساتھ ایک کپڑا بھی کھنچتا ہوا باہر آ گیا۔

وہاں موجود تمام نفوس بری طرح چونک اٹھے۔ وکی کے والد جو سخت طیش کے عالم میں ساری کارروائی دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی گویا جھٹکا کھا کر اپنی جگہ سے چند قدم آگے آ گئے۔

مٹی میں اٹا وہ میلا کپڑا یقیناً "سفید رنگ" کا رہا ہو گا۔ اس کپڑے کے نظر آنے کے بعد مزدور نے کدال ایک طرف رکھ دی اور بڑی احتیاط سے ہاتھ سے مٹی ہٹانے لگے۔

جیسے جیسے مٹی ہٹتی جا رہی تھی فضا میں ایک عجیب سی بدبو پھیلتی جا رہی تھی۔ سبھی بے چینی اور فکرمندی سے کبھی ایک دوسرے کو اور کبھی مزدور کی کارروائی کو دیکھ رہے تھے کہ آخر ایک مزدور نے آواز لگاتے ہوئے کہا۔

"صاحب یہ کسی لڑکی کی لاش ہے۔"

(آخری قسط ان شاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

سیما بنتِ عاصم

گھڑی کی سوئیاں شام کے سات بجا رہی تھیں۔ میں کافی دیر سے اس نچلے درجے کے چائے خانہ میں بیٹھا چائے کے کپ پر کپ چڑھا رہا تھا۔ مجھے اپنے وقت کے ضیاع کا بھی احساس تھا اور جیب میں پڑے گنتی کے نوٹوں کا بھی۔۔۔ مگر میری زندگی جیسے اس پل میں ٹھٹھر کر رہ گئی جب اسی چائے خانے میں میرے سامنے والی کرسی سے مائرہ اٹھ کر گئی تھی۔

اسے گئے ہوئے ایک گھنٹہ سے زیادہ بیت چکا ہے۔ مجھے یاد ہے جب اس کی ہمراہی میں میں نے اس چائے خانہ میں قدم رکھا تو چھ سے اوپر کا وقت تھا۔ دفتر سے اس کی چھٹی ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی اور اب سات بج چکے تھے۔ یعنی تقریباً" ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ مگر میرا وجود حرکت سے انکاری تھا۔ لمحات میرے لیے گمبھیر ہو گئے تھے اور ان چند لمحات میں میں نے ایمانداری سے نا صرف اپنا احتساب کیا ہے بلکہ خود کو مجرم بھی قرار دے دیا مائرہ چلتے وقت مجھے جو کچھ کہہ گئی تھی اس نے میرے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ طنز و ملامت سے بھرپور ان لفظوں نے جیسے میرے اعصاب پر کوڑے برسائے تھے۔ میں اب بھی ان لفظوں کی مار سے نڈھال سا ہوں شاید یہی وجہ ہے کہ خود میں حرکت تک کی سکت نہیں پاتا۔

جہاں تک وقت کے ضیاع کی بات ہے۔۔۔ دیکھا جائے تو میں نے اب تک گزرے وقت سے خسارہ ہی خسارہ پایا ہے۔ میں وقت کو کار آمد نہ بنا سکا یا شاید وقت ہی مجھ سے وفا نہ کر سکا۔ وجوہات کچھ بھی رہی ہوں۔ میرے نصیب نے مجھے ہمیشہ ناکامیاں، آزار اور مصائب بخشے جن کا الزام میں ہمیشہ حالات، قسمت یا دوسروں کے سر دھرتا رہا اور شاید ہمیشہ دھرتا رہتا۔ اگر آج اک عرصہ بعد میری مائرہ سے ملاقات نہ ہوتی۔ اس چند منٹ کی ملاقات نے نا صرف مجھے خود احتسابی پر آمادہ کیا۔۔۔ بلکہ خود سے بدظن بھی کر دیا۔ جی ہاں خود سے بدظن۔۔۔۔! کبھی آپ نے سنا کہ کوئی شخص خود سے بدظن ہو؟

جی ہاں! خود احتسابی اک ایسا ہی عمل ہے۔ جس کے ذریعے انسان اپنی خطاؤں کا شمار کرتا ہے اور اگر کوئی مجھ جیسا خود غرض طمع پرست اور بے حس ثابت ہوتا ہے جو آخر کار خود کو مجرم بھی قرار دے دیتا ہے۔ اس کے بعد خود سے بدظن نہ ہو تو کیا ہو؟

آج صبح جب میں اس بلڈنگ میں داخل ہوا، جس میں مائرہ کا دفتر ہے تو میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ آج کی تاریخ میں مائرہ سے میری ملاقات رقم ہے۔

مائرہ! اک مڈل کلاس، عام سی بے کشش لڑکی جسے ماضی کے دیگر تلخ و کریہہ حقائق کا حصہ سمجھ کر میں بھلا چکا تھا۔ اب تو اس کی دھندلی سی شبیہہ بھی میرے ذہن و دل میں باقی نہ تھی۔ اب آپ سے کیا چھپانا میرا اس سے کوئی خاص قلبی تعلق تو رہا نہ تھا۔ ہاں بس، اس سے کچھ عرصہ کی وابستگی بھی اک سمجھوتے کا نتیجہ تھی مگر اس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ شاید آج بھی میں اک نظر اسے دیکھ کر نظر انداز کر دیتا مگر میری دلچسپی کا محور و مرکز مائرہ سے زیادہ اس کا عہدہ تھا۔

یہ ملک کے اک مایہ ناز اخبار کا دفتر تھا۔ مائرہ کے ہینڈ بیگ سے لٹکتا کارڈ اسے اس اخبار کی ملازم ثابت کرتا

۱۰ ا<

تھا اور اس پر درج مائرہ کے عہدے نے مجھے ٹھٹکنے پر مجبور کیا۔ قلم سے مائرہ کا تعلق پہلے بھی تھا ۔۔۔ جو میرے نزدیک حماقت ہی رہی ۔۔۔ اس وقت وہ اک معمولی سی افسانہ نگار تھی' جسے بمشکل اعزازیہ کے نام پر چند پرزے نصیب ہوتے تھے اور میں جو انسان کو اس کی حیثیت سے تولتا تھا تو پھر بھلا ۔۔۔ میرے نزدیک یہ پرزے کیا اہمیت رکھتے تھے ۔ اور بات کہ اپنے نظریات کے تحت میں بارہا ٹھوکر کھاتا رہا۔ اک عرصہ ہو گیا تھا مجھے بے روزگاری کا عذاب جھیلتے ہوئے اور اس بے روزگاری کے نتیجے میں جتنے آزار کسی بھی بے حیثیت فرد کے حصے میں آتے ہیں وہ نا صرف میں بھگتتا تھا بلکہ کسی حد تک ان کا عادی بھی ہو چلا تھا۔ مجھے لاکھ ہاتھ پاؤں مار کر کہیں پیسے کی شکل دیکھنے کو ملتی تھی۔ اب بھی میری جیب دہائیاں دیتی تھی اور ایسے ہی میں تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں مار کر کہیں نہ کہیں سے کوئی کام پکڑنے کی کوشش کرتا تھا۔

اس بلڈنگ میں اک پرائیویٹ چینل کا برانچ آفس تھا۔ میری ہزار ناکامیوں اور بربادیوں سے قطع نظر قدرت نے مجھ پر ایک عنایت ضرور رکھی تھی کہ شکل وصورت کے معاملے میں مجھے لاکھوں میں ایک بنایا تھا اور فی الوقت یہی نکتہ میرے حق میں جاتا تھا گو کہ میں نے کسی اچھے اور برے کردار کے لیے بہت جدوجہد کی مگر ہر جگہ کی طرح یہاں بھی دھاندلی اقربا پروری اور پرچی کا دور دورہ تھا یا یوں سمجھ لیجیے کہ ہر معاملے کی طرح اس معاملے میں بھی قسمت نے مجھے دھتکار دیا اور میری اوقات چھوٹے موٹے پروگرامز اور کرداروں تک رہ گئی تھی۔ جو میرے لیے غنیمت تھے کہ میرے آگے پیچھے کون تھا' جس کا بوجھ اٹھانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا یا تگ کر کوئی کام دھندا کرتا مجھے تو صرف اور صرف اپنا پیٹ پالنا تھا۔

خیر جانے دیجیے ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ آج صبح اس بلڈنگ میں داخل ہوتے ہوئے میرا ٹکراؤ مائرہ سے ہوا تھا۔ مائرہ' جو میری زندگی میں آنے والی تیسری لڑکی تھی ۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ صدفی صد وہی تھی اور شاید میری طرح پہچان کا مرحلہ بھی طے کر چکی تھی۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اس نے مجھے پہچاننے کے بعد کنی کترانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس وقت جب میں ریسپشن پر کھڑا اس کی جانب بغور دیکھ رہا تھا وہ میرے برابر سے نکلی اور تیز قدموں سے لفٹ تک جا کر منٹوں میں آنکھ سے اوجھل ہو گئی۔ مگر ان تھوڑے سے لمحوں میں' میں نے بہت کچھ جانچ لیا تھا۔ اس کے بیگ پر جو آئی ڈی کارڈ لٹک رہا تھا وہ اسے اس نیوز پیپر کی Employ ثابت کرتا تھا جو اسی بلڈنگ میں واقع تھا اور ملک کا مایہ ناز اور صف اول کا اخبار تھا اور جو عہدہ درج تھا اس نے میری آنکھیں چوپٹ کھول دی تھیں۔ وہ ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل تھی۔ اس حساب سے میرے اندازے کے مطابق اس کی تنخواہ ہزاروں میں بنتی تھی۔ اخبارات ورسائل سے مائرہ کا تعلق اس وقت بھی تھا جب وہ مجھ سے منسوب تھی لہٰذا شک وشبہ کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ مجھے اپنے اندر اک ۔۔ نئی توانائی دوڑتی محسوس ہوئی تھی۔

وہ سرعت سے لفٹ تک پہنچی تھی اور میرے اندازے کے مطابق اب اپنی سیٹ تک جا پہنچی ہو گی۔ سو اگلے ہی پل میں نے مذکورہ ریسپشنسٹ سے خود کو متعارف کرواتے ہوئے مائرہ سے ملاقات کا ارادہ ظاہر کیا۔ ریسپشنسٹ نے انٹرکام پر اس سے رابطہ کیا اور جواب میری توقع کے عین مطابق تھا۔

"مادام مصروف ہیں۔" میں ایک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔ یقیناً" اس نے مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا تھا اور اس کے ایما کے بغیر میں اس سے ملاقات نہ کر سکتا تھا۔ اس کے یوں انجان بن کر گزر جانے کے بعد اور توقع بھی کیا کی جا سکتی تھی۔ میں مائرہ جیسی مڈل کلاس اور نیک نامی وساکھ کو اہمیت دینے والی لڑکیوں کی دکھتی رگ سے خوب واقف تھا۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی' نیک نامی اور ساکھ جن کی عمر بھر کی کمائی اور اوڑھنا بچھونا ہوتی ہے۔ لہٰذا میں نے دل ہی دل میں اک فیصلہ کیا۔ بعد ازاں آف تک کا وقت میں نے ادھر ادھر ٹہلتے گزارا تھا۔ دوپہر ہوئی تو اسی چائے خانہ میں بیٹھ کر چائے بسکٹ کھا لیے۔ اس عرصہ میں ہزار سوچیں میرے ذہن ودل میں ہلچل مچاتی رہیں۔ اس سے قطع تعلق کو کچھ سال گزرے تھے' ان گزرے سالوں میں' مجھے اس کی کوئی خبر نہ تھی اور مجھے کیا پڑی تھی کہ حقارت سے دھتکار دیے جانے کے بعد اس کی خبر لیتا یا پھر اس عرصہ میں ممکن ہے کہ وہ ٹھکانے ہی لگ گئی ہو۔ سونے کا انڈہ دینے والی مرغی کو ہر کوئی ہاتھوں ہاتھ لیتا ہے۔ بصورت دیگر قسمت تو آزمائی ہی جا سکتی تھی۔ اسی خیال کے تحت شام میں آف تک کا وقت میں نے بمشکل گزارا تھا اور اس بار میں نے اسے جا لیا۔

"کتنے دکھ کی بات ہے۔" میں نے لہجے میں افسردگی سمو کر کہا "صبح تم مجھے دیکھتے ہوئے بھی انجان بن کر گزر گئیں۔ بعد میں مجھ سے ملنے سے بھی انکار کر دیا۔ ہم ماضی کے خوب صورت حوالے سے ہی سہی کچھ دیر بیٹھ کر بات تو کر سکتے ہیں۔"

"گزشتہ وقت کی ہر بات میں اک تلخ یاد سمجھ کر بھلا چکی ہوں۔ آپ کو بیٹھ کر گزشتہ وقت کی تلخیاں ہی کریدنی ہیں اتنا تو مجھے اندازہ ہے۔" اس کا سرد وسفاک لہجہ میری سماعتوں کو چھو گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر کنی کترا کر گزرنا چاہا تو میں پھر اس کے سامنے آ گیا۔

"میں نے آج صبح سے اب تک کا وقت صرف تمہارے انتظار میں گزارا ہے۔ اگر تم آج میری بات سننے پر آمادہ نہ ہوئیں تو میں ہر روز یونہی تمہاری راہ روکتا رہوں گا۔ گزشتہ وقت کا کوئی لمحہ میری گفتگو میں نہیں آئے گا یہ میرا وعدہ ہے۔"

میرا تیر نشانے پر بیٹھا کچھ سوچ بچار کے بعد بالآخر وہ میرے ساتھ اس چائے خانے میں چلی آئی۔ میں نے اس کے سامنے بیٹھنے کے بعد بغور اس کا جائزہ لیا تھا۔ وہ پہلے بھی عام سے نقش ونگار کی سادہ سی لڑکی تھی۔ اب کچھ اور بھدی اور تھوڑی اور سانولی ہو گئی تھی۔ سر کے بالوں میں جا بجا چاندی نظر آ رہی تھی۔ چہرے پر گزری عمر کی تھکن اتر آئی تھی۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح گاؤدی اور خود سے لاپروا نظر آتی تھی۔ مجھے سمجھنے میں تاخیر نہ ہوئی کہ اگر وہ اب تک کنواری ہے تو معیار کی مارکیٹ میں اس کی قیمت اور گر گئی ہو گی۔ اس کے لیے رشتوں کا تو پہلے ہی کال تھا۔

"تم بہت بدل گئی ہو لگتا ہے شادی وادی کر ڈالی۔" میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

"شادی زندگی کی شرط تو نہیں۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ جن کی شادیاں نہیں ہوتیں' وہ بھی زندہ رہتے ہیں۔" مائرہ کے جواب سے میرے ایک شبہے کی توثیق ہو گئی یعنی رستہ صاف تھا۔ عرضداشت پیش کی جا سکتی تھی۔

"مجھے خوشی ہوئی کہ اپنے معمولی سے شوق کی بدولت تم اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں۔ افسانہ وکالم نگاری نے تمہیں ایک کثیر الاشاعت اخبار کی اچھی پوسٹ تک پہنچا دیا۔ میں اسی لیے عورت کی آزادی کا قائل ہوں۔ عورت اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرے تو کسی پر بوجھ نہیں ہوتی۔"

"پروردگار جب زندگی دیتا ہے تو زندگی کے جواز بھی فراہم کردیتا ہے۔ میری ذمہ داریوں نے مجھے پیروں پر کھڑا کیا ورنہ ابا کے گزرنے کے بعد تو جیسے زندگی ختم ہی ہو گئی تھی۔" ابا کے ذکر پر اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ میری نظروں میں وہ تحفی سے بزرگوار گھوم گئے جو سادہ لباس پہنتے اور سیاست پر سیر حاصل گفتگو کرتے تھے۔

"شٹ!" میں اندر ہی اندر چڑا تھا۔ میرے والدین کو گزرے ایک عرصہ ہوا تھا مگر مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی میں نے اپنے والدین سے محبت و انسیت محسوس کی ہو ان کا کردار ایسا تھا ہی نہیں۔

"مجھے معلوم ہوا تھا میں پرسے کے لیے تمہارے گھر آنے کو سوچتا ہی رہ گیا۔ سچ مانو تو میرے قدم ہی نہ اٹھ سکے۔" میں نے جال بننا شروع کردیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے کوئی حوصلہ افزا جواب نصیب ہو گا مگر۔۔۔۔

"آپ نے ٹھیک ہی کیا۔ آپ کے پرسے سے وہ واپس تو نہیں آجاتے۔ پھر آخری بار کی تلخ کلامی کے بعد ایسی کوئی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے۔" اس کا جواب غیر متوقع ہی نہیں دل شکن بھی تھا۔ میں دل ہی دل میں جزبز ہوا۔ مجھے پابند کر کے وہ خود مزے سے گزرے وقت کو کرید رہی تھی اگر جتانے کا موقع ہوتا تو ضرور جتاتا مگر حقیقت حال یکدم مجھ پر عیاں ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً" باپ کے گزرنے کے بعد کنبے کی کفالت کررہی تھی۔ وہ کنبہ جو پہلے ہی معاشی مسائل کا شکار تھا۔

"تمہارے ابا نفیس انسان تھے مشفق اور محبت کرنے والے مجھے یقین ہے ان کے جانے سے تمہاری زندگی میں خلا رہ گیا ہو گا مگر کسی کے جانے سے زندگی ختم تو نہیں ہو جاتی۔"

"ہاں زندگی ختم نہیں ہوتی مگر اپنے معنی تو کھو ہی بیٹھتی ہے۔ مگر ظاہر ہے' جو شخص اپنے مرے والدین کو برے لفظوں سے یاد کرتا تھا وہ میرے والدین کی کیا خاک عزت کرے گا۔" اصولاً" تو مجھے اس بات پر نادم ہونا چاہیے تھا مگر میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہٹ دھرمی سے بولا۔

"اپنے والدین کو میں نے بھگتا ہے۔ میں آج تک جس بدحالی و بربادی کا شکار ہوں اس میں تھوڑا بہت حصہ ان کا بھی بنتا ہے خیر۔۔۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تمہارے قلم نے تمہیں اعلا مقام دیا۔ ورنہ ہمارے ملک میں تو اکثر قابل و اہل لوگ ٹیلنٹ کی ناقدری کا رونا روتے ہی نظر آتے ہیں۔ تمہاری افسانہ نگاری نے کم از کم تمہیں اس قابل تو کیا کہ تم اپنے کنبے کو سپورٹ کرسکو اور ایک اچھی زندگی گزارو۔"

"جی ہاں وہی افسانہ نگاری جس کے لیے آپ نے کہا تھا کہ ملتا ہی کیا ہے۔۔۔ چند پرزوں سے بھلا کیا زندگی کی گاڑی چلتی ہے۔۔۔ مگر کبھی کبھی تنکے بھی سہارا بن جاتے ہیں۔ انسان کو مقام رب کی اعلا ذات فراہم کرتی ہے۔ رہی بات کفالت کی تو۔۔۔ دوسروں کی امیدوں کا آپ سے وابستہ ہونا آپ پر اللہ کا خاص کرم اور احسان ہوتا ہے۔"

میں چند لمحے کو لاجواب سا ہو گیا پھر اپنے تئیں بات سنبھالی۔

"تم سمجھیں نہیں میرا مطلب تھا کہاں وہ چند ٹکوں کی افسانہ نگاری اور کہاں یہ ملک کے مایہ ناز اور صف اول کے اخبار کی شاندار پوسٹ۔۔۔ قسمت کی مہربانی ہے۔"

"جب رب کی ذات کسی سے کوئی کام لینا چاہتی ہے۔ تو اس کے لیے وسیلے بھی خود ہی بناتی ہے۔ کاغذ کی معرفت یہاں راہ و رسم تھی تو میں نے جاب کے لیے کہہ رکھا تھا۔ مناسب ویکنسی نکلی تو انہوں نے بلا لیا۔ تنخواہ اس وقت پچیس ہزار تھی۔ بعد میں اپنی محنت اور لگن سے ترقی اور کامیابی کا سفر طے کیا اور اسی حساب سے انکریمنٹ بڑھتا چلا گیا۔ اب تقریباً" دگنا ہے۔"

میں اس کے مقدر پر اش اش کر اٹھا۔ اک میں تھا' مناسب نوکری کے لیے جوتیاں گھس چکا تھا اور وہ جو کبھی نوکری کے نام سے بھی کتراتی تھی۔ اسے ایسی شاندار جاب گھر بیٹھے میسر آگئی تھی۔

"پچاس ہزار۔" اس کے کہے گئے سارے لفظ ادھر ادھر ہو گئے تھے۔ بس یاد رہا تو اتنا کہ اس کی تنخواہ پچاس ہزار تھی۔ جو اک خطیر رقم تھی۔ میری نظروں کے سامنے میز پر اس کا جدید موبائل رکھا تھا۔ وہ ایک نہ دو' پچاس ہزار کمارہی تھی اور اپنی کمائی پر اس کا اتنا حق تو بنتا ہی تھا کہ ایک بڑھیا اور قیمتی موبائل رکھ سکے۔ میری رال ٹپک پڑنے کو تھی اور دل مچلا جارہا تھا کہ کاش ہائے کاش۔۔۔!

"اچھا موبائل ہے۔" میں نے میز سے اٹھا کر اس کے موبائل کا جائزہ لیا۔

"جدید اور قیمتی۔ میرا خیال ہے کہ اب تک تم اس پرانے اور سالخوردہ گھر سے چھٹکارہ پاکر کسی جدید لگژری فلیٹ میں منتقل ہو چکی ہو گی۔"

"ہم جیسے انسانوں سے محبت کرنے والے لوگ اتنی آسانی سے اپنے ٹھکانے نہیں بدلا کرتے۔ آپ جیسے لوگ سوچتے ہیں کہ اینٹ گارے سے بنے گھر کسی کو کیا دے سکتے ہیں۔ مگر اس گھر سے ابا کی یادیں وابستہ ہیں مجھے ان کی مہک آتی ہے۔"

مجھے اس سے یہی توقع تھی۔ اس جیسے لوگوں کو ہی کنوئیں کا مینڈک کہا جاتا ہے۔ میں نے ویٹر کو اشارہ کیا۔ میری جیب میں بس اتنا ہی تھا کہ خالی خولی چائے کا آرڈر دیا جاسکتا سو دے دیا۔ میری سوچ اک نئی نہج پر سفر کررہی تھی۔ سو اسی خیال کے تحت اسے راہ پر لانا چاہا۔

"انسانوں کے بیچ رنجشیں ہو ہی جاتی ہیں مگر رنجشیں ختم بھی تو کی جاسکتی ہیں اور تم تو مجھ سے محبت کی دعوے دار تھیں مائرہ! کیا محبت کا رشتہ اتنا ہی ناپختہ ہوتا ہے؟"

"بالکل جو رشتہ یک طرفہ ہو' وہ ناپختہ ہی نہیں ناپائیدار بھی ہوتا ہے اور محبت سے بڑھ کر بھی ایک چیز ہوتی ہے اور وہ ہے عزت نفس۔"

مائرہ کی بات پر مجھے اپنے وہ جملے یاد آگئے جو میرے اور اس کے مابین رنجش کا سبب بنے تھے۔ جی ہاں میں نے اس کہا تھا۔ میں نے تو اس سے محض سمجھوتا کیا تھا

یہ بھی کہ وہ ایسی آسمان سے اتری حور نہیں جس سے شادی کے لیے مرا جاؤں اور یہ بھی کہ وہ اک دقیانوسی سوچ رکھنے والی مڈل کلاس لڑکی ہے۔

کاش اس ظالم وقت میں مجھے معلوم ہوتا کہ اس کا مستقبل ایسا شاندار ہوگا تو آج میری زندگی بھی خوشحالی کی تصویر ہوتی۔ میرے کئی مسائل حل ہو چکے ہوتے۔ وہ اب اپنی فیملی کو سپورٹ کر رہی تھی اور جاب کر کے فیملی کو سپورٹ کرنے والی لڑکی کی عمر گزر جائے تو دنیا کیا کیا باتیں بناتی ہے مجھے خوب اندازہ تھا۔ دنیا کو جھیلنا آسان کام تھوڑی ہے وہ تو پہلے ہی اپنے گھر والوں کے لیے بوجھ تھی۔ اب یقیناً" تنگی حالات نے اس کے سارے کس بل نکال دیے ہوں گے۔ تو کیوں نا اسے ایک بار پھر اپنی جانب گھسیٹ کر لایا جائے۔ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کا فیصلہ تو میں کر ہی چکا تھا۔ اس خیال نے مجھے خاصی تقویت دی تھی سو کھنکھار کے کہا۔

"چہ..... چہ..... چہ مجھے تمہاری زندگی کے اجاڑ پن کا خوب اندازہ ہے۔ تمہاری زندگی تو اچھا بھلا تماشا بن کر رہ گئی ہوگی۔ کنبے کا بوجھ ڈھونے میں لڑکی کے کمر جھکا لینے تک دنیا کی کس ستم ظریفی سے پالا پڑتا ہے مجھے خوب اندازہ ہے۔ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تمہارا اپنا گھر اپنی زندگی ہو۔ یہ جدوجہد خود تمہارے اپنے لیے ہو..... دیکھو اک وقت آتا ہے انسان تھک جاتا ہے۔ پھر کون ہوگا..... جو تمہارے سرہانے ہوگا۔ اپنی اولاد' اپنا شوہر اپنا گھر..... تمہیں حق ہے کہ اپنی زندگی گزارو۔"

"انسان جو چاہتا ہے وہ ہوتا نہیں ہے 'ہوتا وہ ہے جو قسمت میں درج ہو اور میری قسمت میں شاید یہی ہے کہ اپنے خوابوں پر خاک ڈال کر دوسروں کے لیے زندگی گزاروں۔"

"مگر تمہاری زندگی پر تمہارا اپنا بھی حق ہے۔ یہ مت بھولو اپنا گھر ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے۔ تمہارا یہ خواب شرمندہ تعبیر ہو چکا ہوتا۔ ہم اک اچھی زندگی گزار رہے ہوتے اگر کچھ اختلافات درمیان میں نہ آتے۔"

"آپ بھول رہے ہیں فہد صاحب! آپ نے گزرے وقت کی باتیں نہ کریدنے کا وعدہ کیا ہے۔" اس کے لہجے میں یکدم اجنبیت سی در آئی تو مجھے سنبھلنا پڑا۔

"اوہ سوری! چلو آج پر آجاتے ہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ کوئی بھی صورت حال ساری زندگی پر محیط نہیں ہوتی۔ وقت کیسا بھی ہو بدلتا ضرور ہے۔" میں نے تمہید باندھی پھر کہا۔

"کیوں نا ہم گزشتہ اختلافات کو بھول کر نئے سرے سے تجدید تعلق کی بنیاد رکھیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مسائل سمیٹ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے' ہم دونوں مل کر زندگی کی گاڑی خوب اچھی طرح چلا لیں گے۔"

"ہاں شاید اس لیے کہ اب میں اپنے پیروں پر کھڑی ہوں اور ہزاروں کما رہی ہوں۔ ایک آزاد خود مختار یا ورکنگ لیڈی تو آپ کی اولین ترجیح تھی نا!" اس کے لہجے میں تمسخر اُمڈ آیا۔ جسے میں نے نظر انداز کر دیا۔

"وہ میری اس وقت کی ضرورت تھی اور میں نے اس شق کے بنا بھی تمہیں قبول کر ہی لیا تھا۔"

"تو اب بھی کون سا آپ کے حالات میں تبدیلی آ گئی ہے۔ آپ آج بھی وہیں کھڑے ہیں جہاں اس وقت تھے۔ کیا آپ مجھے اتنی بے وقوف سمجھتے ہیں کہ یہ نہ سمجھ سکوں کہ آج میری راہ روکنا بے مقصد نہیں ہے۔ یہ شاید میرے اسٹیٹس کے سبب ہے ورنہ میں آج بھی وہی عام سی غیر اہم لڑکی ہوں جس سے آپ نے محض سمجھوتا کیا تھا۔"

وہ برابر مجھ پر طنز و ملامت کے ڈونگرے برسا رہی تھی اور میرے لیے یہ عزت افزائی نئی نہ تھی۔ میں خوب جانتا تھا عورت کی فطرت..... گیند اس کے کورٹ میں گرتی ہے تو وہ یونہی لفظوں کی مار مارتی ہے۔ مائرہ بھی تو ایک عورت تھی مگر میں یہ بھی جانتا تھا۔ عورت کسی طبقے کی ہو کسی رنگ و نسل سے تعلق رکھتی ہو۔ اسے توڑا جا سکتا ہے۔ جوڑا جا سکتا ہے اور

جوڑ کر پھر توڑا جا سکتا ہے تو صرف اور صرف محبت سے اور محبت مائرہ جیسی مڈل کلاس خوابوں کی دنیا میں رہنے والی آئیڈیل پرست لڑکیوں کی کمزوری ہوتی ہے سو میں نے اک نیا پینترا بدلا۔

"تم مانو یا نہ مانو مگر گزشتہ زندگی کے ہر پل نے مجھے میری خطاؤں کا احساس دلایا ہے۔ یقین مانو کہ میں آج بھی تمہارا منتظر ہوں۔ شاید اس لیے کہ مجھے تم سے محبت تھی اور ہے۔" میں نے تاک کر نشانہ لگایا مگر خطا گیا۔

"محبت! کس محبت کی بات کرتے ہیں۔ وہ محبت جس پر آپ کو یقین ہی نہ تھا؟ آپ بھول گئے آپ نے کیا کہا تھا؟ بھلا حیثیت ہی کیا ہوتی ہے محبت کی..... زندگی میں اور بھی بہت کچھ ہے جو محبت سے بڑھ کر ہے..... محبت کا نمبر تو سب سے آخر میں آتا ہے۔"

اس نے من و عن میرے الفاظ لوٹا دیے تو سٹپٹا گیا۔

"وہ تو ہے۔ دیکھو محبت سے خالی پیٹ نہیں بھرا جا سکتا۔ انسان کو رزق کے لیے ہاتھ پاؤں تو مارنے پڑتے ہیں نا! زندگی میں اور بھی بہت کچھ ہے جس کے لیے جدوجہد لازمی ہے۔"

"چلیے ٹھیک ہے اگر آپ اپنے دعوے پر قائم ہیں تو ایک ڈیل کر لیتے ہیں۔" اس کا لہجہ یکدم مفاہمانہ ہو گیا تو میرے اندر اک خوش مستانہ گونجا وہ کہہ رہی تھی۔

"اگر ماضی میں ٹوٹے ہوئے تعلق کی تجدید کر کے ہم دونوں ایک ہو جاتے ہیں تو میں اپنی فیملی کو ہنوز سپورٹ کروں گی۔ آپ بحیثیت شوہر میری کفالت اور گھر گرہستی کا بار اٹھائیں گے۔"

میری آنکھیں چوپٹ کھل گئیں۔ میں نے بے یقینی سے اپنے مقابل بیٹھی لڑکی کو دیکھا جو لبوں پر تمسخرانہ و چیلنج کرنے والی مسکان لیے مجھے دیکھ رہی تھی۔ یہ وہی عام سی بے کشش لڑکی تھی جسے میں ماضی میں بار بار اس کی کم مائیگی و واجبی شکل و صورت کا احساس دلاتا رہا تھا مگر ملازمت پیشہ عورت زور آور ہوتی ہے یہ میرا تجربہ تھا۔ آج اگر وہ مضبوط نظر آتی تھی تو یقیناً" اس کی اہل تھی۔ میرے لیے یہ بہت نازک لمحہ تھا۔ مجھے اپنی فطرت کے برعکس خود کو بے حیا ثابت کرتے ہوئے اس طرح اس پر جال ڈالنا تھا کہ اس پر اپنی محبت کی دھاک بٹھا سکوں۔

"کیسے منظور ہے؟" وہ بدستور چیلنج کرتی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ میں نے اک ٹھنڈی سانس لی۔ ماضی میں وہ خاصی وفاشعار' بے ریا' مخلص اور محبت و خیال کرنے والی لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ لیکن آج اگر وہ ڈیلنگ پر اتر آئی تھی تو اس میں کوئی اچنبھا نہ تھا۔

"تم ٹھیک سوچتی ہو بحیثیت مرد کے میرا ہی فرض بنتا ہے کہ اپنے کنبے کی کفالت کروں..... مجھے اس میں کوئی عار نہیں ہے۔ مگر بات وہیں آ کے رکتی ہے کہ مالی طور پر میں آج بھی وہیں کھڑا ہوں' جہاں آج سے کچھ سال پہلے تھا۔ میں ہنوز بے روزگار ہوں۔ شاید میری معاشی زبوں حالی بھی ہم دونوں کے مابین اختلاف کی اک وجہ تھی..... مگر خیر میں گزرے وقت کو دہرانا نہیں چاہتا بات اگر ڈیلنگ پر آ رکی ہے تو یاد رکھو کہ دنیا کا نظام 'کچھ دو اور کچھ لو' کے اصول پر چل رہا ہے۔ تم فنانشلی طور پر مضبوط ہو۔ تمہاری سیونگ بھی ضرور ہوگی۔ نوکری تو مجھے ملنے سے رہی اگر تم فنانشلی سپورٹ کرو گی تو بہت جلد تمہاری انویسٹ منٹ تمہیں دگنی ہو کر ملے گی۔ اس وقت میرا سب کچھ تمہارا ہو گا۔ ابھی تو میں خالی ہاتھ ہوں مگر میرے ذہن میں کچھ پلاننگز ضرور ہیں کاروبار کے لیے..... جو یقیناً" پیسے کی محتاج ہیں۔"

"او کے' چلیے فرض کریں میں آپ کو فنانشلی سپورٹ کرتی ہوں تب میرا کیا بھلا ہو گا اور کیا پلاننگز ہیں آپ کے پاس....."

"گڈ' دیکھو چند لاکھ تمہاری سیونگ ضرور ہو گی۔ بقیہ تم آفس سے لان لے سکتی ہو۔ میں کوئی کاروبار شروع کرتا ہوں۔ نکاح جب تم کہو ہو جائے گا۔ مگر میں آج بھی بے در ہوں تو پرابلم ہم کچھ عرصہ تمہارے گھر پڑاؤ ڈال لیں گے۔ پھر جوں ہی کاروبار جمے گا میں

تمہاری انویسٹ منٹ لوٹانا شروع کردوں گا۔ ہم جلد ہی اپنا کوئی فلیٹ لے لیں گے اگر تمہیں اپنی فیملی کا خیال ہے تو ہم ہمیشہ ان کے ساتھ بھی رہ سکتے ہیں۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ تمہارے دو مسئلے اک ساتھ حل ہوں گے شادی اور ہمیشہ فیملی کے ساتھ رہنا۔ کہیں اور شادی کی صورت میں تو ظاہر ہے انہیں چھوڑنا ہوگا جو یقیناً" تمہیں بھی منظور نہ ہوگا۔"

میں نے دن بھر کے وقفے میں جو پلاننگز ترتیب دی تھیں۔ من وعن اس کے سامنے رکھ دیں۔ جواباً" اس نے خاصی ملامت کرتی نظروں سے مجھے گھورا تھا۔

"اچھی پلاننگ ہے۔ خاصی جامع مگر آپ نے یہ بھی سوچا کہ میرے گھر پر پڑے رہنے' میری کمائی یا میرے پیسے سے آپ کی اپنی حیثیت دو کوڑی کی ہو جائے گی؟ دنیا ایسے مردوں کو کس نام سے پکارتی ہے۔ آپ کو تو اس کا خوب تجربہ ہے نا!"

"وہ تو ہے مگر میں سمجھتا ہوں کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے نا!"

"شاید اس لیے کہ آپ اک خود غرض اور بے غیرت انسان ہیں۔" اس نے تڑپ کے کہا۔

"مائرہ!" میری آواز بے جان تھی۔

"خبردار جو میرا نام لیا ہو۔ کبھی اپنی زندگی کے خساروں کا شمار کریں تو آپ کو احساس ہوگا کہ یہ تمام خسارے آپ کے اپنے ہی خریدے ہوئے ہیں۔ جس طرح ہم رب سے جو گمان رکھتے ہیں وہ ویسا ہی ثابت ہوتا ہے۔ دنیا کی مثال بھی ایسی ہی ہے۔ آپ نے اپنی قوت بازو پر بھروسا کرنے کی بجائے سہارے تلاش کیے سو ہمیشہ خساروں کا شکار رہے۔ اپنی لالچی خود غرض اور طمع پرست فطرت کی بدولت نقصان اٹھایا سو تنہا ہیں۔ یاد رکھیے عورت مرد سے اپنے لیے پروٹیکشن کی امید رکھتی ہے اور محتاجوں کو صرف بھیک ملا کرتی ہے۔"

وہ نفرت و حقارت سے کہہ کر ٹیبل پر سو کا نوٹ رکھ کر اٹھ گئی تھی اور میری زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی۔

"خسارے!" میرے کانپتے لبوں سے نکلا اور دور گزشتہ کا اک اک لمحہ میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔

☆ ☆ ☆

سوچتا ہوں اپنی کہانی کی شروعات کہاں سے کروں تب جب میں نے اک سسکتے ذلت بھرے محروم ماحول میں آنکھ کھولی یا جب میں اسی لالچی' طمع پرست اور خود غرض فطرت کے سبب خسارے پر خسارہ جھیلتا چلا گیا ..... مگر ان خساروں کا ذکر بھی ساتھ ساتھ ہی آئے گا۔ لہٰذا میں اس کہانی کا آغاز تب سے کرتا ہوں جب مائرہ سے میرا پہلا تعارف ہوا تھا۔

یہ وہ وقت تھا جب میں چاروں طرف سے خساروں کا شکار تھا بے روزگاری میرے گلے کا طوق بن گئی تھی۔ بہن بھائی عزیز رشتے دار سب میری مالی زبوں حالی یا تنگی حالات کے سبب مجھ سے منہ موڑ گئے تھے۔ دوبار کی ناکام ازدواجی زندگی نے مجھے ذہنی اور ملی طور پر تباہ کر دیا تھا۔ (مالی طور پر کیسے .....؟ اس کا جواب آگے جا کر ملے گا) ایک طرح سے میں دنیا سے منہ چھپا تا پھر رہا تھا۔ یا یوں کہیے کہ کل عالم کی ٹھوکروں کی زد پر تھا۔ اگر بھولے بھٹکے کسی تقریب کا بلاوا آ ہی جاتا اور میں چلا ہی جاتا تو لوگ کرید کرید کر میری سابقہ زندگی کے بارے میں سوالات کرتے ہمدردی اور افسوس کی آڑ میں زخم کریدتے۔ نہ جانے لوگوں کو دوسروں کی ذاتیات سے اتنی دلچسپی کیوں ہوتی ہے۔ اب یہ بھی کوئی بتانے والی باتیں تھیں کہ میری دو بیویاں میرے ناکارہ پن کے سبب مجھ سے طلاق لے چکی ہیں۔ عائشہ تو خیر بڑے گھر کی لڑکی تھی' اس کی اپنی پرانی محبت سے تجدید تعلق کے سبب میرا پہلا گھر اجڑا مگر رئیسہ بھی حرفوں کی بنی تھی۔ اس بار بھی قصوروار میں نہ تھا مگر ..... میں دنیا کے پینترے خوب سمجھتا ہوں۔ ایسے معاملات میں لوگ ایک فریق کے سامنے دوسرے فریق کو برا بھلا کہہ کر اندر کی بات نکلواتے ہیں اور مخالف کے کان میں یا تو براہ راست پھونک دیتے ہیں یا پھر بات زبان در زبان سفر کرتی وہاں تک پہنچ ہی جاتی ہے۔

شاید میں موضوع سے بھٹک رہا ہوں ہاں تو میں بتا رہا تھا۔ اپنی معاشی حیثیت اور ناکام ازدواجی زندگی کے سبب سوسائٹی میں میری عزت دو کوڑی کی تھی۔ لوگ مجھ پر ہنستے' پیٹھ پیچھے باتیں کرتے یہاں تک کہ آوازے کستے۔ میں کسی دھتکارے ہوئے کتے کی طرح اپنے عزیز دوست سلمان کے گھر کے ایک کونے میں پڑا تھا۔ سلمان کا یہ طویل و عریض گھر دو منزلہ عمارت پر مشتمل تھا۔ جس کی نچلی منزل میں خاصی کامیابی سے چلتا ہوا اک پرائیویٹ اسکول تھا۔ اوپری منزل پر وہ خود اپنی فیملی سمیت رہائش پذیر تھا۔ بلاشبہ وہ اک کھاتا پیتا گھرانا تھا۔ میری دربدری پر رحم کھا کر یا نچلی منزل کی رکھوالی کی غرض سے اس نے نچلی منزل کے اک گودام نما کمرے میں رہائش کی پیش کش کی تو میں نے جھٹ قبول کر لی۔ جہاں میرا بے مصرف وجود بھی فالتو کاٹھ کباڑ کی طرح پڑا رہتا تھا۔

خیر..... تو میں اس دن کے بارے میں بتا رہا تھا۔ جب مائرہ سے میرا پہلا تعارف ہوا۔ سب سے پہلے مجھے ایک خط موصول ہوا تھا۔ یہ خط ضرورت رشتہ کے کسی اشتہار کے جواب میں مائرہ کے والد بزرگوار کی جانب سے تھا۔ جس میں دختر نیک اختر کے چیدہ چیدہ خواص کے ہمراہ مجھے اپنی فرزندی میں لینے کی خواہش کا اظہار تھا۔ میں نے تصدیق کی خاطر بار بار خط اور لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ خط بلاشبہ میرے لیے ہی تھا۔ میں نے لاکھ عقل کے گھوڑے دوڑائے' بارہا ذہن پر زور ڈالا کہ شادی کے لیے میں نے کب کسی اخبار میں اشتہار دیا تھا مگر کچھ واضح ہو کر نہ دیا۔ یقیناً" ایسے کسی اشتہار سے میرا کوئی واسطہ نہ تھا۔ نہ ہی دوبار ذلت و خواری اٹھا کر میرا فی الوقت شادی کا کوئی ارادہ تھا۔ میں سوچتا رہا کافی دیر بعد میرے ذہن میں اک جھماکا سا ہوا۔ میرا دوست توصیف اشتہارات کی بکنگ ایجنسی میں جاب کرتا تھا اور مجھ سے کئی بار میری ترجیحات کرید کر کسی روز ضرورت رشتہ کے کالم میں میری شادی کے لیے اشتہار دینے کا ارادہ ظاہر کر چکا تھا اور میری ترجیحات یہی تھیں۔ ویل آف گھرانا جو مالی سپورٹ فراہم کر سکے یا گھر دامادی کا اعزاز بخشیں۔ ورنہ اعلا عہدے پر فائز کماؤ بیوی' صورت شکل' عمر' ذات' نسل کی کوئی قید نہ تھی۔ یہ بات صرف ہنسی مذاق تک محدود رہی تھی۔

ان حالات میں جب دنیا کی کوئی عورت اور گھرانا مجھے سند قبولیت بخشنے پر تیار نہ تھا۔ گردش حالات مجھ سے میرا اعتماد چھین کر مجھے اچھے خاصے کمپلیکس میں مبتلا کر چکی تھی یہ خط میرے لیے کسی خوشگوار جھونکے سے کم نہ تھا۔ اب بات کھل ہی رہی ہے تو بتا دوں میری دوسری شادی ختم ہوئے تقریباً" پانچ سال ہونے کو آئے تھے۔ اس دوران میری تنگی حالات پر نظر رکھتے ہوئے میرے کچھ قریبی دوستوں اور خود میں نے بارہا کوشش کی کہ مجھے کسی ایسے گھرانے سے رشتہ میسر آجائے جو مجھے مالی سپورٹ کے ساتھ گھر دامادی کا شرف بھی بخش دیں مگر میرے حالات اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ بھلا اک بے گھر' بے در' بے روزگار اور دوبار کے طلاق شدہ کو کون قبول کرتا۔ توصیف کو بھی میں نے کچھ ایسی ہی شرائط نوٹ کروائی تھیں۔ مگر میرے اپنے کوائف خاصے مایوس کن تھے خصوصاً" میری دو ناکام شادیوں کا سن کر تو سبھی رسے تڑا کر بھاگتے نظر آتے تھے۔ ہر بار ایک سی سچویشن نے مجھے شادی سے خاصا بددل بلکہ مایوس کر دیا تھا۔ جو سچ مانیے تو اب تو میں نے امید ہی چھوڑ دی تھی اور اپنے موجودہ حالات کو اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا سمجھ کر اپنے حال سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ ایسے میں امید کی یہ کرن میرے وجود میں اک نئی توانائی دوڑا رہی تھی۔

خط میں رابطے کے لیے موبائل نمبر درج تھا جس کی کال کم از کم مجھے تو مہنگی پڑتی لہٰذا میں نے بہت سوچ سمجھ کر نپے تلے الفاظ میں ایس ایم ایس کیا اور رابطے کے لیے سلمان کے گھر کا لینڈ لائن نمبر درج کر دیا تاکہ سہولت اور آسانی سے تفصیلی بات ہو سکے۔ اشتہار کہاں دیا گیا تھا اور اس میں کیا کچھ درج تھا مجھے کچھ پتا نہ تھا مگر بہرحال امید پر دنیا قائم ہے۔ سو میں بھی امید

باندھ کے بیٹھ گیا۔

کچھ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ کال آہی گئی۔ میں ان دنوں دن کا بیشتر حصہ سو کر یا اپنے کھوٹے نصیبوں کو رو کر گزار تا تھا۔ اس سہ پہر بھی میں گہری نیند میں تھا۔ جب سلمان کے بڑے بیٹے نے مجھے کال کا مژدہ سنایا تو میں نے اسی سوئی جاگی کیفیت میں اوپری منزل پر جا کر فون ریسیو کیا۔ میرا خیال تھا کہ ایک بار پھر موصوفہ کے والد محترم فون پر موجود ہوں گے مگر خلاف توقع اس بار لائن پر والدہ محترمہ تھیں۔

"معاف کرنا بیٹے لگتا ہے میں نے تمہیں غلط وقت پر پریشان کیا ہے۔"

ان کے لہجے میں شرافت و انکساری تھی مگر میں انہیں کیا بتاتا کہ میرے لیے تو تقریباً" ہر وقت ہی سونے کا ہوتا ہے۔ اک ناکارہ بے روزگار ناکام آدمی کا اور کام ہی کیا ہو سکتا ہے۔

بہرحال چند رسمی باتوں کے بعد اشتہار کا حوالہ دے کر باقاعدہ انٹرویو کا آغاز ہوا مگر محترمہ کا پہلا سوال ہی مجھے بھڑکا کے رکھ دینے والا تھا۔ یعنی میرے والد کا پیشہ۔ یقیناً" یہ سوال انہوں نے میری معاشی حیثیت کا اندازہ لگانے کے لیے کیا تھا۔

"وہ الیکٹرک انجینئر تھے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "مگر آپ یہ نہ سمجھ لینا کہ میں منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا تھا۔ درحقیقت میرے والد عیش پرست تھے' اسی سبب نہ وہ بیوی بچوں کو چھت دے سکے نہ باعزت زندگی۔ ان کی عیش پرستی نے ہمارے کنبے کو اک قابل رحم زندگی دی۔ ہم کتوں کی طرح ماموں کے در پر پڑے ان کی جھڑکیوں میں پلے۔ میرے والد پردیس میں عیش کرتے رہے میری والدہ نے بمشکل تمام سب اولادوں کو پڑھایا لکھایا اور ٹھکانے لگایا اگرچہ عادات و خصائل میں اماں بھی کم نہ تھیں۔ جہالت ان کے دماغ میں بھری تھی۔ بدزبانی ان کا ہتھیار مگر بہرحال ان کا یہ احسان کم نہیں کہ انہوں نے ہم سب کو پال پوس کر اپنے پیروں پر کھڑا تو کر ہی دیا۔ بیٹیوں کو تنگدستی میں بیاہ دیا اور بیٹوں کو پڑھا لکھا دیا۔" ان کے سوال نے میرے اندر کے ابال کو بڑھاوا دیا تھا۔ سو اب بھی میں والدین کے خلاف جتنا غبار نکال سکتا تھا میں نے نکالا۔

میرے اپنے خیال میں ہم سب بہن بھائیوں نے اک ذلت بھری قابل رحم زندگی اپنے والدین کی خامیوں اور نااہلی کے سبب گزاری تھی۔ تنگ گھٹا ہوا ماحول' پیسے کی کمی' ذاتی رنجشیں' جھک جھک چخ چخ یہ تمام عوامل بڑھتی عمر کے بچوں کے اذہان پر منفی اثرات ڈالتے ہی تھے۔ ویسے تو ہم سب بہن بھائی اپنی ذاتی زندگیوں میں پیچیدگیوں کا شکار رہے مگر یہاں میں اپنی کہانی بیان کر رہا ہوں.... محترمہ جواباً" توبہ تلا کرتی رہ گئی تھیں۔

"اللہ معاف کرے۔ بھلا ایسے بھی ماں باپ ہوتے ہیں مگر اس دنیا میں جو نہ ہو' کم ہے۔ تو بیٹا خیر سے تمہاری تعلیم کیا ہے؟"

"میں نے ماسٹرز کیا ہے دیگر چیزوں میں چند شارٹ کورسز بھی ہیں۔ یہ اور بات کہ اتنا عرصہ پڑھائی میں جھک مار کر بھی بے روزگاری میرا مقدر ہے۔"

"اللہ بہتر کرے گا۔ اللہ سے اچھی امید رکھتے ہیں۔ روزگار ہی سے تو گرہستی چلتی ہے۔ ان شاء اللہ گھروالی آئے گی شادی ہو گی تو گرہستی بھی چلے گی۔"

"یہ میں نے کب کہا کہ میری شادی نہیں ہوتی؟" میں بدک اٹھا۔ "ایک نہیں دو بار میری شادی ہو چکی ہے۔ میرے کھوٹے نصیب کہ دونوں بار مجھے بدترین عورتیں ٹکرائیں اور دونوں نے مجھ سے طلاق حاصل کر لی۔"

"ہائیں.... دو بار طلاق....؟" میری یہ بات ان کو گڑبڑا گئی تھی۔ "مگر طلاق کی وجوہات کیا تھیں؟"

یہ ایک ایسا موضوع تھا جس پر میں بے تکان بول سکتا تھا۔ اپنا ماضی کرید کر خود کو مظلوم ثابت کرنے میں اپنا سارا زور لگا دیا کرتا تھا۔ یہاں بھی میں نے اپنے "خواص" حذف کر کے اپنی مظلومیت اور بدقسمتی کے خوب رونے روئے۔ مزے کی بات یہ کہ انہوں نے یقین بھی کر لیا۔

"تو بیٹا تم بے روزگار ہو کیا تمہاری بہن بھائیوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جو تمہیں سہارا دے سکے؟" سوال ہوا۔

"بہن بھائی سب اپنی دنیا میں مگن ہیں۔ کسی کو یہ احساس تک نہیں کہ ان کا ایک بھائی معاشی بدحالی کا شکار ہے اور کسی لاوارث کتے کی طرح غیروں کے در پر پڑا ہے۔"

"ہائیں کیا مطلب؟ یعنی اپنا گھر بھی نہیں ہے؟"

"گھر تو گھروالی بناتی ہے۔ میری قسمت کہ مجھے جو عورتیں ملیں۔ وہ دونوں ہی بے وفا نکلیں۔ پہلی بیوی نے تو گن پوائنٹ پر مجھ سے دستخط لیے تھے۔" ان تمام مذاکرات کے بعد مجھے قوی امید تھی کہ انہوں نے اب مجھ پر لعنت بھیجی کہ تب.... مگر شاباش تھی کہ ان کے پایہ استقلال میں جنبش تک نہ آئی۔ مزید جرح کے بجائے وہ صاحبزادی کے اوصاف اور کوائف گنوانے لگیں۔

موصوفہ بی اے پاس' گھریلو' دین دار' شریف النفس اور توقع کے عین مطابق مڈل کلاس گھرانے سے منسلک تھیں اور ان میں سے ایک بھی خوبی میرے کام کی نہ تھی۔ سیرت و کردار کو تو خیر میں کسی گنتی میں ہی نہ رکھتا تھا۔ میرے نزدیک تو صرف اور صرف انسان کے اسٹیٹس کی اہمیت تھی۔ خصوصاً" عورت تو وہی آئیڈیل تھی جو اپنے پیروں پر کھڑی ہو۔ اپنے گھر کو سپورٹ کر سکے۔ مگر میں بتا چکا ہوں کہ میں ان دنوں خاصی مایوس اور دل شکستہ زندگی گزار رہا تھا۔ میرے بارے میں اک عام تاثر یہ تھا کہ ضرور مجھ میں کوئی خامی ہے جو دو بیویاں مجھے لات مار چکی ہیں۔ جناب گھر' در' ہر جگہ سے میں محروم ہوں تو یہ مکافات عمل ہے۔ یقیناً" میں نے ان عورتوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے تو ان حالوں میں ہوں۔ تب بھی میں نے اک ارزاں سی کوشش کی۔

"ماشاء اللہ خاصی قابل اور باصلاحیت دختر ہیں۔ اتنی صلاحیتوں کو گھر بیٹھے تو زنگ نہیں لگنا چاہیے۔" انڈی پینڈنٹ ورکنگ لڑکی میری اولین ترجیحات میں سے ایک تھی۔ میں عام روایتی مردوں کی طرح تنگ سوچ نہ رکھتا تھا۔ میاں بیوی شانہ بشانہ مل کر کام کریں تو زندگی کی گاڑی رواں اور سہل انداز میں چلتی ہے۔ میں جس بدحالی کا شکار تھا۔ اس نے مجھے مستقبل تو کیا حال سے بھی مایوس کر رکھا تھا۔ ایسے میں ورکنگ لیڈی میری ترجیح ہی نہیں ضرورت بھی تھی مگر ان کے نزدیک یہی شق ناقابل قبول ٹھہری۔

"برخوردار نوکری کا تو نام بھی مت لو۔ ہماری بیٹی کو نوکری کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس پھر اس کے والد اور بھائی بھی نوکری کے سخت خلاف ہیں۔" انہوں نے میری رہی سہی امید بھی توڑ دی تو دل پر پتھر رکھ کر مجھے ان کی ہاں میں ہاں ملانی پڑی۔

اب اگر میں یہ بتانے بیٹھ جاتا کہ شادی کے لیے میری دلچسپی فی الحال صفر ہے۔ میرے لیے میرے اپنے مسائل زیادہ اہم ہیں۔ اور اگر ہو بھی تو میں شادی کے نام پر منہ کا ذائقہ بدلنے کا قائل نہیں.... اس وقت ہی کیا' ہمیشہ سے شادی کے لیے میرا معیار بلند تھا۔ کسی اعلا بارسوخ گھرانے تک رسائی' اک جدید لگژری لائف۔ انسانی زندگی میں اگر سو مسائل ہیں تو ننانوے پیسے کی کمی کے سبب۔ اس بات پر میرا یقین پختہ تھا۔ میں نے محترمہ کو بھی اسی خیال سے ٹٹولا تھا مگر کام کی کوئی بات بھی معلوم نہ ہو سکی تھی۔

اس دن کی کھری کھری باتوں کے بعد شاید ہی کوئی "جی دار" ہوتا جو پلٹ کے مجھ سے رابطہ کرتا یا میرا نام بھی لیتا۔ انہوں نے توبہ تلا کرتے فون بند کیا تھا اور میں نے بھی چار حرف بھیج کر ریسیور رکھا اور دوبارہ آکر سو گیا۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اگلے روز پھر ان کی کال آگئی۔ وہ سب میرے گھر آکر مجھ سے ملاقات کے خواہاں تھے۔ سب سے مراد محترمہ کا گھرانہ۔

"میرا گھر....؟" میں دل بھر کے ہنسا طنزیہ و تمسخرانہ ہنسی۔ "آنٹی میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔ میں اپنے دوست سلمان کے گھر کے اک گودام نما کمرے میں پڑا

ہوں۔ رشتے ناتے کے معاملے میں ایسی جگہ بلانا مناسب ہے کیا؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہو پھر ملاقات کی کیا سبیل ہو سکتی ہے؟"

"سیدھی سی بات ہے۔ دوسرا حل یہی ہے کہ میں آپ کے در دولت پر حاضر ہو جاؤں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر....."

مجھے لگا وہ کچھ متذبذب تھیں انہیں راہ پر لانے کے لیے مجھے اک بحث کرنی پڑی۔ میرا مقصد انہیں اپنے پاس آنے سے روکنا ہی تھیں' ان کے گھر تک جانا بھی تھا۔ بالآخر وہ آمادہ ہو ہی گئیں۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"ہاں کیوں نہیں بیٹا۔ میرا نام صفیہ خاتون ہے۔"

"آنٹی میں نے آپ کا نہیں صاحبزادی کا نام پوچھا ہے۔" میں نے ان کی عقل پر ماتم کر کے پوچھا۔

"اوہ' اچھا معاف کرنا بیٹے۔ وہ ذرا پردہ دار لڑکی ہے مگر رشتے کے معاملے میں تو مذہب میں بھی چھوٹ ہے۔ اس کا نام مائرہ ہے۔"

ان کی اس بات پر میں شیر ہو گیا۔ سو جھٹ مائرہ سے ملاقات کی فرمائش داغ دی۔ مگر انہیں تو میری بات سن کر سانپ ہی سونگھ گیا۔ کافی دیر تک وہ بولنے کے قابل نہ ہو سکیں تو مجھے کہنا پڑا۔

"کیا ہوا آنٹی میں نے کوئی نازیبا بات کہہ دی؟ اب آپ ہی نے تو کہا کہ رشتے کے معاملے میں مذہب میں بھی چھوٹ ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر مائرہ شاید نہ مانے۔ میں نے بتایا نا وہ ذرا پردہ دار قسم کی لڑکی ہے۔"

"تو انہیں سمجھائیں' اسلام نے عورت کو بھی انتخاب یا رد کا اتنا ہی اختیار دیا ہے جتنا مرد کو..... میں تو صرف اپنی گزشتہ زندگی کے حقائق ان پر منکشف کر کے ان کی ایما کا حصول چاہتا ہوں۔ پھر آپ یا آپ کی صاحبزادی مطمئن نہ ہوں تو آپ کو اختیار ہے۔"

میرے اس جملے کے بعد کسی حیل و حجت کی گنجائش نہ رہی تھی مگر وہ گومگو میں تھیں۔ پھر خلاف توقع کئی کالز آئیں۔ خاتون کے مسلسل رابطے سے مجھے اتنا یقین تو ہو ہی چکا تھا کہ ضرور میری کوئی خصوصیت انہیں بھا گئی ہے۔ سو ان کے گھر آ کر افراد خانہ سے ملنے سے قبل میں نے "صاحب معاملہ!" سے ملاقات پر اصرار جاری رکھا اور اگلی دو چار کالز میں میں نے والدہ صاحبہ کو ملاقات کے لیے راضی کر ہی لیا۔ مائرہ کو اس ملاقات پر آمادہ کرنے کے لیے محترمہ نے نہ جانے کتنی جنگیں لڑیں۔ یہ ان کا اپنا معاملہ رہا۔ میرا موقف تو یہ تھا کہ رشتہ ہونا ہو' کچھ منہ کا مزا ہی بدل جائے گا۔

اس ضمن میں بھی ان کے اپنے کچھ تحفظات تھے۔ خاتون اس معاملہ کو دیگر افراد خانہ سے خفیہ رکھنا چاہتی تھیں۔ اس لیے طے یہ پایا کہ گھر سے باہر کسی پبلک پلیس کا انتخاب کیا جائے۔ مجھے ان کا گھر دیکھنے سے کوئی خاص شغف تھا بھی نہیں۔ تاہم اک فطری تجسس اپنی جگہ موجود تھا۔ انسان کی ظاہری وضع قطع' رہن سہن اور جائے سکونت سے اس کی حیثیت کا پتا چلتا ہے۔ تاہم اس مرحلہ کو دیگر مراحل کی پہلی سیڑھی سمجھتے ہوئے میں بن ٹھن کر مقررہ وقت پر طے شدہ مقام تک جا پہنچا تھا۔ گو کہ خاتون کی منکسر المزاجی سادہ طبیعت اور شرافت کے سبب میں نے کچھ اعلا توقعات وابستہ نہ کی تھیں اور وہ میری توقعات کے عین مطابق اک واجبی سی صورت اور ڈھلتی عمر کی عام سی لڑکی ہی ثابت ہوئی۔ اگرچہ اس نے خود کو سنوارنے کے لیے خاصا اہتمام کر رکھا تھا شاید کم صورتی چھپانے کے لیے ..... مگر وہ بھی کیا جانتی تھی۔ میری ترجیحات میں شکل صورت سیرت و کردار یا عمر کا نمبر بہت بعد میں جا کر آتا تھا۔

بات ترجیحات پر آن رکی ہے تو بتاتا چلوں۔ ان کے پاس وہ اخبار بھی تھا جس میں ضرورت رشتہ کا وہ اشتہار تھا۔ جس کے نتیجے میں مائرہ اپنی والدہ کے ہمراہ پارک کے اک پرسکون گوشے میں مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھی تھی۔ میں نے اشتہار پڑھا تو میری آنکھیں چوپٹ کھل گئیں۔ وہ اشتہار کھل کر میرے ارادوں اور فطرت کو عیاں کر رہا تھا۔ اس میں کسی ایسے گھرانے سے رشتہ

مطلوب تھا جو مالی سپورٹ کے ساتھ گھر دامادی کا اعزاز بھی بخشیں یا پھر لڑکی برسر روزگار ہو میں کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ شاید اسی لیے والدہ محترمہ موصوفہ کے کسی حال میں نوکری نہ کرنے پر زور دیتی رہی تھیں۔ میں نے اپنی جھینپ مٹانے کو کہا۔

"یہ اشتہار میں نے نہیں' میرے ایک دوست توصیف نے دیا تھا مجھے تو اس کے بارے میں علم بھی نہیں ہے۔"

"آپ نے کبھی نہ کبھی تو ان سے ڈسکس کیا ہی ہو گا۔" مائرہ نے خاصا عقل مندی کا سوال کیا تھا۔ ظاہر ہے توصیف کو الہام تو نہ ہوا تھا کہ شادی کے لیے میری ترجیحات کیا ہیں۔ تاہم یہ نکتہ ایک طرح سے میرے حق میں ہی جاتا تھا۔ یقیناً" وہ گھرانا دیگر شرائط پر پورا اترتا تھا تبھی تو مجھ سے رابطہ کیا گیا۔ میں کسی خوش فہمی کا شکار نہ تھا بلکہ جن حالات سے گزر رہا تھا ان کے سبب اچھے خاصے کمپلیکس کا شکار تھا۔ میں اپنی ذاتی زندگی میں اک ناکام انسان تھا۔

دو بار کی ناکام ازدواجی زندگی نے مجھے توڑ پھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ بے روزگاری کے سبب میری مالی حیثیت صفر تھی۔ شاید اسی لیے بہن بھائی عزیز رشتے دار سب ایک ایک کر کے مجھ سے منہ موڑ چکے تھے۔ ان سب باتوں سے قطع نظر میرے کریڈٹ پر صرف اچھی شکل وصورت رہ جاتی تھی۔ جس میں ظاہر ہے کہ میرا اپنا کوئی کمال نہ تھا۔ دیکھا جائے تو مجھے اب حیل و حجت کا بھی حق نہ تھا۔ اپنی حریص فطرت کے سبب میں دو بار ٹھوکر کھا چکا تھا تو ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مائرہ کو جو ہے اور جیسی ہے کی بنیاد پر قبول کر لیا جائے کہ میری شادی ہو جانا بھی اک کمال ہی رہتا..... میں ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھتے ہوئے خود کو سدھارنے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرتا مگر برا ہو اس فطرت کا کہ میری نظریں صرف اسٹیٹس کو کھنگالتیں حیثیت پر جمتیں اور ہر کسی سے فائدہ حاصل کرنے کے مواقع ڈھونڈتیں۔

اس بار بھی میں نے باتوں ہی باتوں میں ان کے ذرائع آمدنی کھنگالے تھے اور یہ جان کر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا کہ مائرہ دو کماؤ بھائیوں کی بہن تھی۔ والد صاحب اک عرصہ ملک سے باہر گزار کر آئے تھے میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ یعنی مزے ہی مزے تھے۔ اب ضرورت اس امر کی تھی کہ میرا ناکارہ وجود بھی ان کے لیے قابل قبول ٹھہرتا جس کے لیے مجھے کافی امید ہو چلی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ مائرہ کی نظروں میں پسندیدگی تھی۔ میں نے اس کی والدہ سے کچھ دیر مائرہ سے تنہائی میں بات کرنے کی اجازت چاہی۔ جو بخوشی نصیب ہو گئی۔

"خاصی آئیڈیل شخصیت ہے آپ کی....." میں نے اس کی اپنے بارے میں رائے چاہی تو اس نے کہا۔

"اچھا تو آپ کا آئیڈیل کیا ہے؟ یا آپ کی ڈیمانڈ کیا ہے؟"

"ایجوکیشن اور پرسنالٹی۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"ہائیں!" میں حیران ہوا کہ اسٹیٹس کا کوئی ذکر ہی نہ تھا۔

"ہاں پرسنالٹی کیونکہ جو کمی مجھ میں ہے' میری اولاد میں نہ ہو۔ عورت کے رنگ و روپ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور کم صورتی اک بڑا عذاب ہے۔ آج تک میرے صفحہ زیست میں محبت کا لفظ تحریر نہ ہو سکا۔ اماں کی ہزار کوششوں سے کوئی رشتہ آ بھی جاتا ہے تو لوگ کھالی کر رد کر کے چلے جاتے ہیں۔"

میں سمجھ گیا۔ وہ اپنی عام سی شکل و صورت کے سبب اعتماد سے محروم اور کمپلیکس کا شکار ہے۔ ظاہر ہے اک سانولی سلونی' واجبی سی شکل و صورت اور ڈھلتی عمر کی لڑکی یہاں تک آ کر بری طرح سے ٹوٹ پھوٹ ہی جاتی ہے۔ شادی کے معاملے میں لوگوں کا معیار آسمانوں کو چھو رہا ہے۔ مائرہ جیسی لڑکیوں کو بار بار رد کیے جانے کا عذاب جھیلنا ہی پڑتا ہے۔ شاید اسی لیے بات سمجھوتے پر آ رکی تھی اور مجھ جیسا بے مصرف انسان بھی قابل غور تھا۔ میں اسے اپنے ماضی کا گڑبڑ گھٹالا سنانے کو بے تاب تھا جو میں نے سوچ سوچ کے ذہن میں ترتیب دیا تھا۔ لہٰذا سنبھل کر آغاز

کیا۔

"آنٹی نے آپ کو بتایا ہو گا کہ اس سے پہلے بھی میری دو شادیاں ہو چکی ہیں؟" اس نے محض اثبات میں سر ہلایا تھا "ممکن ہے آپ بھی دوسروں کی طرح اس گمان میں مبتلا ہوں کہ ضرور مجھ میں کوئی قابل ذکر خامی ہے۔ اس لیے میں آپ کو گزشتہ حالات زندگی سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔"

"میں زندگی کے ہر معاملے میں تقدیر کی حامی ہوں۔ انسانی زندگی کے سب فیصلے بہت پہلے کہیں درج ہو چکے ہوتے ہیں۔"

"وہ تو ہے مگر میں نے ہر معاملے میں قسمت سے مات کھائی ہے تو مجھے تو یہی لگتا ہے جیسے قسمت کو مجھ سے کوئی ازلی پرخاش ہے۔"

"انسان قسمت کے لکھے کو صبر شکر سے جھیلے، رب کی رضا پر توکل رکھے تو شاید کبھی کسی سے گلہ نہ کر سکے۔"

صبر، شکر، توکل، ہاہ! میں جی بھر کے بدمزا ہوا۔ یہ الفاظ تو میری لغت میں کہیں درج ہی نہ تھے۔ مگر ان معاملات میں سب کے اپنے اپنے نظریے ہوتے ہیں۔ آپ کسی سے بحث میں جیت بھی جائیں تو اس کا نظریہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ میں نے اک ٹھنڈی سانس بھر کے اپنی دونوں سابقہ بیویوں کی تصویر سامنے رکھی اس نے دونوں تصویریں دیکھ کر معصومیت سے کہا تھا۔ "خاصی بے جوڑ شادیاں ہیں بلکہ آپ کی دوسری مسز تو آپ سے عمر میں بڑی بھی نظر آ رہی ہیں۔"

میں دل ہی دل میں ہنسا۔ اسے کیسے بتاتا کہ جوڑ توڑ شکل و صورت کی میرے نزدیک ثانوی حیثیت ہے۔ میں تو بس اسٹیٹس پر نظر رکھتا ہوں۔ میری دوسری سابقہ بیوی رئیسہ سے شادی کے وقت اس کے گھر والوں نے اس کی عمر اٹھائیس سال بتائی تھی جو ظاہر ہے کہ جھوٹ تھا۔ میں نے بھی اس وقت تک کی عمر میں گھاس تو نہ کھودی تھی۔ معمولی شکل و صورت اور بھاری تن و توش کے ساتھ رئیسہ کی عمر کسی بھی طرح چالیس سال سے کم نظر نہ آتی تھی۔ مگر اس وقت میرے لیے یہ بات زیادہ اہم تھی کہ رئیسہ بینک میں اعلا عہدے پر فائز ہے اور اس کی ماہانہ آمدنی پچاس ہزار روپے سے اوپر ہے۔ یہ اور بات کہ بہت آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ مجھ جیسے ناکارہ و نکمے آدمی کے لیے نوکری پیشہ عورت سرکش ثابت ہوتی ہے اور یہ میرا دوسرا تجربہ تھا۔

رئیسہ بھی میرے لیے عائشہ کی طرح نک چڑھی اور بددماغ ثابت ہوئی۔ وہ نا صرف بگڑی ہوئی بدزبان تھی بلکہ اسے اپنے عہدے کا غرور بھی تھا۔ وہ والدین کی لاڈلی تھی یا شاید کماؤ ہونے کے ناتے اسے ناز نخرے اٹھوانے کی عادت پڑ گئی تھی۔ اسی لیے شوہر کو بھی جوتے کی نوک پر رکھنے کی خواہاں تھی بات یہیں تک رہتی تب بھی ٹھیک تھا کہ دودھ دینے والی بکری کی دو چار لاتیں سہہ جانے میں مجھے بھی کوئی عار نہ تھا۔ یہ اس سے بہتر تھا کہ انسان دنیا کی ذلت اور خواری اٹھائے مگر رئیسہ گرہ کی بھی بڑی مضبوط نکلی۔ میرا خیال تھا کہ اعلا جاب کے طفیل اس کا اچھا خاصا بینک بیلنس ہو گا۔ مگر اس کا بینک بیلنس جوڑ توڑ جمع جتھا۔ یہاں تک کہ وفائیں بھی سب اس کے گھر والوں کے لیے تھیں۔ مجھ سے شادی تو بس خانہ پری تھی میں گھر داماد تھا اور چند ہی دنوں میں مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ رئیسہ کی حیثیت گھر میں ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے۔ اس کی کمائی پر سارا کنبہ پلتا ہے۔ دیگر اولادوں میں بیٹیاں رئیسہ کی کمائی پر بیاہی گئی تھیں اور بیٹے بھی اپنے کنبے کا بوجھ ڈھونے کے لیے رئیسہ کے آگے ہاتھ پھیلاتے تھے اور والدین تو اس کے دست نگر تھے ہی۔ رئیسہ کا بیاہ رچا کر انہیں صرف دنیا کی نظر میں سرخروئی حاصل کرنی تھی جس کے لیے مجھ جیسا "بکرا" نہایت آسانی سے کام میں آ گیا تھا۔ لاکھ وہ تن و توش اور رنگ و روپ میں بھینس کو شرماتی ہو اور دیکھنے میں میری اماں نظر آتی ہو... مگر میں کہہ چکا ہوں کہ میری ترجیحات میں اسٹیٹس صف اول پر رہتا ہے۔

میرا خیال تھا کہ معیار کی مارکیٹ میں رئیسہ کی قیمت گر چکی ہے۔ بھاری تن و توش کی مالک سیاہ فام بیٹی والدین کے سینے پر دھری سل کی مانند ہو گی۔ جس کے سرکنے پر انہیں سکھ کی سانس نصیب ہو گی اور یہ کہ احسان مندی اور شکرانے کے طور پر وہ میرے پیر دھو دھو کر پئیں گے مگر باجی...!

میں تو بھول ہی گیا تھا کہ بہن کے گھر بھائی اور ساس کے گھر جوائی کیا ہوتا ہے۔ وہ بھی اس صورت میں جب وہ روٹیوں کے لیے بھی سسرال اور بیوی کے آسرے پر ہو... بعد ازاں رئیسہ کی جان مجھ سے چھڑانے میں بھی ساس صاحبہ کا ہی اہم کردار رہا تھا۔ رئیسہ کھاتی تو اماں کے ساتھ... سوتی تو اماں کے ساتھ... جاتی تو اماں کے ساتھ... میری حقیقت تو کسی فالتو پرزے کی سی تھی۔ جسے اک کونے میں ڈال کر وہ سب بھول گئے تھے۔ آفس آورز میں بھی وہ موبائل کے توسط سے اک دوسرے سے رابطے میں رہتیں۔ ماں سے ایسا لطف و التفات کبھی دیکھا نہ سنا۔ معاملہ میرے جذبات کے خون ہونے کا نہ ہوتا تو میں جھیلتا رہتا۔ کہانی میں موڑ تو تب آیا جب میں رئیسہ نے اس کے وطیروں پر بازپرس پر اتر آیا اور گویا طبل جنگ بج اٹھا اور کام میں آیا میرا ناکارہ و نکما پن۔ میں جو اب تک رئیسہ کا بینک بیلنس اینٹھنے کے لیے کسی کاروبار کے آسرے پر تھا اور یہ [illegible] کہ کبھی نہ کبھی تو اسے راہ پر لے ہی آؤں گا مگر باجی! یہ عقدہ تو بہت بعد میں جا کر کھلا کہ انہوں نے عائشہ تک رسائی حاصل کر کے اس سے گٹھ جوڑ کر لی تھی۔ اور اب غیر اہم باتیں بھی اہم ہو چلی تھیں۔

"آپ نے ہمیں بتایا کب تھا کہ آپ پہلے سے شادی شدہ ہیں۔" ان کی ماں نے طوطے کی طرح نگاہ پھیر کر کہا تھا۔ میں فٹبال اچھلا کیونکہ بدزبانی میرا وصف تھی سو دوبدو پر اتر آیا۔ "دماغ درست ہے آپ کا... بھول گئیں کہ میرا طلاق نامہ ملاحظہ فرمایا تھا۔ اس یقین کے تحت کہ آپ کی بیٹی کی چھاتی پر سوت دعوے دار بن کر نہ آ بیٹھے؟"

"میری بیٹی مجھ پر بوجھ نہیں ہے بوجھ تو تم ہو۔ سارا دن پڑ کر سوتے رہتے ہو کھانے پر آ کر ٹوٹ کر کھاتے ہو۔"

"آپ بھول گئیں کہ آپ ہی نے کہا تھا رئیسہ کی اپنی اتنی انکم ہے کہ مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تو پھر اپنی اوقات میں رہو اور ہمارے معاملات میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔" میں اگر رئیسہ کی کمائی کے رعب میں نہ ہوتا تو اتنا ضرور کہتا کہ وہ کون سی عاقبت نااندیش ماں ہو گی جو شادی کے بعد بھی بیٹی پر اپنا تسلط جمائے رکھے گی۔ رئیسہ ماں کی حامی تھی اور مجھے اس اعتراف میں کوئی عار نہیں کہ اس نے مجھے تگنی کا ناچ نچایا۔

اور بات آخر کار طلاق پر آ کر ٹھہری۔ ہمارے درمیان اختلاف پیدا کرنے والی بھی اماں تھیں اور طلاق کے لیے بھی وہی حمایتی بن کے سب سے پہلے میدان میں کودیں۔

"یوں کہیے، آپ کو اپنے بڑھاپے کا سہارا درکار ہے۔ شادی کا تو بس نام کرنا تھا تاکہ دنیا کے جوتے..." میری زبان کی تیزی سے بھلا کون بچ سکا ہے وہ بلبلا اٹھیں۔ بات پہنچی عدالت تک... اور اس وقت میری جیب کہاں اجازت دیتی تھی کہ پیشیاں بھگتتا پھرتا۔ میں کچھوے کی طرح خول میں منہ چھپائے پڑا رہا۔ بالآخر رئیسہ عدالت سے یک طرفہ خلع کا فیصلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اگرچہ میں نے مصالحت کی بھی کوشش کی مگر ماں سے بدزبانی نے رئیسہ کو بھڑکا کے رکھ دیا تھا۔

"جب کما کے بھی مجھے ہی کھلانا ہے تو تمہیں کیا میں نے شکل دیکھنے کے لیے پال رکھا ہے؟" یہ جملہ تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا قصہ مختصر یہ کہ میں نے رئیسہ سے بھی خلاصی پائی یا پھر اس نے مجھ سے... بات تو برابر تھی کیونکہ میں ایک بار پھر روڈ پر آ گیا تھا۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس بار خسارہ جھیل کر میں اپنی ترجیحات میں تبدیلی یا نرمی ہی کر لیتا مگر بات گھوم پھر کر وہیں آ جاتی کہ پیسہ میرے نزدیک اہم ترین زندگی

موت کا معاملہ تھا اور خوشحال زندگی کا اہم تقاضا بھی۔

لیجیے میں بات کر رہا تھا مائرہ سے پہلی ملاقات کی اور بات کہیں اور ہی نکل گئی۔۔۔ ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ مائرہ نے بھی پہلی ہی ملاقات میں والدہ محترمہ کی طرح مجھے جتانا فرض سمجھا تھا کہ وہ جاب نہیں کرے گی۔۔۔ میں نے بظاہر اس کی ہاں میں ہاں ملائی مگر دل ہی دل میں سخت بددل ہوا۔ میں اپنے حال اور مستقبل سے اتنا مایوس تھا کہ خود سے کوئی بھی توقع چھوڑ ہی دی تھی۔ ایسے میں میری نظریں اشتہار کے مطابق ملازمت پیشہ لڑکی یا سپورٹنگ فیملی پر ٹکیں اور یہی شق ان کے لیے ناقابل قبول ٹھہری مگر خیر۔۔۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی مالی حیثیت امید افزا تھی۔ میری امیدوں کا ماہتاب پوری آب و تاب سے دمک رہا تھا۔

یہ ملاقات خاصی نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ جس کے اختتام پر سند قبولیت اور گھر کا ایڈریس دونوں نصیب ہو چکے تھے اور میں نے بھی اگلے روز حاضری کا وعدہ کر لیا۔

نا صرف یہ بلکہ اگلے ہی روز در خانہ پر جا پہنچا اب تک میرا ذہن اس امکان پر غور کرتا رہا تھا کہ محلے کا سب سے بڑھیا اور اونچا مکان وہی ہو گا۔ مائرہ دو کماؤ بھائیوں کی بہن تھی۔ عرصہ تک باہر کی کمائی کا ہن برستا رہا تھا۔ اتنی قابلیت و اہلیت پر بھی وہ نوکری کرنے کے حق میں نہ تھی تو اس کا مطلب یہی بنتا تھا کہ گھرانا کھاتا پیتا اور مکان خاصا اونچا ہو گا مگر میری تمام امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ متوسط علاقے میں خاصے قلیل رقبے پر وہ اک عام سا گھر تھا۔ اندر آ کر چھوٹے سے بیٹھک نما کمرے میں آ کر بیٹھنے تک میں خاصا بددل ہو چکا تھا۔ اک نگاہ میں سارے گھر کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔

اس بار سابقہ مائرہ کے والد محترم سے پڑا تھا۔ بمبئی کٹ پاجامہ، اونچا کرتا پہنے وہ خاصے شریف النفس، مہذب اور منکسر المزاج نظر آتے تھے۔ خاصی تفصیلی گفتگو میں خصوصاً "میری شادیوں کو کھنگالا اور مجھے تو بہانہ درکار رہتا تھا۔ اپنے اندر کے غبار کو یوں تک لانے کا۔۔۔

"میاں صاحبزادے سنا ہے دو شادیاں بھگتائی ہیں۔ کتنا عرصہ شادیاں برقرار رہیں۔۔۔"

"جی پہلی شادی تقریباً" پانچ سال۔۔۔ اور دوسری گیارہ ماہ۔"

"گزشتہ شادیوں سے کوئی آل اولاد۔۔۔؟" انہوں نے موٹے عدسوں کی عینک تلے مجھے گھورا تو میرا جواب انکار میں تھا۔ "حیرت ہے اک شادی پانچ سال اور دوسری گیارہ ماہ رہی اور اولاد کوئی نہیں۔۔۔؟"

ان کا سوال بجا تھا۔ اگر رئیسہ پر چار حرف بھیج دیے جائیں تو بھی پانچ سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔۔۔ عائشہ سے میری شادی پانچ سال اور کچھ ماہ برقرار رہی تھی اب میں انہیں یہ تو بتانے سے رہا کہ میں بارہا عائشہ کو زیر کرنے کے لیے ترپ چال چلتا رہا تھا کہ یہ عمل شاید اس کے پیروں میں زنجیر ڈال دے یا سدھار کا باعث بن جائے مگر وہ ہر بار میری حکمت عملی پر پانی پھیرتے ہوئے ننھی معصوم کلیوں کو کھلنے سے پہلے مسلتی اور الزام میرے ناکارہ پن کے سر دھرتی رہی تھی۔ یہ عقدہ تو بہت بعد میں جا کر کھلا کہ اس کی توجہ اور دلچسپی کا محور و مرکز میرا گھر یا میری ذات نہیں تھی۔ اس کے دل میں روز اول سے اپنی سابقہ محبت کا دیا جل رہا تھا۔ تو وہ میرے بچوں کی علت کاہے کو پالتی۔۔۔ مگر یہ نکتہ چونکہ میرے مخالف جاتا تھا۔ ناچار مجھے اس ضمن میں چند حقائق سے آگاہ کرنا پڑا۔ وہ لاحول پڑھتے رہ گئے۔ میں اپنا ماضی کرید کر خود کو مظلوم ثابت کرنے کی ساری تیاری میں تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے خصائل نفی کر کے تمام حالات گوش گزار کیے تھے اور مزے کی بات یہ کہ انہوں نے یقین بھی کر لیا۔

"کیسا زمانہ آ گیا ہے!" بزرگوار نے کہا "پہلے طلاق انتہائی قبیح اور معیوب فعل سمجھا جاتا تھا۔ اب عورتوں کی بے جا آزادی، بے پردگی اور بے حیائی کے سبب کھیل مذاق بن کر رہ گیا ہے۔"

وہ مجھ سے لمبی چوڑی امیدیں وابستہ نہ کیے بیٹھے ہوں، اسی خیال کے تحت میں نے اچھی طرح ان پر

اپنی حیثیت واضح کردی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر مجھ میں ایسی کیا خوبی تھی جو ان کو بھا گئی تھی اور وہ ہر الزام سے بری الذمہ قرار دے کر ہر حال میں مجھ سے رشتہ جوڑنے پر کمربستہ تھے۔ میرے اس سوال کا جواب ان کی اگلی بات میں تھا۔

"ہمارے نزدیک ہم قوم اور اعلا نسب ہونا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اصل سے خطا نہیں کم نسل سے وفا نہیں۔ تم ہم قوم ہو' اعلا نسب ہو۔ ہمیں اور کیا درکار ہے۔ رہا روزگار تو وہ بھی ضرور مل جائے گا۔ روزگار ہی دیگر مسائل کا حل بھی ہے۔" وہ نیاز مندی سے کہہ کر مغرب کے لیے وضو کرنے چلے گئے۔

مجھے خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ مادہ و طمع پرستی کے اس دور میں ایسے بھی لوگ تھے جو نام و نسب کو اہمیت دیتے تھے۔ اسٹیٹس کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی' میرا اسٹیٹس ہی صفر نہ تھا دیگر حالات بھی میری مخالفت میں جاتے تھے۔ میں نے ایک نظر میں بھانپ لیا۔ گھرانا نیک اطوار' شریف النفس اور سفید پوش تھا اور وہ جو میرا خیال تھا۔ مائرہ دو کماؤ بھائیوں کی بہن ہے۔ والد اک عرصہ ملک سے باہر گزار کر آئے ہیں سو ہن چھما چھم برستا ہوگا سب خاک میں مل گیا۔

بزرگوار دمے کے مریض تھے۔ مائرہ کے بڑے بھائی شادی شدہ تھے جنہوں نے اپنی دنیا گھر کے اوپری پورشن میں بسائی ہوئی تھی۔ اس معاملے سے ان کا انداز لیا دیا سا ہی رہا۔ جیسے موقع پاتے ہی رسے تڑا کر بھاگنے کی فکر میں ہو اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ چھوٹا بھائی زیر تعلیم تھا اور اپنی تنخواہ اپنی تعلیم و دیگر اخراجات میں صرف کیا کرتا تھا اور ایک چھوٹی نوعمر بہن تھی جو میری توقع کے عین مطابق مائرہ کی طرح پروے کی پوبو نکلی خیر۔۔۔ مجھے اس کے دیدار سے کوئی خاص شغف بھی نہ تھا۔

ایک ہی ملاقات نے مجھ پر اس گھر کے حالات منکشف کر دیے تھے۔ سو میری ایک ایک امید مٹی میں مل گئی۔ اور میں جو کوئی لمبا ہاتھ مارنے کے چکر میں رہتا تھا سخت بددل ہوا۔ مگر شادی تو میں نے کرنی ہی تھی۔ اس لیے نہیں کہ مجھے وہ گھرانا یا مائرہ بھا گئی تھی۔ بلکہ اس لیے کہ کوئی اور گھرانا مجھے قبول کرنے پر تیار جو نہ تھا۔ میری سابقہ بیویاں جن کی میں اپنی متجسس فطرت کی بنا پر ٹوہ رکھتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اپنی اپنی زندگیوں میں خوش و مطمئن تھیں۔ عائشہ نے تو خیر مجھ سے طلاق ہی اپنے محبوب سے شادی کی خاطر لی تھی اور شادی کے کچھ عرصہ بعد میرے رقیب روسیاہ کے ہمراہ لندن جا بسی تھی۔ رئیسہ کا بھی تذکرہ ہی کیا۔۔۔ میں بتا ہی چکا ہوں کہ یہ شادی بس اک خانہ پری تھی سو وہ اپنے حال میں مطمئن تھی۔ ایسے میں میری ناکام زندگی اور لنڈورا پھرنا باعث شرم ہی تو تھا۔ مائرہ کا گھرانا میری دو ٹکے کی اہمیت و حیثیت سمیت مجھے سند قبولیت بخشنے کو تیار تھا تو یہ ان کی کم فہمی و بدبختی تھی۔ میرا تو بھلا ہی بھلا تھا۔

بزرگوار مغرب کی ادائیگی کے بعد لوٹ کر آئے تو دستر خوان سج گیا۔ عام سادہ مگر خوش ذائقہ کھانا۔۔۔ میرے لیے یوں غنیمت تھا کہ میں نے بہت عرصہ بعد گھر کے کھانے کا ذائقہ چکھا تھا ورنہ عموماً" میرا گزارا نچلے اور گھٹیا درجے کے ہوٹلوں سے ہوتا۔ یہاں تک کہ جیب زیادہ ہلکی ہوتی تو میں صرف چائے پاپوں پر گزارا کیا کرتا۔ اس کا حل میں نے یوں نکالا تھا کہ دن تو کسی نہ کسی طرح کاٹ ہی لیتا۔ شام میں اکثر کسی دوست یا دور پار کے رشتے دار کے گھر نکل جاتا۔ باتوں کے دوران کھانے کا وقت بھی ہو ہی جاتا تھا مگر یہ معمول زیادہ عرصہ برقرار نہ رہا۔ رفتہ رفتہ سب کی آنکھیں بدلنے لگیں۔ شاید وہ سب میری نیت کو پا گئے تھے۔ حالانکہ میں ترتیب ایسی رکھتا کہ ایک بار جس کے گھر طعام کرتا دوبارہ اس کی باری تقریباً" ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ بعد ہی آتی۔۔۔ کہ میرے دوستوں کی تعداد خاصی کثیر تھی۔ مگر یونہی تو نہیں کہا گیا کہ برے وقت میں سایا بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے میں بدبخت تھا یا خطاکار نتیجہ تو یکساں ہی تھا کہ میں برباد رہا۔ شاید میں بار بار تلخ ہو جاتا ہوں۔ یہ تلخی ان پے در پے ناکامیوں کا نتیجہ ہے جنہوں نے میرے حال کو تباہ کر کے مجھے بدحال کر دیا ہے۔

ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا مدارات کا۔۔۔ عرصہ بعد خاتون خانہ کا بنا گھر کا لذیذ کھانا نصیب ہوا سو میں نے ڈٹ کے کھایا۔ ایک ایک چیز پر ہاتھ صاف کیا۔ اس دوران بزرگوار اپنی صاحبزادی کے سلیقہ و ہنر مندی باپردگی اور خوب سیرتی کے قصیدے پڑھتے رہے اور میں دل ہی دل میں ہنستا رہا کہ میں ان کی باپردہ بیٹی کے دیدار سے مستفیض بھی ہو چکا تھا انہیں خبر ہی نہ تھی۔ وہ صاحبزادی کی تعریف میں رطب اللسان رہے کہ مائرہ کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔ گھر کے تمام افراد اس ذائقے کے گرویدہ ہیں وغیرہ وغیرہ شاید وہ اپنی عام سی صاحبزادی سے مجھے مرعوب کرنا چاہتے تھے۔ میں ناچار سر دھنتا رہا اگرچہ اندر ہی اندر چڑ رہا تھا۔۔۔

نہ جانے کیوں عورتیں مردوں کا دل جیتنے کے لیے اپنا سارا زور لگا دیتی ہیں۔ بھلا جو کام معمولی معاوضے پر ملازمائیں کر سکتی ہیں۔ اس کے لیے خاتون خانہ کو اپنی جان کھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں تک کہ مرد کے دل تک کا راستہ بھی معدے کو قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایک دقیانوسی اور مڈل کلاس سوچ ہے۔ میری نظر سے اپر کلاس کی ہزار عورتیں گزری ہیں۔ جو امور خانہ داری کی ابجد سے ناواقف ہونے کے باوجود شوہر کے دل پر راج کرتی ہیں۔۔۔ خیر یہ اک الگ موضوع ہے۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ اس دوران مائرہ کا چھوٹا بھائی آکر کچھ دیر بیٹھا اور پڑھائی کا عذر تراش کر جلد ہی اٹھ گیا۔ بزرگوار سیاست کے رسیا تھے۔ گھنٹہ بھر سیاست کے بخیے ادھیڑتے میرا دماغ چاٹتے رہے۔ میں ان کی خشک باتوں پر جی بھر کے بدمزا ہوتا رہا۔ ان کی صاحبزادی ایسی کوئی چندے آفتاب چندے ماہتاب نہ تھیں کہ میری نگاہیں متلاشی رہتیں ناچار سنتا رہا۔ مگر یہ ملاقات اچھی طرح واضح کر گئی تھی کہ لوگ مخلص و مہمان نواز تھے شریف و بامروت مگر ان اوصاف کی میرے نزدیک اہمیت ہی کیا تھی۔ اب تک مجھے اتنا تو اندازہ ہو ہی گیا تھا کہ مائرہ کی گزرتی عمر اور واجبی سی شکل و صورت اور رشتوں کی عدم دستیابی کے سبب ان کے معیار کا گراف گر چکا ہے اور اب وہ کسی صورت مجھ جیسا اعلا رشتہ چھوڑنا نہیں چاہتے۔ سو یہ ملاقات گویا فائنل فیصلے کا محرک ہی بن گئی جس کے بعد مائرہ سے روابط بھی بڑھے اور معاملہ موبائل کے ذریعے پیغامات تک جا پہنچا اور شاید یہیں سے خرابی کا آغاز ہوا۔ ہر روز علی الصبح اس کا مارننگ میسج آتا۔ میں جواباً" کبھی فارورڈ ایس ایم ایس بھیج دیتا کبھی نپا تلا سا جواب۔ "صبح بخیر اچھی لڑکی"

"مجھے اچھی لڑکی نہ کہا کریں۔" اک روز اس نے جواب لکھا۔

"اچھی لڑکیاں کسی پر بوجھ نہیں ہوتیں۔"

مجھے اس کے حالات تک رسائی حاصل کرنے میں دشواری نہ ہوئی۔ وہی خوابوں کی دنیا میں رہنے والی آئیڈیل پرست لڑکیوں کا المیہ۔۔۔ جو حالات کے ہاتھوں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں۔ وہ بار بار تلخ ہو جاتی تھی تو شاید انہی حالات کے طفیل۔۔۔ یہیں آکر میرا اختلاف ہوتا ہے۔ لڑکیوں کے والدین اور معاشرے کا ہر فرد ان کے دل میں یہ بات بٹھا دیتے ہیں کہ صرف شادی ہی ان کی منزل بلکہ مقصد حیات ہے ورنہ زندگی ناکارہ و ناکام ہے۔ مائرہ جیسی عام سی لڑکیاں مات کھاتی ہیں تو ٹوٹ جاتی ہیں۔ ان کی ترقی کا سفر رک جاتا ہے۔ وہ احساس کمتری کا شکار ہو کر منہ چھپانے لگتی ہیں حالانکہ یہ سب تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں۔ شادی جس وقت اور جس سے درج ہے وہ اپنے وقت پر ہوگی۔ اس کو منزل مقصود بنا کر مستقبل اور حال کی قربانی دینا میرے نزدیک حماقت ہے۔ کچھ ایسی ہی حماقت کا شکار وہ گھرانا تھا۔ جو اب مجھ جیسا رشتہ پا کر قدرے مطمئن نظر آتا تھا۔ جیسے مائرہ کی اب تک کی عمر میرے ہی انتظار میں گزری تھی۔ میرے نام و نسب کے حوالے سے پہلی بار مجھے کچھ ملنے لگا تھا۔ ورنہ اب تک تو یہ نام و نسب میرے لیے بے معنی ہی رہا تھا۔ اگرچہ میں خاصا ناامید ہوا تھا ماضی کے تلخ تجربوں کے باوجود اب تک ہر تگ و دو سے ہاتھ جھاڑ کر تھالی میں پیش کی جانے والی کسی نعمت غیر مترقبہ کے انتظار میں تھا۔

مگر اس وقت میں معاشی طور پر اتنا تنگ دست تھا اگر ان سب کی امیدوں اور میری دوڑ دھوپ کے نتیجے میں مجھے جاب مل بھی جاتی تو کافی وقت لگتا مجھے سیٹل ہونے میں۔۔۔

میں نے ادھر ادھر کئی جگہ سے قرضے لے رکھے تھے۔ قرضدار گاہے بگاہے مجھے یاددہانی کرواتے رہتے میں کئی معاملات میں اپنے دوست سلمان کا دست نگر تھا۔ ہوٹلز پان سگریٹ کے کھوکھے والوں کے کھاتے میں میرا نام تھا غرض اک عرصہ لگتا مجھے سنبھلنے میں اور شادی کا نمبر تو بہت بعد میں آتا تھا۔ اس کے لیے بھی میں کسی گولڈن چانس کی تاک میں رہتا تھا۔ مائرہ کا گھرانا میرے معیار سے کوسوں دور تھا۔ میں اگر انکار کی پوزیشن میں ہوتا تو ضرور انکار کر دیتا۔ مگر یہ وہ وقت تھا جب دنیا کا ہر رشتہ مجھے ٹھکرا چکا تھا۔ میری مالی زبوں حالی اور پے در پے ازدواجی زندگی میں ناکامی کے بعد معاشرے کو منہ دکھانے کے لیے بھی شادی میری ضرورت بن گئی تھی۔ ایسے میں وہ گھرانہ میرے لیے غنیمت تھا کہ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہرحال بہتر ہوتا ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ وہ کنجوس لوگ ہیں کچھ پیسے والے لوگ پیسے کو دبا کے رکھتے ہیں بلکہ وہ پیسے والے ہوتے ہی اس لیے ہیں کہ ظاہری بناوٹ و سجاوٹ یا پھر کھانے پینے میں پیسہ اڑانے کے بجائے پس انداز کرتے ہیں مگر میرا یہ خیال بھی خام ثابت ہوا۔ جب ایک بار فرصت سے بزرگوار کو کھنگالا۔

"آپ کے ذرائع آمدنی خاصے محدود سے نظر آتے ہیں کیا آپ اپنی مالی پوزیشن سے مطمئن ہیں؟"

"بالکل۔" انہوں نے شدومد سے سر ہلایا۔ "بفضل تعالیٰ۔ گھر کی چھت اپنی ہے۔ اوپر پورشن میں بڑا بیٹا رہائش پذیر ہے نچلا حصہ چھوٹے بیٹے کے نام کر رکھا ہے۔ ہم میاں بیوی کا کیا ہے آج مرے کل دوسرا دن۔ بیٹیاں اپنے گھر کی ہو جائیں تو ان شاء اللہ حج کا ارادہ ہے۔" میں لہو کے گھونٹ بھر کے رہ گیا تاہم مزید کریدا۔

"خیر مکانات نہ سہی میرے ابا زمینیں خریدنے کے شوقین تھے۔ کافی عرصہ پراپرٹی ادھر ادھر کر کے منافع بھی کمایا۔ ان کا خیال تھا کہ جائیداد و املاک ہی برے وقت میں کام آتی ہے۔"

"وہ تو ہے مگر میرے نزدیک زمین جائیداد فساد کی جڑ ہے۔ میں تو ضرورت کے مطابق املاک بنانے کا قائل ہوں۔ بیٹے یوں تو واسطہ نہیں رکھتے مگر اپنے حصے سے انکار تھوڑی کریں گے۔"

"بجا فرمایا زمین و جائیداد وجہ تنازع ہی ہیں۔ اس سے تو لاکھ درجہ بہتر ہے کہ بینک بیلنس رکھ لیا جائے بھلے وقتوں میں فکسڈ ڈپازٹ کی شکل میں محفوظ کر لیا جائے۔"

"بالکل' اللہ اگر دے تو بینک بیلنس ضرور رکھنا چاہیے۔ مگر یہ فکس ڈپازٹ وغیرہ کا میں قائل نہیں۔ سود خوری کا اگر نام بدل دیا جائے تو وہ جائز نہیں ہو جاتی۔ سچ کہوں تو میاں ہمارے پاس نہ زمین و جائیداد ہے نہ بینک بیلنس اور نہ ہی کوئی جمع جوڑ۔ ہم تو بیٹیوں کو بھی تین کپڑوں میں رخصت کریں گے۔ صد شکر کہ پروردگار نے سر چھپانے کا ٹھکانہ دے رکھا ہے اور عزت سے دال روٹی چل رہی ہے جو زمین جائیداد بناتے ہیں ان کا بھی آخری مسکن ڈیڑھ گز زمین ہی ہے

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا
جب لاد چلے گا بنجارہ

میں سر پیٹ کر رہ گیا۔ یہ بھی خوب رہی اس تصنع اور بناوٹ کے دور میں لوگ اپنا سارا زور خود کو اہل ثابت کرنے میں لگا دیتے ہیں' ان کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔

"ارے ہاں یاد آیا تمہارے دیے گئے اشتہار میں مالی سپورٹ کا ذکر تھا۔ بھئی پیسہ ہوتا تو تم سے بڑھ کر نہ تھا۔ میرا تو کل اثاثہ یہی اک گھر ہے۔ جو میرے بعد میری اولاد کا ہے۔ شرعی اعتبار سے جس کا جو حق بنتا ہے ملے گا۔ بیٹیاں بیاہ کر اپنے گھروں کو جائیں گی۔ تو ہم سکون سے حج کو جائیں گے۔ تم ہم قوم و ہم نسل ہو اور ہمارے لیے بس یہی کافی ہے۔"

یہیں آکر مجھے اچنبھا ہوتا۔ یہ وقت جو کھنکتے سکوں کی جھلملاہٹوں کا وقت تھا۔ ان کے نزدیک اسٹیٹس کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ وہ مجھے اس وقت سند قبولیت بخشنے کو تیار تھے جب تقریباً" تمام ہی حالات میرے مخالف جاتے تھے۔ میرا نہ گھر تھا نہ در' نہ روزگار نہ کوئی مورل سپورٹ۔ یہاں تک کہ میرے ماضی سے انہیں واجبی سی دلچسپی تھی اور اس ضمن میں' میں نے انہیں جو کہانی سنائی تھی انہوں نے بسروچشم یقین کر لیا تھا۔ شاید یہ کسی بھی انسان کے اچھے سچے اور کھرے ہونے کی سند ہوتی ہے مگر میرے نزدیک شرافت و سچائی جیسی لغویات کیا بیچتی تھیں۔ بات تلخ سہی مگر سچ ہے کہ محبت و وفا کی کوئی قیمت نہیں رہی۔ انسان کی ترجیحات بلند ہیں شاید اسی لیے وہ تنہا ہے۔ لیجیے میں پھر بھٹک گیا۔

ہاں تو میں تیار تھا کہ اس فائنل ملاقات کے بعد مائرہ سے راہ و رسم کی داغ بیل پڑی۔ نا صرف پیغامات کا سلسلہ جاری ہوا بلکہ آنے جانے کا رستہ بھی صاف ہوا لہٰذا بات اک طرح سے طے تھی۔ وہ میرے بہن بھائیوں سے ملنے کے خواہاں تھے تاکہ اب باقاعدہ رسم کا اہتمام ہو۔ اب یہ تو میں ہی جانتا تھا کہ میرے اور بہن بھائیوں کے مابین سفارتی تعلقات اس قابل کہاں تھے کہ منظر عام پر لائے جاسکیں۔ وہ سب اگر میری زندگی میں مداخلت کے قائل ہوتے تو شاید میں اتنا خانماں برباد نہ ہوتا۔ لہٰذا اس مد میں بھی میں نے انہیں چند آسرے پکڑا دینے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا۔ کیونکہ یہ بعد کی باتیں تھیں ان سب کے ارادوں اور امیدوں نے مجھے کمک فراہم کی تھی۔ لہٰذا اب میں اکثر و بیشتر متوقع سسرال میں قدم رنجہ فرمانے لگا۔ وہ سب بھی دیدہ و دل فرش راہ کیے ملتے

والدہ صاحبہ خصوصی محبت و شفقت سے پیش آتیں۔ بزرگوار مجھے کھانا کھائے بغیر نہ آنے دیتے۔ نا صرف یہ بلکہ میری تواضع میں خوب اہتمام بھی کیا جاتا۔ مجھے اور کیا درکار تھا میں بے شرمی سے کھا پی کر ڈکار لیتا اور اپنی راہ لیتا۔ میرا گھر ہی نہ تھا جو میں بھی جواباً" انہیں بھی مدعو کرتا۔۔۔ بات ہو رہی تھی محبت کی۔۔۔ ایک تو میں اس محبت کے خلاف ہوں۔ دنیا میں کتنے لوگ اس محبت کے پیچھے برباد ہوتے ہیں۔ محبت تو بس وقتی احساسات و جذبات کا کھیل ہے۔ انسان کو پریکٹیکل ہو کے سوچنا چاہیے۔ لوگ دنیا سے لڑ جھگڑ کر ایک دوسرے کو اپنا لیتے ہیں۔ کچھ عرصہ لگتا ہے محبت کا نشہ اترنے میں۔۔۔ جب زندگی کے تلخ حقائق سے واسطہ پڑتا ہے۔ وہ محبت بھاپ بن کر اڑ جاتی ہے اور زندگی کی اہم ضرورت روٹی اور اس کا حصول رہ جاتا ہے۔ پھر جو کچھ عرصہ میں فنا ہو جائے وہ محبت تو نہ ہوئی نا! اس موضوع پر میرے پاس کہنے کو اور بھی بہت کچھ ہے مگر کہانی پھر بھٹک جائے گی۔

ہاں میں تو کہہ رہا تھا کہ مائرہ کو مجھ سے محبت ہو گئی تھی۔ خیر اگر وہ اس فضول جذبے کا شکار ہو ہی گئی تھی تو میرا کیا جاتا تھا۔ بلکہ میرا تو فائدہ ہی تھا وہ ہر خاص موقع کو یاد رکھتی' وش کرتی۔ چند دنوں میں میرے پاس کئی کارڈز جمع ہو گئے تھے۔ یہی نہیں۔۔۔ اک بار تو حد ہو گئی۔ اس نے کئی رنگ برنگے دھاگوں سے خوشنما تکیے کا غلاف مجھے کاڑھ کے دیا۔ اس گاؤدی لڑکی نے سن پینسٹھ کی ہیروئین کی طرح مجھے تکیہ کاڑھ کے دیا۔۔۔؟ وہ سچ مچ گاؤدی تھی۔ وہ مجھے اپنے ہاتھ کے پکے کھانے کھلا کر خوشی محسوس کرتی تھی۔ میں رسماً" بھی اٹھنے کو پر تولتا تو اس کا تنبیہی ایس ایم ایس آجاتا۔ "جانا نہیں میں فلاں چیز پکا رہی ہوں۔" مجھے بھلا اور کیا درکار تھا بلکہ اب تو اکثر میں خود بھی کوئی فرمائش داغ دیا کرتا تھا۔

میں بزرگوار سے گپ شپ کرنے بیٹھ جاتا۔ جن کی گفتگو کا محور و مرکز صرف ملکی سیاست رہا کرتی۔ جس سے ظاہر ہے کہ مجھے کوئی غرض نہ تھی۔ میری اپنی حالت ملکی سیاست سے بدتر تھی۔ میں اگر اپنی حالت زار پر غور فرمانے بیٹھ جاتا تو آٹھ آٹھ آنسو رونے کا مقام تھا۔ اچھی نوکری کی تلاش میں میری جوتیاں تو کیا تلوے بھی گھس گئے تھے۔ روٹیوں تک

کے لالے تھے۔ سلمان کے تیور بتاتے وہ کبھی بھی مجھے باہر کا راستہ دکھا دے گا میں کون سا کرایہ دار تھا اور تو اور بزرگوار محترم کو بھی میرے ان معاملات و مسائل کی چنداں پروا نہ تھی۔

اپنی اولاد اور خود اپنے لیے وہ مستقبل کا سارا لائحہ عمل ترتیب دیے بیٹھے تھے اور میں جوان کی اک نگاہ التفات کا منتظر تھا کہ شاید کسی روز وہ اپنے گھر کے کسی کونے کھانچے میں مجھے پڑا رہنے کا عندیہ دے دیں۔ اپنی کسی جمع جوڑ کو اپنی بیٹی کے روشن مستقبل کی خاطر ہی سہی ہوا دکھا دیں یا کم از کم بیٹی کو کسی اعلا بڑھیا جاب کا عندیہ دے دیں تاکہ میرے بھی حالات سدھریں مگر نا! میرا دل جل کر خاک ہو جاتا جس وقت وہ فرماتے۔

"ہمارے پاس تو صرف بیٹی ہے۔" اور مجھے کمال سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہنا پڑتا کہ مجھے اور کچھ درکار بھی نہیں ہے۔

"ہمیں تو بس شرافت درکار ہے۔" وہ بار بار کہتے اور میں سوچ میں پڑ جاتا کہ کیا واقعی فی زمانہ شرافت اتنی ہی نایاب ہے کہ مجھ جیسے دو کوڑی کے آدمی کو محض اسی بنیاد پر تمام خامیوں سمیت اپنا لیا جائے۔۔۔؟ صاف ظاہر تھا کہ میں اپنی تمام تر بدنیتی پر خاک ڈال کر انہیں جو ہے جیسا ہے کی بنیاد پر قبول کر لوں۔۔۔ اب یہ تو میں ہی جانتا تھا کہ میرا گمان اب بھی کسی گولڈن چانس کی سمت سفر کرتا تھا۔ جیسے اچانک وہ کسی قارون کے خزانے کی چابی مجھے تھما کر کہیں گے "جا بیٹا عیش کر۔"

مجھے حیرت تھی کہ اک عرصہ ملک سے باہر گزار کر انہوں نے کیا کیا ہے۔۔۔ وہ میرے اپنے ابا کی طرح عیش پرست بھی نظر نہ آتے تھے کہ جو کمایا عیش و عشرت میں اڑایا۔ اولاد دوسروں کے در پر پڑی سسکتی رہی ٹھوکریں کھاتی رہی۔ ان کا طرز زندگی سادہ تھا تو ظاہر تھا کہ وہ اپنی جمع جوڑ کو ہوا دکھانے کے قائل نہ تھے۔ ہوتے ہیں کچھ لوگ۔۔۔ جو سدا محرومی کا رونا ہی روتے نظر آتے ہیں۔ سب کچھ میسر ہونے پر بھی۔۔۔ نہ وہ دوسروں سے کچھ طلب کرتے ہیں۔ نہ انہیں عطا کرنے کی نیت رکھتے ہیں۔۔۔ یہ بھی ان ہی لوگوں میں سے تھے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان کا سارا زور شرافت پر رہا تو میں بھی خود کو شریف النفس ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا۔ مگر ہوا یہ کہ میں ان کی انکساری، شرافت، ضرورت و مجبوری کو بھانپ کر جامے سے باہر ہونے لگا اور یہی میری بھول تھی۔ شاید میں ایک بار پھر موضوع سے ہٹ رہا ہوں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مائرہ کو مجھ سے محبت ہو گئی تھی بات صرف یہیں تک رہتی تب بھی ٹھیک تھا مگر وہ جواب میں مجھ سے بھی اسی محبت کی امید رکھتی۔ اب بھلا میرے پاس اتنی فراغت و عافیت کہاں تھی کہ اسے کال یا ایس ایم ایس کر کے بار بار اس کی اہمیت جتاتا رہوں۔ وہ ہر روز مجھے مارننگ میسج کرتی تو میں بھی جواب میں چھانٹ کے اک اچھا سا میسج کر دیتا۔ کال کے لیے تو عموماً میرے موبائل کا زیرو بیلنس میرا منہ ہی چڑاتا۔ میں اسے کال کرتا تو کہتا بھی کیا۔ کسی اشد ضرورت کے تحت بھی مجھے اسے مس کال ہی دینی پڑتی "جواباً" وہ فی الفور کال کرتی اور میں شرمندہ ہوئے بغیر اس سے وہی کھوکھلے وعدے کر لیا کرتا کہ نوکری ملنے پر میں اسے نا صرف اس زحمت سے بچا لوں گا بلکہ اس کی تمام کالز مجھ پر ادھار ہیں جنہیں میں سود سمیت لوٹا دوں گا۔ تاہم اپنے سابقہ تجربوں اور چند "خیر خواہوں" کے مشورے کے مطابق اب میں نے عورت کی لگامیں کس کر رکھنے کی ٹھان رکھی تھی۔

مجھے خوب یاد ہے اس دن چودہ فروری تھی ویلن ٹائن ڈے۔ شاید وہ سارا دن میری جانب سے کسی پیار بھرے ایس ایم ایس کے انتظار میں رہی تھی۔ تبھی رات گئے اس کا ایس ایم ایس ملا۔ "آئی ایم اینگری وِد یو" وجہ پوچھنے پر وہی سادہ و معصوم سا شکوہ کہ آج محبت کے اظہار کا دن تھا اور میں خاموش رہا۔ بے وقوف! وہ یہ سمجھتی تھی کہ میں اس سے محبت کا اظہار کروں گا جبکہ مجھے ایسا کوئی دعوا تھا ہی نہیں۔ میں نے تو سمجھوتا کیا تھا خود پر چسپاں ناپسندیدگی و ناقابل قبول کا

لیبل ہٹانے اور دنیا کی تمسخرانہ نظروں اور دل شکن رویوں سے بچنے کے لیے۔۔۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر ریپلائی کیا۔

"میں ویلن ٹائن ڈے پر یقین نہیں رکھتا۔ ہم مسلم ہیں اوکے؟"

"آئی نو مگر اس دن سے ہٹ کر بھی آپ نے کب مجھ سے محبت کا اظہار کیا ہے۔" مجھے اس کی بات پر حیرت ہوئی۔ وہ میری زندگی میں آنے والی تیسری عورت تھی جسے مجھ سے شکوہ تھا کہ مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔ عائشہ اور رئیسہ کو تو میں نے بیوی ہونے کے ناتے کسی نہ کسی طرح مطمئن کر ہی دیا تھا مگر اس سے کیسے کہتا کہ محبت پر میرا ایمان ہی نہیں ہے۔ نہ ہی مجھے اس کی ضرورت ہے۔ محبت، وفا، خلوص، صبر، ایثار، قسمت یہ سب لفظ میری چڑ بن کر رہ گئے تھے۔ اس مشینی دور میں جذبات جیسے کھو کر رہ گئے ہیں۔ اگر میسر ہوں تو بھی ان کی قیمت ہی کیا ہے۔ محبت بھلا حیثیت داو قات ہی کیا ہے اس فضول سے جذبے کی۔۔۔ لہٰذا میں نے مائرہ کی دل آزاری کی پروا کیے بغیر لکھا۔

"زندگی میں اور بھی بہت کچھ ہے جو محبت سے بڑھ کر ہے۔ محبت کا نمبر تو سب سے آخر میں آتا ہے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے۔ جس طرح سب کچھ میسر ہو جاتا ہے محبت بھی اسی آسانی سے مل جاتی ہے؟" جواب فوراً آیا۔ شاید اسے میرے جواب نے ہرٹ کیا تھا۔ "یاد رکھیے زندگی میں ہر چیز ہم تھوڑی بہت کوشش اور جدوجہد سے حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر محبت صرف اور صرف قسمت سے ملتی ہے۔"

اب وقت آگیا تھا کہ اسے لفظوں کے جال میں پھانس کر اپنی محبت کا یقین دلایا جائے۔ لہٰذا دل پر پتھر رکھ کر مجھے اسے بھی یقین دلانا پڑا کہ وہ اک آئیڈیل لڑکی ہے اور صرف اتنا ہی نہیں کہ مجھے اس سے محبت ہے بلکہ وہ سچ مچ چاہے جانے کے قابل ہے۔ شاید یہیں آکر ہر عورت مات کھا جاتی ہے۔

میرے ان جملوں کے بعد اس کا دکھ بھی جھاگ کی طرح بیٹھتا چلا گیا۔ حالانکہ سچ تو یہ تھا کہ محبت جیسا کوئی جذبہ کبھی مجھے چھو کر بھی نہ گزرا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے نا کہ اپنی چھتیس سالہ زندگی میں کبھی محبت کے جذبے سے آشنا نہ ہوا تھا۔ مزے کی بات کہ یہ بات میری دونوں بیویوں پر اچھی طرح واضح رہی۔ بلکہ عائشہ کا تو یہ آزار ہی بن کر رہ گیا تھا۔ شاید میں اسے بھرپور ازدواجی زندگی کا سکھ دے پاتا تو ممکن ہے اس کے دل میں سابقہ محبت کے نقوش مدھم پڑ جاتے مگر میری اس سے شادی اک طمع کے تحت رہی یہ وہ بھی جانتی تھی اور یہی میرے اجڑنے کا باعث بنی عائشہ سے جس وقت میری شادی ہوئی میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔

میرے سامنے مستقبل کا اک بھرپور لائحہ عمل تھا۔ اب تک کا وقت تو جیسے تیسے کٹ ہی گیا تھا۔ مگر اس گزرتے وقت نے مجھے خوب سمجھا دیا تھا کہ پیسہ اک عظیم طاقت ہے۔ انسانی زندگی میں اگر سو مسائل ہوتے ہیں تو ننانوے پیسے کی کمی کی بدولت۔۔۔ میرے ابا غیر ذمہ دار و عیش پرست نہ ہوتے۔ اپنے کنبے کی بھرپور کفالت کرتے تو کاہے کو ہم دوسروں کے در پر ان کے ٹکڑوں کے محتاج رہتے۔۔۔ پھر اماں کا مزاج ایسا تھا کہ ان کے سبب ہر جگہ فتنہ و فساد ہی رہتا لہٰذا یہ ٹکڑے اور بھاری رہتے۔ تب تک جیسے تیسے اماں نے چار بہنوں کو تو بیاہ ہی دیا تھا۔ بڑے بھیا کچھ ذمہ دار ثابت ہوئے تو آمدنی کا کچھ آسرا بنا۔۔۔ اور ہم کرائے کے گھر میں آگئے۔ مگر ماضی کی عسرت و بدحالی نے مجھے رشتوں سے بہت برگشتہ کر دیا تھا۔۔۔

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ عائشہ سے شادی کے وقت میرے سامنے مستقبل کی لمبی چوڑی پلاننگز تھیں۔ جس کے لیے ظاہر ہے کہ پیسہ درکار تھا اور وہ میرے پاس تھا نہیں۔۔۔ عائشہ میری آپا کی واقف کار تھی۔ انہوں نے عائشہ کی مضبوط حیثیت کے حوالے سے مجھے اتنے سنہری خواب دکھائے کہ میں یہ بھول ہی گیا کہ میری اپنی حیثیت کیا ہے۔

شادی مرد کے لیے اک بڑی ذمہ داری ہوتی ہے مگر اس کی توقع میں دوسروں سے رکھتا تھا عائشہ مسیحی

بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور اس میں کچھ شک نہیں کہ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہونے والوں میں سے تھی۔ اب یہ تو میرے فرشتوں تک کو خبر نہ تھی کہ اس کے دل میں اپنی سابقہ محبت کے لیے نرم گوشہ اب بھی موجود ہے جو اس کی دانست میں اسے بے وفائی کا داغ دے کر کسی اور سے شادی رچا کر پردیس سدھار گیا تھا۔ اقتدار سے تجدید تعلق کی بنیاد کب پڑی ؟ کب عائشہ اور اس کے مابین تعلقات استوار ہوئے پتا ہی نہ چلا۔ میری شادی کو پانچ سال گزر چکے تھے اور ان پانچ سالوں نے عائشہ پر میری حیثیت و اوقات اچھی طرح واضح کر دی تھی کہ میں دوسروں پر انحصار رکھنے والا' نکما و ناکارہ انسان ہوں۔ لہٰذا میری قدر و قیمت کا گراف تیزی سے نیچے آیا تھا۔ عائشہ کا سلوک مجھ سے ویسا ہی ہو گیا تھا۔ جیسا کسی بھی بیوی کے ٹکڑوں پر پلنے والے شوہر کے لیے ہوتا ہے۔ خود اس میں کتنے خواص تھے یہ اک الگ کہانی ہے۔ میرے لیے کم از کم اتنا ہی کافی ہے کہ اپنے مال دار میکے کی بدولت وہ گھر کی گاڑی چلا رہی تھی مگر ان عاقبت نا اندیش لوگوں سے اتنا نہ ہوا کہ جہاں بہن کو بڑھیا جہیز سے بھر کر شاندار لگژری فلیٹ دیا تھا۔ وہیں کچھ رقم اس کی خاطر مجھے کسی اچھے کاروبار کے لیے مرحمت فرما دیتے۔ مگر نا جی! وہی مرد کی غیرت و حمیت کے فلسفے انہیں ازبر تھے۔ کفالت کی مد میں سارا کا سارا ذمہ میرا تھا اور وہ جو میں اپنی شاندار ڈگریوں سے سجی فائل بغل میں داب کر جوتوں کی گرد جھاڑنے نکلتا تھا۔ اس کے سبب انہیں امید تھی کہ کبھی نہ کبھی کوئی اچھی جاب مجھے مل ہی جائے گی۔ اگرچہ بارسوخ لوگ تھے۔ ان کے نزدیک یہ مرحلہ بھی چند فون کھڑکا کے حل ہو ہی سکتا تھا مگر نا جی! وہی شرافت' ایمانداری اور اپنے زور بازو پر یقین رکھنے کے فلسفے ... جو مجھ جیسے ناکارہ انسان کو مزید ناکام بنا چکے تھے۔

بات ہو رہی تھی عائشہ کی سابقہ محبت کی ... جس میں نئی روح جب پڑی جب اقتدار اپنی ناکام ازدواجی زندگی کا داغ لے کر لندن سے لوٹا تو عائشہ سے اس کی کھلم کھلا ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ پھر بات نت نئے قیمتی تحائف پر آ رکی۔ استفسار پر عائشہ نے بھی بڑے دھڑلے سے اقتدار کا نام لے دیا۔

"اقتدار ... ؟" میں ٹھٹکا وہ تمہارا ماموں زاد جو عرصے سے لندن میں مقیم تھا؟ مگر اس کو کیا پڑی کہ تمہارے لیے اتنے قیمتی گفٹس لے کر آئے؟"

عائشہ آئیں بائیں شائیں کر گئی۔ خیر یہاں تک بھی ٹھیک ہی تھا۔ مگر کچھ دنوں میں اک نیا تماشا دیکھنے کو ملا۔ اقتدار صاحب کی سوک ہر شام ہمارے کمپاؤنڈ میں آ کر رکتی اور اک ہی ہارن پر اس کی منتظر بنی تھی عائشہ صاحبہ فرنٹ سیٹ پر جم کے یہ جا وہ جا۔ کہاں کا شوہر اور کس کا گھر' بات کچھ اور آگے بڑھی۔ اقتدار' عائشہ کو بڑے شاپنگ مالز سے بیگ بھر بھر کے شاپنگ کروا رہا تھا۔ اعلا ترین ہوٹلز میں لنچ' ڈنر چل رہے تھے۔ یعنی ان سب خواہشات کی تکمیل جن کی توقع وہ مجھ سے رکھتی تھی اور میری ناتواں جیب ان کا بار نہ اٹھا سکتی تھی۔ اک روز تو حد ہی ہو گئی۔ عائشہ' اقتدار کے ہمراہ سر شام گئی تو رات گئے تک نہ لوٹی۔ میں بے چینی سے کروٹ پر کروٹ بدلتا سگریٹیں پھونکتا رہا۔ بعد ازاں میرے استفسار پر وہ پہلے سے ہی اکھڑ گئی۔

"تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟"

"میں تمہارا شوہر ہوں اور تم سے بازپرس کا حق رکھتا ہوں۔ جب سے اقتدار آیا ہے تم اپنے آپے میں نہیں رہی ہو۔"

"تو سمجھ لو تم ہم دونوں کے درمیان آنے والی دیوار ہو۔ میں پہلے بھی اس سے محبت کرتی تھی اور اب بھی کرتی ہوں۔"

"عائشہ! تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہی ہو؟" میں سناٹے میں آ گیا تھا۔

"ہاں مجھے اچھی طرح پتا ہے۔ تمہیں کون سی مجھ سے محبت ہے۔ میرے توسط سے اب تک کا وقت تمہارا اچھا گزرا۔ اب گزارا نا ممکن ہے۔"

"یوں کہو کہ تمہاری آنکھیں پیسے کی چکاچوند سے چندھیا رہی ہیں۔ تمہیں یہ بھی نظر نہیں آ رہا کہ تم

ایک میرڈ عورت ہو۔ یہ سب تمہیں زیب نہیں دیتا۔"

"اگر یوں ہے تو یوں ہی سہی۔ کبھی اپنے گریبان میں منہ ڈال کے دیکھو کہ اب تک کی زندگی میں تم نے مجھے کیا دیا ہے۔ میں اگر گھر کی گاڑی چلاتی ہوں تو تم نے سچ مچ اپنے ہاتھ پیر موڑ لیے ہیں۔ نوکری تمہیں ملتی نہیں۔ گھر در تمہارا تھا ہی نہیں۔ رشتے دار' بہن بھائی تمہیں پوچھتے نہیں۔ کبھی سوچو کہ تمہاری زندگی میں تمہارا اپنا کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں کیونکہ تم اک مستعار شدہ زندگی میں ہی خوش ہو۔"

غرض میری ذات کے سارے کیڑے اس کی زبان پر آ گئے اور مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ عائشہ کے دل میں اپنی پرانی محبت کے دیے سدا روشن رہے۔ وہ اب تک اقتدار کی منتظر تھی تو اسی شاندار زندگی کے لیے ... عورت کے پیسے پر عیش کرنے والا تو یوں بھی اپنی قدر و قیمت گنوا دیتا ہے۔ سو میں گنوا چکا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا یہ میں بتا ہی چکا ہوں۔ جی ہاں عائشہ نے چند کرائے کے غنڈوں کی مدد سے گن پوائنٹ پر مجھ سے طلاق کے پیپر سائن کروائے تھے اور میرے سارے عیش و عشرت ختم ہو گئے۔ مجھے فلیٹ بھی چھوڑنا پڑا عائشہ تو جو تھی سو تھی۔ رئیسہ اس کی بھی استاد ثابت ہوئی۔

میرے دل میں عائشہ کی کج ادائی کا زخم ابھی تازہ تھا اگرچہ حالات تب بھی مختلف نہ تھے۔ ایک بیوی کے ہاتھوں ذلت و خواری اٹھا کر میں دربدر تھا اور اپنے آئندہ کے لیے لائحہ عمل ترتیب دے دیا تھا۔ ادھر رئیسہ بھی اپنی گزری عمر اور کم صورتی کی بنا پر اپنے والدین کے لیے بوجھ تھی۔ اپنے تمام "خواص" سے قطع نظر اس کے کریڈٹ پر ایک ہی خوبی تھی اور وہی میرے حق میں جاتی تھی یعنی وہ بھی "موٹی مرغی" تھی ۔ بینک میں جاب کے طفیل وہ اک اچھی زندگی گزار رہی تھی۔ انہوں نے بھی میری معاشی حیثیت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے مجھے سند قبولیت بخشی تھی کہ نوکری کا کیا ہے بالآخر مل ہی جائے گی۔ رئیسہ کی اپنی انکم بہت ہے۔ اس وقت میں اتنا بھی نہ سمجھ سکا کہ گھر کی کفالت کے سبب وہ خود رئیسہ کو گنوانا نہیں چاہتے۔ مجھ جیسا بے گھر بے در اور ناکارہ آدمی ہی رئیسہ کی مالی پوزیشن کے سبب دب کر ان کے گھر کے اک کونے میں پڑا رہ سکتا ہے۔ انہیں رئیسہ کی انکم سے بھی برابر فائدہ نصیب ہوتا رہے گا اور دنیا کی زبانوں سے بھی نجات ملے گی جو کماؤ بیٹی کو نہ بیاہنے کی سبب انہیں سو سو جوتے لگاتی ہے۔ مجھے یہ بھی منظور تھا کہ رہنے کا ٹھکانہ اور دو وقت کی روٹی تو نصیب ہو ہی رہی تھی مگر معاملہ تو رئیسہ کی مجھ سے بے التفاتی و بے رغبتی پر بگڑا تھا۔

میری بدقسمتی کہ میری زندگی میں دو عورتیں آئیں اور دونوں ہی ایک سے بڑھ کر ایک۔ اپنے ان ہی سابقہ تجربات اور چند خیر خواہوں کے مشورے کے مطابق اب میں نے لگامیں کس کر رکھنے کی روش اپنائی تھی۔ اب میں یہ بتاتا کیا بھلا لگتا کہ مجھ جیسے نکمے اور ناکارہ انسان کو کمانے والی عورتوں کے رعب میں رہنا ہی پڑتا ہے۔ مگر یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ماضی کے تلخ تجربات سے سبق سیکھتے ہوئے میں اب اپنا قبلہ درست رکھتا۔ اپنی بدنیتی و خصائل پر چار حروف بھیج کر اس گھرانے کو اپنے لیے غنیمت سمجھتے ہوئے اپنے حالات بدلنے کی کوشش کرتا اور مائرہ کو نیک نیتی کے ساتھ بسر و چشم اپناتا۔ مائرہ اور اس کا گھرانہ معیاری یا بہت اعلا بڑھیا نہ سہی۔ میری حیثیت و اوقات سے پھر بھی بڑھ کر تھا مگر ہوا یوں کہ ضرورت سے زیادہ عزت و تکریم اور آؤ بھگت کی وجہ سے میں اپنی حیثیت و اوقات بھولنے لگا۔ مزید یہ کہ خواہش رکھتا کہ وہ مجھ سے قطعی کوئی امید نہ باندھیں۔ اسی لیے میں اسے خاصا زچ بھی کیا کرتا۔ "میرے پاس اک کھٹارا اسکوٹر تھی۔ وہ بھی بیچنی پڑ گئی۔ اب آپ کو بسوں میں سفر کرنا پڑے گا۔" مگر کیا مجال جو اس کے پایہ استقلال میں جنبش آ کے دی ہو۔

"کوئی بات نہیں۔ ہمیں اب بھی بسوں میں دھکے کھانے کی ہی عادت ہے۔"

"کرائے کے گھر میں رہنے کی تو عادت نہیں ہے

—— محدود آمدنی میں گھر کا کرایہ نکال کے بچتا ہی کیا ہے۔ نوکری مل بھی گئی تو—— "میں دراصل اسے اس جانب لانا چاہتا تھا کہ وہ کہہ دے کہ اس کا اپنا گھر کس لیے ہے آخر والدین کی املاک میں اس کا بھی تو حصہ تھا جہاں دیگر لوگ مقیم ہیں اک میری گنجائش نہیں نکل سکتی۔ گھر بہت زیادہ بڑا نہ سہی—— اتنا کم بھی نہ تھا۔ مل ملا کے گزارا ہو ہی جاتا—— وہ جھوٹے منہ بھی کہتی تو میں جھٹ بوریا بستر سمیت کر اس کے گھر جا پڑتا۔ مگر نا جی—— !میں لاکھ اپنی مجبوریوں کے رونے روتا—— اس پر خاک اثر نہ ہوتا—— ان سب کے نزدیک تو میرے تمام مسائل کا حل اک میری نوکری کی صورت موجود تھا۔ اپنے تئیں وہ مجھے تسلی سے نوازتی۔

"جب اچھا وقت نہیں رہا تو برا بھی نہ رہے گا۔ آپ تسلی رکھیے ان شاء اللہ جلد آپ کو اچھی نوکری مل جائے گی۔"

ان معصومیت بلکہ حماقت آمیز جملوں پر میں سر پیٹ کر رہ جاتا۔ کبھی جو اس کا موڈ خوشگوار ہوتا اور وہ مذاق ہی کر ڈالتی تو میں بگڑ اٹھتا اسے بھی فوری اپنی خطا کا احساس ہو جاتا۔

"اوہ میں بھول گئی آپ کو مذاق پسند نہیں ہے۔ بے خیالی میں منہ سے نکل گیا۔"

"یقیناً" آپ کے منہ سے بے خیالی میں نکل گیا ہو گا۔ مگر میرے معاملے میں محتاط رہیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ بلاوجہ کا ہنسی ٹھٹھول مجھے پسند نہیں ہے۔"

"میں آپ سے معذرت کرلوں گی۔" اس کا لہجہ گھٹ گیا۔ میں دل ہی دل میں خوش ہوا مگر بظاہر ماش کے آٹے کی طرح اکڑ گیا۔ اپنی دانست میں اسے کھری کھری سنائیں۔ "میں آدمی ذرا صاف گو ہوں۔ مجھ سے کسی لگی لپٹی کی امید نہ رکھیے گا۔"

میں نے اچھی طرح بلاوجہ ہی اس کی عزت افزائی کی۔ میرے نزدیک یہ عورت کو جوتی تلے دبا کے رکھنے کا گر تھا کہ اسے اس کی اوقات میں رکھو اور یہ گر میں نے اپنے سابقہ تجربات سے سیکھا تھا۔

"یہ تو اچھی عادت ہے۔ جھوٹ بولنے سے بہتر ہے کہ صاف گوئی سے کام لیا جائے۔" اس نے شگفتہ لہجے میں کہا تو مجھے لگا جیسے کوئی معرکہ مار لیا ہو۔ وہ میری خامیوں کو بھی خوبیاں گرداننے تو یہ میری قسمت تھی یا ان کی مجبوری——

مگر ہوا یہ کہ ان سب کے فدویانہ رویوں سے میرے حوصلے بلند ہو گئے۔ جیسے مجھ سے بڑھیا آدمی انہیں مل ہی نہیں سکتا۔ ان ہی دنوں اک نئی بات ہوئی۔ سلمان نے آنے بہانے کر کے مجھے کمرہ خالی کرنے کا الٹی میٹم دے دیا۔ کمرے کی ضرورت ہے اسکول کا دیگر سامان رکھنا ہے یہ وہ اس کاٹھ کباڑ سے بھرے کمرے کا بھلا اور کیا مصرف ہو سکتا ہے۔ میں محض ایک کونے ہی میں تو پڑا تھا۔ مگر جب دلوں پر قفل پڑ جائے تو گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔ سلمان نے بھی میری مجبوریوں کا رتی بھر خیال نہ کیا تھا اور یہ ایسا ہی تھا جیسے مرے پہ سو درے۔ اگرچہ وہ خوب جانتا تھا کہ مستقل بے روزگاری کے سبب میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ رہتی۔

میں ہزاروں کا مقروض تھا۔ میرے پاس گھر ورنہ تھا تو میں کہاں جاتا تف ہے ایسی دوستی پر—— پھر ایسے میں میرا دھیان گھوم پھر کر اسی طرف جاتا تھا۔ وہ لوگ معاشی طور پر زیادہ خوشحال نہ سہی۔ کم از کم اتنی توفیق تو رکھتے ہی تھے کہ گھر کے کسی کونے میں مجھے جگہ دے دیتے۔ اچھا ہے کہ ان کی بیٹی ان کی نظروں کے سامنے رہے گی۔ ناچار میں نے مائرہ سے رونا رویا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

"چلیں اک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا۔ شادی کے لیے بھی تو آپ کو نئے گھر کا بندوبست کرنا ہی تھا۔"

عجیب لڑکی تھی۔ میں اپنا بوریا بستر سمیٹ کر ان کے گھر پڑاؤ ڈالنے کی سوچ رہا تھا اور وہ میری دربدری پر خوش ہو رہی تھی۔

"عورت کا اصل گھر اس کے شوہر کا گھر ہوتا ہے۔ شادی کے بعد ہم کسی فلیٹ میں منتقل ہو جائیں گے۔"

اف! آخر ان سب کی تان شادی پر ہی آکر کیوں ٹوٹتی ہے؟ میں سخت بدمزا ہوا۔ کاش وہ اتنا ہی کہہ دیتی کہ "اس کا گھر کس لیے ہے۔ مجھے پتا ہے آپ بے روزگار ہوئے گھر منتقلی کے لیے پیسہ اور سامان بھی تو درکار ہوتا ہے۔" یوں منہ پھوڑ کر کہنے کا نتیجہ بھی وہی صفر نکلا۔ بالآخر کسی نہ کسی طرح شیئر پر اک کرائے کا کمرہ حاصل کرنا ہی پڑا۔ جس پر وہ خوش بھی ہوئی۔

"چلیے بعد میں کوئی بہتر جگہ دیکھ لیں گے۔ یہ تو آپ کی تنخواہ پر منحصر ہو گا۔"

اف! یہ مشرقی وفاشعار عورتوں کے گمان! میں نے تو کبھی اس سے یہ کہا ہی نہیں تھا کہ میں شادی کر کے نوکری بھگتا کر اس کی کفالت بھی کروں گا—— مگر ان میں سے کسی کو یہ احساس کب تھا کہ معاشی طور پر میری حیثیت صفر تھی اور یہ کہ نوکری کے لیے تگ و دو میں عرصہ ہوا ترک کر چکا تھا اور اب تک کوئی لمبا ہاتھ مارنے کے چکر میں رہا تھا۔ مزید یہ کہ ان کے ذرا سے تعاون سے میرے بگڑے حالات سدھر سکتے تھے مگر وہ سمجھتے تب نا! اب میں منہ پھوڑ کے ان سے یہ تو کہنے سے رہا کہ بزرگ محترم املاک کے نام پر صرف یہ گھر آپ کے پاس ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سیکڑوں بیماریاں ہیں۔ آپ گزر گئے تو فرا فساد ہی چھوڑ جائیں گے۔ جیتے جی بیچ کر جس کا جو بنتا ہے عطا کیجیے۔ بعد ازاں کسی بیٹے یا بیٹی کے گھر پڑے رہیے۔ ارادوں کے مطابق خرچ کر کے بقیہ عمر پیر پسار کر گزار لیے۔

کم از کم میں تو ایسا ہی کرتا۔ اتنے بڑے گھر کو بیچ کر مناسب قیمت میں ایک فلیٹ گزارے لائق خریدتا بقیہ سرمایہ بینک میں فکسڈ ڈپازٹ میں جمع کروا دیتا اور مزے کی زندگی گزارتا۔ مگر یا تو یہ لوگ ضرورت سے زیادہ سادہ بلکہ احمق تھے یا پھر گرہ کے پورے—— وہ سب تو اس گمان کو تھامے بیٹھے تھے کہ مجھے جلد یا بدیر اچھی نوکری مل جائے گی تو میرے دن پھر جائیں گے۔ جس کے لیے وہ سب اٹھتے بیٹھتے دعاگو رہتے۔ جبکہ میرا خیال تھا کہ جب قسمت روٹھ جائے تو دعائیں کارگر نہیں ہوتیں—— اور وہ جو کہتے ہیں کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی اسی طرح تمام آسمانی بلائیں جیسے میرا ہی پتا پوچھتی اترتی تھیں۔ لہٰذا حالات نے اک نئی کروٹ لی۔ بزرگوار کے دماغ میں اک نیا کیڑا کلبلایا۔

"سائرہ (مائرہ کی چھوٹی بہن) کا اک بڑا اچھا رشتہ آیا ہے۔ ادھر سے نکاح کا اصرار ہے کیوں نا دونوں نکاح ایک ساتھ کردیے جائیں؟"

انہوں نے میرا گھیراؤ کیا تو میرا دل جل کر خاک ہو گیا۔ یہ تو وہی بات ہوئی۔ سوت نہ کپاس—— جواز تو ڈھیروں تھے مگر میں نے وہی گھسا پٹا بے روزگاری کا جواز پیش کیا جسے انہوں نے قطعاً" درخور اعتنا نہ گردانا۔

"میاں! مرد کے نصیب میں عورت کے نصیب کا رزق ہوتا ہے۔ تم دونوں کے نصیب جڑ جائیں گے تو روزی کی بھی سبیل نکل آئے گی۔"

انہوں نے یہ بات یقیناً" معاملہ اپنے حق میں رکھنے کی خاطر کی تھی میں خوب جانتا تھا۔ واجبی سی شکل و صورت کی ڈھلتی عمر کی بیٹی ان کے سینے پر کسی سل کی مانند دھری تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اسی بہانے اپنا بوجھ ڈھو کر میرے کندھے پر دھرنا چاہتے تھے۔ نکاح کے شکنجے میں مجھے جکڑ کر کچھ بعید نہ تھا کہ اگلے ہی پل مائرہ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر خالی خولی چلتا کرتے۔ کنجوس لوگوں سے اور بھلا امید بھی کیا کی جا سکتی ہے۔ مگر میں اتنا بے وقوف نہ تھا۔ شادی معاشی طور پر میری ضرورت بلکہ مجبوری سہی مگر میری ترجیحات میں اولین درجے پر نہ تھی۔ میں تو اس گمان کو تھامے بیٹھا تھا کہ شادی کے وقت میں جہیز کی جگہ کیش طلب کرلوں گا۔ جس سے میرے مسائل کچھ نہ کچھ تو حل ہو ہی جائیں گے۔ مگر ان کی عاجزی و انکساری اور تنگدستی کے رونے غماز تھے کہ جہیز میں صرف دعائیں ہی ملیں گی۔ میں اگر کچھ کہنے کی پوزیشن میں ہوتا تو کم از کم اتنا تو کہہ دیتا کہ محترم خاطر جمع رکھیے۔ کچھ دے نہیں سکتے تو طلب بھی نہ کیجیے یقیناً" وہ بدک اٹھتے۔

مزید مائرہ کی جانب سے پیشگی تنبیہہ مل چکی تھی کہ

ابا جو کہیں کان دبا کر سن لیتا ورنہ بات بگڑ جائے گی۔ لہٰذا خلاف طبع میں چپ سنتا رہا اور سوچ کر جواب دینے کا کہہ کر اٹھ آیا۔ اس وقت میں بھول گیا تھا کہ جو امیدیں میں نے ان سے وابستہ کر رکھی ہیں، وہی امیدیں وہ بھی تو مجھ سے رکھ سکتے ہیں۔ میرے اندر غبار ہی غبار بھر گیا تھا۔ بعد ازاں مائرہ میرے عتاب کا نشانہ بنی "تم خوب جانتی ہو میں جاب لیس ہوں۔ میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں رہتی نکاح کیا خاک کروں گا۔"

"ابا بھی مجبور ہیں سائرہ کے نکاح کی صورت میں ساری دنیا انہیں نام دھرے گی۔"

"یوں کہو انہیں صرف اپنی غرض سے مطلب ہے۔ میرا سر چھپانے کا ٹھکانا تک نہیں ہے۔ تمہیں لے کر کیا روڈ پر بیٹھوں گا۔ اس تمام عرصہ میں کم از کم اتنا اندازہ تو میں کر ہی چکا ہوں کہ جو کرنا ہے مجھے ہی کرنا ہے۔" جانے کیسے میرے منہ سے نکل گیا۔ میرا خیال تھا وہ شرمسار ہوگی مگر وہ چڑ گئی۔

"تو آپ مرد ہیں فیملی کی کفالت آپ ہی کا ذمہ ہے۔"

"بس یہی تو خامیاں ہیں تم لوگوں میں..... زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور تم لوگ بیٹھے وہی دقیانوسی راگ الاپتے رہتے ہو۔ میں پوچھتا ہوں کیا خواتین مردوں کے شانہ بشانہ کام کر کے گھر کی گاڑی نہیں گھسیٹتی ہیں۔ تم نے اتنی تعلیم چولہے میں جھونکنے کے لیے حاصل کی ہے کیا؟"

"میں نے اپنی سوچ پہلے ہی آپ کو بتا چکی ہوں۔ جاب کرنا میرا مقصد کبھی نہیں رہا۔"

"اف یہ تمہاری کم عقلی..... تم جیسی تعلیم یافتہ اہل و قابل افسانہ نگار کو میں بتاؤں کہ انسان کی ویلیو اس کی حیثیت سے عیاں ہوتی ہے؟ ڈگری کو زنگ لگا کر پردے کی بوبو لڑکیوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے اس دور میں۔"

"تعلیم شعور کے لیے حاصل کی جاتی ہے۔ فائدے حاصل کرنے کے لیے نہیں..... عورت کی پہلی ترجیح اس کا گھر ہوتا ہے۔"

"بس یہی تو خامیاں ہیں تمہاری سوچ میں..... لاکھ سر پٹخ لو مگر تم وہی کنوئیں کی مینڈک رہو گی۔ میری مجبوریاں دامن گیر نہ ہوتیں تو کاہے کو تم جیسی بیک ورڈ لڑکی سے سمجھوتا کرتا۔"

"سمجھوتا.....!" اس کے لہجے میں شدید رنج اُمڈ آیا مگر میں نے غور نہیں کیا۔

"تو اور کیا..... بھلا خوبی ہی کیا ہے تم میں..... کبھی آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر دیکھو۔ ایسی آسمان سے اتری حور بھی نہیں ہو کہ تم سے شادی کے لیے مرا جاؤں۔"

"ان سب باتوں کا آخر مقصد کیا ہے؟"

"یہ آپ بھی سن لیں اور والد محترم کو بھی اچھی طرح سمجھا دیں کہ میرا انتظار نہ کریں۔ یہ نسبت ٹوٹتی ہے تو شوق سے توڑ دیں مگر میری مالی پوزیشن فی الحال اس کی متحمل نہیں ہے۔"

اپنی ازلی بدگوئی کو بروئے کار لاتے ہوئے میں نے اسے کھری کھری سنائیں اور دل ہی دل میں خوب خوش ہوا۔ میرے اندر کا غبار نکل گیا تھا۔ میرا خیال تھا وہ ہمیشہ کی طرح صفائیاں پیش کر کے میرے ابال کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرے گی یا مجھ سے معذرت کر لے گی..... مگر اس نے فون ہی بند کر دیا اور میں ہاتھ جھاڑ کر سو گیا۔

نکاح کی تجویز نامعقول تھی اور میں اس پر عمل کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا یہ میری خامی تھی مگر میں ان میں کیڑے چننے بیٹھ گیا اور یہی میری خطا تھی۔ جواباً اس کا ردعمل اتنا شدید ہوگا۔ میں سوچ بھی سکتا تو زبان تالوسے لگائے رکھتا مگر مجھے تو ہر حال میں ان سب کے فدویانہ رویے کی عادت ہو گئی تھی۔ میں الٹا چور کوتوال کے مصداق اکڑ کر بیٹھ گیا اور میرا خیال تھا کہ اب کوئی مجھے منانے آیا کہ تب..... اور ہو نہ ہو سائرہ کے نکاح میں شرکت کے لیے تو مجھ سے رابطہ کیا ہی جائے گا۔ بڑی بہن کی گزرتی عمر سے دامن بچا کے چھوٹی کا نکاح رچانے پر دنیا انہیں جوتے لگائے گی اس سے بچنے کے لیے میرا چہرہ کرانا تو لازمی تھا مگر خلاف توقع ادھر خاموشی چھا گئی۔ میں نے درخور اعتنا نہ گردانا، بلکہ اک دوست کی دعوت پر اس کے ہمراہ اپنا سفری بیگ اٹھا کر شمالی علاقہ جات کی سیر کو نکل گیا۔ اب میرا خیال تھا کہ نکاح پر بلاوے کی صورت میں اپنی بھرپور ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے اس نکاح کے بائیکاٹ کا اعلان کروں گا۔ مگر میں منتظر ہی رہا اور نکاح کی تاریخ آکر بھی گزر گئی۔ میرا موبائل خاموش ہی رہا۔ میں ٹھٹکا مگر پھر یہ خاموشی اتنی طویل ہو گئی کہ مجھے گمان گزرا کہیں نکاح ملتوی تو نہیں ہو گیا۔ اس شبہے کی تصدیق کے لیے میں نے مائرہ کے چھوٹے بھائی کو کال کی اور یہ خیال بھی خام ہی ثابت ہوا۔ البتہ اس کا روکھا پھیکا انداز مجھے کھٹکا گیا۔ تب مجھے ناچار ان کے "دولت خانہ" پر حاضری دینی ہی پڑی۔

مگر یہ کیا.....! بزرگوار کا رویہ بھی روکھا پھیکا اور سپاٹ ہی تھا تاہم مجھے گھر میں داخلہ کی تو اجازت مل ہی گئی تھی ان کی بیٹھک میں زمانہ قدیم کے صوفے پر بیٹھ کر میں نے اسٹارٹ لینا ہی چاہا تھا۔ جب بزرگوار نے بات سمیٹتے ہوئے کہا تھا۔

"میاں اگر تم مائرہ سے شادی کے معاملہ پر کچھ کہنا چاہتے ہو تو ہر دلیل و حجت بے کار ہے۔ کیونکہ مائرہ نے تم سے شادی سے انکار کر دیا ہے۔" بزرگوار کا یہ جملہ میرے سر پر بم کی طرح پھوٹا تھا اور میری ازلی بدگوئی عود کر آئی۔

"خوب! تو یہ وجہ تھی جو اتنی دیر سے کوئی مجھ سے رخ دے کر بات نہیں کر رہا تھا۔ میں نے احتشام کو فون کیا تو اس نے بھی مجھ سے روکھے انداز میں بات کی تھی۔"

"جی ہاں بالکل یہی وجہ تھی۔" خلاف توقع مائرہ آکر تن کر کھڑی ہو گئی۔ میری آنکھیں چوپٹ کھل گئیں۔ یہ وہ لڑکی تھی جو پردے میں رہ کر چائے کھانے بیٹھک میں پہنچاتی تھی۔

"مائرہ بیٹی!" بزرگوار نے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے ٹوک دیا۔

"مجھے بولنے دیں ابا جی! باپردگی، خوب سیرتی، شرافت تمیز تہذیب جیسے اوصاف ان پر کارگر ہوتے ہیں جو وہ ان کے اہل ہوتے ہیں۔ اگر آپ کسی کم ظرف کو ضرورت سے زیادہ عزت دیتے ہیں تو وہ اسی طرح سر پر چڑھ جاتا ہے۔"

بات راست تھی سو تلخ رہی۔ میں اچھل گیا۔

"اپنی غلطیوں کو میرے سر تھوپنے کی کوشش مت

"کرو۔ میں اگر نکاح میں شامل نہ ہوا تو کون سا سسی نے مجھ سے نہ آنے کا سبب دریافت کر لیا؟"

"تو آپ کا کیا خیال تھا کہ نکاح آپ کے بغیر نہیں ہو سکتا؟"

"تمہارے حوالے سے اک معتبر رشتہ بنتا ہے میرا۔"

"رشتے کی پاس داری صرف یک طرفہ نہیں ہوا کرتی۔ اس تمام عرصہ پر نظر دوڑائیے' آپ نے اس رشتے کی سالمیت کے لیے کیا کیا ہے؟ آپ رشتے بھگتنے کی تمام تر توقع دوسروں سے رکھتے ہیں اور یہی آپ کی خامی ہے۔"

"اور تم... فرسودہ سوچ رکھنے والی مڈل کلاس لڑکی! ذرا سوچو کون پوچھے گا تمہیں؟"

"مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں مگر یاد رکھیے شادی زندہ رہنے کی شرط نہیں۔ جن کی شادیاں نہیں ہوتیں وہ بھی زندہ رہتے ہی ہیں۔ آپ کیا مجھے میری اوقات کی یاد دلائیں گے۔ مجھے خود آپ جیسے طمع پرست کا ساتھ منظور نہیں ہے۔"

"اچھا!" میں نے مضحکہ اڑایا "ساری زندگی ماں باپ کے در پر پڑی سڑتی رہو گی۔"

"یہ میرا اور میرے نصیب کا معاملہ ہے' اسے نصیب پر ہی چھوڑ دیں۔"

"جہنم میں جاؤ۔ تم جیسی ہزار میرے آگے پیچھے پھرتی ہیں۔" میں جل کر کہہ آیا حالانکہ یہ صریحاً جھوٹ تھا۔ لڑکیاں میری بے روزگاری پر کانوں کو ہاتھ لگاتی تھیں اور دو طلاقوں کا سن کر تو بھاگتی نظر آتیں۔

کئی روز میں منتظر رہا۔ شاید ان میں سے کسی کو اس عمل پر ندامت یا پچھتاوا ہو۔ شاید وہ ایک بار پھر رابطے یا مصالحت پر آمادہ ہو جائیں۔ مگر اک گمبھیر خاموشی پھر یہ خاموشی طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ میری آس و امید کا دیا بجھ گیا۔

اور آج وہی لڑکی میرے سامنے بیٹھی ہوئی کہہ رہی تھی کہ میری زندگی کے سارے خسارے میرے اپنے خریدے ہوئے ہیں میں محتاج ہوں۔ پل بھر میں گزشتہ وقت کا اک لمحہ میری نظروں میں آ کر رک گیا۔ ہاں عائشہ نے بھی تو کچھ ایسا ہی کہا تھا کہ میری زندگی میں میرا اپنا کچھ نہیں۔ میں اک مستعار شدہ زندگی گزار رہا ہوں۔ تو کیا سچ مچ میں محتاج ہوں؟

ہاں! مجھ جیسے آدمی کو اور بھلا کیا کہا جا سکتا ہے۔ جو اپنے لیے ہمیشہ دوسروں کے کندھے تلاشتا رہا۔ میری نظریں ٹیبل پر رکھے سو کے نوٹ پر ٹھہری تھیں اور ذہن کہیں دور سفر کر رہا تھا۔ عورت اپنے لیے تحفظ چاہتی ہے اور حاکم صرف کمانے والا مرد ہوتا ہے۔ ہم فطرت کو جھٹلا کیسے سکتے ہیں۔ انسان کے لیے رستے اور مقام اللہ کی ذات منتخب کرتی ہے اور اس کی متعین کردہ حدود جھٹلانے میں خسارہ ہی تو ہے اور مرد ہو کے میں کتنا بے غیرت تھا کہ کمانے والی عورت تلاشتا رہا خواہ اس کی جوتی تلے دب کے رہنا پڑے...؟

شاید مائرہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہم دنیا کو جس نظر سے دیکھتے ہیں یہ ہمارے لیے ویسی ہی ثابت ہوتی ہے۔ میں نے زندگی میں رشتوں سے بڑھ کر پیسے کو جانا شاید اسی لیے آج تنہا ہوں۔ نیت میں خلوص اور راستی ہو تو راہیں خود بخود سہل ہو جاتی ہیں۔

میں کچھ وقت کے لیے بھول گیا تھا کہ مجھ جیسا آدمی بے نقاب ہو کر نظروں سے گر جاتا ہے اور نظروں سے گر جانے والا پھر دوبارہ اپنا مقام نہیں پا سکتا... میری آج کی خستہ حالی میری اپنی خطاؤں کی باعث ہے رب تعالیٰ بھی اس قوم کے حالات اس وقت تک نہیں بدلتا۔ جب تک وہ خود اپنے حالات نہیں بدلتی... میں نے اپنی قوت بازو پر بھروسا کرنے کے بجائے سہارے تلاش کیے۔ سو ہمیشہ محتاج اور خساروں کا شکار رہا... شاید اسی لیے آج تنہا ہوں مگر یہ نکتہ مجھے بہت دیر سے سمجھ آیا...!

وہ چند لمحوں میں مجھے آئینہ دکھا کر میری اوقات یاد دلا گئی تھی۔ شاید اب تو آپ جان ہی گئے ہوں گے کہ میں خود سے بدظن کیوں ہوں...؟

☆ ☆

مکمل ناول

-۹-

نویں قسط

مرے ہمنوا کو خبر کرو

فاخرہ گل

☆☆☆
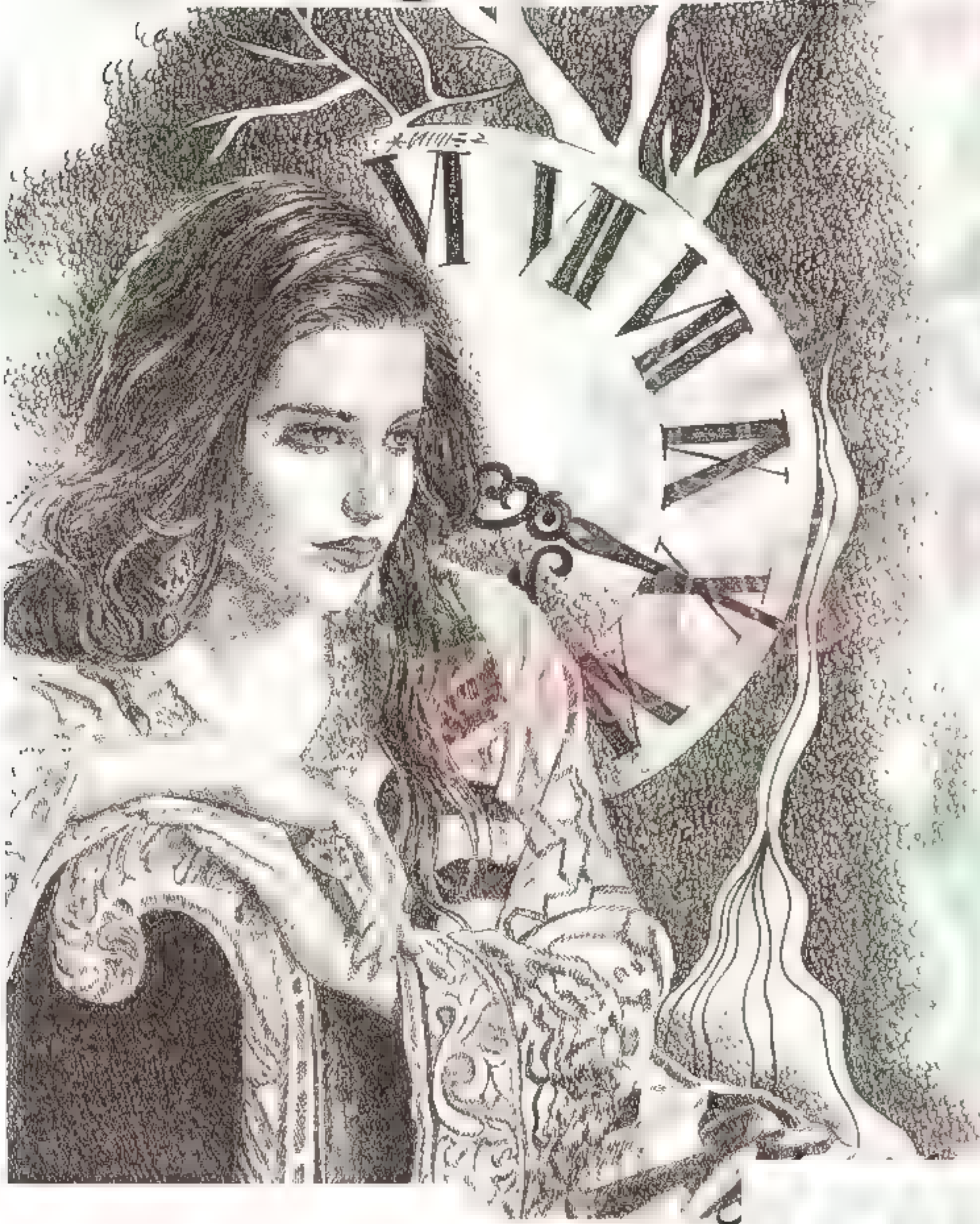
لاؤنج سے ناصر بھائی کی آمد کے ساتھ ہی ایک غیر معمولی ہلچل کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ اکیلے نہیں آئے ہیں بلکہ ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ جن سے بات چیت کا سلسلہ جاری تھا اور پھر ان کی یقینی طور پر چائے سے تواضع بھی کی جارہی تھی اس بات کا احساس برتنوں کے ٹی ٹرالی سے اٹھا کر ٹیبل تک منتقل کرنے کی آوازوں سے بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔ یوں بھی امی بابا کا بیڈ روم مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے مختص ٹی وی لاؤنج سے ملحق ہی تھا اور اس جگہ عام طور پر فارمل مہمانوں کو بٹھایا جاتا تھا بصورت دیگر اپنے دوست احباب یا فیملی فرینڈز اور رشتے دار ڈرائنگ روم میں بیٹھا کرتے جس کے بالکل سامنے کچن ہونے کی وجہ سے آسانی رہتی اور کچن میں موجود بندہ بھی باآسانی مہمانوں کی گپ شپ سنتا بھی اور اس میں حصہ بھی لے پاتا۔

ندی، امی کے ساتھ بیڈ پر لیٹی یونہی اِدھر اُدھر کی، اپنے بچپن کی اور پھر بابا کی باتیں کررہی تھی، خود کو اللہ کے بھروسے پر چھوڑ کر وہ خود کو امی کے سامنے بے حد کمپوزڈ محسوس کروارہی تھی۔ ان کا ملائم محبت بھرا چہرہ کس قدر ضعیف معلوم ہورہا تھا۔ تار تار سفید ہوتے بال زندگی سے ان کا دل اچاٹ ہونے کی طرف اشارہ کررہے تھے تو خاموش آنکھیں بھی حالات کی ستم ظریفی پر شکوہ کناں تھیں۔

''امی! آپ کے بال کتنے سفید ہوگئے ہیں نا، پہلے تو کبھی اتنے سفید نظر نہیں آئے۔''

''اس لیے کہ اب بہت کچھ وہ ہورہا ہے جو پہلے نہیں ہوتا تھا۔'' امی نے مسکرانے کی صرف کوشش ہی کی۔

''جی نہیں، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، میں کل ہی آپ کے بالوں کو کلر کرتی ہوں۔۔۔ یا ایسا کیوں نا کروں کہ ابھی لے آؤں۔'' بات کرتے کرتے وہ جوش میں اٹھ بیٹھی تو وہ حقیقتاً مسکرادیں۔

''ارے نہیں بیٹا! اب ضرورت نہیں ہے ان چیزوں کی۔''

''ارے واہ! کیوں ضرورت نہیں ہے بھلا ایویں ہی۔۔۔ خوامخواہ۔۔۔ ضرورت ہے اور بالکل ہے اور میں آپ کو ہیئر کلر لگا کر ہی چھوڑوں گی۔ ہاں البتہ صبح تک رعایت دینے کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔'' دونوں ہاتھ باندھ کر بڑی فراخ دلی سے صبح تک کی رعایت کا اعلان کرتی ندی کے انداز میں انہیں اپنی اسی نٹ کھٹ، شوخ شرارتی اور معصوم سی ندی کا عکس نظر آیا تھا جس کی مسکراہٹ اور شوخیاں حالات چپکے سے کہیں لے اڑے تھے۔

کروٹ لے کر دائیں ہتھیلی پر زور ڈال کر وہ بیٹھ گئی تھیں۔ ندی نے ان کی کمر کے پیچھے کشن رکھے تو انہوں نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

''اللہ تمہیں سدا خوش رکھے اور تم ہمیشہ دل سے مسکراتی رہو۔''

انہوں نے دانستہ طور پر ''یونہی مسکراتی رہو'' کے بجائے یہ الفاظ ادا کیے تھے کہ جانتی تھیں اس وقت وہ مسکراہٹ بھول چکی ہے اور یہ اقدام محض ان کی خوشی اور ذہنی تسکین کے لیے ہے۔ اسی دوران دروازے پر دستک ہوئی اور ناصر بھائی اندر داخل ہوئے۔ لاؤنج سے آتی آوازیں نسبتاً کم ضرور ہوئی تھیں، مگر ابھی تک بات چیت جاری تھی۔ ناصر بھائی آکر اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گئے تھے۔ ساتھ ہی ثروت آپا بھی اندر آئیں اور دوستانہ نظروں سے ندی کو دیکھتے ہوئے امی کے پاس بیڈ پر ہی بیٹھ گئیں۔

چند لمحے سب نے ایک دوسرے کی وہاں موجودگی کو تسلیم کرنے میں صرف کیے اور بالآخر ناصر بھائی بولے۔

''آج تک ہمارے ساتھ پچھلے کچھ عرصے میں جو بھی ہوا اور جس کا بھی قصور تھا وہ سب ایک الگ کہانی ہے لیکن پھر بھی الحمدللہ میں مطمئن ہوں امی کہ اتنا بہت کچھ ہونے اور اس کا نام لوگوں کی زبان پر عام ہونے کے باوجود میں اس کے لیے ایک بہترین رشتہ تلاش کرنے کے معاملے میں سرخرو ہورہا ہوں۔''

ندی اور امی کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں، امی کے کمزور پڑتے چہرے کو دیکھ کر اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہارا دیا تھا۔ باوجود اس کے کہ خود اس کا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا وہ امی کا ہاتھ سہلانے لگی۔

''اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ ہیں، سیاسی خاندان سے تعلق ہے، لڑکا پڑھا لکھا بھی ہے، قبول صورت بھی اور عمر میں بھی اس سے بمشکل چند سال ہی بڑا ہوگا۔۔۔ میں اپنے ساتھ ہی جیولر اور ٹیلر ماسٹر کو بھی لے آیا ہوں، البم میں سے آپ اور یہ جو ڈیزائن چاہے پسند کرلیں اور جتنی بھی جیولری کا آرڈر کرنا ہو، کردیں۔ میری طرف سے کوئی حد نہیں بس۔۔۔ اس طرح ٹیلر ماسٹر کو بھی اپنا درست ناپ اور پسند وغیرہ سے کہیں کہ بتادے تاکہ ریڈی میڈ لیے جانے والے تمام ڈریسز اس کے ناپ کے مطابق ہوں۔''

ناصر بھائی نے ندی کو براہ راست مخاطب کرنا اور اس کا نام لینا تو جانے کب سے چھوڑ دیا تھا۔ تبھی امی کو مخاطب کرکے ساری بات کی گئی۔

''اور امی! مزید سکون کی بات تو یہ ہے کہ وہ لوگ بھی سید ہیں، دیکھا اللہ نے ندی کی زندگی میں کتنی بہتریاں اور سکون لکھا ہے۔ پریشانیوں کا وقت تو سمجھیں ختم، اب اس کی نئی اور خوش گوار زندگی کا آغاز ہونے والا ہے۔'' ثروت آپا نے ناصر بھائی کی گفتگو کی حمایت کی تھی۔ ندی جو ابھی ان کے آنے سے چند لمحے پہلے ہی امی کے سامنے خود کو مطمئن اور پہلے جیسی پرسکون ظاہر کرنا چاہتی تھی لگتا تھا اب لبادہ اترنے کو تھا۔ خشک آنکھیں نم ہوکر ایک بار پھر کانچ سی چمکنے لگی تھیں۔ وہ اس وقت امی سے نظریں ملانے کی سکت نہیں رکھتی تھی کیونکہ جانتی تھی کہ ان سے نظریں ملنے کے بعد وہ خود پر قابو نہیں رکھ پائے گی۔ اپنے ہاتھ میں لیے ان کے ہاتھ کا سرد ہونا محسوس ہونے کے ساتھ ہی اسے بابا کی یاد بڑی شدت سے آئی تھی۔

''اگلے ہفتے کی تاریخ پکی ہوگئی ہے۔ کسی کو دعوت نامہ بھیجنا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اور نہ بھی بھیجیں تو میرا خیال ہے کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں بنتا اور۔۔۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''آپ دونوں ثروت آپا کے ساتھ باہر آکر جیولر اور ٹیلر ماسٹر کو گائیڈ کردیں۔'' وہ دروازے سے باہر نکل گئے۔

ایک تو اپنی لاڈلی بیٹی کی جدائی اور پھر ان حالات میں، یوں نکالے جانے کے انداز میں۔۔۔ امی کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ خود ندی کی کیفیت بھی اُن سے کچھ مختلف نہ تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ کسی طرح بابا اور ان کا پیار ایک بار پھر سے لوٹ آئے۔ والدین شاید بیٹیوں سے اسی لیے زیادہ پیار کرتے ہیں کہ نہ جانے ان کی آئندہ زندگی میں انہیں اتنا پیار، لاڈ اور مان میسر آبھی سکے گا کہ نہیں۔۔۔ جس شخص کے ہاتھوں میں وہ اپنے ہیرے سی بیٹی دے رہے ہیں وہ اس کی قدر کرسکے گا کہ نہیں کیونکہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بیاہی بیٹیوں کے دکھ بابل کی دہلیز کے اندر بیٹھی بیٹیوں سے کہیں زیادہ دل شکن اور اعصاب توڑ ہوتے ہیں جو اچھے خاصے والدین کو ریت کی بھربھری دیوار کی طرح آہستہ آہستہ زمین بوس کرتے چلے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بیٹی کے پیدا ہوتے ہی اس کو دی جانے والی تمام دعاؤں میں نصیب کے اچھے ہونے کی دعا سر فہرست ہمیشہ سے رہی ہے اور پھر ندی جس کو ملنے والے لاڈ پیار کی ایک دنیا گواہ تھی۔

''مجھے اتنا پیار نہ دو بابا
کل جانا مجھے نصیب نہ ہو
یہ جو ماتھا چوما کرتے ہو
کل اس پر شکن عجیب نہ ہو
میں جب بھی روتی ہوں بابا
تم آنسو پونچھا کرتے ہو
مجھے اتنی دور نہ چھوڑ آنا
میں روؤں اور تم قریب نہ ہو
میرے ناز اٹھاتے ہو بابا
میری چھوٹی چھوٹی خواہش پر

تم جان لٹاتے ہو بابا
کل ایسا نہ ہو اک نگری میں
میں تنہا تم کو یاد کروں
اور رو رو کر فریاد کروں
اے اللہ! میرے بابا سا
کوئی پیار جتانے والا ہو
میرے ناز اٹھانے والا ہو
مجھے اتنا پیار نہ دو بابا
کل جتنا مجھے نصیب نہ ہو"

"ندی! معاف کر دینا میرے بچے!" امی نے اپنے ہاتھوں میں موجود ندی کے ہاتھوں کو بھینچ کر اپنی آنکھوں سے لگایا تھا اور ان کے اس انداز پر ندی تڑپ ہی تو گئی تھی۔

"ایسا نا کہیں، میں مطمئن ہوں، جو کچھ ہو رہا ہے میری بہتری اور بھلے کے لیے ہو رہا ہے اور۔۔۔ اور۔۔۔ جب میں خوش ہوں تو آپ کو یہ پریشانی کیوں؟" ان کے ہاتھ اپنے ہونٹوں تک لے جا کر انہیں بوسہ دیتے ہوئے ندی نے اپنے اندر ابلتے یقین کے لاوے کو پس پشت ڈال کر انہیں حوصلہ دیا۔

"آپ ہی نے مجھے کہا تھا نا کہ اپنی زندگی کی گاڑی کو اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کے حوالے کر دو اور خود مطمئن ہو جاؤ تو وہ بحفاظت منزل پر پہنچاتا ضرور ہے چاہے راستہ کٹھن یا دشوار ہی کیوں نہ ہو۔"

"میری بچی! اللہ تجھے خوش رکھے آباد اور مطمئن رکھے۔"

"میرا خیال ہے میں بھی ٹیلر کو اپنا ناپ گھر پر ہی دے دوں، پھر کیا جاؤں گی دوبارہ بوتیک پر صرف ناپ لکھوانے۔" ثروت آپا کو اپنی فکر نے آن لیا تھا۔

"انھیں امی! وہیں لاؤنج میں بیٹھ کر جیولری کے ڈیزائن دیکھتے ہیں البم میں۔" ثروت آپا کا جوش و خروش روایتی تھا۔

ندی نے گہری سانس لیتے ہوئے آنکھیں بند کیں اور خود کلامی کے انداز میں زیر لب بولی۔

"یا اللہ! میری زندگی اور میرا نصیب سب تیری رضا کے لیے تیرے حوالے، جو تُو بہتر سمجھتا ہے وہ کرنا۔" ثروت آپا اٹھ کر امی کے تکیے کی سائیڈ پر آ کھڑی ہوئیں تو امی نے سرزنش کرتے ہوئے ہٹ جانے کو کہا۔

"ابھی اتنی لاغر نہیں ہوں بیٹا کہ کسی کے سہارے کی ضرورت پڑے، اکیلی چل پھر سکتی ہوں ابھی۔۔۔" بیڈ سے اتر کر بات کرتے ہوئے ثروت اور ندی کے ساتھ لاؤنج میں داخل ہوئیں تو عائشہ بھابھی اپنے لیے جیولری پسند کر رہی تھیں۔ بس یہیں تک کا منظر انہوں نے واضح دیکھا پھر جانے کیا ہوا کہ آنکھوں کے سامنے دھند سی چھانے لگی اور ٹانگوں نے جسم کا بوجھ اٹھانے سے انکار کرتے ہوئے معذوری ظاہر کی اور وہ وہیں کارپٹ پر ڈھیر ہو گئیں۔

☆☆☆

میران شاہ کے دوست ہوں، خوشی کا موقع ہو اور محفل رنگین نہ ہو، یہ بھلا کیسے ممکن تھا۔ یوں بھی اس وقت وہ جس حصے میں موجود تھا وہاں حویلی کے غیر متعلقہ ملازمین کا بھی آنا ممنوع تھا۔ الگ تھلگ سے اس حصے میں اس وقت میران کی شادی کو دنیا کی واحد اور آخری خوشی سمجھ کر منایا جا رہا تھا۔ یوں تو شادی میں چند روز باقی تھے مگر آج پہلا دن ہونے کی وجہ سے جوش و جذبہ کچھ انوکھا ہی تھا اور پھر اپنا آپ دکھانے کا موقع بھی تھا۔ اب تک کی ہونے والی شادیوں میں سب سے بڑھ کر داد وصول کرنے کی کوشش اور واہ واہ سننے کی خواہش میں میران تو ایک طرف، سارا انتظام اس کے دوستوں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ پہلے تو گاؤں کے اور نزدیکی گاؤں سے بلائے جانے والے گانے بجانے والے روایتی لوک گیتوں اور جگتوں سے محفل گرماتے رہے تھوڑی دیر بعد شہر سے چند ڈانسرز بھی پہنچنے والی تھیں جنہیں میران کے دو تین دوست خود اپنی جیپ میں لینے گئے ہوئے تھے اور جن کے ساتھ رات بھر کے پروگرام کی بکنگ کی گئی تھی۔ یوں بھی آج کل اسٹیج پر صرف ان کا ڈانس دیکھنے کے لیے لوگ کتنی ہی دیر ٹکٹ کے لیے قطار میں کھڑے

رہتے تھے اور ان کا نام مارکیٹ میں ہاٹ کیک کی طرح بکتا تھا جبھی انہیں منہ مانگے ریٹ پر آج کے فنکشن کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔

گہرے گلوں، چست چمک دار مگر باریک لباس زیب تن کیے میک اپ کی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جب وہ تینوں ڈانسرز داخل ہوئیں تو وہ تمام لوگ جو ان کی آمد سے بے خبر تھے کھلے منہ اور پھٹی آنکھوں سے بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ہی میران کے وہ دوست جو انہیں لے کر آئے تھے تفخر سے یوں سینہ تان کر چلتے آ رہے تھے گویا کوئی علاقہ فتح کر کے آئے ہوں۔ جب حیرت سے گنگ حاضرین اپنی جاگتی حالت میں واپس آئے تو سیٹیوں اور جملے اچھالنے کا کوئی لمحہ بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا گیا۔ جیبوں سے نوٹوں کی گڈیاں نکلنا شروع ہوئیں، میوزک سیٹ ہونے لگا تو ان تینوں ڈانسرز کے ساتھ آئے ان کے اسلحہ بردار باڈی گارڈز بھی تماشائیوں کے "لطف" کی راہ میں رکاوٹ نہ بنتے ہوئے سائیڈ پر ہو گئے۔

ایک دو اور پھر مسلسل میران ملکانی سائیں کی طرف سے کی گئی مسلسل فون کالز پر بدمزا ہو رہا تھا۔ جبھی ایک سائیڈ پر ہو کر آخر کار فون سننا ہی پڑا۔

"اماں سائیں! کیا مسئلہ ہے؟" وہ بھنایا ہوا تھا۔ سامنے جلوے دکھاتی حسینائیں اور کانوں میں پڑتی ماں کی آواز، اسے لگا وہ قورمہ کی لذیذ پلیٹ میں چینی ڈال کر کھا رہا ہو۔

"پتر بوت وڈا مسئلہ ہو گیا ہے، توں جلدی نال میرے پاس حویلی آ۔"

"اوہو اماں سائیں! میں اس وقت حویلی نہیں آ سکتا اور اب مجھے فون نہیں کرنا۔"

"پتر! ہم کسی نوں منہ دکھان جوگے نئیں رہیں گے، عزت خاک وچ رل جائے گی ساری۔۔۔ تو اک واری جلدی نال حویلی آ۔۔۔"

ان کے لہجے کی فریاد میران کو مزید طیش دلا گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ انہیں کسی نے ان ڈانسرز کے یہاں آنے کے متعلق بتا دیا ہے جس کی وجہ سے انہیں اپنی عزت خاک میں مل جانے کی فکر تھی۔ مہربانو کے ساتھ بھی کبھی کچھ ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔

"جو ہوتا ہے نا اماں سائیں! ہو جائے، عزت خاک میں ملے یا راکھ میں، میں صبح سے پہلے حویلی نہیں آؤں گا۔"

تلخ ہوتے ہوئے اس نے ملکانی سائیں کو جواب دیا اور میوزک کی تال پر تھرکتی کم عمر رقاصہ کو دیکھا جس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اپنے ساتھ ڈانس کرنے کی آفر کی تو میران نے دوبارہ ملکانی سائیں کی کال سے بچنے کے لیے فون سائلنٹ پر کر کے جیب میں ڈالا اور مقناطیسی کشش کی طرح کھنچتا ہوا اس کے قریب پہنچا تو دوستوں، یاروں نے دائرے میں کھڑے ہو کر وہ نوٹ نچھاور کیے کہ زمین پر نوٹوں کے علاوہ یہ ڈھونڈنا مشکل تھا کہ اس میں موجود کارپٹ کس رنگ کا ہے۔

☆☆☆

ناصر بھائی کی گاڑی ٹریفک میں سے رستہ بناتی ہاسپٹل کی طرف دوڑی چلی جا رہی تھی۔ پچھلی سیٹوں پر ندی امی کا سر گود میں لیے ان پر ذہن میں محفوظ ہر آیت ہر سورہ پڑھ پڑھ کر پھونکتے ہوئے اللہ سے ان کی صحت اور زندگی کی دعائیں بھیک کی طرح مانگ رہی تھی۔ گڑگڑا رہی تھی، فریاد کر رہی تھی اور لڑی کی مانند بہتے آنسوؤں کے ساتھ اس کی عدالت میں رحم کی اپیل کر رہی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ناصر بھائی بیک مرر سے بڑی دل گرفتگی کے عالم میں اسی کو دیکھ رہے تھے اور اسے یوں روتا بلبلاتا اور دعا کے لیے ہاتھ بلند کرتا دیکھ کر ان کا دل بھینچ رہا تھا۔

جتنی تیزی سے ان کے پاؤں کا وزن ایکسیلیٹر پر بڑھ رہا تھا اتنی ہی برق رفتاری سے انہیں پچھلا ایک ایک وقت یاد آ رہا تھا جب وہ ندی کے بغیر کھانا نہ کھایا کرتے تھے۔ اسے دیکھے بنا ان کے لیے سونے کا تصور ناممکن تھا۔ جسے خوش رکھنا اور دیکھنا ان کی زندگی

کی اولین ترجیح ہوتی تھی۔ آج وہ یوں رو رہی تھی، بلک رہی تھی اور وہ اسے تسلی کا حوصلے کا ایک بول بھی نہیں بول پا رہے تھے۔

"اگر اس نے غلطی کی تھی تو کیا اس کے لیے اتنی سزا کافی نہیں تھی؟" ان کے اندر سے ہی ایک آواز ندی کی حمایت میں ابھری۔

"اسے کہاں، سزا تو مجھے مل رہی ہے نا، لوگوں کا سامنا تو میں کرتا ہوں، باتیں تو مجھے سننا پڑتی ہیں۔" ایک دم ہی کسی دوسری آواز کی بازگشت بھی ابھری۔

"تم باتیں سنو گے اور دو چار دن پھر بس۔۔۔ مگر ندی کو شادی کے نام پر جہاں جھونک رہے ہو وہاں تو وہ ساری زندگی یہی باتیں، طعنے اور شاید ظلم بھی سہتی رہے۔ تم تو اسے ہی داماں کر کے بھیج رہے ہونا، نہ کوئی میکے کی امید نہ بھائیوں کا مان۔۔۔ اور جانتے ہو جن لڑکیوں کو میکے میں یاد کرنے اور عید تہوار پر بلانے والا کوئی نہ ہو انہیں سسرال میں چاہے کتنی ہی عزت اور مان کیوں نہ دیا جائے ہر چاندرات کو ان کے تکیے آنسوؤں سے ضرور بھیگتے ہیں، ہر خوشی منانے سے پہلے ان کے دوپٹے کے پلو وہ آنسو ضرور جذب کرتے ہیں جنہیں وہ دنیا والوں کے سامنے خوشی کے آنسوؤں کا نام دیتے ہوئے بھیگی آنکھوں سے ہنس پڑتی ہیں۔

"میں نے اس کے لیے ایک بہترین رشتے کا انتخاب کیا ہے اور میں مطمئن ہوں۔"

"نہ لڑکا دیکھا اور نہ ہی اس کے قول و کردار کا کچھ معلوم۔۔۔ ہونہہ! لیکن رشتہ بہترین ہے۔ تم اپنی ذات میں اپنے مزاج کے خدا بن ہی گئے ہو تو انصاف بھی تو کرو۔۔۔ بھائی، بہنوں کی دعاؤں کے حصار میں ہی رہیں تو کامیاب ہوتے ہیں، جن بھائیوں کے تعاقب میں ان کی اپنی ہی بہنوں کی آہیں لگ جائیں تو لاکھ رستہ بدلیں، منزل بے سکون ہی رہتی ہے" بابا کو تو خود سے ناراض دنیا سے رخصت کر ہی چکے ہو، اب ماں اور اپنی چھوٹی اور لاڈلی بہن کے ذریعے ہی ان کی روح کو خوش کرو۔"

اپنے اندر ہوتی جنگ کے باعث انہیں پتا ہی نہ چلا کب ان کی گاڑی ہاسپٹل کے عین سامنے جا پہنچی تھی۔ انہوں نے ایک جھٹکے سے بریک لگایا۔ سامنے ہی موجود اسٹریچر لیا اور ساتھ ڈیوٹی پر کھڑے وارڈ بوائے کی مدد سے امی کو گاڑی سے نکال کر اسٹریچر پر لٹا کر برق رفتاری سے اسپتال کے اندر کی طرف بھاگے۔ ندی بھی بڑی سی سیاہ چادر کو سنبھالتی ہوئی ان کے پیچھے تھی۔

ناصر بھائی اس وقت ارد گرد سے بے خبر ایک ایک لمحہ بھی ضائع ہونے نہیں دینا چاہتے تھے۔ بجلی کی سی رفتار سے ایمرجنسی وارڈ میں اسٹریچر لے کر داخل ہوئے تو وارڈ بوائے نے ندی کو معذرت خواہانہ انداز میں باہر ہی روک دیا۔

"معاف کیجیے گا بی بی! مریض کے ساتھ صرف ایک ہی شخص اندر جا سکتا ہے۔" اور تب وہ ست قدموں سے چلتی ہوئی ذرا سائیڈ پر دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ باوجود ضبط کے اس کے آنسو رکنے میں نہیں آ رہے تھے۔ وہ اپنی ماں کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اسی لیے اپنی دونوں ہتھیلیوں میں منہ چھپا کر رو دی کہ چاہنے پر بھی اپنی ہچکیوں کو نہیں روک پائی تھی اور اسے یوں منہ چھپا کر تنہا تنہا کھڑے روتا دیکھ کر ہی اماں کے کمرے کی طرف جاتی ثمینہ کے قدم رک گئے تھے۔

اس وقت تو جلدی میں شاہ زین گھر سے اماں کو لے کر نکل آیا تھا مگر بعد میں زرین کے حالیہ کیے گئے انکشافات کے بعد اسے ثمینہ کا گھر میں اس وقت اکیلا رہنا غیر محفوظ محسوس ہوا تو جا کر اسے بھی لے آیا۔ ابھی وہ باہر سے آئی ہی تھی کہ ندی کو دیکھ کر وہ مزید آگے نہیں بڑھ سکی اور اس کے قریب جا کر ندی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"خیریت تو ہے نا؟ کسے لے کر آئی ہیں یہاں؟"

ثمینہ کے یوں مخاطب کرنے پر اس نے منہ سے ہاتھ ہٹائے تو ثمینہ اتنا مکمل حسن دیکھ کر حیران رہ گئی۔ بڑی بڑی شفاف سی آنکھیں جو یقیناً مسلسل رونے سے متورم اور سوجی ہوئی تھیں۔ بے داغ سفید چہرہ جو گریہ وزاری سے بہت زیادہ سرخ نظر آتا تھا۔ گلابی ہونٹ اور روئی کے گالوں سے نرم ہاتھ۔ وہ لڑکی ہو کر بھی اسے یک ٹک دیکھے گئی تھی۔

لانبی پلکوں پر ابھی تک اکا دکا آنسو شبنم کے قطروں کی طرح اٹک گئے تھے اور اس پر گہری سیاہ چادر، جو اسے مزید حسین بنا رہی تھی۔

"پریشان نہ ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا، بس پلیز آپ روئیں مت۔"

ثمینہ نے دلاسا دیتے ہوئے ندی کو گلے لگا لیا تھا اور یہی ہمدردی کے دو بول، اپنائیت کا ذرا سا لمس اور احساس کے چند لمحے، یہی سب کچھ تو تھا جس کی خواہش یہ دل بار بار کرتا اور سر پٹختا تھا۔ اب ثمینہ نے اتنی محبت سے بات کرتے ہوئے اسے دلاسا دیا اور گلے لگایا کہ اس کا دل چاہا وہ زور زور سے روئے، چیخے اور اپنی آواز کو بلند کر کے دنیا والوں کو بتائے کہ دیکھو میں اتنی بری بھی نہیں ہوں، اب بھی دنیا میں ایسے لوگ ہیں جو مجھے گلے لگا کر پیار کر سکتے ہیں، جن کے لیے میں کوئی اچھوت نہیں ہوں، جو خود کو فرشتہ سمجھ کر مجھے دھتکارنے کے بجائے اپنے ہی جیسا ایک ایسا انسان سمجھتے ہیں جو کہ غلطیوں کا پتلا ہے۔"

اس نے ثمینہ کو جس طرح بھینچ کر گلے لگایا تھا وہ جان چکی تھی کہ معصوم حسن والی یہ لڑکی کس قدر تنہا ہے۔ سو اسے حوصلہ دیتے ہوئے آہستہ آہستہ اس کی کمر تھپکنے لگی اور ندی جو چند لمحوں پہلے دل کھول کر رونے کی خواہش کر رہی تھی، ثمینہ سے گلے مل کر یوں سیراب ہوئی کہ آنسو جہاں تھے وہیں رک گئے اور زبان دل اور آنکھیں سب اپنی ماں کے لیے مجسم دعا بن گئے مگر اس سے پہلے کہ وہ خود کو ثمینہ سے الگ کر کے اس کا شکریہ ادا کرتی سامنے ریسپشن کی طرف سے آتے شاہ زین کو دیکھ کر اس کا دل تو جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا تھا۔ خود شاہ زین بھی ثمینہ اور ندی کو آپس میں گلے ملتا دیکھ کر وہیں ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔

مدت کے بعد آج اسے دیکھ کر منیر
اک بار دل تو دھڑکا مگر پھر سنبھل گیا
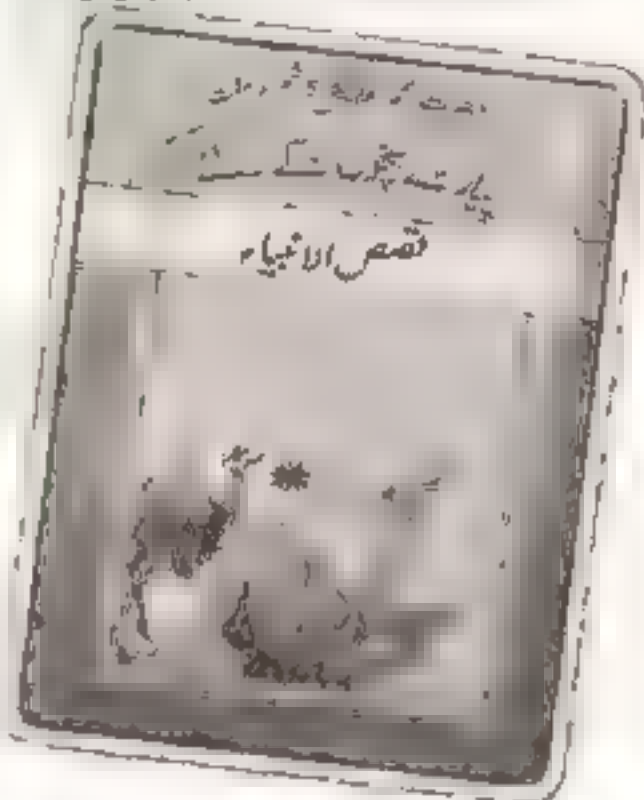
سائیاں رات ادھوری ہے، سائیاں مات ادھوری ہے
دشمن چوکنا ہے لیکن، سائیاں گھات ادھوری ہے
سائیاں راہیں تنگ بہت، دل کم ہیں اور سنگ بہت
پھر بھی تیرے رنگ بہت، خلقت ساری دنگ بہت
سائیاں رات ادھوری ہے، سائیاں گھات ادھوری ہے

بار بار فون کرنے کے بعد بھی میران شاہ فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ سرد ہوتے جسم اور زرد پڑتے چہرے کے ساتھ ملکانی سائیں اپنے نیم مردہ وجود کو لیے مہمان خواتین کے ہمراہ بیٹھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیوانوں کی طرح دائیں بائیں دیکھ رہی تھیں اور کبھی گردن جھکا کر قدموں میں بیٹھی سوئی کے جسم کے بال گننے لگتیں۔ مکمل ہوش و حواس میں ہونے کے باوجود ان کا ذہن بالکل سپاٹ تھا۔ ان کے گرد ڈھولک کی تھاپ اور تالیوں کی گونج میں کون سے گیت گائے جا رہے ہیں، گاؤں کی عورتیں کس گانے پر لڈی ڈالتے ہوئے گیت کے کون سے فقرے پر شرماتے، لجاتے اور دوپٹے میں منہ چھپاتے ہوئے قہقہے لگاتی پنجوں کے بل بیٹھنے لگتی ہیں، ملازمائیں سب کی خاطر مدارات کس انداز میں کر رہی ہیں، یہ سب باتیں ان کے لیے بالکل نہ سمجھ میں آنے والی اور نا آشنا سی معلوم ہو رہی تھیں۔ اتنے تمام لوگوں کی موجودگی میں بھی تنہائی اور بے بسی کے اس احساس کے تحت ان کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

ان کی لاڈلی بیٹی، ایک انجان شہر میں رات کے اس پہلے پہلے پہر جب ان کے خاندان کی کوئی لڑکی اس وقت کھلے آسمان تک کے نیچے کھڑی نہ ہوا کرتی تو وہ کہاں اور کس کے ساتھ ہے اس وقت؟ اور کیا صرف آج یا۔۔۔ پہلے بھی وہ ہاسٹل سے یوں اس وقت کہیں چلی جایا کرتی ہے؟ کیونکہ اس سے پہلے تو کبھی رات کو کم ہی بات ہوا کرتی تھی۔ ہمیشہ ہی ملکانی سائیں شام سات بجے رات کا کھانا کھانے سے کچھ دیر پہلے اُس سے بات کر کے خیریت معلوم کر لیا کرتیں۔ کیا میران شاہ اور شاہ سائیں کو مہربانو کے متعلق بتا دینا چاہیے یا صبح تک کا انتظار کرنا بہتر ہوگا اور اگر ان دونوں میں سے کسی کے علم میں یہ بات آگئی کہ مہربانو آج رات ہاسٹل کے علاوہ کسی اور جگہ پر گزارے گی تو کس قدر ہولناک وقت ہوگا وہ۔۔۔ اور اگر یہی بات رحمٰن شاہ کے کانوں سے جا ٹکرائی تو۔۔۔؟

دہشت اور خوف کے مارے ان کی آنکھیں گویا باہر ابلنے کو تھیں اور یہ بات بھی ایسی تھی کہ وہ کسی اور سے مشورہ تو کیا کسی اور کے ساتھ شیئر بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ چاروں طرف سب خوش و خرم چھوٹی چھوٹی باتوں پر دیر تک ہنستے ہی چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے موقع غنیمت جانا اور کنیزاں کو ایک بار پھر سب کا خیال رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے شاہ سائیں کے کمرے کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھتی چلی گئیں۔ خراماں خراماں چلتی سوئی ان کے تعاقب میں بڑی خاموشی کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ شاہ سائیں کے کمرے کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر لحہ بھر کے لیے ملکانی سائیں نے اپنے اوسان بحال کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے تھوک نگلا اور دروازے کے ہینڈل پر دائیں ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈال کر کھولنے کے بعد اندر داخل ہوئیں مگر لائٹ براؤن اور انگوری رنگ کے فرنیچر سے مزین کمرہ خالی تھا۔ اپنا وجود تقریباً گھسیٹتے ہوئے وہ صوفے پر گر سی گئی تھیں۔ یہ آج ان کی زندگی میں کیسا موڑ آگیا تھا جب ہر طرف سے ہی ان کا ذہن آندھیوں کی زد میں آیا ہوا تھا۔ ظاہری طور پر ان کی حویلی کے در و دیوار پر خوشیاں رقصاں اور رونقیں جلوہ افروز تھیں مگر یہ ان کا دل جانتا تھا کہ پس پشت کیا کہانی تھی۔ ہر طرف سے خوف اور بے یقینی کے بادل جس طرح امڈ کر آ رہے تھے، اس میں انہیں اپنا آپ اس زرد پتے کی طرح محسوس ہونے لگا تھا جو بارش برسنے سے پہلے ہی اس کی شدت اور ہواؤں کی تیزی کے خوف سے لرزتا رہتا ہو۔

انہیں یوں پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا دیکھ کر سوئی ان کی گود میں آ بیٹھی تھی اور اسی دوران واش روم سے پانی کی آواز آنے پر ملکانی سائیں کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا یعنی شاہ سائیں کمرے میں ہی موجود تھے۔ ملکانی سائیں چادر درست کرتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھیں، اسی دوران واش روم کا دروازہ کھلا اور شاہ سائیں کمرے میں داخل ہو کر ان پر نظر پڑتے ہی چونک گئے۔

"خیریت تو ہے نا سب؟" خلاف معمول انہیں یوں مہمانوں کو چھوڑ کر بیڈ روم میں بیٹھا دیکھ کر ان کے منہ سے نکلنے والا سوال برجستہ تھا۔

"آہو خیر تے ہے پر۔۔۔ وہ۔۔۔ مہربانو دے بارے وچ بات کرنی تھی۔" رک رک کر انہوں نے بالآخر اپنا جملہ مکمل کیا تو شاہ سائیں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر بیڈ کے دائیں طرف موجود صوفے پر بیٹھ گئے اور بولے۔

"مہربانو کے بارے میں اب کوئی بھی بات کرنے کا وقت نہیں بچا ہے ملکانی۔" ملکانی چونکیں۔

"تم اور تمہارے بھائی مل کر میری اجازت تو دور مجھے بتائے بغیر رحمٰن شاہ کو ہاں کر چکے ہو، انہیں زبان دے چکے ہو، اُن کے گھر شادی کی رسومات شروع ہو چکی ہیں۔۔۔ اور اب۔۔۔ اب کیا بات کرنا باقی رہ گئی ہے؟"

تلخ ہوتے لہجے کو انہوں نے آواز کے دھیمے پن میں چھپانا چاہا کیونکہ درحقیقت وہ اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ یہ سب کیا کرایا ملکانی کے بھائیوں کا تھا جنہوں نے اس وقت ملکانی کی موجودگی کو محض استعمال کیا تھا اور اس کے بعد رحمٰن شاہ کو انہی کی طرف سے آس دلائی جاتی رہی اور وہ بھی اس حد تک کہ وہ مہربانو پر اپنا حق سمجھنے لگا۔

"اب اگر میں رحمٰن شاہ کو اس موقع پر انکار کرتا ہوں تو تمہارے بھائیوں کو اپنی عزت اور انا داؤ پر لگتی محسوس ہوگی۔ وہ تمہیں پریشان کریں گے اور مجھے پتا ہے کہ تم ان کی ناراضی کسی طور برداشت نہیں کر پاؤ گی ہاں البتہ اپنی بیٹی کو اس اندھے کنویں میں جھونک کر شاید تمہیں اتنی تکلیف نہ ہو جتنی اپنے بھائیوں کی ناراضی سے ہوگی۔"

ملکانی سائیں نے بڑی ترحم آمیز نظروں سے شاہ سائیں کو دیکھا۔ خود وہ بھی اس رشتے کے حق میں صرف اس لیے تھیں کہ رحمٰن شاہ سے شادی نہ ہونے کی صورت میں مہربانو کو اگلے کئی برس تک شادی کے لیے انتظار کرنا پڑتا اور اسی وجہ سے انہوں نے اپنے بھائیوں کی ہاں میں ہاں ملائی تھی لیکن اس وقت تو مسئلہ کچھ اور ہی تھا۔

"لیکن ایک بات میں تم پر واضح کر دوں کہ میں نے اس معاملے پر بہت سوچا ہے اور میں اپنی بیٹی کی زندگی برباد نہیں ہونے دوں گا، چاہے وہ شادی کی رسومات کریں یا بارات لے آئیں۔۔۔ اور اسی مقصد کے لیے میں نے صبح برادری کے بڑوں کو مدعو کر رکھا ہے۔"

"کس دی شادی شاہ سائیں! مہربانو تے رب جاندا ہے اج اپنے ہوسٹل دے بجائے ساری رات کدر گزارنی ہے؟" شاہ سائیں کے فیصلہ سنانے پر اب ان سے رہا نہ گیا تھا۔ اُن کی وجہ سے ان کے بھائیوں کا سر نیچا ہو اس خیال نے سونے پر سہاگہ کا کام کرتے ہوئے لہجے کو زہر خند بنا دیا تھا۔

"کیا مطلب ہے اس بات کا؟" یوں لگا گویا شاہ سائیں کے جسم کو کوئی برقی رو چھو گزری ہو، یہ بات تھی، طعنہ تھا یا پھر تشویش بھرا محض ایک جملہ، وہ سمجھ نہیں پائے تھے اور نہ ہی سمجھنا چاہتے تھے کہ اس بات کو سننے کے بعد ان کا ذہن لہجہ جانچنے کی پوزیشن میں بھلا رہا ہی کب تھا۔

"مہربانو اج اپنے ہوسٹل نئیں گئی، میں نے آپ اس دی سہیلیوں کے ساتھ بات کی ہے اور وہ دونوں بوت پریشان سیں کہ رب جاندا اے او کدر گئی؟" ملکانی سائیں نے میری اور کنول کی زبانی سننے والی تمام روداد بیان کردی تھی۔

"بوت منع کیا تھا نا کہ نہ بھیجو دھی ذات کو اتنی دور۔۔۔ میکوں تے چلو عقل نئیں، میرے بھائیوں نے وی منع کیا تھا نا، پر کسی نہ منیے، ہون ویخ لیا نا انجام۔" وہ ایک بار پھر اپنے بھائیوں کو سچا ثابت کرنے پر تلی تھیں۔

"شاہ سائیں! میرے بھائیوں نے کدی غلط گل نئیں کیتی اور ایہہ تے اب ثابت بھی ہوگیا ہے۔"

"مہربانو آج رات ہاسٹل نہیں گئی، یہ کس طرح ممکن تھا اور اگر یہ حقیقت ہے تو پھر اس وقت وہ کہاں ہے؟" شاہ سائیں نے خود کلامی کی۔

"میرا تے اپنا کالجا پھٹ رہا ہے، رحمٰن شاہ کو یا اللہ زندگی دے، میرے بھائیوں نوں پتا لگا تے فیر کی ہووے گا، وناں تے ایہی کہنا ہے کہ منع کیتا سی ناں تے بات مان جائے تے اج ایہہ دن نہ دیخنا پڑتا۔"

"میری بیٹی کوئی غلط قدم نہیں اٹھا سکتی، اتنا تو یقین ہے مجھے اُس پر۔" انہوں نے مضبوط لہجے سے کہا۔

"نئیں اٹھا سکتی تے فیر گئی کدر؟ سہیلیاں نے اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر چلیاں گئیاں ہوسٹل تے وہ خود کدر گئی، کیوں نا پہنچی واپس شاہ سائیں؟" شاہ سائیں خاموش رہ کر ذہن کو ہر قسم کے ممکنات پر دوڑا رہے تھے۔

"حویلی مہمانوں سے بھری ہوئی تھی۔ کوئی ایسی ویسی گل ہوگئی تے کیہڑا منہ دکھائیں گے دنیا نوں؟"

"ملکانی! دنیا والوں کی نہیں صرف اور صرف اپنی بیٹی کی فکر کرو اور دعا کرو کہ وہ خیریت سے ہو۔" اضطراب کے عالم میں وہ اٹھ کر کمرے میں ہی ادھر اُدھر ٹہلنے لگے تھے۔ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے وہ عجیب کشمکش کا شکار تھے کہ آخر اتنی دور بیٹھ کر وہ کریں تو کیا کریں۔۔۔ یوں بھی بیٹی کا مسئلہ تھا وہ کسی دوسرے کو کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے لہٰذا جو بھی تھا اور جیسے بھی تھا خود وہاں جا کر ساری صورت حال کا جائزہ لینا تھا سو فوراً فون پر نمبر ڈائل کر کے ایئر ٹکٹ کا کہا اور ملکانی سائیں کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کسی کے سامنے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے، خواہ وہ میران ہو یا تمہارے بھائی، سمجھیں نا؟"

"او تے سب ٹھیک ہے پر کی۔۔۔"

"میں خود جا کر دیکھتا ہوں اصل بات کیا ہے، تب تک کسی کو اس بات کی خبر نہ ہو، میران بے شک ہمارا بیٹا ہے مگر بے حد جذباتی، اس لیے اس کے سامنے اس بات کا تذکرہ تک نہ کرنا۔" شاہ سائیں نے عجلت میں اپنا والٹ چیک کرتے ہوئے چند ہدایات دیں۔ اس بات سے وہ قطعی طور پر لاعلم تھے کہ ملکانی سائیں تو میران کو آگاہ کرنے کے تمام جتن کر چکی تھیں مگر سوئے اتفاق کہ ایسا ہو نہ سکا ورنہ اب تک یقیناً میران شاہ کے جذباتی پن کی وجہ سے سبھی اس بات سے آگاہ ہو چکے ہوتے۔

"میں چلتا ہوں، مہربانو کے لیے دعا کرنا، اللہ ہماری بیٹی کی حفاظت کرے۔" برق رفتاری سے کمرے سے نکلتے ہوئے انہوں نے کہا اور ملکانی سائیں کا جواب سننے میں وقت ضائع کیے بغیر کمرے سے نکل گئے۔

وہ جانتے تھے کہ حسد میں آکر انسان واقعی اندھا ہو جاتا ہے اور اگر وہ ایک بھاری اکثریت میں مقبول تھے تو ان کے مخالفین کی تعداد بھی تو کم نہ ہوگی۔ کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو ڈنکے کی چوٹ پر مخالفت کا اعلان کرتے ہیں مگر کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو گھر کے بھیدی بن کر لنکا ڈھانے میں مصروف رہتے ہیں اور شاہ سائیں ہمیشہ انہی کی طرف سے محتاط رہنے کی کوشش کرتے تھے مگر اب ایسا کیا ہوا مہربانو کے ساتھ کہ وہ واپس ہاسٹل نہ پہنچ سکی۔ سب سے پہلے وہ اس کی دوستوں سے خود ملنا اور بات کرنا چاہتے تھے۔ باقی تمام آپشنز استعمال کرنے کا ارادہ فی الحال ملتوی کر دیا گیا تھا تاوقتیکہ وہ ساری صورت حال سے مکمل طور پر آگاہ ہو جائیں۔

☆☆☆

میں نے اس طور سے چاہا تجھے اکثر جاناں
جیسے ماہتاب کو بے انت سمندر چاہے
جیسے سورج کی کرن سیپ کے دل میں اترے
جیسے خوشبو کو ہوا رنگ سے ہٹ کر چاہے

کتنی عجیب بات تھی اور کس قدر دلچسپ صورت حال تھی کہ وہ جس سے ملنے کی آرزو اکمل کے دل میں روز بروز بڑھ رہی تھی اور جس سے صرف ایک بار مل لینے اور اپنے جذبات اس تک پہنچا لینے کو وہ اتنا بے قرار تھا کہ ایک روز ندی تک سے دعا کرنے کو کہہ ڈالا آج وہ اس کے سامنے تو تھی، دعا تو قبول ہو چکی تھی مگر وہ اس سے ایک بھی لفظ کہہ نہیں پا رہا تھا۔ ایک کونے میں دروازے کے بالکل ساتھ وہ کھڑا تھا اور سامنے لفٹ کی دیوار کے ساتھ چپکی مہربانو بیٹھی گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائی دونوں ٹانگوں کے گرد بازو لپیٹے یقیناً کچھ پڑھنے میں مصروف تھی۔ قدرت نے آج اُن دونوں کو ایک عجیب موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔ ایک دوسرے کے سامنے اور اس قدر نزدیک ہونے کے باوجود آپس میں بات چیت کا کوئی امکان پیدا ہوتا نظر نہیں آتا تھا اور پانچ دس منٹ کی تو بات تھی نہیں، انہیں پوری رات اسی لفٹ میں گزارنا تھی۔ جبھی اکمل نے مہربانو کے چہرے پر لرزتے خوف کے سائے کچھ کم کرنے کا سوچتے ہوئے گلا صاف کیا تو مہربانو کے تیزی سے ہلتے ہونٹ لمحہ بھر کو رک گئے اور آنکھیں پلکیں جھپکنے کا عمل ملتوی کرتے ہوئے پھر سے یوں پھیل گئیں جیسے اندھیری رات میں کسی نے دروازے پر پراسراری دستک دے ڈالی ہو۔

"مہربانو۔۔۔!" اکمل کے منہ سے نکلتے یہ چند حروف جب اس کے نام کا روپ دھارتے ہوئے کانوں سے ٹکرائے تو مہربانو کو لگا جیسے نہ تو یہ لہجہ اجنبی ہے اور نہ ہی آواز البتہ دل کے دھڑکنے کی جو رفتار تھی وہ پہلے سے کہیں تیز ضرور ہوگئی تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ آج اچانک پیش آجانے والی یہ صورت حال پریشان کن تو ضرور ہے مگر آپ پلیز مجھ سے خوف زدہ نہ ہوں۔ میں کوئی غلط قسم کا انسان نہیں ہوں اور نہ ہی آپ کو مجھ سے کسی بھی قسم کا کوئی خطرہ ہے۔۔۔" اکمل چند لمحے رکا۔

"یہ جو کچھ بھی ہوا، اس میں نہ میرا کوئی عمل دخل تھا اور نہ ہی کوئی کوشش، یہ سب اچانک کس طرح ہوگیا خود مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ میں نے بس یونہی آنکھیں بند کر کے لفٹ میں قدم رکھ کیسے دیا، کیونکہ یقینی طور پر اگر لفٹ خراب ہے اور اس کا انتظامیہ کو بھی علم ہے تو باہر نوٹس ضرور لگا ہوا ہوگا، جو ہم دونوں ہی دیکھنے سے رہ گئے۔"

"اگر لفٹ خراب تھی تو چھوٹا سا کیوں بہت بڑا لکھ کر لگانا چاہیے تھا کہ لفٹ استعمال نہ کی جائے یا پھر لفٹ کے آگے ریڈ ربن لگا دیتے تاکہ جو نہیں بھی پڑھ سکتا اسے بھی پتا چل جاتا۔" سر اسی انداز میں جھکائے ہوئے مہربانو بولی تو تلخی اس کے لہجے میں بھرپور نمایاں تھی۔ مگر اکمل کے لیے یہ بات ہی تسلی بخش تھی کہ وہ کچھ بولی تو سہی کیونکہ جو خوف کے عالم میں خاموش رہتا ہے خوف اسے دہشت میں بدل کر دماغ پر اپنا قبضہ جما لیتا ہے۔

"یہی تو المیہ ہے کہ ہم بنیادی حفاظتی اصول تک سے غفلت برت جاتے ہیں حالانکہ اس کے نقصان بعض اوقات شدید بھی ہو سکتے ہیں۔"

"اور میں جانتی ہوں کہ اس حادثے کے بعد ہونے والا میرا نقصان کسی صورت پورا ہونے والا نہیں۔" مہربانو نے بہت دھیمی آواز میں خود کلامی کی

تھی جسے اکمل سن لینے کے باوجود ان سنی کر گیا تھا۔
چند لمحے خاموشی کی نذر ہوئے۔
"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کو اپنے متعلق کچھ بتاؤں۔۔۔آئی مین انٹروڈکشن۔۔۔" وہ مہربانو کی خاموشی کو گفتگو میں بدلنا چاہتا تھا۔ جانتا تھا کہ وقت تو گزرنا ہی ہے یونہی خاموش رہ کر بھی لفٹ کے اندر ہی صبح ہونی ہے اور بات چیت کر لی جائے تب بھی صورت حال یہی رہنی ہے ہاں البتہ بات چیت کرنے سے ذہنوں کا بوجھل پن ضرور کم ہو سکتا تھا، جبھی وہ چاہتا تھا کہ کچھ اپنی کہی جائے اور کچھ اس کی سنی جائے مگر یہ صرف وہی چاہتا تھا، مہربانو کے چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ خاموش رہنا چاہتی ہے جس کی تصدیق اس نے زبان سے بھی کر دی۔
"میرا خیال ہے آپ یہ تکلیف رہنے ہی دیں۔"
مہربانو کے یوں صاف جواب پر تو وہ حیران رہ گیا تھا کیونکہ اس طرح کے بغیر لگی لپٹی کے جواب کی اسے مہربانو سے ہرگز توقع نہیں تھی۔ اس کا یہ انداز بے اختیار اسے ندی کی یاد دلا گیا تھا مگر صرف اس جملے تک ہی، ورنہ تو دونوں ہی کی شخصیت ایک دوسرے سے بالکل متضاد تھی۔
"چلیں ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی، ویسے میری ایک بہت اچھی دوست اور کزن کی یاد دلا دی آپ نے، اتنے روکھے انداز میں جواب دے کر۔" وہ کہے بنا رہ نہیں پایا تھا۔ مہربانو کی روشن پیشانی پر سلوٹیں ابھریں اور اس نے گردن کو ہلکا سا موڑ کر اکمل کے جوتوں کو دیکھا۔
"نام تو اس کا ندرت ہے مگر قریبی لوگ اسے ندی ہی کہتے ہیں اور جس طرح آپ نے ابھی لمحہ بھر میں حساب چکتا کیا ہے وہ بھی اسی طرح کسی کا ادھار نہیں رکھتی تھی جو بات ہو فوراً اسے منہ پر۔۔۔"
دائیں ٹانگ موڑ کر جوتا دیوار سے ٹکاتے ہوئے اس نے گہری سانس لی۔
"لیکن اب تو وہ سب باتیں اور اس کا وہ انداز خواب سا لگتا ہے، حالات نے بہت بدل دیا ہے اسے۔۔۔" وہ افسردہ ہو گیا تھا اور اس کی آواز میں چھپے دکھ کو محسوس کرتے ہوئے مہربانو سے رہا نہ گیا اور وہ پوچھ بیٹھی۔
"ایسا کیا ہوا اُس کے ساتھ؟"
"وہی ہمارے معاشرے کا سطحی رویہ۔۔۔ ہونہہ! یونیورسٹی میں کسی میران نامی وڈیرے سے ایک دو دفعہ اس طرح جملوں کا تبادلہ ہوا جسے میران نے اپنی بے عزتی تصور کرتے ہوئے اس طرح بدلہ لیا کہ ندی کو خود گھر والوں کے سامنے اپنے کردار کی گواہیاں دینی پڑیں۔"
"میران۔۔۔" مہربانو کے ذہن میں ہر طرف اس نام کی گونج سنائی دینے لگی تھی۔ اس کا اپنا بھائی، ایک لڑکی کی زندگی تباہ کرنے کا ذمہ دار بنا اور یونیورسٹی چھوڑ جانا بھی یقیناً اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ وہ چونکہ ان دنوں میں یہاں تھی اور یہاں میڈیکل کی سخت پڑھائی کے بعد نہ تو روزمرہ اخبارات کی ورق گردانی کا وقت ملا کرتا اور نہ ہی اسے ان حالات حاضرہ کے پرزوں سے کوئی خاص دلچسپی تھی کہ وہ ان کے لیے ٹائم نکالا کرتی۔ حویلی میں یوں بھی اخبار روزانہ کی بنیاد پر نہیں آیا کرتا تھا کیونکہ شاہ سائیں زیادہ وقت شہر میں گزارا کرتے تھے اس لیے جب وہ گاؤں میں ہوتے تو منشی چاچا ہر صبح ان کے اٹھنے سے پہلے مختلف اخبارات ناشتے کی میز پر پہنچا دیا کرتے جن کا مطالعہ وقتاً فوقتاً سارا دن جاری رہتا۔
"یہ جاگیردار، وڈیرے خود کو سب سے اعلا وارفع کیوں سمجھنے لگتے ہیں؟ یہ دوسرے لوگوں کو بھی اپنی ہی طرح کا کوئی انسان سمجھنے کے بجائے انہیں کیڑے مکوڑوں کا ہی درجہ دینے پر بضد کیوں نظر آتے ہیں؟ کیا یہ نہیں جانتے کہ رستے میں پڑا ایک چھوٹا سا پتھر جسے وہ حقیر جانتے اور سمجھتے ہیں وہ بھی کسی دن ٹھوکر لگنے کا باعث بن کر انہیں منہ کے بل گرا سکتا ہے۔ اسی طرح جیسے ایک ننھی اور بے ضرر سی چیونٹی ہاتھی کی موت کا سبب بنتی ہے۔" ندی اس کی بچپن کی سب

سے بہترین دوست تھی جسے وہ ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا تھا اور آج کل اسے مشکل میں جان کر افسردہ رہنے لگا تھا۔ تبھی اس کا ذکر آیا تو وہ اپنا دکھ چھپا نہیں پایا اور چھپاتا بھی کیوں اور کس سے؟
"یقین کرو مہربانو! مجھ سے اس کا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔ اس کی کردار کشی ہونے پر خود اس کے سگے بھائی نے اس پر اعتماد نہیں کیا، اسی صدمے میں اس کے بابا اللہ کو پیارے ہو گئے، دنیا والوں کی باتیں اور طعنے الگ سنے، صرف اس وجہ سے کہ اسے اپنوں کی ڈھال نہیں ملی اس وقت جب اسے ان کی سخت ضرورت تھی۔ ابھی میں گاڑی میں آتے ہوئے اسی سے بات کر رہا تھا اور تبھی دل ایسا بوجھل ہوا کہ فون اٹھانے کا خیال بھی نہیں رہا۔" مہربانو نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا وہ دیوار سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے ہوئے تھا۔ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے باتیں کرتے ہوئے اکمل کو دیکھ کر مہربانو نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس وقت لفٹ کے اندر وہ موجود ہے اگر اس کی جگہ کوئی اور آدمی اس کے ساتھ اندر داخل ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔۔۔ یہ سوچ ذہن میں آتے ہی اس کے پورے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی تھی۔
لیکن اب صبح لفٹ سے باہر نکلنے پر کیا ہوگا؟ یہ خیال ہی اس کا خون خشک کیے دے رہا تھا۔ میری اور کنول نے اسے کہاں کہاں ڈھونڈا ہوگا، ملکانی سائیں کا رات کو اس سے بات نہ ہونے پر کیا ردعمل ہوگا اور اگر ان کے علم میں اس کا رات بھر ہاسٹل نہ جانا آ گیا تو کیا ہوگا؟ یہ اور اس جیسے بہت سے سوالیہ نشان مہربانو کے ذہن کو بری طرح اپنے شکنجے میں لیے ہوئے تھے۔
"ایک بات بتائیں مہربانو!" اکمل کی آواز ایک بار پھر اسے خدشات کے بھنور سے کھینچ کر حقیقت کی دنیا میں لے آئی تھی مگر اس نے جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کی۔
"آپ کو کبھی کسی سے محبت ہوئی ہے؟" اس کے یوں ایک دم سابقہ گفتگو سے ہٹ کر کیے گئے سوال پر مہربانو کا حیران ہونا لازمی تھا۔ وہ بات کر کے خاموش ہو چکا تھا یعنی اب وہ اس سے جواب چاہتا تھا سو کچھ دیر بعد مہربانو بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔
"میں نکاح سے پہلے کی گئی محبت پر یقین نہیں رکھتی ہوں۔ زندگی میں بعض اوقات یقینی طور پر ہمیں کچھ لوگ اچھے لگتے ہیں جو کہ ایک فطری عمل ہے مگر اس احساس کو خود پر حاوی کر لینا کہ وہ محبت کے جذبے کی شکل اختیار کر جائے یہ میرے لیے ناقابلِ قبول ہے۔" اکمل کو ایک بار پھر جہاں اس کے جواب نے حیران کیا تھا وہیں وہ اس کے لیے پہلے سے بھی کہیں زیادہ قابلِ احترام انداز میں سامنے آئی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ شاید بہت کم بولتی ہے مگر جب بھی بولتی ہے اس کی کہی گئی بات میں اتنا وزن ہوتا ہے کہ اکمل اس کی سوچ کی بلندی کا قائل ہونے لگتا ہے۔
"گھر سے یہاں اتنی دور میرے والدین نے اگر مجھے بھیجا ہے تو صرف اور صرف پڑھائی کی غرض سے نا کہ اپنا رشتہ ڈھونڈنے کے لیے اور مجھے اپنے جذبات اور احساسات کے ساتھ ساتھ دل و دماغ پر بھی مکمل کنٹرول ہے اس لیے میں کبھی بھی شادی سے پہلے محبت کے ڈھونگ رچا کر اپنے والدین کا سر کسی اور کے سامنے نیچا ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔"
مہربانو کی باتیں سن کر اکمل جو یہ سوچے بیٹھا تھا کہ آج کسی طور وہ مہربانو کے ساتھ اپنی فیلنگز شیئر کر ہی لے گا اب ایک بار پھر ان تمام لفظوں کو غلاف پہنا کر پھر سلا آیا تھا۔ ندی اور مہربانو کی سوچ کس قدر مختلف تھی اور شاید ندی کو زیادہ ہزیمت شاہ زین کا ساتھ نہ ملنے پر ہوئی تھی جب اس کے علم میں یہ بات آئی کہ عنقریب اس کی شادی ہو رہی ہے۔
"میں آپ کی سوچ کو سلام کرتا ہوں مہربانو! لیکن میرا یہ سوال پوچھنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ جب بندہ کسی سے محبت کرتا ہے تو اس پر محبت سے بڑھ کر اعتماد ہونے لگتا ہے اور اگر وہی نہ رہے تو پھر خود کو سنبھالنا بڑا مشکل ہوتا ہے بس یہی کچھ ندی کے ساتھ

بھی ہوا۔" بات کرنے کے لیے کوئی تو موضوع چاہیے تھا سو اس نے مہربانو کے ساتھ ندی کے واقعے کو بڑی تفصیل سے شیئر کیا تھا۔

"اور میران۔۔۔؟ اس کے ساتھ اس پورے واقعے میں کیا ہوا؟" مہربانو نے جاننا چاہا۔

"اس کے ساتھ کیا ہونا تھا، ہونہہ! آج تک اس جیسے کسی بھی شخص کے ساتھ پہلے بھی کچھ ہوا جو اس کے ساتھ بھی ہوتا۔ بس زیادہ سے زیادہ یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔" اکمل میران کے نام پر تلخ ہوا تھا اور یہ تلخی لہجے کے ذریعے مہربانو تک بھی پہنچی۔

"آپ جانتے ہیں نا کہ اللہ کی لاٹھی بڑی بے آواز ہے۔" اکمل اس کے اس جملے کی گہرائی اور یہاں استعمال کرنے کو سمجھ نہیں پایا تھا جبھی گردن جھکا کر سامنے بیٹھی مہربانو کو دیکھ کر اس کی بات کی معنویت سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد اسی طرح گردن جھکا کر آلتی پالتی مار کر بیٹھی مہربانو نے انگوٹھے کو دائیں ہتھیلی پر مسلتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور اسے یوں خود پر نظریں جمائے دیکھ کر گڑبڑاتے ہوئے پھر سے سر جھکا لیا اور بولی۔

"میرا اس بات پر کامل ایمان ہے کہ اگر ہم کسی دوسرے کے لیے گڑھا کھودتے ہیں تو خود بھی اسی گڑھے میں ضرور گرتے ہیں جو دوسروں کی بہن بیٹیوں کو سر بازار رسوا کرتے ہیں ان کی اپنی بہنیں بیٹیاں چاہے کتنی ہی پاک دامن کیوں نہ ہوں ان کے اعمال کی بدولت رسوائی کا کچھ حصہ ان کے اپنوں کے اعمال کے عکس کے باعث ان کے حصے میں بھی ضرور دیکھا جاتا ہے۔۔۔

جیسے آپ نے بتایا کہ میران نے ندی کی ہولڈنگز میں بیٹھے ہوئے جعلی تصاویر اخبارات میں چھپوائیں اور بے گناہ ہونے کے باوجود اس پر ہر طرف سے تہمتیں لگیں تو شاید تقدیر کے گھومتے پہیے میں اس وقت اوپر نظر آنے والا میران اب پہیے کے نیچے کی طرف آنے کو ہے۔"

"میں بالکل نہیں سمجھ پا رہا مہربانو! آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ کیا آپ میران کو جانتی ہیں؟" اکمل اس کی باتوں سے الجھ رہا تھا۔

"جی ہاں۔۔۔" مہربانو نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میران کی بہن ہوں میں۔۔۔ اور مجھ سے بڑھ کر بھلا کون جانتا ہوگا اسے۔"

"کیا۔۔۔؟" اکمل کے لیے یہ بات ایک انکشاف ہی تو تھی۔ وہ لڑکی جس کے کردار کی عظمت اور سوچ کی پختگی کا وہ دل سے معترف ہو چکا تھا۔ اس کا اور میران کا آپس میں اس قدر نزدیکی رشتہ ہوگا وہ یہ بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک ہی ماں باپ کے خون سے جنم لینے والی اولادیں یوں متضاد شخصیت اور سوچ کی مالک ہو سکتی ہے۔ یہ بات وہ تسلیم تو کرتا تھا مگر آج نہ جانے کیوں ذہن یہ بات ماننے سے انکار کرتا نظر آتا تھا۔

"آپ اپنی دوست کے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر پریشان تھے نا تو شاید آج قدرت کی طرف سے انصاف کرنے کا دن آ گیا ہے۔ جس طرح میران نے کسی دوسرے کی بہن، بیٹی کی عزت اچھالی تھی، کون جانتا ہے کہ پوری رات آپ کے ساتھ اس لفٹ میں گزارنے کے بعد اس کی اپنی بہن کی عزت اور کردار کو کن کن نظروں سے نہیں دیکھا جائے گا۔ ندی کی پاک دامنی کے بے شمار گواہ ہونے کے باوجود وہ کسی کو اپنا یقین نہیں دلا پائی تھی نا، تو میں۔۔۔ میں کس سے گواہی کی امید رکھوں؟" باوجود ضبط کے اس کی خشک آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے سو اس نے اپنی دونوں ہتھیلیاں آنکھوں پر رکھ لیں۔

اکمل اب تک چپ چاپ گم سا اس کی باتوں کے معانی میں گم تھا۔ جانتا تھا کہ آج کی رات کے بعد بیدار ہونے والے بے شمار سوالات کے جواب اس سے کہیں زیادہ مہربانو کو دینے ہوں گے مگر میران کو اس کے کیے کی سزا یوں ملے گی یہ تو اس نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا اور مہربانو جو بڑے غیر محسوس طریقے سے بغیر کچھ کہے سنے اس کے حواسوں پر چھا چکی تھی۔ اس کا تعلق میران سے جو اسے دنیا میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت شخص لگا کرتا تھا اس قدر نزدیکی ہے کہ اس کے اعمال کی پرچھائیں بھی مہربانو پر پڑ رہی ہیں۔ بڑی بے بسی سے اکمل نے اپنے سامنے موجود اس معصوم اور سچی لڑکی کو بڑی بے دردی سے بار بار اپنی ہی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو مسلتے دیکھا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ وہ خود آگے بڑھ کر اس کے سارے آنسو سمیٹ لے، اسے بتائے کہ اگر کبھی ایسا وقت آیا کہ ندی کی طرح تمہیں تمہارے گھر والوں کا ساتھ اور اعتماد نصیب نہ ہوا تو میں دنیا میں وہ پہلا شخص ثابت ہوں گا جو کہ تمہیں آگے بڑھ کر سہارا دے گا، تھام لے گا اور تمہیں کسی کے سامنے اپنی ذات کے متعلق صفائیاں نہیں دینا پڑیں گی۔ کہنے کو تو وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ہمیشہ تو، بھلا ایسا کب ہوتا ہے کہ ہم جو کہنا چاہیں وہ کہہ بھی ڈالیں بعض اوقات ذہن میں ترتیب دیے جانے والے بے شمار جملے، کئی باتیں ان کہی بھی تو رہ جاتی ہیں اور ان ان کہی باتوں کی اذیت انسان کو ہمیشہ بے قرار رکھتی ہے۔ مہربانو سے ملاقات کی اس کی دعا پوری بھی ہوئی تو کس طرح کہ وہ اب تک حیران تھا اور نہ دل سے اس صاف دل لڑکی کے لیے دعا گو بھی تھا کہ صبح کا طلوع ہونے والا سورج اس کے عزت و وقار میں کسی قسم کی کوئی کمی لانے کا سبب نہ بنے۔

اُن سے جو کہنے گئے تھے فیضؔ جاں صدقہ کیے
اَن کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد

☆☆☆

"کسے لے کر آئی ہیں ہاسپٹل؟ اور اتنی پریشان کیوں ہیں؟" ثمینہ نے ندی کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑی محبت سے دریافت کیا تو وہ جو ٹکٹکی باندھے شاہ زین کو دیکھ رہی تھی خیالات سے حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ تو آج کل اپنی شادی کی تیاریوں میں مگن ہے اور اسے بھول بھال چکا ہے وہ جو شاید اس کے لیے یونیورسٹی میں وقت اچھا گزارنے کا ایک ذریعہ تھی اور بس۔

"امی بیمار ہیں میری، بس دعا کرو کہ اللہ انہیں جلدی سے ٹھیک کر دے۔۔۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو۔۔۔ تو میں بھی مر جاؤں گی۔" شاہ زین سے توجہ ہٹاتے ہوئے اس نے ثمینہ کو جواب تو دیا مگر غیر ارادی طور پر اب بھی وہ اسی کو دیکھے جا رہی تھی جو وہیں ریسپشن کے پاس ٹھہر گیا تھا۔

"کیا ہوا ہے انہیں؟ آئی مین کوئی بیماری وغیرہ۔۔۔" ثمینہ کے پوچھنے پر وہ چپ چاپ بس اسے دیکھے گئی، بھلا کہتی بھی تو کیا کہ ان کی بیماری تو وہ خود تھی اور اسی کی وجہ سے بابا اس دنیا سے چلے گئے اور اب امی کی یہ حالت ہوگئی ہے تو ذمہ دار اس کے علاوہ بھلا کون ہے۔

"دراصل میں بھی اپنی امی کو لے کر آئی تھی، اُن کا شوگر لیول بہت بڑھ گیا تھا تو بھائی انہیں فوراً یہاں لے آئے۔ اب ڈاکٹرز نے کہا ہے کہ ان کی حالت کافی بہتر ہے۔ بس اسی لیے میں نے آپ سے بھی پوچھا تھا کہ آپ کی امی کو خدانخواستہ کیا ہوا ہے؟" ندی کو یوں اپنی طرف خاموشی سے دیکھنے پر وہ گھبرا گئی تھی کہ شاید اس نے کوئی غلط بات پوچھ لی ہے اسی لیے وضاحت دے ڈالی۔

"میری امی کو تو کوئی بیماری نہیں ہے مگر۔۔۔ وہ اعصاب کی جنگ ہارتی جا رہی ہیں بس۔" ثمینہ اس کی بات سمجھ نہیں پائی تھی اور اسے اماں کا کمرہ نمبر بھی معلوم نہیں تھا۔ اس لیے شاہ زین کے آنے تک اسے یہیں رہ کر اس کا انتظار کرنا تھا سو وہیں موجود کرسیوں پر ندی کے ساتھ ہی اس طرح بیٹھ گئی کہ اس کی پشت شاہ زین کی طرف تھی اور شاہ زین جس کے لیے اب تک یہ اندازہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ آیا یہ سامنے بڑی سی سیاہ چادر اور شکنوں سے بھرے ملگجے کپڑوں میں ملبوس لڑکی ندی ہی ہے یا کہ اس کی کوئی ہم شکل۔۔۔ کیونکہ اس کا ذہن ندی کو اس حلیے میں قبول کرنے پر آمادہ ہی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ندی جس کی خوش لباسی کے پورے ڈیپارٹمنٹ میں چرچے ہوا کرتے تھے اور جسے دیکھ کر لڑکیاں فیشن کے ٹرینڈز جانا کرتی

تھیں آج اس طرح اس کے سامنے ہوگی یہ تو کبھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر یونہی ریسپشن پر کچھ کاغذات رکھ کر انہیں اوپر نیچے کرتے ہوئے خود کو مصروف ظاہر کرنے کی کوشش کے دوران جب جب اس نے ندی کو دیکھا ثمینہ سے باتیں کرتے ہوئے ندی کی نظروں کو خود پر مرکوز ہی پایا۔

جذبۂ محبت میں تیر بے خطا پایا
ہم نے جب اسے دیکھا، دیکھتا ہوا پایا

اور پھر آخر جب وہ خود پر مزید جبر نہیں کر پایا تو بالآخر چھوٹے چھوٹے قدم لے کر اس کی جانب آیا اور اس کے قریب آتے ہی پتا نہیں ندی کو کیا ہوا کہ میکانکی انداز میں ثمینہ کی بات سننا چھوڑ کر ایک دم کھڑی ہوگئی۔ چہرہ مجسم شکایت تھا تو آنکھیں سراپا سوال۔۔۔ ثمینہ اسے یوں ایک دم کھڑا ہوتے دیکھ کر اس کی نظروں کے تعاقب میں پہنچی تو سامنے شاہ زین کو دیکھ کر وہ بھی ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔

''شاہو۔۔۔!'' ندی کا انداز بے تکلفانہ اور لہجے کی بے تابی ثمینہ کو یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں۔

''بھول گئے ہو کیا مجھے؟ کہاں چلے گئے تھے مجھے چھوڑ کر؟ کیا ہمارا ساتھ صرف یونیورسٹی تک کا تھا اور بس؟'' ندی کے سوالات ایک لمبی قطار میں اس کے منتظر تھے۔ ثمینہ اب تک یہ سمجھ چکی تھی کہ یہی ندی ہے جس کے ساتھ نے پہلے شاہ زین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیری اور آنکھوں میں زندگی کی رمق جگائی اور پھر ذہن و دل پر اداسی کے ڈیرے ڈال کر خود منظر سے غائب ہوگئی۔

''وقتی رشتے، دوستیاں اور جذبات وقت کے ساتھ اسی طرح اوجھل ہو کر اپنا ہر نشان یوں مٹا دیتے ہیں کہ پھر وہ یادیں جو ان رشتوں، دوستوں اور جذبات سے وابستہ ہوتی ہیں، یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آتیں۔''

یہ کیسا جواب تھا۔ ندی سر اٹھا کر بس اسے دیکھے ہی گئی۔

لمبے چوڑے شاہ زین کی آنکھیں اسے اتنی اجنبی کیوں لگ رہی تھیں؟ اور کیا وہ واقعی اسے محض یونیورسٹی کی حد تک ہی دوست سمجھتا تھا؟ اس کا لہجہ اور الفاظ کیا پیغام دے رہے تھے؟ یعنی کہ اب وہ ایک نئی زندگی کی شروعات کرتے ہوئے اسے یاد ماضی کی طرح بھول جانا چاہتا ہے؟

''تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا مجھے بے حد افسوس ہے، میری وجہ سے میران نے تمہیں اخلاقی طور پر جو نقصان پہنچایا اس کی بھی میں تم سے معافی چاہتا ہوں کیونکہ میرا دل صاف تھا اور میں نے کبھی بھی یہ سب اس طرح سے نہیں چاہا تھا۔'' شاہ زین بولا بھی تو انتہائی نپے تلے لہجے میں اور اجنبیت کی حد کو پھلانگے بغیر اور اس کا یہی انداز ندی کے لیے باعث حیرت تھا کیونکہ اس کے خیال میں ان دونوں کی ایک ملاقات ہوتے ہی راوی بس چین ہی چین لکھنے لگے گا۔ ابھی مزید آزمائش شاید باقی ہے یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

''لیکن یہ بات میرے ساتھ ساتھ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ اکثر اوقات جرم سرزد ہو جانے کے بعد دنیا والوں کی نظر میں مجرم پھر بھی سرخرو ہی رہتا ہے اور سزا کاٹتا ہے تو بس کوئی میری طرح کا عام سا مگر شریف انسان۔''

ثمینہ اگر اب سے کچھ دیر پہلے ندی کے اس تعارف سے قبل اس سے اپنی علیحدہ اور ذاتی حیثیت میں نہ مل چکی ہوتی تو یقیناً وہ بھی ندی کو ایک ایسی ہی لڑکی سمجھتی جس نے اس کے بھائی کی خوشیوں کا خون کر دیا تھا اور جو اسے بینائی لوٹانے کے بعد ایک بار پھر نابینا کر گئی تھی مگر اب ایسا نہ تھا۔ اب اس کے دل میں سامنے کھڑی اس خوب صورت سی لڑکی کے لیے ایک نرم گوشہ ضرور بن چکا تھا۔ جبھی شاہ زین کی باتوں سے اس کے چہرے پہ ہلدی اترتے دیکھ کر خود ثمینہ کو بھی افسوس ہونے لگا تھا کہ ایک تو وہ اپنی ماں کے لیے اپ سیٹ تھی اور دوسرا شاہ زین اس کی ذہنی حالت کی پروا کیے بغیر اس سے مزید طنزیہ باتیں کیے

جا رہا تھا اور خود ندی کو بھی تو اس سے بے شمار گلے شکوے تھے، لاتعداد شکایات تھیں لیکن پھر بھی وہ اسے اپنے سامنے پا کر سب کچھ بھلا بیٹھی تھی۔ اتنے سخت اور مشکل ترین حالات میں شاہ زین نے ایک مرتبہ بھی پلٹ کر اس کی خبر لینے کے بجائے نئی زندگی شروع کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ندی کو اگر یکسر نظر انداز کر ڈالا تھا تو خفا تو وہ بھی تھی اور سوچا تو اس نے بھی یہی تھا کہ اب اگر زندگی کے کسی موڑ پر وہ سامنے آ بھی گیا تو وہ قطعاً اس سے بات نہیں کرے گی مگر پھر ایسا کیا ہوا کہ اسے دیکھتے ہی وہ تمام ارادے ریت کی بھربھری دیوار کی طرح زمین بوس ہوگئے۔

سوچا اسے تو ہم نے نہ ملنے کی ٹھان لی
دیکھا اسے تو سارے بہانے بدل دیے

''میں نے آج تک تم کو کیا سمجھا، اپنے دل میں تمہارے لیے کیا محسوس کیا اور اب تک کا یہ وقت کیسے گزرا میرا خیال ہے اب جبکہ زندگی ایک نئی کروٹ لینے کو ہے تو یہ سب باتیں کرنا بس وقت کے زیاں سے بڑھ کر اور کچھ نہیں۔۔۔ تمہاری زندگی تمہیں مبارک ہو۔'' بات ختم کرنے کے بعد شاہ زین نے لمحہ بھر رک کر اسے یوں الوداعی نظر سے دیکھا جیسے اس کا چہرہ اپنی آنکھ کی پتلیوں پر منجمد کر لینا چاہتا ہو اور ندی تو نہ کچھ بول پا رہی تھی اور نہ ہی شاید اس کا ذہن کچھ اور سوچ رہا تھا سوائے ان باتوں کے مفہوم کے جو ابھی ابھی شاہ زین نے کی تھیں۔

''بھائی دراصل وہ۔۔۔'' ثمینہ نے شاید ندی کی صفائی دینا چاہی تھی اور تبھی ندی کو معلوم ہوا کہ وہ جس سے ابھی کچھ ہی دیر پہلے اپنا دکھ سکھ کر رہی تھی وہ کوئی اور نہیں شاہ زین کی بہن تھی۔

''ثمینہ! تم چپ رہو اور چلو میرے ساتھ۔۔۔'' شاہ زین نے ثمینہ کو سرزنش کرتے ہوئے جاتے جاتے مڑ کر ایک بار پھر ندی کو دیکھا جو ہونق سی اب تک اسی طرح کھڑی تھی۔

''اپنا خیال رکھنا۔'' ندی کو مخاطب کر کے کہنے کے بعد وہ رکا نہیں تھا اور تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ اماں کے وارڈ کی طرف چل پڑا۔ ثمینہ نے البتہ جاتے جاتے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اچھی طرح بھینچے اور آہستہ سے اللہ حافظ کہہ کر شاہ زین کے پیچھے جاتے ہوئے مڑ مڑ کر اسے دیکھتی رہی۔ یوں بھی ثمینہ کا دل بے حد بوجھل ہو گیا تھا۔ شاہ زین تو اپنا بھائی تھا اس کا دکھ تو جو تھا سو تھا مگر اسے تو ندی کا دکھ بھی ہلکا معلوم نہیں ہو رہا تھا اور پھر میران کے ساتھ کہیں اس کی شادی کسی زبردستی کا نتیجہ ہے یا پھر خود ندی اور میران کی خواہش؟ جو بھی تھا اور اس نے شاہ زین کے جذبات کو کتنا ہی ہرٹ کیوں نہ کیا ہو، ثمینہ کو اس کانچ کی آنکھوں والی لڑکی سے بے حد ہمدردی محسوس ہو رہی تھی جو ان کو یوں جاتے ہوئے بڑی ہی بے بسی سے بس دیکھے جا رہی تھی جس کے ساتھ کچھ بھی حسب توقع نہیں ہو رہا تھا اور یہی بنیادی وجہ تھی کہ وہ بار بار سنبھلتی اور گرتی جا رہی تھی۔ خود کو لاکھ جتن کر کے مجتمع کرتی ہی تھی کہ ایک اور امید ٹوٹ جانے پر پھر سے سارا وجود کرچی کرچی ہو جاتا۔ ان دونوں کے نظر سے اوجھل ہو جانے پر وہ جہاں کھڑی تھی انہیں قدموں پر پیچھے رکھی کرسی پر ڈھے گئی تھی۔ وہ جو خود کو بڑی ہی مضبوط قوت ارادی کی مالک سمجھا کرتی تھی اب اپنی اس خوش گمانی کے آگے ہار مان گئی تھی۔ اسے اعتراف تھا کہ شاہ زین کے مقابلے میں خود اس کا دل اس کے اپنے مدمقابل ہے سو چاہ کر بھی وہ نہ تو شاہ زین کے متعلق کچھ غلط سوچ سکتی ہے اور نہ ہی اس کی طرف سے برتے گئے کسی بھی غلط رویے پر اسے قصوروار ٹھہرا سکتی ہے۔ جانے کہاں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر دل اس کی حمایت میں ایسی ایسی دلیلیں پیش کرتا کہ دماغ کی سرزنش بھی کسی کام نہ آتی اور وہ ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر اس کی حمایت میں سوچنے لگتی اور شاید اسی کا نام محبت ہے۔

کرسی پر سر جھکا کر بیٹھی ندی کا دھیان کبھی اسی کی طرف جاتا تو کبھی اس آخری رہی سہی امید کے ٹوٹ جانے کی طرف اور شاید وہ ابھی مزید کتنی ہی دیر اسی کیفیت میں بیٹھی رہتی کہ ایک مانوس سی چاپ پر

چونک کر رہ گئی۔ سر اٹھایا تو سامنے ناصر بھائی انتہائی شکستہ حالت میں کھڑے تھے۔ خود سے ندی کو مخاطب کرنا تو ظاہر ہے ان کی انا کے سر پر پاؤں رکھنے کے مترادف ہوتا جبھی اسے پکارنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ ندی نے دیکھا تو ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔

''امی کو ہوش آگیا؟ کیسی ہیں وہ؟ میں مل سکتی ہوں ان سے؟'' ایک ہی سانس میں اُس نے بے تابی سے کئی سوال کر ڈالے تھے۔ جواب میں ناصر بھائی کی نفی میں ہلتی گردن۔۔۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی تھی کہ وہ بولے۔

''وہ ابھی ہوش میں نہیں ہیں۔ ڈاکٹرز نے ان کے لیے فوری خون کا بندوبست کرنے کا کہا ہے۔ میں ابھی۔۔۔''

''تو میرا لے لیں نا خون۔ ایک ایک قطرہ نکال لیں میرے جسم کا لیکن خدا کا واسطہ ہے بھائی! میری امی کو بچالیں۔۔۔ اُن کے سوا اب کون ہے میرا۔۔۔ میں مرجاؤں گی اگر انہیں کچھ ہوا تو۔۔۔'' ندی نے ناصر بھائی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی تھی۔

''اگر یہ بات ہوتی تو کیا تم مجھے اتنا ہی خود غرض سمجھتی ہو کہ میں اپنے خون کا آخری قطرہ بھی انہیں پیش کرنے سے کتراتا؟''

کتنے ہی عرصے بعد آج دونوں ایک دوسرے کو براہِ راست مخاطب کر رہے تھے مگر اس وقت تو ندی کو لگ رہا تھا کہ درمیانی عرصے میں جیسے آج تک کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ یاد تھا تو بس یہ کہ اس وقت امی کی حالت تشویش ناک ہے اور بس۔۔۔

''ہم دونوں کا بلڈ گروپ ان سے مختلف ہے اور اتفاق سے اس وقت ہاسپٹل میں بھی ان کا بلڈ گروپ اسٹوریج میں موجود نہیں ہے۔''

''پھر۔۔۔ اب کیا ہوگا؟''

''اللہ بہتر کرے گا، میں اپنے ایک دوست کو فون کرتا ہوں وہ ایک آدھ گھنٹے میں اپنے ساتھ چند رضا کاروں کو لے آئے گا لیکن اس کے لیے مجھے پہلے گھر جانا پڑے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''اس کا نمبر میرے پاس فون میں نہیں ہے۔ تم یہیں مت بیٹھی رہو، اندر چلی جاؤ، میں بس تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔'' ندی کو اپنی جگہ ڈاکٹرز کے روبرو کروا کر ناصر بھائی جب حواس باختگی کے عالم میں تیز قدموں کے ساتھ پارکنگ کی طرف دوڑے تو ریسپشن پر اماں کی ڈسچارج سلپ پر دستخط کرتے شاہ زین نے بڑی حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

میری اور کنول کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ وہ رات گیارہ بجے کے بعد ہاسٹل کے سامنے کھڑی اندر جانے کے لیے ہچکچاہٹ کا شکار تھیں۔ کیا بہانہ کریں اور مہربانو کا ساتھ نہ ہونا کیسے چھپائیں۔ یہ بات دونوں کے لیے اس وقت ایک بھوت کی جگہ لے چکی تھی۔

''کسی کو کیا پتا چلے گا کہ مہربانو ہمارے ساتھ تھی یا اپنے کمرے میں ہے؟'' کنول نے ہاسٹل گیٹ سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر کچے چوروں کی طرح کا رویہ اختیار کیا۔ گھور اندھیری رات اور وہ دونوں اکیلی جس طرح اتنی دیر شاپنگ سینٹر کے چاروں طرف خوار ہوتی پھری تھیں اور پھر جس طرح بس پر بیٹھ کر یہاں تک پہنچی تھیں یہ وہی دونوں جانتی تھیں اور اب اندر داخل ہونا بھی ان کے نزدیک ایسا مشکل ترین عمل بن چکا تھا جسے کرنے کے لیے دونوں ہی میں ہمت مفقود نظر آتی تھی۔

''ہاں بات تو تمہاری ٹھیک ہے، پھر اس کا مطلب ہے بس یونہی چپ چاپ سر جھکائے گزر جائیں گے کسی نے پوچھا تو کہہ دیں گے کہ ہمیں نہیں معلوم۔۔۔'' میری نے بھی اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا۔

''لیکن خود سوچو، اس طرح تو مہربانو زیادہ قصور وار ٹھہرائی جائے گی نا کہ ہمیں بھی نہیں بتایا اور کہیں چلی گئی۔ کم از کم ہمیں تو ہر حال میں اس کی سپورٹ کرنی ہی ہے حالانکہ خود ہم بھی اس کی پراسرار گمشدگی پر حیران ہیں۔''

''بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے۔ پھر کیا کریں؟'' میری نے کنول سے اتفاق کرتے ہوئے حل بھی اسی سے طلب کرلیا تھا۔

''میرا تو خیال ہے پہلے ہاسٹل کے اندر داخل تو ہوں پھر دیکھتے ہیں، شاید وہیں پر کسی سے مشورہ مل جائے۔'' کنول نے کہا اور دونوں دھڑکتے دل کے ساتھ ہاسٹل کے گیٹ پر جا پہنچیں جہاں پر گیٹ کیپر اپنے مخصوص کیبن میں بیٹھا چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ ان دونوں کو یوں گھبرائے گھبرائے اندر داخل ہوتے دیکھا تو پکار لیا اور اس کی آواز سنتے ہی دونوں کے اوسان خطا ہونے میں کوئی بھی کسر باقی نہ رہی۔

''بیٹا! آج اتنی دیر؟ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا؟'' گیٹ کیپر نے ازراہ شفقت پوچھ ڈالا تھا۔ جسے وہ دونوں ہی اس کی شک کی نظر سمجھ بیٹھیں۔

''جی وہ دراصل۔۔۔ آج کچھ دیر ہوگئی۔۔۔ یہ چیزیں لینی تھیں نا۔۔۔۔'' گھبراہٹ میں کنول نے بات کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگز بھی سامنے کر ڈالے جس میں میری اور مہربانو کے لیے خریدے جانے والے لفافوں کے ساتھ ساتھ اس کی اپنی ذاتی استعمال کی بھی چند اشیاء موجود تھیں۔

''اچھا اچھا۔۔۔ لیکن بیٹا! اس رجسٹر پر ابھی کا وقت لکھ کر آپ کو اپنے اپنے سائن کرنا ہوں گے۔'' گیٹ کیپر نے دونوں کے درمیان میں رکھے میز پر رجسٹر کھول کر رکھ دیا تھا جس پر آج کی تاریخ میں رات دس بجے کے بعد ہاسٹل کے اندر آنے اور ہاسٹل سے باہر جانے والی لڑکیوں کے نام، وقت اور دستخط موجود تھے اور یہ بات میری اور کنول کے بھی علم میں تھی کہ مہینے میں تین سے زائد دفعہ اس رجسٹر پر نام کا اندراج ہونے کی صورت میں ایک تحریری اطلاعی لیٹر گھر پر ارسال کر دیا جاتا ہے مگر اُن دونوں کا یہ پہلا موقع تھا اس لیے دونوں نے لمحہ بھر ایک دوجے کو دیکھا اور رجسٹر کے اوپر رکھے گئے پین سے سائن کر کے ابھی اس سے پہلے کہ وہ مڑتیں گیٹ کیپر کی آواز پر ایک دفعہ پھر چونک کر پلٹیں۔

''بیٹا! کیا بات ہے، لگتا ہے آپ کی اپنی تیسری دوست سے لڑائی ہوگئی ہے۔'' گیٹ کیپر نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے کپ میں موجود چائے کا آخری گھونٹ لیا اور کپ ایک طرف رکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ یوں بھی ان لوگوں کا واسطہ سارا دن انہیں طالبات سے پڑتا رہتا ہے اور اپنے تجربے کی بنیاد پر یہ اکثر اوقات بہترین فیس ریڈرز بھی ثابت ہوتے ہیں اور انہیں اس بات کا بھی بہت اچھی طرح علم ہوتا ہے کہ ہاسٹل میں موجود کس لڑکی کی کس سے دوستی ہے اور لڑکیوں کو کون سا گروپ ہاسٹل سے زیادہ باہر کی سرگرمیوں میں تفریح محسوس کرتا ہے۔

''مہربانو سے۔۔۔؟'' میری حیران ہوئی۔

''جی جی، نام تو مجھے نہیں معلوم تھا لیکن دراصل آج تک کبھی ایسا ہوا نہیں کہ آپ تینوں ایک دوسرے کے بغیر ہاسٹل سے باہر نکلی اور واپس آئی ہوں، بس اسی لیے پوچھ لیا۔''

''گئے تو ہم ایک ساتھ ہی تھے لیکن۔۔۔'' کنول کو ذرا سی ہمدردی گیٹ کیپر کے لہجے میں محسوس کیا ہوئی مختصراً سارا قصہ کہہ سنایا اور نہ صرف یہ بلکہ مشورہ بھی طلب کرلیا۔

''یہ تو بڑی پریشان کن بات ہے بیٹا! خود سوچو آج کل کے حالات کس قدر خراب ہیں اور اگر اسے کسی نے وہیں سے اغوا کرلیا ہو تو۔۔۔؟'' بجائے حوصلہ تسلی یا کوئی بہتر مشورہ دینے کے گیٹ کیپر کے اس ''اگر'' نے انہیں مزید خوف زدہ کر دیا تھا۔

''پھر اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟ کیسے ڈھونڈیں گے اُسے؟'' میری نے مشورہ چاہا تھا۔ یوں بھی لڑکیوں کی ایک بہت بڑی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ جہاں ذرا سی ہمدردی کے دو بول سننے کو ملے وہیں پر اپنی تمام تر کہانی بیان کر ڈالی۔ یہ سوچے بغیر کہ کوئی بھی یاد، قصہ کہانی یا راز اُن کے دل میں ہے تو محفوظ تر ہے البتہ زبان پر آتے ہی کسی اخباری خبر کی طرح ہر ایک

کی ملکیت ہوگا جس کا جس ذہن سے دل چاہے پڑھے اور پھر اپنی مرضی کا تبصرہ کرتے ہوئے اوروں کی رائے بھی چاہے۔

"پتا نہیں وہ کس حال میں ہوگی؟ اور اگر اس کے گھر والوں کو پتا چل گیا کہ وہ اغوا ہوگئی ہے تو وہ کیا کریں گے؟"

"سب سے پہلا کام جو وہ کریں گے وہ پولیس اسٹیشن میں رپورٹ درج کروانے کا ہی ہوگا کیونکہ اس کے بغیر اسے ڈھونڈنا کسی طور پر بھی ممکن نہیں ہے۔" گیٹ کیپر دور کی کوڑی لایا تھا۔

"اس کے گھر والے تو یہاں نہیں ہیں اور پھر وہ ہماری دوست ہے، ہمارے ساتھ گئی تھی اور اس کے لیے کوشش کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم خود پولیس میں رپورٹ درج کروادیں۔" میری بہت جذباتی ہورہی تھی۔

"لیکن اس طرح تو یہ خبر ہر ایک کو پتا چلے گی اور بدنامی الگ۔"

"مگر اس کے بغیر اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔" کنول کی طرف سے خدشے کا اظہار کیے جانے پر گیٹ کیپر بولا۔

"اور ویسے بھی اس واقعہ کو یوں حالات کے رحم و کرم پر تو نہیں چھوڑا جاسکتا۔ آج رات کو وہ نہیں ملی اور اگر کل کا دن بھی اسی طرح گزر گیا اور پرسوں کا بھی پھر۔۔۔؟ پھر بھی تو یہی کچھ کرنا پڑے گا نا۔۔۔؟ تو کیوں نہ ابھی فوری طور پر یہ قدم اٹھالیا جائے تاکہ کامیابی کا تناسب تو بڑھ جائے ورنہ یہاں ہمارے ملک میں وزیراعظم کا بیٹا بھی اغوا ہوجائے تو مہینوں اس کی خبر نہیں ملتی یہ تو پھر ایک عام شہری ہے اور لڑکی ذات ہے۔" میری اور کنول دونوں ہی کشمکش و پیچ کا شکار تھیں اور اپنے آپ میں فیصلہ کرنے کی قوت موجود نہیں پارہی تھیں۔ سو بے یقینی کی کیفیت میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال کرنے لگیں۔ گیٹ کیپر نے یوں دونوں کو تذبذب کے عالم میں دیکھا تو کچھ سوچ کر بولا۔

"اگر آپ دونوں کہو تو میں وارڈن سے بات کروں؟"

"نن۔۔نن۔۔نہیں، بالکل نہیں۔" دونوں بلا تاخیر یک زبان ہوکر بولی تھیں۔

"کیا آپ کے پاس مہربانو کا کوئی فون نمبر وغیرہ۔۔۔؟"

"ہے تو۔۔۔ مگر اس کے فون کی چارجنگ تو دوپہر سے ختم تھی۔" کنول نے مایوسی سے کہا۔

"تو بیٹا! پھر آپ لوگ مجھے اجازت دو کہ جو میری سمجھ میں آتا ہے وہ کروں اور آپ دونوں بھی اپنے کمرے میں جاؤ کیونکہ اتنی دیر تک رات کو آپ کا میرے کیبن میں کھڑا رہنا بھی کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔"

گیٹ کیپر کے سمجھانے پر وہ دونوں اس کے کیبن سے نکل کر تقریباً خود کو گھسیٹتے ہوئے کمرے کی طرف سے جانے لگیں۔

☆☆☆

میری بستی سے پرے بھی میرے دشمن ہوں گے
پر یہاں کب کوئی اغیار کا لشکر اُترا؟
آشنا ہاتھ ہی اکثر میری جانب لپکے
میرے سینے میں میرا اپنا ہی خنجر اترا

"اولاد جب نو ماہ اپنی ماں کے خون سے پرورش پاتی ہے تو دنیا میں آتے ہی اس کا بلڈ گروپ بھلا تبدیل کیوں ہوتا ہے؟ کیوں زندگی میں کسی بھی مشکل وقت میں اپنے ہی ماں یا باپ کے لیے خون حاصل کرنے کی غرض سے اوروں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے؟ ہماری رگوں میں دوڑتا ہوا خون کا ایک ایک قطرہ بھی پھر کس کام کا اگر اپنے ہی ماں باپ کی زندگی محفوظ کرنے کے کام نہ آسکے؟"

یہ اور اس جیسے کئی مکالمات خود سے ہی کرتے ہوئے ناصر بھائی نے گاڑی ہارن دے کر اندر کرنے کے بجائے باہر ہی روکی کیونکہ ان کا ارادہ گھر میں ٹھہرنے کا نہیں تھا بلکہ اپنے دوست کا نمبر لے کر اسے فون پر صرف مطلع کرنا تھا کہ انہیں اس بلڈ گروپ کی

فوری ضرورت ہے اور انہیں یقین تھا کہ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں وہ ہاسپٹل پہنچ جاتا جبھی متبادل چابی کا استعمال کرتے ہوئے گیٹ کھولا تو لان سے اندر تک کا فاصلہ طے کرنے کے دوران انہیں محسوس ہوا بے شک امی کی پریشانی سے ان کا دل تو بوجھل تھا ہی مگر پاؤں بھی ساتھ دینے پر تیار نظر نہ آتے تھے۔ بابا اس دنیا سے اس کیفیت میں رخصت ہوگئے کہ جب وہ ندی کی وجہ سے ان سے ناراض تھے اور اب امی جو عرصہ ہوا ان سے بات چیت چھوڑ چکی تھیں وہ بھی بستر علالت پر تھیں۔ وہ ایسا نہیں چاہتے تھے جو کچھ ہورہا تھا اور نہ ہی وہ امی کو خفا رکھنا چاہتے تھے مگر ہمیشہ سب کچھ ویسا بھی تو نہیں ہوتا نا جیسا ہم چاہتے ہیں۔

رات کے اندھیرے میں مین گیٹ کے دونوں اطراف روشن لائٹس کی روشنی میں لان میں رکھی امی، بابا اور ان تینوں کی کرسیاں جن پر وہ سب آخری دفعہ شام کو کب بیٹھے تھے، ناصر بھائی کو یاد کرنے پر بھی وہ دن ذہن میں نہیں آرہا تھا۔ خیال تھا تو بس اتنا کہ وہ سب ایک ٹوٹی ہوئی تسبیح کی طرح ادھر اُدھر بکھر گئے تھے کوئی موتی تسبیح سے ٹوٹ کر مٹی میں جاملا تھا تو کوئی اپنی پہچان ہی گنوا بیٹھا تھا۔

جس طرح پانی کی کمی پودوں کیا کھڑی فصلوں تک کو مار ڈالتی ہے اسی طرح رشتے کتنے ہی نزدیکی کیوں نہ ہوں رابطوں کی کمی ان کے وجود کو بھی یوں ختم کردیتی ہے کہ ان کا ہم سے تعلق صرف ذکر چھڑنے اور ان کا نام آنے پر ہی یاد آتا ہے اور خود اس گھر کے مکینوں میں بھی بھلا کوئی رابطہ کب باقی رہا تھا۔ تعلق بھی تھا تو بس برائے نام۔ ناصر بھائی کی ساری زندگی بس عائشہ بھابھی سے شروع ہوکر انہیں پر ختم ہونے لگی تھی اور یہ بات آج امی کو اپنے ہاتھوں سے گاڑی سے نکال کر اسٹریچر پر اٹھا کر ڈالتے ہوئے انہیں بڑی شدت سے محسوس ہوئی تھی اور وہ جو سب لوگوں میں بے حد مضبوط اعصاب کے مالک سمجھے جاتے تھے وہ بھی امی کو ڈاکٹرز کے حوالے کرکے ہتھیلیوں میں چہرہ چھپا کر اکیلے میں رو پڑے تھے اور واقعی وہ جو اتنے عرصے سے اپنے دل کا غبار اپنے ہی اعصاب پر لیے پھرتے تھے یوں تنہائی میں کھل کر روئے تو انہوں نے جانا کہ بے شک رونا بھی اس خدائے واحد کی کس قدر بڑی نعمت ہے کہ جب دل رنج و غم سے بوجھل ہو اور سینے سے سانس تک خارج ہونے کے بجائے کہیں حلق میں ہی اٹکی محسوس ہونے لگے تب اس کرب کا اظہار آنسوؤں کے ذریعے ہوجانے سے روح پر سے دکھ کی کثافت ہٹتی تو نہیں مگر ہاں انسان کو اپنا آپ قدرے ہلکا ضرور محسوس ہونے لگتا ہے اور اس مشکل وقت سے نبرد آزما ہونے کے لیے مزید توانائی میسر آتی ہے۔

گھر میں داخل ہوئے تو ثروت آپا کے کمرے سے تلاوت کی آواز لاؤنج تک آرہی تھی۔ رات کے اس پہر وہ خدا کے حضور اس کی اپنی ہی کتاب کا واسطہ دے کر اپنی ماں کی صحت و سلامتی کے لیے دعا گو تھیں۔ سو ان کی دعاؤں میں خلل آنے کے خیال سے ناصر بھائی نے انہیں پکارنا اور ان کے کمرے میں داخل ہونا مناسب نہ سمجھا، جانتے تھے کہ ان کے سامنے ہوتے ہی وہ امی کے بارے میں پوچھیں گی اور جواب میں ان کے پاس یقیناً کوئی حوصلہ افزا جملہ نہ پاکر وہ مزید پریشان ہوتیں جبھی ان کا خیال تھا کہ وہ اپنی آمد پوشیدہ رکھتے ہوئے دبے پاؤں بیڈروم میں جاکر محض نمبر لینے کے بعد باہر نکل آئیں گے تاکہ کسی بھی قسم کے سوالات کا سامنا کرنے سے بچ سکیں اور پھر اللہ کی رحمت سے امی کی صحت بہتر ہونے کے بعد ہی انہیں کسی بھی قسم کی اطلاع دی جائے اس سوچ کے تحت وہ آہستگی سے نرم قدموں کے ساتھ ثروت آپا کے کمرے کے سامنے سے گزر کر ہینڈل پر ہلکا سا غیر محسوس دباؤ ڈال کر اس سے پہلے کہ اپنے بیڈروم میں داخل ہوتے، عائشہ بھابھی کی آواز نے انہیں وہیں رکنے پر مجبور کردیا۔

"پہلے تو صرف ڈراموں میں یہ چالبازی دیکھتی تھی، اب تو خود ہمارے اپنے گھر میں ہر وقت کی ڈرامہ بازی شروع ہوگئی ہے، جہاں اُس ندی سے

جان چھوٹنے کی امید نظر آتی ہے، امی خود پر بیماری طاری کر کے سب کی ہمدردیاں جمع کرنے لگتی ہیں۔ اچھا خاصا آج زیورات تک کا آرڈر دے دیا تھا، دو چار دنوں میں اسے بھی رخصت کر دیتے مگر اب پھر بستر سنبھال لیا ہے خیر سے اور بیٹا بیٹھے گا پائتی پکڑ کر، تم دیکھنا۔" انتہائی زہر خند لہجے میں فون پر یقیناً وہ کسی دوست سے گفتگو میں مصروف ہونے کے ساتھ ساتھ غصے کے عالم میں تیزی سے اپنے دائیں کندھے پر پڑنے والے بالوں کو انگلی پر مروڑتی جا رہی تھیں۔

"تمہیں تو پتا ہی ہے کتنے جتن سے تو ناصر کے دل سے اس کی بہن کی محبت کھرچی ہے لیکن ان بہن بھائیوں کا کیا اعتبار، کچھ نہیں معلوم کہ ہاسپٹل میں ماں کی محبت میں روتی ندی کو دیکھ کر ناصر کے دل میں ایک بار پھر بھائی کا پیار جاگ جائے، ورنہ میں نے تو تب سے اب تک ناصر کو اسی خدشے کی وجہ سے کبھی اس ندی کے سامنے تک نہیں ہونے دیا تھا۔ اگر پھر سے دونوں بہن بھائی پہلے جیسے ہو گئے تو میرے تو سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔" خدشات بھرے الفاظ اور تاسف سے بھرپور لہجہ ناصر بھائی کے سامنے عائشہ کی شخصیت کا ایک نیا روپ لا رہا تھا ورنہ تب سے اب تک تو ناصر بھائی کے سامنے ہمیشہ انہوں نے ایسی کوئی حرکت کرنے سے گریز ہی برتا تھا جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ اندرونی طور پر گھر اور گھر والوں کے خلاف کہیں پروپیگنڈے کو پال رہی ہیں۔ یوں بھی یہ بات وہ جانتی تھیں کہ اتنا بڑا واقعہ ہو جانے کے بعد بھی ناصر کے سامنے ندی کے خلاف کوئی بات کرنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا جبھی وہ بڑے ہی دھیان سے سارا کھیل یوں کھیل رہی تھیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

"میرے ہیرے جیسے بھائی کو رد کر کے سمجھتی تھی کہ جو چاہے گی کر لے گی لیکن چلو اور چار چھ دن انتظار کر لے، پھر جب شادی کے بعد اسے پتا چلے گا نا کہ وہ اسی میران کی دلہن بنی ہے جس نے اس کی ہوٹلوں میں تفریح کرتے ہوئے جعلی تصویریں اخباروں میں لگوائیں اور شاہ زین جیسے شریف انسان کے ساتھ اس کا جھوٹا اسکینڈل بنا کر سارے شہر میں رسوا کیا، تب سوچے گی کہ کاش! میں عائشہ بھابھی کی منتیں اور درخواستیں مان کر اکمل ہی کے لیے ہاں کر دیتی۔"

الفاظ کیا تھے زہر میں بجھے نیزے کی انی کی طرح ناصر بھائی کے ذہن و دل میں پیوست ہوتے جا رہے تھے۔ بابا کی موت، امی کی بیماری، بے چارگی اور بے بسی، ثروت آپا کے سسرال میں ان کی ہونے والی شرمندگی، عزیز و اقارب کی اٹھتی انگلیاں، احباب کے چبھتے سوالات اور سب سے بڑھ کر تکلیف کہ وہ بہن جوان کے لیے زندگی کا سب سے بہترین رشتہ اور آتی جاتی سانسوں کی طرح ان کے دل کی دھڑکن تھی، اس کی چہرے کی پیلاہٹ، آنکھوں کی اداسی اور اس کا جھکا ہوا سر اور ناصر بھائی کے اتفاقیہ سامنے آجانے پر ان کے مخاطب کرنے کا انتظار۔۔۔ ان سب کا ذمہ دار اگر میران تھا تو عائشہ بھابھی بھی اس میں برابر کی حصہ دار تھیں کیونکہ میران نے اگر بدنامی کا بیج بویا تھا تو اسے روزانہ کی بنیاد پر سینچا عائشہ بھابھی نے ہی تھا۔ ناصر بھائی کے سامنے ہر وقت دبے لفظوں اس واقعے کو بڑھا چڑھا کر اس کا باقاعدگی سے اعادہ کرنے والی اور انہیں بارہا یہ باور کروانے والی کہ اب وہ دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے، کوئی اور نہیں وہی تو تھیں۔ یہ سب جاننے کے باوجود کہ تصاویر جعلی اور اسکینڈل من گھڑت ہے وہ اسی بات کو مخفی رکھتے ہوئے زور دیتی رہیں کہ یہ سب سچ ہے اور اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ ناصر بھائی جو آج سے پہلے ہی بری طرح ذہنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے، عائشہ بھابھی کے اس کریہہ روپ پر ایک نئے صدمے کا سامنا کر رہے تھے۔

"لیکن تم دیکھنا، اکمل کے لیے ایسی لڑکی لاؤں گی کہ۔۔۔"

اس سے پہلے کہ عائشہ بھابھی جملہ مکمل کرتیں، ناصر بھائی کے فون پر ہوتی بیل نے انہیں چونک کر ہلکے سے کھلے دروازے کی طرف مڑنے پر مجبور کر دیا جہاں ہینڈل پر ہاتھ رکھے ناصر بھائی سامنے موجود انہیں یوں خاموش نظروں سے بغیر پلکیں جھپکائے دیکھے جا رہے تھے کہ خوف سے عائشہ بھابھی کے ہاتھ سے اپنا موبائل چھوٹ کر کارپٹ پر جا گرا۔ متوحش نظروں سے دروازے کے باہر کھڑے ناصر بھائی کا آدھا وجود اور دائیں آنکھ کا ارتکاز انہیں اس پل بے حد خوف ناک محسوس ہو رہا تھا۔ لحہ بھر کے لیے انہوں نے سوچا کہ شاید یہ ان کا خیال یا کوئی وہم ہے اور درحقیقت ناصر بھائی یہاں موجود نہیں ہیں مگر اگلے ہی پل فون پر ہوتی بیل نے اس وہم کو یقین میں بدل دیا کہ وہ خود اس وقت عائشہ بھابھی کے سامنے موجود ہیں۔ بمشکل تھوک نگلتی عائشہ بھابھی کے قدم پھر بھی جم کر رہ گئے تھے اور باوجود اس کے کہ وہ چاہتی تھیں کہ چند قدم آگے بڑھ کر دروازہ پورا کھولیں اور انہیں کمرے میں بلا کر اس بات کی یقین دہانی کریں کہ ناصر بھائی نے کچھ سنا تو نہیں اور اگر ایسا ہے تو کوشش کر کے ان کے ذہن میں اپنا اعتماد بحال کریں مگر۔۔۔ ایسا کچھ بھی کرنے کے بارے میں وہ محض سوچ کر ہی رہ گئی تھیں کہ اس وقت ان کا پورا جسم ان کے خلاف کھڑا تھا البتہ ان کے فون کی بیل رات کے سناٹے میں گونجی تو ثروت آپا تلاوت موقوف کر کے بھاگتی ہوئی ان کے بیڈ روم کی طرف آئیں تب تک ناصر بھائی فون ریسیو کر چکے تھے مگر آنکھیں اب تک عائشہ بھابھی پر جمی ہوئی تھیں اور اپنی جگہ سے نہ تو ایک قدم آگے گئے تھے اور نہ ہی پیچھے۔

"ہاں ندی! میں بس نکل رہا ہوں۔" فون ریسیو کر کے ندی کی آواز سنتے ہی وہ اسے بات مکمل کرنے کا موقع دیے بغیر بولے تھے۔

"نہیں بھائی! آپ بے شک آرام سے آئیں اور اب بلڈ کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے، ڈاکٹرز نے بتایا ہے کہ بلڈ ارینج ہو گیا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ ان کی حالت اب خطرے سے باہر ہے ان شاء اللہ کچھ دیر تک ہوش بھی آجائے گا۔" ندی نے تفصیلی طور پر انہیں آگاہ کیا تو بے اختیار انہیں اپنی اس ننھی پری کی آواز پر بے حد پیار آیا۔ تبھی ثروت آپا نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اشارے سے امی کی خیریت دریافت کی۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔" ناصر بھائی نے گہری سانس لی اور ثروت آپا کی طرف مڑتے ہوئے مسکرا کر اثبات میں گردن ہلائی تو ثروت آپا کی آنکھیں اس تشکر سے بھیگ گئیں اور انہوں نے اپنی دونوں ہتھیلیاں ملا کر ان پر پیشانی ٹکا دی۔

"عادل تو سو رہا ہے، میں بھی چلوں آپ کے ساتھ ہاسپٹل؟" ثروت آپا کے انداز میں لجاجت تھی۔

"اور عادل کیا اکیلا سوتا رہے گا؟" عائشہ بھابھی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے موبائل فون پینٹ کی جیب میں ڈالا تو ثروت آپا بڑے جوشیلے انداز میں بولیں۔

"ہاں تو اور کیا۔۔۔ تھوڑی دیر پہلے ہی تو سویا ہے اور اگر جاگ بھی گیا تو عائشہ ہے نا گھر میں فکر کیسی؟"

"یہ ابھی تک اس گھر میں ہے اسی بات کی تو فکر ہے۔" ان کے لہجے کی کاٹ جہاں عائشہ بھابھی کو یہ یقین دلا گئی تھی کہ وہ تمام گفتگو سن چکے ہیں وہیں ثروت آپا الجھ کر رہ گئیں۔

"جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید۔۔۔ ہونہہ!" زہر خند انداز میں بولتے ہوئے انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے عائشہ بھابھی کو دیکھا جن کے چہرے کے تمام رنگ موسمی پرندوں کی طرح اڑ چکے تھے اور تب وہ ٹھان چکے تھے کہ اب ان کی اس گھر میں کوئی جگہ باقی نہیں ہے ان کے حصے کا جتنا رزق اس گھر میں لکھا گیا تھا شاید اب ختم ہونے کو تھا، انتظار تھا تو محض امی کی اس گھر میں بخیریت و عافیت واپسی کا۔

پلٹ کر آنکھ نم کرنا، مجھے ہرگز نہیں آتا

گئے لمحوں کا غم کرنا، مجھے ہرگز نہیں آتا
محبت ہو تو بے حد ہو، نفرت ہو تو بے پایاں
کوئی بھی کام کرنا، مجھے ہرگز نہیں آتا

☆☆☆

بعض اوقات برس ہا برس گزرنے کے بعد اُن پر لمحہ بھر میں بیت جانے کا گمان گزرتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ایک لمحہ بھی صدیوں کی مانند محسوس ہوتا ہے۔ سارا کھن چکر ہے تو جذبات کا، دل کے اندر بسنے والے اس پانچویں موسم کا جس کے سامنے وقت کی رفتار بھی ہیچ معلوم ہوتی ہے اور یہی وجہ تھی کہ آج گزرنے والی رات ملکانی سائیں کی زندگی کی سخت ترین رات ثابت ہوئی تھی۔ مہمانوں کی موجودگی ان کے لیے سخت اذیت کا باعث بنی۔ ان کی زندگی میں آنے والی بیٹے کی شادی کی سب سے بڑی خوشی یوں دھندلائی کہ مہمانوں کی واپسی پر انہیں ایسا محسوس ہوا گویا وہ سب ان کی خوشی میں شریک ہونے نہیں بلکہ انہیں پُرسہ دینے آئے تھے۔ شاہ سائیں کے جانے کے بعد وہ اپنے بیڈ روم سے اٹھ کر پھر سے مہربانو کے کمرے میں آگئیں۔ اس کے زیرِ استعمال رہنے والی ایک ایک چیز کو اٹھاتیں اور محبت سے کبھی آنکھوں سے مس کرتیں تو کبھی چوم ڈالتیں۔ ہزار طرح کے وسوسے اگر مگر کے خیمے تلے دہشت کی بکل مارے بیٹھے تھے۔ وہ اس وقت کہاں ہوگی اور کیا بخیریت انہیں مل پائے گی؟ یہ سوال انہیں گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔

بیٹا تھا تو وہ اپنی شادی کی خوشی میں مکمل طور پر رنگ رلیاں منانے میں مصروف تھا۔ یہ جانے اور محسوس کیے بغیر کہ ان کی عزت کس طرح بیٹھے بٹھائے داؤ پر لگ چکی ہے اور ماں باپ کی جان کیسے سولی پر اٹکی ہے مگر وہ جانتا بھی کیسے کہ اس تک تو کوئی بھی اطلاع پہنچ ہی نہیں پائی تھی۔ بھائیوں اور پھر رحمٰن شاہ کا چہرہ ذہن میں آتا تو تھوک کا حلق سے نگلنا ناممکن سا لگنے لگتا۔ اسی کیفیت میں کس طرح صبح کا سورج طلوع ہوا اور چاند منہ چھپا کر اوجھل ہوا ملکانی سائیں کو خبر نہیں ہوئی تھی جیسے ہی دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونکیں، باہر کنیزاں کھڑی اندر آنے کے لیے ان کی اجازت کی منتظر تھی۔

"ملکانی سائیں کج چاہ پانی ایدر ای لے آواں؟" اجازت ملنے پر کنیزاں اب ان کے سامنے کھڑی ناشتے کے متعلق پوچھتے ہوئے ان کی سرخ اور سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ یوں بھی ان کا رات بھر بے چین رہنا بھی کنیزاں سے مخفی نہ تھا۔ اس پر رات اپنے کمرے کے بجائے مہربانو کے کمرے میں یوں گزارنا کہ پوری رات ہی وہ جاگتی رہی ہوں، اس کے لیے اچنبھے کا باعث تو تھا ہی مگر پھر خود ہی ان کی اس کیفیت کو اس نے بیٹی کی شادی کے موقع پر خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات سے موسوم کر دیا۔

"میران کدر ہے؟" گم سم سی ملکانی سائیں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے جواب دینے کے بجائے اس سے سوال کیا۔

"او جی فزر (فجر) دے بعد آئے تھے اپنے کمرے وچ، تے اب سو رہے ہوں گے۔"

"ہوں۔۔۔ اور کوئی فون شون تے نئیں آیا؟" ملکانی سائیں کا اپنا موبائل تو ان کے پاس تھا مگر لینڈ لائن پر شاید شاہ سائیں نے رات کے کسی پہر فون کیا ہو اسی خیال سے کنیزاں سے دریافت کیا جس کا جواب نفی میں ملنے پر دل پر جو سل نما بوجھ رات سے رکھا تھا اب بھی سرکنے کے بجائے مزید سانس روکتا محسوس ہوا۔

"ملکانی سائیں! آپ دے کھان کے لیے کش ایدر ہی لے آواں؟"

"او نا، نا۔۔۔ بس ٹھیک ہے۔" ہاتھ کے اشارے سے انہوں نے ناگواری سے کنیزاں کو باہر جانے کا کہا۔

"سوٹی نے کش کھادا؟ جے نئیں تے اس کو ضرور کھلا دیں کش۔"

"جی اچھا۔۔۔" کنیزاں حسب معمول تابعداری سے سر جھکا کر باہر جاتے ہوئے آہستگی سے دروازہ بند کر گئی تھی، اس کے جانے کے بعد ایک الوداعی نظر مہربانو کے کمرے کی تمام چیزوں پر ڈالتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل کر میران کے کمرے کی طرف گئیں جہاں میران انتہائی گہری نیند میں سویا ہوا تھا۔ دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے موبائل فون تھا، وہ ایک ایک لمحہ بعد اس کی اسکرین کی طرف تکتی جا رہی تھیں۔ شاہ سائیں جب سے حویلی سے گئے تھے اب تک انہوں نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا اور خود سے ان کو فون کر کے کچھ بھی معلوم کرنے کی ہمت بھلا ملکانی سائیں میں تھی ہی کب۔ سو محض اس خیال سے کہ شاید انہوں نے میران کے موبائل پر رات کے کسی پہر فون کر کے کوئی اطلاع دی ہو، یا ابھی اس کے سونے کے دوران ان کی طرف سے کوئی فون کال ریسیو ہونے سے رہ گئی ہو، بیڈ کے دائیں طرف موجود سائیڈ ٹیبل پر اس کے موبائل فون کو اٹھا کر انہوں نے کوشش تو کی کہ کچھ معلوم ہو سکے مگر ظاہر ہے کہ اس کے جدید فون کے آگے ان کی سمجھ بوجھ ناکافی تھی جبھی بے بسی سے ہاتھ میں اسے لیے حسرت سے بس دیکھے ہی گئیں۔ اسی دوران کروٹ لینے پر میران کی آنکھ غیر محسوس طریقے سے کھلی اور وہ یوں ان کے ہاتھ میں اپنا سیل فون اور انہیں اپنے کمرے میں موجود پا کر حیران رہ گیا۔ خود ملکانی سائیں نے بھی اسے اپنی طرف متوجہ محسوس کیا تو موبائل واپس اس کی جگہ پر رکھ کر بیڈ کے سرے پر ٹک گئیں اور براہِ راست سوال کیا۔

"شاہ سائیں نے تیکوں کوئی فون شون تے نئیں کیا؟"

"بابا سائیں نے؟ نہیں مجھے تو کوئی فون نہیں آیا اُن کا۔ آپ ہی رات کو بار بار ڈسٹرب کر رہی تھیں۔" بے زاری سے کہتے ہوئے اس نے کشن منہ پر رکھ لیا تھا۔ پھر دوبارہ کسی خیال کے تحت کشن پرے کر کے انہیں دیکھا۔

"آپ اس وقت میرے کمرے میں۔۔۔؟ خیر تو ہے نا اماں سائیں؟"

"اللہ خیر ہی کرے۔" گہری سانس خارج کرنے کے دوران وہ بولیں تو میران کو کسی غیر معمولی چیز کا احساس ہوا۔

"کیا مطلب ہے؟ اور رات کو مجھے بار بار فون کیوں کر رہی تھیں؟ اور بابا سائیں کہاں ہیں؟" نیند سے اس کی آنکھوں میں چبھن ہو رہی تھی مگر ملکانی سائیں کے انداز سے دل میں جو کھٹکا سا پیدا ہو رہا تھا اس کی تسلی اس نے لگے ہاتھوں کر ڈالنے کا سوچا اور ملکانی سائیں کا دل تو چاہ رہا تھا کہ وہ میران سے تمام باتیں شیئر کر ڈالیں اور شاید وہ رات کو ہی کسی بھی طرح ملازم کے ذریعے اسے بلوا کر اسی وقت سب کچھ بتا بھی دیتیں اگر جو شاہ سائیں انہیں اس متعلق کوئی ہدایات جاری کیے بغیر جاتے تو۔۔۔ مگر اب ظاہر ہے کہ وہ ان کے حکم کے بغیر کچھ بھی کہنے کی مجاز نہیں تھیں۔

"رات دی گل ایہہ سمجھو کہ رات نوں ای ختم ہو گئی تھی تے یا فیر رات دی گل اب کدی وی ختم نئیں ہونی۔" مبہم سی آدھی ادھوری حقیقت والی بات کر کے انہوں نے میران کو کوئی سرا ہاتھ پکڑانے کے بجائے اس کے خیالات کو تجلک ہی رکھا تھا۔

"تینوں کس طرح پتا کہ شاہ سائیں حویلی وچ نئیں؟" ان کی باتوں پر غور کرتا میران اب اٹھ بیٹھا تھا اور بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے ان کے رویے پر غور کر رہا تھا۔

"اماں سائیں! ظاہر ہے اگر وہ حویلی میں ہوتے تو آپ مجھ سے ان کی فون کال کا نہ پوچھتیں نا۔" ملکانی سائیں کو اپنی بوکھلاہٹ کا احساس ہوا۔

"اماں سائیں! ایسا کیا ہے جو آپ مجھ سے چھپا رہی ہیں؟ رحمٰن شاہ نے تو کچھ نہیں کہا؟" اُن کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے میران نے براہِ راست سوال کیا اور ان کے لیے باعثِ پریشانی رحمٰن شاہ کا نام بھی برجستہ تذکرہ لے ڈالا کہ شاید وہ اس کی وجہ سے یوں سہمی ہوئی ہیں۔

''اماں سائیں! میں جانتا ہوں کہ عام لوگوں کے درمیان میرے بارے میں کیا باتیں ہوتی ہیں، لوگ میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں یہ بھی معلوم ہے مجھے مگر۔۔۔ ہر برا آدمی بھی تو دنیا کے تمام لوگوں کے لیے برا نہیں ہوتا نا۔۔۔ اس کے دل میں بھی کچھ ایسے لوگ ضرور بستے ہیں جن کے لیے وہ اپنا آپ مٹی میں ملا سکتا ہے اور جنہیں خوش دیکھنے کے لیے وہ ساری دنیا اور خود اپنے آپ سے بھی ٹکر لے سکتا ہے۔۔۔ ہوتا ہے نا ایسا؟'' اپنی جگہ سے سرک کر اب وہ ملکانی سائیں کے روبرو آ بیٹھا تھا جو اس کی بات کے جواب میں اس کے کہے ہوئے تمام الفاظ کی مکمل حمایت کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا رہی تھیں۔

''تو اماں سائیں! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس پوری دنیا میں، میں صرف اور صرف آپ کی خاطر کسی کی جان لے بھی سکتا ہوں اور اپنی جان دے بھی سکتا ہوں۔''

''ہائے ماں صدقے، ایسے نہ بول میرے پتر۔۔۔!'' ان کے پورے جسم میں اس کی بات سے بجلی دوڑ گئی تھی۔ یوں لگا جیسے انہوں نے بجلی کی ننگی تار کو گیلے ہاتھ سے چھو لیا ہو۔

''رب کرے میری وی حیاتی تجھے لگ جائے، اج دے بعد میں ایسی گل نہ سناں۔''

''نہیں کروں گا۔'' وہ مسکرا دیا۔

''مگر آج کے بعد آپ نے بھی اس طرح پریشان نہیں ہونا، ٹھیک ہے نا۔''

''آہو۔۔۔ چل ٹھیک ہے۔''

''اماں سائیں! چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے اگر میں آپ کے اور بابا سائیں کے ہوتے ہوئے یہ بات کروں تو۔۔۔''

''کیہڑی بات۔۔۔؟''

''اگر آپ کو مہربانو کے لیے رحمٰن شاہ مناسب نہیں لگتا تو اپنے بھائیوں کی انا کے لیے خود کو ساری عمر کا پچھتاوا دینے سے پہلے اب بھی سوچ لیں کیونکہ ابھی تک اس کا نکاح نہیں ہوا۔''

''ایہہ گل توں کر رہا ہے میران پتر؟'' وہ حیران تھیں کہ صرف انہیں یوں پریشانی کے عالم میں دیکھ کر وہ اپنے ماموؤں کے خلاف بھی اسٹیپ لینے کو تیار تھا جنہیں وہ ہمیشہ سے اپنے بابا سائیں کے مقابلے میں درست قرار دیتا آیا تھا۔

''اماں سائیں! سچ کہوں تو اس دن رحمٰن شاہ کے سامنے آپ کا انداز میرے دل میں اس کے لیے نفرت بٹھا گیا ہے۔ ایک تو اس جاہل اور ان پڑھ کو ہم اپنی اتنی تعلیم یافتہ بیٹی دے رہے ہیں کہ جہیز کے نام پر کتنے بیگھہ زمین، جائیداد پھر بھی وہ آپ سے اس طرح بات کر رہا تھا جیسے خدانا خواستہ مہربانو میں کوئی عیب ہے اور وہ اس سے شادی کر کے ہم پر بہت بڑا احسان کر رہا ہے۔'' وہ جذباتی ہو رہا تھا اور ملکانی سائیں کو محسوس ہوا کہ ان کے دل کے دھڑکنے کی رفتار سست سے سست ترین ہوتی جا رہی ہے۔

کون جانے کہ اب مہربانو ان سے کن حالات میں ملتی ہے اور خدا جانے اب آگے کیا ہونے والا تھا۔ ان کا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا اور جسم جیسے دسمبر کی یخ بستہ ہواؤں کی زد میں تھا۔

''کیا یہ وہی میران ہے جو سب کی نظر میں ایک اکھڑ، بددماغ اور سخت دل نوجوان ہے۔ کیا ماں کی محبت اس کے لیے بھی اتنی طاقت ور ہے کہ یہ جذبہ اسے اس قدر حساس ہو کر سوچنے پر مجبور کر رہا ہے اور کیا وہ مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے۔'' اس کا رویہ ملکانی سائیں کے دل میں اس کے پیار ارمان کے سر پر غرور کا تاج سجا رہا تھا۔

''اگر آپ اس کی بارات آنے پر بھی کوئی فیصلہ کریں تو یقین رکھیے گا کہ آپ کے ہر فیصلے کی حمایت کے لیے میں ہمیشہ آپ کے پیچھے کھڑا نظر آؤں گا۔''

''رب خوش رکھے تجھے میریا پتر!'' فرط جذبات سے ان کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں، آگے بڑھ کر میران کو گلے لگایا اور اس کے بالوں میں لاڈ سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

''اپنے بابا سائیں نوں وی خوش رکھیا کر، بوہت پریشان ہیں آج کل۔''

''ہونہہ! اماں سائیں! میری اچھی بات بھی تو انہیں اچھی نہیں لگتی۔'' منہ کا زاویہ بگاڑ کر وہ بولا تھا اور ملکانی سائیں اس وقت اسے سمجھانے کی سکت نہیں رکھتی تھیں تبھی اٹھتے ہوئے بولیں۔

''اچھا چل جا فیکٹری دا چکر لگا لے، فیر سو جائیں آ کے۔'' اور تب میران کو یاد آیا تھا کہ شاہ سائیں نے اسے کم از کم ایک گھنٹہ بھر کے لیے فیکٹری جانے اور وہاں وقت گزارنے کا مشورہ نہیں بلکہ حکم دیا تھا اور ساتھ ہی کسی بینک عہدیدار کی بہت تعریف بھی کی تھی۔

''چلو لگے ہاتھوں اس ہیرو سے بھی ملاقات کر لیتے ہیں آج۔'' منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی لیتے ہوئے اس نے سوچا اور مسکرا کر ملکانی سائیں کے سامنے شاہ سائیں کے حکم کی تعمیل کرنے کے بارے میں رضامندی دے کر اپنے تئیں انہیں بھی مطمئن کر ڈالا۔

☆☆☆

آگ لگی تھی سینہ سینہ، ہر شعلہ جوالا تھا
اب کے شہر میں روشنیوں کا منظر دیکھنے والا تھا
امجد تقدیر تھی اس کی یا قدرت کا کھیل؟
کراچیاں پر رات کا سپچھی، تھوڑی دور اجالا تھا

معاملہ کچھ ایسا انتہائی حساس نوعیت کا تھا کہ اسے مخفی رکھنے ہی کی غرض سے شاہ سائیں اکیلے ہی لاہور پہنچے تھے۔ فلائٹ منہ اندھیرے لاہور پہنچی تو ان کے لیے ایئرپورٹ پر گاڑی اور ڈرائیور دونوں ہی موجود تھے۔ ڈرائیور کو ہاسٹل کے بجائے کالج جانے کا کہہ کر انہوں نے سیٹ سنبھالی اور آنکھیں بند کر لیں۔ انہیں یاد تھا کہ مہربانو کی پیدائش پر ان کے بابا سائیں نے کسی قسم کی بھی خوشی کا کوئی اظہار نہیں کیا تھا اس کے برعکس میران شاہ کے پیدا ہونے اور حویلی کو وارث مل جانے کی خوشی منانے میں انہوں نے بلاشبہ زمین آسمان ایک کر دیے تھے۔ مہربانو کے معاملے میں ان کی سوچ وہی روایتی تھی اور ان کا خیال تھا کہ بیٹیوں کی وجہ سے بڑے بڑے شملہ والے سروں کو بھی کسی کے آگے جھکنا پڑتا ہے اور وہ اپنا سر کسی کے آگے نیچا کر کے بات کریں یہ انہیں گوارا ہی کب تھا۔ کچھ ان کی اپنی بھی بیٹی نہیں تھی اس لیے وہ اس راحت سے قطعی طور پر نا آشنا اور محروم تھے جو بیٹیوں کے وجود سے عموماً والدین کے حصے میں آتی ہے۔ جب تک حیات رہے تب بھی مہربانو ان کے لمس کی خاطر ترستی ہی رہتی۔ میران بھی ان کی گود اور کبھی کندھوں پر سوار رہا کرتا اور وہ منہ میں انگلی ڈالے جان بوجھ کر ان کے سامنے کھڑی حسرت بھری نظروں سے اپنے دادا سائیں کو دیکھا کرتی کہ شاید محبت کی کوئی نظر اس پر بھی پڑے۔

مگر ان کی وفات تک مہربانو کی یہ خواہش حسرت ہی رہی اور شاید لاشعوری طور پر مہربانو کی اس کمی کو دور ہی کرنے کی غرض سے اسے پھر شاہ سائیں کی طرف سے اتنا پیار ملا کہ وہ سیراب ہو گئی البتہ اس کے ننھیال والوں کی طرف سے شاہ سائیں کو اکثر اپنے لاڈ پیار میں محتاط رہنے کی ہدایت اشاروں کنایوں میں ملا کرتی جسے وہ کسی خاطر میں نہ لاتے اور سب کی مخالفت کی پروا نہ کرتے ہوئے ہی انہوں نے مہربانو کو اعلا تعلیم دلانے کا سوچا تھا مگر اپنے ہی فیصلے پر اب وہ خود نظر ثانی کرنے لگے تو دل نے دماغ کی طرف بڑھتے تمام غلط خیالات کو جھڑک دیا۔ انہیں اپنی بیٹی پر مکمل بھروسہ اور اعتماد تھا اور وہ جانتے تھے کہ وہ ایسے کسی بھی کام پر موت کو ترجیح دے گی جس سے اس کے والدین کی عزت پر حرف آنے کا خدشہ ہو مگر اس سارے واقعے کے پیچھے اصل کہانی دراصل ہے کیا؟ یہی جاننے کے لیے اور کسی بھی قیمت پر جلد از جلد اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے وہ بے حد بے چین تھے۔ سو جیسے ہی ڈرائیور نے کالج کے آگے گاڑی روکی انہوں نے باہر نکل کر اسے کچھ روپے تھماتے ہوئے گاڑی کی چابی لے کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اسے وہیں سے رخصت کر دیا اور اسٹیئرنگ ہاسٹل کی جانب موڑ

دیا جہاں کچھ ہی دیر بعد وہ میری اور کنول کے ساتھ وزیٹنگ روم میں موجود ان دونوں کے حواس باختہ چہروں اور ہکا بکا نگاہوں سے معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہ رہے تھے۔ میری اور کنول کی ان سے یہ پہلی ملاقات تھی اور ان کی شخصیت میں موجود رعب و دبدبے نے دونوں ہی کی زبان کو گویا تالا لگا دیا تھا۔

"ب۔۔۔ باقی بات انکل! آپ چاہیں تو گ۔۔۔ گیٹ کیپر سے پوچھ سکتے ہیں کیونکہ پھر پتا نہیں اس کے بعد انہوں نے کیا کیا؟"

"لیکن آپ ہمارا یقین کریں اس سارے معاملے میں ہم دونوں بالکل بے قصور ہیں اور خود مہربانو بھی۔۔۔" کنول نے میری کی بات آگے بڑھاتے ہوئے صفائی پیش کی۔

"نہ ہی اس کی ہمارے علاوہ کسی سے دوستی تھی، اسی لیے ہم خود پریشان ہیں کہ آخر وہ گئی تو گئی کہاں؟"

"کیا اس نے پولیس اسٹیشن میں رپورٹ تو نہیں لکھوادی؟" شاہ سائیں نے اپنی بیٹی کی نادان دوستوں سے انتہائی فکر مندی سے دریافت کیا جو بجائے اس کے کہ اس کے والدین سے بات کرتیں، گیٹ کیپر کو سارا معاملہ سنا کر مدد طلب کر آئی تھیں۔

"پتا نہیں انکل! ہم تو خود پولیس کے خوف سے آج کالج بھی نہیں گئے۔" میری بولی اور ساتھ ساتھ اطلاع بھی دے ڈالی کہ وہ دونوں آج کسی بھی وقت اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جائیں گی۔

"نہیں آپ دونوں ابھی کہیں نہیں جاؤ گی، ہوسکتا ہے مہربانو کے حوالے سے آپ کی مدد کی کوئی ضرورت پڑے۔"

"اس کے لیے تو ہماری جان بھی حاضر ہے۔" کنول نے میری کی تائید حاصل کرتے ہوئے انہیں ہر قسم کے تعاون کی مکمل یقین دہانی کروادی تھی۔

"بیٹا! آپ دونوں کی عزت میرے لیے اسی طرح ہے جیسے مہربانو کی۔ اس لیے اللہ کے حکم سے میں آپ کو کوئی گزند پہنچنے نہیں دوں گا۔" اور وہ دونوں جو ان سے خوف محسوس کر رہی تھیں تھوڑی دیر بات چیت کے بعد ہی خود انہیں پریشان نہ ہونے کا کہہ کر ان کے ساتھ گیٹ کیپر کے پاس پہنچیں تو شفٹ تبدیل ہو جانے کے باعث رات والے گیٹ کیپر کے بجائے دوسرے شخص کو موجود پایا۔ سو ان دونوں کے تمام واقعات سے آگاہ کرنے کے بعد رات کی ڈیوٹی کرنے والے گیٹ کیپر نے کیا اقدامات کیے تھے اس سے وہ بھی نا آشنا ہی رہے سو شاہ سائیں نے ان دونوں کو ساتھ لیا اور گاڑی شاپنگ مال کی طرف جاتی سیاہ سڑک پر ڈال دی۔

☆☆☆

کئی گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد بالآخر امی ہوش میں آچکی تھیں۔ ندی اور ناصر بھائی تو رات سے ہی ان کے پاس بیٹھے دعاؤں میں مصروف تھے البتہ ثروت آپا ناصر بھائی کے منع کرنے کے باوجود بھی بیٹے کو عائشہ بھابھی کے پاس چھوڑ کر ہاسپٹل آن پہنچی تھیں اور امی کی نیم وا آنکھیں دیکھ کر بے اختیار ان سے لپٹ کر رونے لگی تھیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی ان کو لگائی جانے والی خون کی بوتل ختم ہوئی تھی اور انہیں آئی سی یو سے کمرے میں منتقل کیا گیا تھا۔

آنکھ کھلتے ہی جو دھندلا سا منظر انہوں نے دیکھا اس میں ندی ان کے بیڈ کے دائیں طرف موجود کرسی پر بیٹھی دونوں کہنیاں بیڈ پر رکھے آنکھیں بند کرکے کچھ پڑھنے میں مصروف تھی اور اس کے عین عقب میں ناصر بھائی بھی دعا کے لیے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ دونوں بہن بھائیوں کو ایک مدت کے بعد ایک دوجے کے اس قدر قریب اور ایک ساتھ دیکھ کر طمانیت کی جو پرسکون لہر ان کے اندر دوڑی تو انہوں نے دل ہی دل میں اپنی اولاد کے حسنِ اتفاق اور دائمی محبت کی دعا مانگ ڈالی۔

"امی۔۔۔! امی کیا حال ہے اب؟ کیسی ہیں آپ؟" ان کا ہوش میں آنے کے بعد آنکھیں کھول کر انہیں دیکھنا سب سے پہلے ناصر بھائی نے ہی نوٹ کیا تھا۔ سو حیرت و خوشی سے لرزتی آواز کے ساتھ فوراً ہی ان پر جھک گئے۔ ندی نے بھی اللہ کا شکر کرتے ہوئے بڑی مسرت سے آنکھیں کھولیں تو ناصر بھائی کو یوں والہانہ انداز میں امی سے پیار کا اظہار کرتے دیکھ کر وہ پہلے تو حیرت سے ناصر بھائی کو دیکھنے لگی اور پھر خود بھی بڑی بے تابی سے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام کر بوسے دینے لگی۔ امی نے بڑے پُرشفقت انداز میں بایاں ہاتھ ناصر بھائی کے کندھے پر رکھ کر انہیں سہلایا۔

"میں نے رات کو کہا بھی تھا کہ مجھے ساتھ لے چلیں، لیکن بھائی نہیں مانے، ورنہ یقین کریں ساری رات مجال ہے جو پل بھر کے لیے بھی آنکھ بند کی ہو۔" ثروت آپا نے آتے ہی گلہ کیا اور امی سے لپٹ گئیں۔

"ہمارا بالکل خیال نہیں ہے آپ کو۔۔۔ سوچیں نا اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو ہمارے لیے دنیا میں بھلا رہ کیا جاتا۔"

"اللہ نہ کرے کہ امی کو کبھی بھی کچھ ہو۔" ناصر بھائی نے محبت سے کہا تو ندی اور امی چپ چاپ مگر مسکراتے ہوئے انہیں دیکھے ہی گئیں۔ اسی اثنا میں ڈاکٹرز چیک اپ کرنے آگئے تو ناصر بھائی نے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب! بلڈ کا ارینجمنٹ آپ کی اپنی لیب سے ہو گیا تھا؟"

"ارے نہیں، لیب میں ہوتا تو کیا اس وقت آپ کو یونہی خوامخواہ دوڑاتے۔" فائل پر انہوں نے آج دی جانے والی دوائی کو چیک کرکے اُس پر اوکے لکھا اور ساتھ کھڑی نرس کے حوالے کر دی۔

"یہ تو ایک نیک دل نوجوان نے شاید آپ کو پریشان دیکھ کر وجہ پوچھی تو ہماری ریسپشن کے بتانے پر اسی وقت اپنا خون دینے کی آفر کر ڈالی۔"

ناصر بھائی کو لگا جیسے وہ اس نوجوان کے مقروض ہو گئے ہوں۔

"کیا اس کا کوئی ایڈریس وغیرہ مل سکتا ہے؟"

"ہاں بالکل کیوں نہیں، ہم کسی کا بھی بلڈ لیتے وقت ان کا ایڈریس وغیرہ ضرور نوٹ کرتے ہیں، آپ چاہیں تو ان کا شکریہ ادا کرنے کی غرض سے لیب میں جا کر وہ ایڈریس حاصل کر سکتے ہیں۔" پین پر ڈھکن لگا کر اپنے سفید کوٹ کی اوپری جیب میں ڈالتے ہوئے انہوں نے بتایا تو ناصر بھائی امی سے اجازت لے کر اپنے خاموش مسیحا کا شکریہ ادا کرنے ان کے پیچھے چل دیے۔ ثروت آپا بھی ان سے دو قدم پیچھے اُس فرشتہ صفت انسان سے ملنے اور اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ناصر بھائی کے ساتھ ہی تھیں اور ابھی کچھ دیر پہلے کمرے میں ان کا امی کے ساتھ انتہائی دیکھ بھال اور پیار محبت کا خوب صورت سا رویہ دیکھ کر انہیں لگا جیسے وقت پھر سے بدل کر پہلے جیسا ہو گیا ہے اور بیچ میں یہ غلط فہمیاں اور بدگمانیاں گویا آئی ہی نہ تھیں۔ تب انہوں نے بڑے ہی صدقِ دل سے اپنے میکے کے پھر سے آباد و شاد ہونے اور آپس کی محبتوں کے سدا قائم رہنے کی دعا مانگی تھی اور اتفاق سے آج گاڑی میں مطلوبہ ایڈریس تک پہنچنے کے دوران انہوں نے ناصر بھائی سے بھی اب اس بدلے ہوئے رویے کو کبھی نہ بدلنے کی التجا کی تھی۔

وہ شاید نہیں جانتی تھیں کہ دل کی دنیا تو اسی لمحے زیر و زبر ہو گئی تھی جب انہیں خود عائشہ کی زبانی تمام اصلیت کا پتا چلا تھا۔ اب تو بس پچھتاوے کو اپنے بہتر سے بہترین رویے کے ذریعے مٹانا تھا اور اپنے تمام رویے کی تلافی کرنا تھی جس کے باعث ان کے ہنستے بستے گھر سے مسکراہٹیں روٹھ گئی تھیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ بھی باتیں کرتے رستہ لمحوں میں طے ہو گیا تھا۔ یوں بھی یہ پہلا موقع تھا کہ ثروت آپا کو ناصر بھائی سے علیحدگی میں عائشہ بھابھی کی موجودگی کے بغیر بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس لیے کھل کر بات چیت بھی ہوئی اور اپنی غلطیوں کی تلافی کے راستے بھی ڈھونڈے گئے اور انہی باتوں کے دوران جب انہوں نے گاڑی پارک کرنے کے بعد ایڈریس کے عین مطابق پہنچ جانے پر اطلاعی گھنٹی بجائی تو ثمینہ انہیں دیکھ کر اندر بلاتے ہوئے قدرے جزبز کو شکار معلوم ہوئی۔

"دیکھیں آپ ڈریں نہیں، ہم تو صرف آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں کہ آپ کے دیے گئے خون کی بدولت ہماری امی کی جان بچ گئی۔" ثروت آپا نے وضاحت کی تو ثمینہ کو اندر بلانا ہی پڑا۔ امی ٹیک لگا کر تخت ہی پر بیٹی ہوئی ہاتھ میں تسبیح کے دانے گھمارہی تھیں۔ انہیں اندر آتے دیکھا تو دونوں کے سر پر ہاتھ پھیر کر اٹھ بیٹھیں اور ثمینہ کی رہنمائی میں تینوں نے ڈرائنگ روم میں جا کر نشست سنبھالی۔

"معاف کرنا بیٹا! میں آپ دونوں کو پہچان نہیں پائی۔"

"آنٹی! اب تو ہمارا آپ سے خون کا رشتہ ہے اس لیے پہچان ہم خود ہی کروائے دیتے ہیں۔" ثروت آپا خوش دلی سے بولیں۔

"آپ کے بیٹے نے جس طرح اپنا خون بروقت دے کر ہماری والدہ کو بچایا ہے اس کے لیے ہم آپ سب کے ہمیشہ احسان مند رہیں گے۔" ناصر بھائی تشکر آمیز لہجے میں بولے تو واقعی ان کا لفظ لفظ احسان کے بوجھ تلے دبا ہوا محسوس ہوا۔

"ارے بیٹا! احسان کیسا، انسان ہی تو انسان کے کام آتا ہے اور درحقیقت ہماری زندگی کا مقصد بھی یہی ہونا چاہیے۔" اماں مسکرائیں۔ بیٹے پر مان تو تھا ہی آج یہ احساس کہ وہ یوں کسی کے کام آیا ہے انہیں فخر میں مبتلا کیے دے رہا تھا۔

"جی بالکل اور بلاشبہ یہ آپ کی تربیت ہی ہے کہ آپ کے بیٹے نے ایک ماں کی جان بچا کر اس کی گویا ساری اولاد کی جان بچالی۔"

"اور ویسے بھی ایک انسان کی جان بچانا پوری انسانیت کو بچانے کے مترادف بھی تو ہوتا ہے نا۔" ثروت آپا نے ناصر بھائی کی تائید کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی تو اماں اب یوں تعریف ہونے پر ذرا جزبزسی دکھائی دینے لگیں۔

"بس ہمارے بھائی کی خوشیوں کے لیے بے حد دعا کیجیے گا۔" ثمینہ نے چائے دونوں کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ضرور ان شاء اللہ کیوں نہیں۔" ثروت آپا نے کپ تھامتے ہوئے کہا۔

"اگر ہم ان سے ملاقات کرنا چاہیں تو کیا ابھی مل سکتے ہیں۔" ناصر بھائی بے چین تھے کہ خود مل کر اس شخص کا شکریہ ادا کریں جس نے انہیں مزید پچھتاوؤں کے گڑھے میں گرنے سے بچالیا تھا۔

"ہاں بیٹا! کیوں نہیں، لیکن ابھی تو وہ اپنے آفس گیا ہے۔۔۔ آج کتنے بجے تک آئے گا شاہ زین؟" ناصر بھائی سے بات کرتے کرتے اماں نے ثمینہ کو مخاطب کیا تو ناصر بھائی اور ثروت آپا دونوں ہی چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"شاہ زین۔۔۔؟" یہ نام اور اس سے وابستہ ذہن میں موجود کئی یادیں جنہوں نے اُن کے پورے گھرانے کی زندگی مکمل طور پر بدل کر رکھ دی تھی ان دونوں کو بری طرح چونکا کر رکھ گیا تھا۔

☆☆☆

ہر گدا شاہ کا رتبہ مانگے
اک محل اور رعایا مانگے
سر دربار سخن ہے درپیش
شاہ دربار قصیدہ مانگے

چڑھتے سورج کے پجاری ہر جگہ بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں جو بادشاہوں کے سامنے سے آئینہ ہٹا کر خود اپنے لفظوں کے ذریعے ان کی ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ سننے والے اش اش کر اٹھیں اور ایسے ہی لوگ پھر ان کی اس کمزوری سے فائدے بھی اٹھاتے ہیں۔

میران بھی آج فیکٹری میں داخل ہوا تو اسے یوں اچانک اپنے درمیان پا کر سبھی پہلے تو حیرت سے اسے دیکھنے لگے اور پھر خاطر مدارات کی طرف دھیان گیا۔ چونکہ اس سے پہلے وہ صرف فیکٹری کے یہاں قیام کے اوائل روز میں ہی یہاں آیا تھا اور اس کے بعد خود شاہ سائیں ہی اکثر و بیشتر یہاں کے حالات اور کام کی رفتار سے واقفیت رکھنے کی غرض سے یہاں کا چکر لگایا کرتے۔ اس لیے کئی اسٹاف

ممبرز اس کے لیے اجنبی تھے اور ان کے ساتھ آج اس کی پہلی ہی ملاقات تھی۔

کچھ دیر تک ان کے تعارف کے بعد وہ شاہ سائیں کی ہدایت کے مطابق پیکنگ ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور وہاں کے ہیڈ آفیسر کے آفس میں داخل ہوا جو اس وقت خالی تھا۔ کمرے میں گھوم پھر کر اس نے آفس کا جائزہ لینے کے دوران شاہ سائیں کا اپنے پاس کام کرنے والوں کے خیال رکھنے کے انداز کو جی ہی جی میں سراہا اور کچھ دیر انتظار کی غرض سے ریوالونگ چیئر پر بیٹھ کر سامنے شیشے کی صاف شفاف میز پر رکھی فائلز اور کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے عدم دلچسپی کی بنیاد پر دائیں ہاتھ پر انٹرکام کے ساتھ رکھے ریموٹ کو اٹھایا اور سامنے دیوار میں نصب اٹھارہ انچ کے چھوٹے سے ٹی وی کو آن کر کے اس سے پہلے کہ سامنے موجود نیوز چینل کو بدلتا کمرے میں داخل ہوتے شاہ زین کو دیکھ کر چونک گیا۔ خود شاہ زین ہاتھ میں مکمل شدہ آرڈرز کی لسٹ لے کر اندر آتے ہوئے میران شاہ کو یوں اپنی کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے حاکمانہ انداز میں بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔

یہ بات تو ان دونوں ہی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ یونیورسٹی کے بعد کبھی یوں زندگی کے کسی موڑ پر ان کی ملاقات ہو جائے گی۔ نیوی بلیو کلر کی آفس شرٹ اور لائٹ مسٹرڈ پینٹ میں ملبوس شاہ زین ہمیشہ کی طرح ہینڈسم دکھائی دے رہا تھا۔ چہرے پر وہی سنجیدگی، متانت اور ٹھہراؤ جو کبھی یونیورسٹی میں بھی اس کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔ میران نے چند لمحے حیرت زدہ رہنے کے بعد جب یہ بات لاشعوری طور پر سوچی کہ وہ اس فیکٹری کا تن تنہا مالک اور شاہ زین اس کے ایک ادنیٰ ملازم کی حیثیت سے اس کے سامنے کھڑا ہے تو اس کی گردن میں بھی اس کے بادامی رنگ کے شلوار سوٹ سے کہیں زیادہ کلف اترتی محسوس ہوئی۔ دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت انگوٹھے کے ساتھ مل کر مونچھوں کو ہلانے لگی تو ہونٹوں پر خود بخود ایک طنزیہ مسکراہٹ رینگنے لگی۔

"آیئے آیئے، مسٹر شاہ زین! آپ رک کیوں گئے، اندر آیئے نا، آپ کا اپنا آفس ہے۔" شاہ زین نے ایک گہری نظر سے اسے دیکھا اور دروازہ بند کر کے یوں اندر چلا آیا جیسے آج سے پہلے تک وہ اسے جانتا تک نہیں تھا اور اس کے آفس میں موجود ہونے پر اسے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس کا یوں نظر انداز کرنا ہی میران کو گیلی لکڑی کی طرح سلگا کر رکھ گیا تھا۔ میران یہاں اس کے آفس میں کیوں موجود ہے؟ اور اس کا اس فیکٹری سے کیا تعلق ہے؟ یہ سوالات خود شاہ زین کے ذہن میں نمودار تو ضرور ہوئے تھے مگر اس نے کسی بھی قسم کی بات کرنے سے گریز برتا تھا۔

"ہونہہ! بابا سائیں بھی کیسے کیسے لوگوں کو اپنے پاس ملازم رکھ لیتے ہیں اور پھر ان کی تعریفیں بھی کرتے ہیں یہ جانے بغیر کہ وہ ماضی میں کیا کیا گل کھلا چکے ہیں۔" میران نے اپنے ہی انداز میں اپنا تعارف کروایا تو شاہ زین اس کی اور شاہ سائیں کی نسبت جان کر حیران رہ گیا تھا۔ اتنے ڈیسنٹ اور پیار کرنے والی پراثر شخصیت کے مالک کا بیٹا ان سے اس قدر متضاد عادات کا مالک بھی ہو سکتا ہے۔ وہ دم بخود رہ گیا تھا۔ کمرے میں ٹی وی سے نشر ہونے والی خبروں کی آواز ان کے درمیان ایک تیسرے فرد کا کردار ادا کرتے ہوئے فضا کی یکسوئی تقسیم کرنے میں کامیاب نظر آتی تھی۔

"ویسے میں کبھی تو سوچتا ہوں کہ تم جیسے کم حیثیت لوگ بھی کس قدر بے وقوف ہوتے ہو نا، جس لیڈر کی خاطر نعرے لگاتے اور جس کے جلسوں میں جا جا کر جوتیاں گھساتے تم لوگوں کی عمریں بیت جاتی ہیں وہ بس ایک دفعہ تمہاری طرف منہ کر کے تمہارے نعروں کے جواب میں ہاتھ ہلا دے تو وہ بس ایک لمحہ تمہاری پوری زندگیوں پر محیط ہو جاتا ہے اور تم لوگ اپنا بھوکا ننگا وجود لیے اسی کے نام کی مالا جپتے ہوئے زندگی ہار جاتے ہو۔" میران شاہ نے کرسی گھماتے ہوئے اپنا رخ شاہ زین کی طرف کیا جس کے کانوں تک شاید

اس کی آواز پہنچ ہی نہیں پا رہی تھی، فائل ریک میں مکمل شدہ آرڈرز کی فائل نکال کر اس نے ہاتھ میں موجود پیپرز اٹیچ کیے اور ٹرانسپورٹ اینڈ گڈز کی فائل ڈھونڈنے لگا، یوں بھی اس کا ماننا تھا کہ جاہل سے بحث کرنے سے افضل خاموش ہو جانا ہے اور اس کے حد سے تجاوز کرنے کی صورت میں باوجود اس کے وہ اس فیکٹری کا مالک تھا، شاہ زین نے کمرے سے نکل جانے کا اختیار اپنے پاس محفوظ رکھا۔

"بالکل اسی طرح جیسے یونیورسٹی میں تم ندی کے اس وقتی ساتھ کو ہی اپنے لیے سرمایہ کل سمجھتے ہوئے خود کو سکندر اعظم سمجھنے لگے تھے۔ ہونہہ! یہ جانے بغیر کہ وہ سب تو محض ان نعروں کے جواب میں ہاتھ ہلانے کے برابر تھا اور بس۔"

"میران شاہ شاید تم بھول رہے ہو کہ میں نے تمہیں پہلے بھی اپنی زبان سے ندی کا نام نہ لینے کی یاد دہانی کس انداز میں کروائی تھی۔" ندی کا نام آتے ہی شاہ زین جو خود کو خاموش رہنے کی تلقین کر رہا تھا خود پر قابو نہ رکھ پایا۔

"بھول تو شاید تم رہے ہو شاہ زین! کہ جس کا نام بھی لینے کی تم نے مجھ پر پابندی لگائی تھی نا، اب وہ مکمل طور پر میرے نام ہونے والی ہے۔" میران طنزیہ ہنسی ہنسا تو اس کی سیسہ پگھلاتی ہنسی کی آواز کے ساتھ ہی جیسے شاہ زین کی یادداشت لوٹ آئی ہو۔ زمین کے وہ الفاظ اس کی سماعت میں ایک بار پھر بازگشت بن کر گھومنے لگے تھے جن میں اس نے اس روز میران اور ندی کی شادی ہونے کے متعلق بتایا تھا۔ اگر یہی سب کچھ سچ ہے تو پھر سیاہ چادر میں لپٹی ندی کے چہرے پر وہ سوگواریت اور ویرانی کیوں تھی؟ اس کا دل اب تک ندی کی جانب لپک کر اس کی حمایت کیوں کرنے لگتا تھا۔

"یہ میرا ظرف ہی ہے شاہ زین! کہ جس لڑکی کی بدکرداری اخباروں کی زینت بن کر صبح کی دھوپ کی طرح گھر گھر اتری ہو میں پھر بھی اسے اپنے نام کی عزت دے رہا ہوں۔ بڑا غرور تھا نا تمہیں اور بڑا زعم تھا اس کو بھی، یوں۔۔۔۔ یوں چٹکی بجاتے ہوئے میں نے خاک میں ملا دیا تم دونوں کی محبت کو بھی غرور بھی اور عزت بھی۔۔۔" اس نے چٹکی بجاتے ہوئے آنکھیں سکیڑیں۔

"مت بھولو میران شاہ! کہ عزت اور ذلت اوپر والے کے ہاتھ میں ہے جو چاہے تو بادشاہوں کو بھی لمحہ بھر میں بحوالہ کشکول کر دے اور چاہے تو گداؤں کو تخت و تاج کا مالک بنا دے۔۔۔ تم نے جو کیا اور جو کچھ کر رہے ہو وہ تمہاری نیت اور تمہارے اعمال۔۔۔ میں نے نہ کل تمہارا برا سوچا تھا اور نہ ہی آج تمہارے لیے میرے دل میں کوئی برا ارادہ ہے موسمی پرندوں سے الجھنا میری فطرت میں نہیں ہے۔"

ندی کا یوں ذکر آنے پر خود پر مکمل کنٹرول رکھتے شاہ زین نے مناسب لفظوں کے چناؤ سے بات مکمل کی اور مطلوبہ فائل مل جانے پر میران شاہ کی طرف مڑا تو اس کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں دیکھ کر جو اس کی نظروں کے تعاقب میں سامنے ٹی وی اسکرین کو دیکھا تو خود اس کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔

☆☆☆

رحمٰن شاہ کی شادی تو تھی مگر شادی کی تقریب سے کہیں زیادہ اس میں مقابلے کا عنصر نمایاں نظر آ رہا تھا۔ رات ان کے ہاں بھی ڈھولک کی پہلی رات تھی اور خاطر تواضع میں اول و آخر صرف یہی بات مدنظر رکھی گئی تھی کہ وہ اشیاء مہمانوں کے آگے پیش کی جائیں جنہیں دیکھ کر سب کے منہ سے صرف "واہ واہ بہت خوب" جیسے الفاظ کے اور کچھ نہ نکلے۔ ملبوسات کی خریداری ہوتی یا زیورات کی بناوٹ، اصول صرف اور صرف یہی تھا کہ ان کے ڈیزائن اور تعداد اتنی ہو کہ آج سے پہلے تک کسی کی نہ ہو اور نمود و نمائش کی دوڑ میں وہ بلا مقابلہ منتخب ہو کر اعلا ہونے کی مسند عالیہ پر تنہا براجمان ہو سکیں۔ یوں بھی رحمٰن شاہ کا کوئی اور بہن بھائی تو تھا نہیں جو بھی تھا سب اسی کا ہی تھا اور جو کچھ بھی رسوم و رواج یا چاؤ کرنے تھے سب اسی کی شادی پر کیے جانے تھے۔ اس لیے شاہ سائیں کے

مقابلے پر خود کو ان سے اعلا ثابت کرنے کی غرض سے پیسہ پانی کی طرح بہایا اور ہوا کی طرح اڑایا جا رہا تھا۔ شہر کے سب سے بہترین اور مہنگے ترین ڈریس ڈیزائنرز کو آج کل کے فیشن کے عین مطابق بری کے تمام ملبوسات تیار کرنے کا آرڈر دیا گیا تھا۔ عروسی لباس پر سونے کی تاروں سے مکمل طور پر یوں کام کروایا جا رہا تھا کہ لہنگا کا نچلا تمام حصہ صرف اور صرف سونے کا ہی نظر آتا اور بس صرف یہی نہیں تھا بلکہ سر پر رکھے جانے والے تاج میں خصوصی طور پر ڈائمنڈ لگوا کر خاندان کی پچھلی تمام روایات سے چار قدم آگے بڑھائے گئے تھے۔

اسے بخوبی یاد تھا کہ آج سے چند سال پہلے میران کے ماموں کے بیٹے کی شادی پر دلہن کو رخصتی کے بعد جب گاڑی میں بٹھایا گیا اور گاڑی مین روڈ پر چلی تو پانچ پانچ روپے کے نوٹ ہوا میں اڑائے جاتے رہے کئی لوگ ہوا میں اڑتے ان نوٹوں کے پیچھے بھاگتے حیرانی سے اپنی زندگی میں دیکھی جانے والی اس واحد بارات کو یادوں میں محفوظ کرتے کہ جب ہر گاڑی کا شیشہ نیچے اور اس میں سے پانچ اور دس کے نوٹ یوں باہر اچھالے جا رہے تھے جیسے کوئی بدتہذیب انسان کچھ کھا کر گاڑی سے باہر ہی چھلکا پھینکتا جائے۔ اس انوکھی بارات کو لوگ آج تک یاد کرتے تھے سو رحمٰن شاہ نے ظاہر ہے کچھ ایسا کرنا تھا کہ اُن کی بارات کا اثر لوگوں کے ذہن سے زائل ہو جاتا۔ اسی معاملے میں کچھ صلاح مشورہ کرنے وہ آج اپنے ایک جیولر دوست کے پاس بیٹھا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ دونوں مل کر چائے پی رہے تھے اور اس سے پہلے کہ بات شروع ہوتی، شاپ میں موجود ٹی وی سے نشر ہوتی خبر نے اس کا دماغ بھک سے اڑا دیا۔

بے شمار مائکس کے پیچھے نقاب کیے کھڑی لڑکی اور ساتھ چست و توانا جسم کا حامل لمبا چوڑا نوجوان، اسکرین کے ایک کونے میں ان دونوں کو لفٹ سے نکلتے دکھایا جا رہا تھا اور اس میں اس لڑکی کا چہرہ با آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی اور نہیں مہر یا تو ہے جو میڈیا کے ان نمائندوں کے مطابق اس لڑکے کے ساتھ ساری رات لفٹ میں رہی تھی اور صبح لفٹ سروس کے نمائندگان جب اسٹور انتظامیہ کے ساتھ پہلے سے طے شدہ وقت پر لفٹ کی درستگی کے لیے پہنچے اور لفٹ کھولی تو ان دونوں کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"صوبائی اسمبلی کے ممبر حیدر شاہ کی بیٹی ڈرامائی انداز میں لفٹ سے برآمد۔" صحافی حضرات اپنے اپنے چینلز تک خبر پہنچا کر اب ان سے مختلف قسم کے سوالات کر رہے تھے۔ خلاف توقع پولیس بھی وہیں پر موجود تھی اور چاہتی تھی کہ رپورٹرز ان سے بھی بات چیت کر کے آئندہ کے لائحہ عمل اور ان پر لگنے والی ممکنہ دفعات کے بارے میں بھی کچھ بات چیت کریں مگر فی الحال تمام رپورٹر کا رخ ان کی طرف تھا جو کسی طرح وہاں سے نکلنا چاہتے تھے مگر سامنے کھڑے رپورٹرز اور شاپنگ مال میں خریداری کی نیت سے موجود لوگوں کا رش جو کیمرے دیکھ کر مزید بڑھتا جا رہا تھا اس قدر تھا کہ وہ وہاں سے نکل پانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے تھے۔

وہ کس وقت سے لفٹ میں موجود تھے؟ کیا انہوں نے لفٹ نہ کھلنے پر کسی سے رابطہ کیا؟ ساری رات گزر گئی مگر ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی اپنے کسی دوست، عزیز رشتہ دار کو فون تک کر کے مدد کے لیے کیوں نہیں کہا؟ لفٹ کے باہر چھوٹا سا نوٹس جس پر لفٹ خراب ہونے کی صورت میں دی جانے والی ہدایات تھیں وہ کیوں نہ پڑھی گئیں؟ یہ اور اس جیسے کئی سوالات جو یکے بعد دیگرے جواب کے انتظار کے بغیر پوچھے جا رہے تھے۔ کسی چینل نے تو فوراً سے پیشتر ہاسٹل کی انتظامیہ کو بھی لائن پر لے لیا اور ان سے پوچھا جانے لگا کہ اگر ان کی کوئی طالبہ رات بھر ہاسٹل سے باہر رہے تو وہ اس کے خلاف کیا کارروائی کرنے کی مجاز ہیں؟ اور کیا اس سے پہلے بھی وہ کبھی ہاسٹل کے اوقات سے تاخیر سے واپس آئی؟ کچھ چینلز پر یہ بھی قیاس کیا گیا کہ شاید وہ دونوں شادی کرنے کے خواہاں تھے اور گھر والوں کی رضامندی نہ

ہونے کے باعث یہ ایک احتیاطی عمل تھا اور بس۔ اس کے فوراً بعد ماہر نفسیات کو بھی آن لائن لے کر نفسیات پر بات شروع ہوئی اور یوں کچھ دیر کے لیے میڈیا کے ہاتھ ایک دلچسپ خبر آگئی جسے وہ مزے لے کر بیان کرتے اور باوجود اس کے کہ مہربانو نے لفٹ سے نکلنے کے فوراً بعد یوں غیر متوقع طور پر لوگوں کو اپنے سامنے موجود پایا تو فوراً چہرے پر نقاب کرلیا تھا مگر وہ چند لمحات جن میں وہ لفٹ سے باہر نکلی تھی میڈیا والے یوں بار بار دکھا رہے تھے گویا انہوں نے بڑی مہارت سے یہ سین فلمبند کیا ہو اور پھر اکمل کی برداشت کی حد ختم ہوگئی اس نے ساری دنیا کے سامنے مہربانو کا ہاتھ تھاما اور اس کے سرد پڑتے وجود کو لوگوں کی چبھتی نظروں اور زہر خند سوالوں سے بچا کر گاڑی میں بٹھایا اور ایکسیلیٹر پر پاؤں کا وزن بڑھاتا چلا گیا۔

یہ سب دیکھ کر مارے غصے کے رحمن شاہ کے منہ سے کف نکلنے لگا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً گاڑی میں بیٹھا اور ملکانی سائیں کے پاس جا پہنچا جو سونی کو گود میں لیے کارڈلیس اور موبائل فون سامنے رکھے بیٹھی تھیں اور بند آنکھوں کے ساتھ دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے ہوئے تھیں۔ آندھی طوفان کی مانند رحمن شاہ اندر داخل ہوا تو وہ چونک گئیں اور اس کے تیور دیکھ کر اس کے کچھ بھی کہنے کے بغیر ہی سہم گئیں۔

”شاواشے چاچی شاوا۔۔۔ اب سمجھ آیا مجھے کہ تو کیوں اس دن شادی ٹالنے کی ضد کررہی تھی۔“

وہ سمجھ گئی تھیں کہ اسے مہربانو کے متعلق کوئی سن گن ملی ہے مگر کیا؟ یہ بات ابھی ان کی سمجھ سے باہر تھی۔

”میں اتنا ہی ناپسندیدہ تھا تو کیوں مجھے اتنا عرصہ لارے پر رکھا، کہہ دیتی نا مجھے یا اپنے اُن بھائیوں سے کہلوا دیتی جو آج سے پہلے تک بڑا شملہ اونچا کر کے چلتے تھے کہ ہماری بیٹی نے اپنا رشتہ خود ڈھونڈ لیا ہے اور اگر ہم نے اس کی نہ مانی تو وہ سب کے منہ پر کالک مل کر بھاگ جائے گی اُس کے ساتھ۔“

ملکانی سائیں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ یہ کیا کہہ رہا تھا رحمن شاہ اور آخر کس بنیاد پر اتنا بڑا الزام لگا رہا تھا ان کی بیٹی پر۔ ہاتھ پاؤں میں فوراً لگتا جیسے ساری دنیا کے حشرات الارض رینگنے لگے تھے۔

”ایہہ کی کہہ رہا ہے رحمن شاہ! ہوش نال گل کر، تے دماغ ٹھیک رکھ کے اپنی زبان تے قابو رکھ۔“ اپنی بیٹی پر اس قدر کھلم کھلا الزام لگاتے رحمن شاہ کو سامنے صحیح سالم کھڑے دیکھ کر ان کا دل چاہا تھا کہ وہ اس کا منہ نوچ لیں اور اس کی زبان حلق سے کھینچ کر اسے آئندہ کے لیے اپنی بیٹی کا نام لینے کے قابل ہی نہ چھوڑیں اور رات سے چاہے وہ کتنی ہی نڈھال تھیں مگر اب ان کے اندر ایک عجیب سی طاقت اتری تھی اور انہیں لگ رہا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو وہ اسی لمحے اپنی بیٹی پر کیچڑ اچھالنے والے سامنے کھڑے شخص کو منہ کے بل گرا سکتی ہیں۔

”زبان پر بھی قابو ہے چاچی! اور میرا دماغ بھی ٹھیک ہے۔ بھئی دینے شاواش دینی چاہیے تیرے گھر والوں کو بھی کہ تجھے اسی لیے ہی تو ساری عمر نرا جاہل ہی رکھا کہ خود وہ تینوں باہر جو مرضی گل چھرے اڑاتے رہیں تجھے حویلی بیٹھی کو کچھ خبر بھی نہ ہو۔“

ملکانی دل ہی دل میں جاننا تو چاہ رہی تھیں کہ آخر اس کے ہاتھ کون سا ایسا سرا لگا ہے کہ وہ ڈور کھینچ کر ان کی روح تک ہلا ڈالنے کے درپے ہے مگر فی الحال انہوں نے اس کی بات کے مکمل ہونے کا انتظار کیا۔

”چاچا سائیں ہیں تو وہ رب جانے شہر میں کیا کرتے پھرتے ہوں گے آخر سیاست دان ہیں غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے تو ماہر ہیں ہی نا، میران کو خیر سے رنگ رلیاں منانے سے ہی فرصت نہیں، سمجھتا ہے کہ بس دولت اور حاکمیت تو بس اسی کے پاس ہے۔ دونوں بازوؤں کو ایک ایک فٹ دور رکھ کر اور جو گردن میں سریا ڈال کر چلتا تھا نا۔۔۔ توڑ دیا ہے تیری بیٹی نے آج۔ ٹی وی لگا کر دیکھ چاچی! مہربانو ساری رات اپنے عاشق کے ساتھ صرف دو گز کی لفٹ میں مرزا صاحبہ کی کون سی داستان دوہراتی رہی

ہے اور یہ میں نہیں ٹی وی پر بیٹھے لوگ کہہ رہے ہیں کہ وہ دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں شادی۔۔۔“

”رحمن شاہ۔۔۔! بکواس بند کر۔“ ملکانی سائیں اس قدر زور سے چلائی تھیں کہ حویلی کے درودیوار نے آج تک اُن کی اتنی اونچی آواز نہیں سنی تھی۔ جذبات سے سرخ ہوتا چہرہ اور آنکھوں میں اترتا خون۔۔۔ وہ اب ایک لفظ بھی اس کے منہ سے نہیں سننا چاہتی تھیں۔ ارد گرد موجود ملازمین بھی ان کی آواز کی شدت پر حیرت سے ایک دوجے کو دیکھنے لگے تھے۔ اپنے کاموں میں مصروف ہونے کے باوجود اب ان کے کان حویلی کی اندرونی خانے کی طرف کھڑے ہوگئے تھے اور رحمن شاہ جو اب تک صرف مہربانو ہی کی امید پر شادی کے۔۔۔ انتظار میں تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کسی طور مہربانو کو وہ سبق سکھائے کہ آئندہ کی ان کی تمام نسلوں میں کسی کو اپنی بیٹی کو پڑھانے کی ہمت نہ ہو اور وہ جو یہ سمجھ رہا تھا کہ مہربانو سے متعلق معلوم ہونے پر ملکانی سائیں فوراً اسے کوستے ہوئے اپنے نصیبوں کو روئیں گی اور اس کے ساتھ اظہار ہمدردی و یکجہتی کریں گی ایسا کچھ بھی نہ ہونے پر وہ مزید سیخ پا اور آگ بگولا ہو رہا تھا۔

”آج تو کچھ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ تیری بیٹی پکڑی گئی ہے چاچی! ورنہ کون جانے کہ اس سے پہلے اس نے کتنی دفعہ ہاسٹل سے باہر راتیں گزاری ہوں گی اور کتنی دفعہ اپنے سب اگلوں پچھلوں کا منہ کالا کیا ہوگا۔“

”میں کہتی ہاں اب ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تے میں تیری زبان کھچ لاں گی، دفع ہوجا ایتھوں۔۔۔ نکل جا۔“

”سچی بات ہے چاچی! برداشت کر برداشت۔“ رحمن شاہ نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بات کرتے ہوئے ریموٹ سے ٹی وی لگا کر ریموٹ اُن کی طرف رکھے صوفے پر اچھالا اور خود باہر نکل گیا۔ اسکرین پر ابھی تک وہی منظر دکھایا جارہا تھا۔ ملکانی سائیں نے شدتِ غم سے سینے پر ہاتھ رکھا اور بیٹھتی چلی گئیں۔

☆☆☆

بھول جائیں تو آج بہتر ہے
سلسلے قرب کے جدائی کے
بجھ چکیں خواہشوں کی قندیلیں
لٹ چکے شہر آشنائی کے
رائیگاں ساعتوں سے کیا لینا
زخم ہوں پھول ہوں ستارے ہوں
موسموں کا حساب کیا رکھنا
جس نے جیسے بھی دن گزارے ہوں
زندگی سے شکایتیں کیسی
اب نہیں ہیں اگر گلے تھے بھی
بھول جائیں کہ جو ہوا سو ہوا
بھول جائیں کہ ہم ملے تھے کبھی
اکثر اوقات چاہنے پر بھی
فاصلوں میں کمی نہیں ہوتی
بعض اوقات جانے والوں کی
واپسی سے خوشی نہیں ہوتی

نیند کی ادویات کے سبب کچھ دیر ندی سے بات چیت کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر غنودگی میں تھیں۔ رات دی جانے والی دواؤں کا اثر بہر حال ابھی موجود تھا ورنہ ڈاکٹرز نے اب ان کی حالت کو تسلی بخش قرار دے دیا تھا۔ رات بھر کی جاگی ندی کی آنکھوں میں البتہ اب بھی نیند کی کوئی رمق تک نظر نہیں آرہی تھی۔ کرسی کو دیوار کے ساتھ رکھ کر پاؤں امی کے بیڈ پر ٹکائے سر کو کرسی کی پشت پر رکھے وہ اپنی اور شاہ زین کی ہونے والی اس غیر متوقع اور انوکھی ملاقات کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ جس سے ملنے اور بات کرنے کی خاطر وہ انتہائی رسک لے کر گھر سے نکلی اور اس کے گھر تک پہنچی، آج اس سے ملاقات ہوئی بھی تو کیسی، ایک ملاقات کے لیے اُس نے کتنی دعائیں مانگی تھیں کیونکہ اس کا خیال تھا کہ شاید شاہ زین سے مل کر اس کے تمام مسائل حل ہوجائیں گے مگر آج اس کے انداز میں موجود اس بے گانگی نے ندی کو بہت دکھ دیا تھا۔ اس کی امیدوں کے برعکس نہ تو

اس نے ندی کے یوں اچانک نظر آنے پر کوئی گرمجوشی دکھائی اور نہ ہی اس کی آنکھوں میں ندی کی خوشی کا کوئی تاثر ملا۔ بات کرنے کا انداز بھی ایسا کہ جیسے کوئی جنگ کے پہلے مرحلے پر ہی ہتھیار ڈال دے۔ اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی بجائے اس کے کہ وہ ندی سے ہمدردی کے دو بول بولتا خود اس کا انداز ہی ندی کو بے حد روٹھا روٹھا اور شاکی محسوس ہوا اور یہی بات ندی کے لیے باعث تکلیف بھی تھی۔ یونیورسٹی میں اکٹھے گزارے گئے خوش گوار لمحات کی یادیں کسی فلم کی ریل کی طرح ایک بار پھر اس سے پہلے کہ آنکھوں کے پردے پر چلنے لگتیں اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ خود کو بار بار اس اذیت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جبھی خود کو مصروف رکھنے اور اپنا دھیان شاہ زین کی باتوں سے ہٹانے کے لیے اٹھ بیٹھی۔ امی کے بیڈ کی طرف دیکھا تو پھر سے خیال آ گیا کہ خود وہ اس کے لیے کتنی دعائیں مانگا کرتی تھیں کہ اس کی شاہ زین سے ملاقات ہو جائے اور جب اس نے براہ راست اس کے گھر جانے کا فیصلہ کیا تب بھی اس کا بھرپور ساتھ دیا۔

"اس سے تو بہتر تھا شاہ ہو کہ تم سے ملاقات ہی نہ ہوتی کم از کم تمہاری یاد ایک کسک بن کر دل کا حصہ تو رہتی اور میرے دل میں یہ خلش تو ہوتی کہ اگر تم سے ملاقات ہو جاتی اور میں تم کو اپنے ساتھ بیتنے والے تمام حالات بتا پاتی تو تم کوہ قاف کے شہزادے کی طرح مجھے حالات کے ظالم جادوگر سے بچا کر اپنے سفید گھوڑے پر بٹھائے کہیں دور لے جاتے جہاں ہم ہمیشہ ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے۔"

وقت گزاری کے لیے وہ کمرے سے نکل کر یونہی ہاسپٹل میں سست قدموں سے گھومنے لگی تھی۔ وہ جگہ جہاں اس کی اور شاہ زین کی ملاقات ہوئی تھی وہاں دیر تک کھڑی اس راہداری کی طرف دیکھے گئی جہاں ثمینہ اور شاہ زین گئے تھے۔ دل تو چاہا کہ وہ بھی اس طرف جائے اور شاید کہیں کسی طرف ایک بار پھر وہ اسے دیکھ سکے مگر کیوں؟ اور آخر اب ان سب باتوں کا کیا حاصل تھا؟ یہی سوچ کر اس نے خود کو اس عمل سے باز رکھا اور ریسپشنسٹ کے بلانے پر اس کی طرف بڑھی۔ ریسپشن پر موجود یہ نرس اس دن ندی کو امی کے لیے روتے بلکتے دیکھتی رہی تھی اس لیے اس کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ بھی زیادہ تھا۔ آتے جاتے ندی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس کا حال چال پوچھتی اور حوصلہ بڑھاتی رہی۔

"یہ تمہارے نام خط رکھا ہوا ہے، ابھی تمہیں دیکھا تو یاد آیا ورنہ تو انہی پیپرز میں ہی جانے کب تک پڑا رہتا۔" ندی کے قریب جانے پر اس نرس نے دو تین کاغذات کے نیچے سے جھانکتے لفافے کو اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

"میرے نام خط؟" وہ حیران ہوئی۔

"ہاں۔۔۔ ثمینہ نام کی لڑکی تھی جس نے دیا۔ کہہ رہی تھی کہ اسے تمہارا کمرہ نمبر وغیرہ معلوم نہیں ورنہ خود دے دیتی، صرف نام ہی پتا تھا اسے، مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا رکھ دو میں پہنچا دوں گی۔" نرس نے تفصیل بتائی۔

"اور وہ خود؟" ندی نے بغیر کسی نام پتے کے اس سفید لفافے کو الٹتے پلٹتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"وہ لوگ تو رات اپنی والدہ کے ڈسچارج ہونے کے بعد گھر چلے گئے ہیں۔ اس کے بھائی نے ہی تو تمہاری امی کے لیے اپنا خون دیا تھا نا۔" نرس نے مزید اطلاع دی تو ندی کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے مزید پھیل گئیں۔

"واقعی۔۔۔؟" وہ حیران تھی۔

وہ جس شخص کو اب خود سے کوسوں دور محسوس کر رہی تھی وہ اب بھی اس کے ساتھ تھا اور اب ہر گھڑی اسے اس کے ساتھ ہی رہنا تھا کہ اس کا خون امی کی رگوں میں نئی زندگی کی نوید بن کر دوڑ رہا تھا۔ قدرت کی اس دھوپ چھاؤں پر حیران و پریشان کھڑی وہ کچھ دیر یونہی لفافے کو دیکھتی رہی اور پھر سامنے سے آتی ثروت آپا اور ناصر بھائی کو دیکھ کر اس نے بے اختیاری طور پر لفافہ اپنی سیاہ چادر میں چھپایا مبادا ناصر بھائی نہ دیکھ لیں۔

(دسویں اور آخری قسط آئندہ ماہ)

ناولٹ

ریحانہ امجد بخاری

وہ اک پری ہے

فرزان ایک دن کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو چائے پینے کی نیت سے باہر جاتا ہے جہاں اس کی ملاقات چند علماء کرام سے ہوتی ہے جو اسے باقاعدگی سے مسجد آنے اور نیک اعمال کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ فرزان کی ان سے بحث ہوجاتی ہے۔ تو تکرار میں بہت سے لوگ جمع ہوجاتے ہیں۔ اسی دوران پولیس آجاتی ہے جو ان سب کو پکڑ کر تھانے لے جاتی ہے وہاں پر بھی فرزان پولیس والوں سے عجیب و غریب گفتگو کرتا ہے۔ پولیس والے اسے پاگل قرار دے کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اذان کو ایک اسٹیج پلے کرنے کی آفر ملتی ہے۔ ساری ذمہ داریاں اسی پر ہوتی ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ تیاریوں میں لگ جاتا ہے۔ اسکرپٹ کے مطابق ڈرامے میں ایک لڑکی کی ضرورت ہے مگر ان کی ٹیم میں کوئی لڑکی نہیں ہے۔ ایک دوست رانا فہیم اسے بتاتا ہے کہ وہ ایک ایسی لڑکی کو جانتا ہے جو یہ کردار بہت اچھا کرسکتی ہے۔ اذان اس لڑکی ماہم سے ملتا ہے۔ ماہم بہت پر اعتماد اور خوب صورت لڑکی ہے جو پوری ذمہ داری سے اپنا کام کرتی ہے۔ اذان اس کے حسن اور صلاحیتوں سے متاثر ہوجاتا ہے مگر اس کے سامنے اعتراف نہیں کرتا۔ ماہم اس کے گروپ کے تمام لڑکوں سے فری ہوجاتی ہے اور باری باری سب کو اپنا موبائل نمبر دیتی ہے۔ اذان کو یہ بات بہت بری لگتی ہے۔ مگر وہ اس سے موبائل نمبر نہیں مانگتا۔ اذان کا اسٹیج پلے بہت پسند کیا جاتا ہے مگر اسی دوران اس کے اپنے دوست رانا فہیم سے تلخی ہوجاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ماہم اب تمہارے پلے میں کام نہیں کرے گی۔ تم کوئی متبادل انتظام کرلو۔ اذان جیسے تیسے باقی کے پروگرام کرتا ہے مگر وہ ماہم کو بھول نہیں سکا۔ وہ دل ہی دل میں اسے یاد کرتا ہے۔ اس کے دوست اور ٹیم ممبر اسے بتاتے ہیں کہ ماہم فون پر سب سے بات کرتی ہے لیکن وہ ملنے کے سخت خلاف ہے اور ایک مخصوص حد تک بات کرتی ہے۔ وہ دوستی کرنے کے حق میں نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ جو شخص اس سے مخلص ہوگا اور اس سے شادی کا خواہش مند ہوگا وہ اسی سے تعلق رکھے گی۔ ماہم کے خیالات سن کر اذان کو خوشی ہوتی ہے۔ ماہم کا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہوتا ہے اس کی ماں ایک اسکول میں کینٹین چلاتی ہے اور باپ سائیکل پر گھوم کر صبح کے ناشتے کے لیے سموسے بیچتا ہے۔ مگر وہ اپنی غربت کے باوجود ماہم کو اعلیٰ تعلیم دلا رہے ہیں۔ ماہم بی کام کی اسٹوڈنٹ ہے۔ ذہین اور حساس مگر اپنی غربت سے نالاں ہے۔ اذان کو اپنے ایک دوست سے پتہ چلتا ہے کہ ماہم ایک کریمنل آدمی سے ٹیلی فونک رابطے میں ہے اور اس کی دوستی کا دم بھرتی ہے۔ اذان کو تشویش ہوتی ہے مگر وہ اپنے دوستوں سے اس کا نمبر پوچھنا پسند نہیں کرتا۔ اسی دوران اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ اس کا ایک دوست رشتے میں ماہم کا چچا لگتا ہے۔ اذان اس سے ماہم کا نمبر حاصل کرلیتا ہے۔ اذان اور ماہم کی دوستی ہوجاتی ہے۔ جو رفتہ رفتہ محبت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ محلے دار فیضی صاحب سے فرزان کی الٹی سیدھی حرکتوں کی شکایت کرتے ہیں۔ فیضی صاحب بہت شرمندہ ہوتے ہیں اور فرزان سے سخت رویہ تنقید کرتے ہیں۔ وہ دوٹوک انداز میں کہتے ہیں کہ یا تو اپنے دوستوں کو چھوڑ دو یا پھر گھر کو۔ فرزان ضد میں آکر بیوی بچوں کا ساتھ دیتا ہے اور گھر چھوڑ دیتا ہے۔ فرزان کے گھر چھوڑنے کے بعد فیضی صاحب فرزان کی بہت کمی محسوس کرتے ہیں مگر اس کا اظہار نہیں کرتے۔ ذکیہ بیگم جو ایک ماں ہیں، بیٹے کی جدائی ان پر بھی بہت اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ بیٹے کی وکالت کرتی ہیں مگر فیضی صاحب انہیں سمجھا دیتے ہیں کہ وہ بیٹے کی بھلائی کے لیے کررہے ہیں۔ فرزان گھر چھوڑنے کے بعد مالی پریشانیوں کا شکار ہے اور اس کے گھر کے حالات بہت خراب ہیں۔ اس کا ایک دوست اسے ایک این جی او میں کام کرنے کی دعوت دیتا ہے جہاں اس کی ملاقات نیلم سے ہوتی ہے۔ نیلم کو فرزان بہت اچھا لگتا ہے مگر وہ اسے بتادیتا ہے کہ وہ شادی شدہ ہے یوں نیلم کے دل میں فرزان کی محبت پروان چڑھنے سے پہلے ہی ختم ہوجاتی ہے۔ فیضی صاحب کو بیٹے کی نافرمانی اور جدائی نے اندر سے توڑ دیا ہے۔ انہی دنوں فیضی صاحب کا دوسرے شہر جانا ہوتا ہے۔ وہ وہاں جاکر شدید بیمار ہوجاتے ہیں۔ اذان فرزان سے کہتا ہے کہ وہ جاکر ان سے معافی مانگ لے اور انہیں گھر لے آئے مگر فرزان اس سے بھی بدتمیزی کرتا ہے اور اس کی بات ماننے سے انکار کردیتا ہے۔ فرزان کو فیضی صاحب کے انتقال کی خبر ملتی ہے تو اسے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر دل ہی دل میں بہت شرمندگی ہوتی ہے مگر بجائے اس کے کہ وہ اپنی اصلاح کرتا اور غلط کام کرنے لگتا ہے۔ تدفین والے دن شراب کے نشے میں دھت ہوکر الٹی سیدھی حرکتیں کرتا ہے۔ فرزان کی وہی روٹین ہوتی ہے اب تو اسے روکنے ٹوکنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا اس کی اور اس کے دوستوں کی چاندی ہوجاتی ہے۔ زارا دبے لفظوں میں اسے سمجھاتی ہے مگر وہ اسے ڈانٹ دیتا ہے۔ فرزان سنجیدگی سے سوچتا ہے کہ اسے اپنے آپ کو بدلنا چاہیے اور ڈھیر ساری دولت کمانی چاہیے وہ ان باتوں کا ذکر محبوب خان سے کرتا ہے۔ محبوب خان جلال زئی قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اور لنڈی کوتل کا رہائشی ہے جو اسے منشیات اور اسلحہ کے کاروبار کے متعلق معلومات دیتا ہے جس میں فرزان خاصی دلچسپی لیتا ہے۔ معاشی حالات اور تنگ دستی سے گھبرا کر وہ محبوب خان کے ساتھ لاہور چلا جاتا ہے۔ ان کا پروگرام ہوتا ہے کہ کچھ دن لاہور رہ کر سیر و تفریح کریں گے پھر وہاں سے لنڈی کوتل روانہ ہوجائیں گے لیکن وہاں ایک حادثہ میں فرزان شدید زخمی ہوجاتا ہے۔ محبوب خان فرزان کو زخمی حالت میں اسپتال چھوڑ کر فرار ہوجاتا ہے لیکن وہ فون کرکے نیلم کو اس کے بارے میں بتادیتا ہے۔ فرزان ہوش آنے پر ڈاکٹر فریال سے حسب عادت عجیب و غریب گفتگو کرتا ہے تو ڈاکٹر فریال کو اس سے دلچسپی پیدا ہوجاتی ہے اور وہ اسے کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر لے جاتی ہے۔ اذان اور ماہم میں بے تکلفی پیدا ہوتی ہے تو اذان اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے لیکن ماہم انکار کردیتی ہے جس پر اذان سخت ناراض ہوجاتا ہے۔ ماہم اسے دوبارہ کال کرتی ہے تو وہ ماہم سے کہتا ہے کہ اس نے اس کے انکار پر دل برداشتہ ہوکر دیوار میں ٹکریں ماری ہیں جس کی وجہ سے اس کا سر پھٹ گیا ہے اور پیشانی پر زخم آیا ہے۔ ماہم سہم جاتی ہے اور اگلے ہی دن اذان کی مزاج پرسی کے لیے آنے کا وعدہ کرکے فون بند کردیتی ہے۔ اذان پریشان ہوجاتا ہے کیوں کہ اس نے دیوار میں ٹکریں ماری ہوتی ہیں نا ہی اس کی پیشانی پر زخم آیا ہوتا ہے۔ وہ بوکھلا کر اپنے دوست علی کو فون کرتا ہے اور اپنے اس جھوٹ کو نبھانے کے لیے اس سے مشورہ طلب کرتا ہے۔ علی کہتا ہے کہ وہ کاٹن پر رنگ لگا کر سر پہ پٹی باندھ لے لیکن اذان مطمئن نہیں ہوتا اسے خدشہ ہوتا ہے کہ ماہم پٹی کھول کر دیکھ لے گی اور اس کا جھوٹ پکڑا جائے گا وہ پریشان ہوکر اپنا سر پھاڑنا چاہتا ہے مگر تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے اس کا حوصلہ نہیں کرپاتا۔ تنگ آکر وہ پیشانی پر زخم بنوانے اسپتال جا پہنچتا ہے۔

-۲۰-

بیسویں قسط

چلا تو راہ میں، ہرگز نہ میں کہیں پہ رکا
میں آسمان سے اترا تو اس زمیں پہ رکا
میں مر کے پہنچا وہیں جس جگہ کی مٹی تھا
مرا خمیر جہاں سے چلا وہیں پہ رکا

شاعر نے یہ شعر نہ جانے کس کیفیت میں ڈوب کر لکھا ہوگا لیکن کبھی کبھی کچھ اشعار ہمارے جذبات، ہمارے احساسات، ہماری کیفیات کی اس قدر مکمل ترجمانی کرتے ہیں کہ ہمیں ان میں اپنی زندگی کا عکس دکھائی دیتا ہے اور یہ عکس حقیقت سے بہت قریب ہوتا ہے یہی حقیقت اس وقت اس پر بھی آشکار تھی۔

وہ آسمان سے اترا تھا جہاز لینڈ کرچکا تھا اب اس کے قدم زمین کو چھو رہے تھے اور وہ زمین کا سینہ ناپتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتا چلا جارہا تھا۔

زندگی اور موت یقیناً خالق دو جہاں کے ہاتھوں میں ہے لیکن کبھی کبھی انسان زندہ ہوتے ہوئے بھی خود کو مردہ تصور کرتا ہے جب وہ ساری کشتیاں جلا دیتا ہے، جب وہ سب کچھ لٹا دیتا ہے، جب وہ شکست کا بوجھ کندھوں پر لاد لیتا ہے تو وہ ٹوٹ جاتا ہے، مر ہی جاتا ہے اور وہ بھی یہاں تک پہنچا تھا تو اپنے آپ کو مار کر ہی پہنچا تھا۔ وہ اپنی پچھلی زندگی کو خیرباد کہہ چکا تھا اور اب وہ اسی فضا میں سانس لے رہا تھا اسی زمین پر چل رہا تھا اسی آسمان کے نیچے سفر کررہا تھا جہاں وہ رہتا تھا۔ جس مٹی سے اس کا خمیر اٹھایا گیا تھا۔ آج وہ اپنی اسی شناسا بستی میں موجود تھا۔ یہ اس کا اپنا علاقہ تھا جہاں اس کے بچپن کے دن گزرے تھے۔ جہاں کھیلتے ہوئے کودتے ہوئے، بھاگتے دوڑتے ہوئے اس نے ایک وقت گزارا تھا۔ یہ وہ گلیاں تھیں وہی مانوس مناظر تھے اور آج وہ پھر ایک طویل عرصے کے بعد ان سارے مناظر کو ایک ساتھ اپنی نگاہوں میں قید کرلینے کی جستجو لیے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے ہوئے ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر نکل آیا تھا۔

ایک جگہ کھڑے ہوکر اس نے چاروں جانب کا جائزہ لیا، پھر ایک طویل سانس اپنے پھیپھڑوں میں بھرنے کے بعد آہستہ آہستہ خارج کی اور پھر سست قدمی سے ایک جانب چلنے لگا۔

یہ دیکھے بھالے مناظر، یہ دنیا، یہ لوگ اس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ یہ سب کے سب اس کے اپنے تھے اور اپنائیت کا یہ احساس اس کے سینے میں لہریں لے رہا تھا۔

شعر کہنا، شعر پڑھنا اور اچھے اشعار کو یاد رکھنا شروع سے ہی اس کا شوق رہا تھا اور اس وقت بھی اس کے دماغ میں کچھ اشعار گونج رہے تھے۔

وہی حسن نظر ہے اور میں ہوں
وہی تیرا شہر ہے اور میں ہوں
وہی گلیاں وہی مانوس چہرے
وہی چھوٹا سا گھر ہے اور میں ہوں
وہی ہیں فاصلے جو درمیاں تھے
وہی لمبا سفر ہے اور میں ہوں
وہی بے نام سی چھاؤں ہے سر پر
وہی سوکھا شجر ہے اور میں ہوں
مری قسمت میں ہے صحرا نوردی
تمنا در بدر ہے اور میں ہوں
جو میرے درد کو پہچانتی ہے
وہ میری چشم تر ہے اور میں ہوں

وہ ان سب چیزوں سے ہم کلام ہوتے ہوئے قدم آگے بڑھاتا چلا جارہا تھا۔ ابھی وہ چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ پیچھے سے بھاگتے ہوئے ایک شخص اس کے قریب آیا اور بولا۔

"صاحب۔۔۔!صاحب!ٹیکسی چاہیے؟"

اس نے مڑ کر اس کالے بھجنگ شخص کی جانب دیکھا، چھوٹا سا گھٹا ہوا قد، سر بالوں سے بے نیاز چاند کی طرح چمکتا ہوا، کالے سیاہ توے جیسے چہرے کے اوپر گہری سیاہ مونچھیں، چندھیائی ہوئی آنکھیں اور گلے میں چمڑے کا موٹا سا تعویذ لیے ٹیکسی ڈرائیور کم اور ڈاکو زیادہ ظاہر کر رہا تھا لیکن شاید وہ تھا محنتی شخص اس لیے وہ ہاتھ آئی روزی کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اور اسی لیے وہ اس کے پیچھے لپکا تھا۔

فرزان نے بغور اس کا جائزہ لیا اور پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے ادب سے پچھلا دروازہ کھولا اور وہ اپنے چھوٹے سے بریف کیس سمیت اس عجوبہ روزگار گاڑی میں براجمان ہوگیا۔

ڈرائیور نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اگنیشن سوئچ میں چابی گھمائی اور گاڑی ہلکا سا کھانس کر، غرا کر بند ہوگئی۔ اس نے مزید کوشش کی، صورت حال جوں کی توں رہی، اس نے شرمندہ سے انداز میں شیشہ درست کرتے ہوئے فرزان کی جانب دیکھا اور شاید پھر تمام تر قوت مجتمع کر کے ایک آخری کوشش کر ڈالی اور اس کی یہ کوشش کامیاب ہوگئی۔ گاڑی نے بھی یقیناً اس کی بے بسی کا اندازہ لگا لیا تھا اور وہ کسی مدقوق بوڑھے کی طرح کھانستے ہوئے ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ اسٹارٹ ہوگئی۔

ڈرائیور نے گیئر بدلا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

گاڑی آگے بڑھی تو فرزان کی نظریں کھڑکی سے باہر تبدیل ہوتے مناظر پر جا ٹکیں، منظر تبدیل ہو رہے تھے، گاڑی رواں دواں تھی، گلیاں، فٹ پاتھ، درخت، لوگ تیزی سے گزرتے جا رہے تھے اور گاڑی سڑک پر چلی جا رہی تھی۔

چند لمحوں تک یہ سفر جاری رہا اور پھر ایک جگہ نظر پڑتے ہی فرزان نے آگے بیٹھے ڈرائیور کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔

"ایک منٹ ذرا یہاں روکنا۔"

اور ڈرائیور نے بریک لگا دیے لیکن اس نے گاڑی بند کرنے کا رسک نہیں لیا تھا مبادا گاڑی پھر ضد کر بیٹھے۔

اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور پھر گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ تھوڑی دیر تک اس کی نظریں اسی مخصوص جگہ پر جمی رہیں۔ ڈرائیور نے حیرت سے اس کی نظروں کا تعاقب کیا اور پھر اس کے چہرے کی جانب دیکھا کیونکہ ڈرائیور کو وہاں کوئی بھی قابل ذکر چیز نظر نہیں آئی تھی جس کی وجہ سے اس نے گاڑی رکوائی تھی۔

فرزان چند لمحے کھڑا آنکھوں ہی آنکھوں میں جیسے کچھ ناپا، تولتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ چند ہی لمحوں میں اس کا یہ سفر اختتام پذیر ہوگیا اور اب اس کے سامنے لکڑی کا وہ تخت پوش نمایاں تھا جس کے ساتھ اس کی بہت سی یادیں جڑی ہوئی تھیں۔ یہ وہی چائے کا تخت پوش تھا جس کے قریب بینچ پر بیٹھ کر وہ اکثر چائے پیا کرتا تھا لیکن اس وقت اس تخت پوش پر چائے کے برتن نظر نہیں آرہے تھے اور نہ ہی چائے والا اردگرد کہیں دکھائی دے رہا تھا۔ اجڑا ہوا خالی تخت اور اس کے اردگرد کوئی بھی بینچ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے اس تخت کے اردگرد چکر لگا کر جیسے طواف کیا۔ چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔ اب اس کی آنکھوں کے سامنے ایک منظر نمایاں تھا۔

ایک طرف سے بڑی بڑی داڑھیوں والے تین چار اشخاص نمودار ہوئے جن کے کاندھوں پر بستر نما کوئی چیز لدی ہوئی تھی۔ انہوں نے رک کر چند لمحے رانا صاحب سے کچھ گفتگو کی، پھر ان میں سے ایک شخص بینچوں کی طرف متوجہ ہوا اور وہاں بیٹھے تین چار افراد سے مخاطب ہوا۔

"جناب! دو منٹ کے لیے آپ بھی ادھر تشریف لے آئیں اور دین کی بات سن لیجیے۔" وہ تینوں لوگ اٹھ کر ان کے قریب پہنچ گئے لیکن فرزان بدستور کسی گہری سوچ میں مستغرق رہا، اس شخص نے ایک مرتبہ پھر آواز لگائی۔

"جناب! دو منٹ کے لیے آپ بھی ادھر تشریف لے آئیں۔ علامہ صاحب دین کے بارے میں کچھ بیان فرمائیں گے۔ آپ بھی سن لیجیے اللہ جزائے خیر دے گا۔"

لیکن فرزان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ شاید اس نے سنا ہی نہیں تھا تب دعوت دینے والے نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا، فرزان نے ہڑبڑا کر ادھر دیکھا۔

اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا صرف وہ تھا اور خالی تخت پوش۔

اس نے ایک طویل سانس بھری اور واپس پلٹ کر ٹیکسی میں جا بیٹھا ٹیکسی ڈرائیور جیسے منتظر تھا اس نے فوراً ہی گیئر بدلا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ گاڑی چلتی گئی، چلتی گئی اور پھر ایک چھوٹا سا نہر کا پل کراس کرنے کے بعد ایک مخصوص علاقے میں جا پہنچی۔ یہ علاقہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

فرزان کے سینے میں دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔

گاڑی ایک گلی میں داخل ہو کر کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد جیسے ہی رکی۔ فرزان کو حیرت کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس نے اپنی حیرت کا اظہار ڈرائیور پر کرنے کے بجائے دروازہ کھولا اور پھر نیچے اتر کر اسے کرایہ ادا کرنے کے بعد اس بڑے آہنی گیٹ کی جانب روانہ ہوا جس کے اردگرد لٹکتی ہوئی رنگ برنگی لائٹوں کی لڑیاں صاف نظر آرہی تھیں۔ پورے گھر کو روشنیوں سے سجایا گیا تھا اور اندر بلند آہنگ میوزک بجتا ہوا سنائی دے رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا تھا کہ اس مکان کے مکین آج کسی مخصوص خوشی کو سیلیبریٹ کر رہے ہیں۔

وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ خوشی کون سی ہوسکتی ہے۔ اس کے دماغ میں کئی قسم کے خیالات چکرا رہے تھے لیکن وہ مختلف اندازے قائم کرنے کے بجائے بہتر یہ تھا کہ آگے بڑھ کر اس راز سے پردہ اٹھا دے۔

سو اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اس نے چند قدم چل کر دروازے تک کا فاصلہ طے کیا اور پھر اس کا ہاتھ دروازے پر دستک دینے لگا۔ دروازہ کھلتے ہی جو پہلا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آیا اس نے فرزان کو چند لمحوں کے لیے چکرا کر رکھ دیا۔

اس کے سامنے کوئی اجنبی چہرہ نہیں تھا لیکن متوقع چہرہ بھی نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دروازہ امی جان کھولیں گی، زارا کھولے گی یا پھر اذان لیکن دروازے پر نظر آنے والی شخصیت ان تینوں میں سے کوئی نہ تھی۔

فرزان حیرت سے گنگ کھڑا تھا تو دروازہ کھولنے والی ہستی بھی اپنی جگہ مبہوت کھڑی تھی۔ اس پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری تھی اور وہ نیلم کے علاوہ اور کوئی نہ تھی۔

فرزان کو شدید حیرت کا سامنا تھا کہ نیلم کا اس کے گھر میں کیا کام؟؟ حیرت کا جھٹکا شدید تھا لیکن اس کا تاثر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا کیونکہ فرزان نے اپنے آپ کو سنبھالنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

وہ آگے بڑھا اور بولا۔

"اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو شاید یہ میرا ہی گھر ہے۔"

اس کی آواز سن کر نیلم نے ایک جھرجھری سی لی اور پھر مسرت بھری آواز میں بولی۔

"جی۔۔۔ یقیناً یہ آپ ہی کا گھر ہے۔۔۔ آیئے اندر آیئے۔۔۔" اور پھر بھاگتی ہوئی اندرونی حصے کی جانب لپکی۔

"آنٹی۔۔۔ آنٹی! دیکھیں تو کون آیا ہے۔"

اس کی بے ساختگی اور بدحواسی کو دیکھنے کے بعد اور اس کی چلاتی ہوئی آوازوں کو سننے کے بعد اندر سے جو پہلی شخصیت نمودار ہوئی وہ ذکیہ بیگم کی تھی۔

ذکیہ بیگم کے ہاتھ میں موجود کانچ کی پلیٹ میں مٹھائی رکھی ہوئی تھی جو ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گری۔ ان کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت نمودار ہوئی پھر ان کی جذبات سے تھرتھراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"میرا بچہ۔۔۔ میرا فرزان۔۔۔!" پھر وہ لپکتی ہوئی آگے بڑھیں اور فرزان کو ممتا کی آغوش میں لے لیا۔

"کہاں چلے گئے تھے بیٹا! تمہیں بوڑھی ماں کا ذرا بھی خیال نہیں آیا؟ ذرا بھی یاد نہیں آئی میری؟ کیسے بیٹے ہو تم؟ کیا تمہیں اس دن کے لیے پالا تھا کہ تم مجھے چھوڑ کر اس طرح چلے جاؤ۔۔۔ اتنے دن تک کہاں وقت گزارا؟"

ذکیہ بیگم نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے اور یہ ان کی ممتا کی تڑپ اور ان کی بے تابی کی ایک ہلکی سی جھلک تھی۔ ان کے اندر تو زلزلہ برپا تھا، لیکن وہ بھی اپنے آپ کو سنبھالنے میں یکتا تھیں، جذبات کا یہ طوفان جلد ہی ختم ہو گیا۔ وہ فرزان سے الگ ہوتے ہوئے بولیں۔

"آؤ۔۔۔ اندر آؤ۔۔۔ خاموش کیوں ہو؟ یہیں کھڑے رہو گے کیا؟"

انہوں نے جذباتی انداز میں فرزان کا ہاتھ پکڑا اور اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے گھر کے اندرونی حصے کی جانب لے چلیں جہاں بہت سی لڑکیاں بالیاں بیٹھی ڈھولک بجانے میں مصروف تھیں۔

فرزان حیرت سے انہیں دیکھتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا اور پھر اس کی نظر ایک اور شناسا چہرے پر پڑی، یہ مختاراں خالہ تھیں۔ اس نے آگے بڑھتے ہوئے انہیں سلام کیا تو مختاراں خالہ بھی حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئیں پھر وہ دونوں ہاتھوں سے اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے اس کی بلائیں لینے لگیں۔

"میرا بیٹا! میرا بچہ۔۔۔! تم نے تو ہمیں ادھ مرا ہی کر دیا تھا۔ کہاں چلے گئے تھے، چلو جہاں بھی گئے تھے خیر سے اپنے گھر کو آئے اور دیکھو کتنے ہی اچھے موقع پر آئے۔۔۔ اذان کی شادی تمہارے بنا ادھوری رہتی۔"

"کیا۔۔۔ اذان کی شادی۔۔۔؟" فرزان نے حیرت اور قدرے مسرت سے دوہرایا۔

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے، بہت اچھا ہوا میں اس موقع پر آ گیا، کہاں تھا، کہاں رہا، کیا کیا؟ یہ ساری باتیں تو بعد میں، اذان کہاں ہے؟" اس نے ادھر اُدھر دیکھا لیکن اذان نظر نہیں آیا۔

اس کی بات کا جواب ذکیہ بیگم کے بجائے مختاراں بیگم نے ہی دیا۔

"بھئی وہ تو تمہیں پتا ہے کہ کماؤ پوت ہے۔ آج بھی دکان پر ہے حالانکہ آج اس کی مہندی کی رسم ہے لیکن اس نے دکان بند کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ جب میں نے اس سے کہا تو کہنے لگا کہ مہندی کی رسم تو رات ہی ہو گی نا اور میں تو رات سے بہت پہلے شام ہی کو واپس آ جاؤں گا۔ پھر نقصان کیوں کیا جائے۔ یہ حالت ہے۔ ان کی شادی ہو رہی ہے اور انہیں دکان داری کی پڑی ہے۔"

مختاراں بیگم اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھیں لیکن فرزان کی نظریں بے چینی سے ادھر اُدھر کچھ اور تلاش کر رہی تھیں لیکن اس کی یہ تلاش کامیاب نہ ہو سکی تو اس کی متلاشی نظریں بے نیل و مرام واپس لوٹ آئیں اور پھر مختاراں کے چہرے پر جم گئیں۔

اس نے امی جان کے چہرے کی جانب دیکھا لیکن ذکیہ بیگم جو اس دوران اس کی متلاشی نظروں کو بھی دیکھ چکی تھیں اور شاید ان نظروں میں چھپے ہوئے سوال کو بھی پڑھ چکی تھیں، وہ جلدی سے ایک جانب بڑھتے ہوئے بولیں۔

"تم بیٹھو میں ذرا اذان کی دلہن کے کپڑے دیکھ لوں، درزی دے کر گیا ہے میں نے ابھی تک کھول کر نہیں دیکھے، چیک کر لوں کہ صحیح سلے بھی ہیں یا نہیں۔" اور تیزی سے لپکتے ہوئے ایک جانب بڑھ گئیں۔ فرزان نے ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں اور پھر خاموشی سے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ پھر ایک کے بعد ایک وہ کمروں میں گھستا چلا گیا اور واپس نکل آیا۔ ایک منٹ، دو منٹ سے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اس نے پورا گھر چھان مارا لیکن جو کچھ وہ دیکھنا چاہ رہا تھا وہ نظر آنا شاید قدرت کو ہی منظور نہیں تھا۔

وہ لپکتا ہوا ایک جانب بڑھا تو اسے دو چار خواتین کے ساتھ بیٹھی امی جان نظر آئیں جو ایک پلاسٹک کے شاپر سے کپڑے نکالے اپنے سامنے پھیلائے بیٹھی تھیں۔ وہ سیدھا ذکیہ بیگم کے پاس پہنچا اور بولا۔

"امی جان! اذان کی شادی ہے اور زارا نظر نہیں آ رہی۔۔۔ وہ کہاں ہے؟"

سوال کیا تھا ایٹمی دھماکا تھا، ہنستی بولتی باتیں کرتی تمام کی تمام خواتین کو جیسے سانپ سونگھ گیا اور صرف خواتین ہی کو نہیں ذکیہ بیگم کے چہرے پر بھی ایک سایہ سا لہرا گیا۔

انہوں نے بے بسی سے فرزان کے چہرے کی جانب دیکھا اور باوجود ضبط کے ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔

فرزان نے سوال کر دیا تھا لیکن اس وقت ذکیہ بیگم کے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کیونکہ یہ سوال ایسا سوال تھا کہ جس کا جواب شاید گھر میں موجود کسی فرد کے پاس نہیں تھا۔

انہوں نے بے چارگی سے اپنے ساتھ بیٹھی خواتین کے چہروں پر نظریں دوڑائیں اور پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

"تم چلو اندر چلو۔۔۔ کمرے میں، میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لے کر آتی ہوں۔"

وہ پہلو بچاتی ہوئی جلدی سے اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

لیکن فرزان وہاں رکنے یا کمرے کی جانب بڑھنے کے بجائے ان کے پیچھے پیچھے کچن میں آ پہنچا۔

ذکیہ بیگم نے سٹپٹا کر فرزان کے چہرے کی جانب دیکھا۔ ان کی پہلو تہی کے باوجود فرزان ان کے تعاقب میں وہاں تک آ پہنچا تھا۔

فرزان کا چہرہ اس وقت متضاد کیفیات کا آئینہ دار تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی تھی ایک بے نام سی خلش تھی جس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کون سا احساس ہے؟ ایسی کون سی بات ہے؟ وہ کون سا سوال ہے جو اس کی روح کی گہرائیوں سے اٹھتا اور پھر اس کے لبوں پر آنے سے پہلے دم توڑ دیتا۔

وہ اپنے اس احساس کو کوئی نام دینے سے قاصر تھا لیکن کچھ نہ کچھ ایسا تھا ضرور جو اس کو ہولائے دے رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ ماں کی یہ پہلو تہی، نظریں چرانے کا یہ انداز اور بات کو ادھر اُدھر گھمانا ضرور اس کے پیچھے کوئی راز پوشیدہ ہے۔ وہ کون سا راز تھا۔ یہی سوچ فرزان کی پریشانی کا باعث تھی اور وہ جلد سے جلد اس راز پر سے پردہ اٹھا دینا چاہتا تھا۔ وہ بے چین تھا یہ جاننے کے لیے کہ آخر خوشی کے اس موقع پر زارا ان سب لوگوں میں شامل کیوں نہیں ہے۔

اور پھر وہ بے اختیار ہو گیا۔ اسے اپنے وجود پر، اپنی زبان پر قابو نہ رہا۔ وہ آگے بڑھا اور ذکیہ بیگم کو کندھے سے پکڑ کر گھما کر ان کا چہرہ اپنی جانب کیا لیکن انداز نرمی ہی لیے ہوئے تھا۔

اس کا چہرہ ایک سوال بن کر رہ گیا لیکن ذکیہ بیگم کی آنکھیں فرزان کی سوالیہ نظروں کا سامنا کرنے سے قاصر تھیں۔ وہ سمجھ سکتی تھیں کہ بیٹا ان سے کیا جاننا چاہ رہا ہے، کیا پوچھنا چاہ رہا ہے، کون سا سوال ہے جو اس کی زبان سے ادا نہیں ہو پا رہا لیکن وہ بے بس تھیں کرتی بھی تو کیا؟ آخر کیا جواب دیتیں اسے اور یوں وہ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئیں اور پھر آخر کار جو سوال بار بار فرزان کے ہونٹوں پر آنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتا تھا اس کے اس خیال کو اس سوچ کو اس سوال کو الفاظ کا سہارا مل گیا اور پھر فرزان کے ہونٹوں سے وہ خوف ناک سوال سرسراتا ہوا برآمد ہوا اور ایک پہاڑ بن کر ذکیہ بیگم کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

اور یہ ایسا پہاڑ تھا جس کی چوٹیوں کو سر کرنا ذکیہ بیگم کے بس کی بات نہیں تھا۔ بیٹے کی تسلی اور تشفی کے لیے انہیں کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ فرزان کے لیے ان کے پاس کوئی اچھی خبر نہیں تھی لیکن خبر اچھی ہو یا بری خبر بہر حال امانت ہوتی ہے جسے حق دار تک پہنچانا ہی پڑتا ہے۔

"امی جان! زارا کہاں ہے؟"

اور ذکیہ بیگم کی آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں۔ دریا کا سوتا ٹوٹ چکا تھا اور پھر اندر چھپے ہوئے رکے ہوئے آنسو کسی طوفانی دھارے کی طرح بہہ نکلے۔ ان کے یہ آنسو بذات خود اپنے اندر بہت سے معنی لیے ہوئے تھے جو فرزان کو یہ سمجھانے کے لیے کافی تھے کہ اس کے سوال کا جواب کیا ہے لیکن شاید اس کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

وہ بے چین تھا اس نے بہت کچھ سوچا تھا۔ بہت کچھ کھو چکا تھا۔ حالات و واقعات نے اس کی ہمت توڑ دی تھی۔ وہ تو اپنا سب کچھ لٹا کر واپس ان اپنوں کے پاس آیا تھا جو حقیقت میں اس کے اپنے تھے، جو اس سے سچی محبت کرتے تھے اور جس محبت کو چھوڑ کر وہ مصنوعی دنیا میں جا بسا تھا۔ آج وہ اپنے ان سچے رشتوں کے پاس دامن پھیلا کر کھڑا تھا لیکن ذکیہ بیگم کے پاس اس کی جھولی میں ڈالنے کے لیے کچھ باقی نہیں بچا تھا۔

فرزان اپنے خاندان، اپنی فیملی کے ساتھ ہنسی خوشی، ایک نارمل زندگی گزارنے کی خواہش لے کر لوٹا تھا لیکن یہاں اس کا سواگت، اس کا استقبال ذکیہ بیگم کے آنسوؤں نے کیا تھا اور یہ آنسو جو کہانی اسے سنا رہے تھے وہ جانتے ہوئے بھی اس سے انجان بن رہا تھا۔

یہ آنسو جس راز سے پردہ اٹھا رہے تھے جس حقیقت سے اسے روشناس کرا رہے تھے وہ اس کے لیے سوہان

روح ہونے کے ساتھ ساتھ شاید ناقابل یقین بھی تھا۔

پے درپے کی ناکامیوں نے، صدمات نے اسے اس قدر توڑ پھوڑ دیا تھا کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں اگر یکسر مفقود نہیں ہوگئی تھیں تو کم از کم وہ صلاحیتیں کمزور ضرور ہوچکی تھیں۔

وہ کچھ دیر تک خاموشی سے ذکیہ بیگم کو روتے ہوئے دیکھتا رہا پھر انہیں جھنجوڑتے ہوئے ہذیانی انداز میں بولا۔

"امی جان! زارا کہاں ہے؟ آپ کچھ بولتی کیوں نہیں؟ میں آپ سے سوال کر رہا ہوں۔ زارا آپ کے پاس میری امانت تھی۔ میں اسے آپ کے حوالے کرکے گیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ میری ماں کے آنچل کے سائے تلے کوئی آفت، کوئی مصیبت، کوئی بلا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ پھر ایسا کیا ہوا کہ آپ کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے۔ کیا یہ آنسو میرے سوال کا جواب ہیں؟ آپ کچھ بتاتی کیوں نہیں؟ آخر زارا ہے کہاں؟ کچھ تو بولیں، خدا کے لیے امی کچھ تو بتائیں۔"

اور ذکیہ بیگم کی ہچکی بندھ گئی۔ ان کی آواز تیز ہوگئی اور ان کے رونے کی آواز باہر موجود لوگوں تک بھی پہنچ گئی۔

ایک کے بعد ایک کچن کے دروازے پر ہجوم جمع ہوتا چلا گیا لیکن اندر آنے کی جرأت کسی نے نہ کی۔ وہ سب جانتے تھے کہ فرزان کا سوال کیا ہے اور ذکیہ بیگم کا جواب کیا ہے اور کسی کے اندر اتنی طاقت نہیں تھی کوئی اپنے اندر اتنی ہمت نہیں محسوس کر رہا تھا کہ وہ فرزان کا سامنا کرتا یا اس کے سوال کا جواب دے پاتا۔ یہ ماں بیٹے کا معاملہ تھا۔ سوال جواب ماں اور بیٹے کے درمیاں تھے تو بہتر یہی تھا کہ وہ سوال جواب ان دونوں کے درمیان ہی ہوں۔

ماحول پر سوگواری چھا گئی کچھ دیر پہلے جس گھر میں خوشیاں رقص کر رہی تھیں، میوزک بج رہا تھا، رنگ برنگی روشنیوں سے پورا گھر جھلملا رہا تھا خوشی کے گیت گائے جا رہے تھے، ڈھولک بج رہی تھی، لڑکیاں ڈانس کر رہی تھیں، شرارتیں ہو رہی تھیں، ہر طرف خوشیوں کا سماں تھا۔ اب وہی ماحول درد و غم میں ڈوب چکا تھا۔ تمام خوشیاں جیسے ڈوب کر کہیں دور بہت دور پاتال کی گہرائیوں میں دفن ہوچکی تھیں اور یوں لگتا تھا کہ جیسے اس گھر میں کوئی زندہ انسان موجود ہی نہیں ہے۔

فرزان کے چیخنے، چلانے اور ذکیہ بیگم کے اونچی آواز میں رونے کا یہ سلسلہ جہاں تمام لوگوں کو اس جانب متوجہ کر گیا تھا وہیں ذکیہ بیگم کی زبان کو لفظوں کی تاثیر سے بھی آشنائی بخش گیا۔ انہوں نے اپنے تمام تر حوصلوں کو مجتمع کرتے ہوئے صرف ایک جملہ کہا۔

"تم نے بہت دیر کر دی فرزان! زارا نے بہت انتظار کیا لیکن شاید جتنا انتظار اس نے کیا اس سے زیادہ کی اس میں سکت بھی نہیں تھی۔۔۔ زارا نہیں رہی فرزان۔۔۔! زارا نہیں رہی۔۔۔"

اس کے ساتھ ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر با آواز بلند رونے لگیں۔

اور یہ رونا صرف ذکیہ بیگم تک محدود نہیں رہا، دبی دبی سسکیوں کی آوازیں کچن کے بیرونی دروازے سے بلند ہوکر فرزان کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

خوشیاں اور مسکراہٹیں، آہوں اور کراہوں میں تبدیل ہوچکی تھیں، سسکاریاں اٹھ رہی تھیں، زخم ہرے ہوگئے تھے اور وہ دکھ جو وقتی طور پر پس پردہ چلا گیا تھا ایک بھیانک حقیقت بن کر ان سب کے سامنے دوبارہ سے آن کھڑا ہوا تھا۔

فرزان کے ذہن میں دھماکے ہونے لگے۔ ایک طوفان تھا جو اسے سر سے پاؤں تک توڑ مروڑ کر رکھے بغیر آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا اس کا پورا وجود ان بگولوں کی زد پر تھا۔

ہوش و حواس مختل ہوگئے اور وہ جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑا تھا لیکن یوں جیسے اس کے وجود میں جان باقی ہی نہ رہی ہو۔

وہ آنکھیں پھاڑے حیرت زدہ انداز میں ذکیہ بیگم کے چہرے کو تکے چلا جا رہا تھا۔ اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔

ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ اس طرح سے اچانک یوں زارا اسے چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہے۔ وہ تو واپس پلٹا تھا اور اس وقت واپس پلٹا تھا جب اسے اس بات کا ادراک ہوگیا تھا کہ زارا سے زیادہ محبت اسے دنیا کی کوئی عورت نہیں

دے سکتی۔ وہ اس سے سچی محبت کرتی تھی۔ اس کی بیوی تھی، اس کی شریک حیات تھی لیکن یہ کیا۔۔۔ وہ اسے دھوکا کیسے دے سکتی ہے؟ وہ اس کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتی ہے؟

اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں اور پھر یہ آندھیاں کھولتے ہوئے لاوے کی شکل اختیار کر گئیں اور اس لاوے نے اسے اندر اور باہر سے جلا کر خاک کر دیا۔

اور وہ خاک جب اڑی تو ہوش و خرد کو اپنے ساتھ اڑا لے گئی۔ وہ دیوانوں کے سے انداز میں دروازہ کھول کر باہر نکلا اور پھر اس نے ڈپٹ کر کہا۔

"کیوں رو رہی ہو تم لوگ؟ کیا ہوگیا ہے؟ کیوں کھڑے ہو یہاں سب لوگ؟"

اور سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ اس رویے کی توقع وہاں موجود کسی شخص کو نہیں تھی۔ سب خاموش ہوگئے اور اپنی آنسو بھری آنکھوں سے فرزان کے وحشت زدہ چہرے کو دیکھنے لگے۔

وہ ایک بار پھر پلٹا، ممتا کی مقدس مورتی اپنی جگہ ایستادہ خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی اور آنسو اس کے رخساروں سے ہوتے ہوئے اس کے نورانی چہرے کو بھگوتے ٹپ ٹپ کرکے زمین پر گر رہے تھے۔ وہ قدم قدم چلتا آگے بڑھا اور پھر عظمت کے اس مینار کے قدموں میں جھکتا چلا گیا۔

ذکیہ بیگم کے وجود میں حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ وہ ساکت کھڑی تھیں اور فرزان ان کے پیروں سے لپٹا ہوا تھا۔

پھر فرزان کی ہچکی بندھ گئی اور وہ زار و قطار رونے لگا اتنا رویا، اتنا رویا کہ جل تھل ہوگیا۔

ماں کے قدم اس کے آنسوؤں سے وضو کرنے لگے اور جنت نکھر کر اس کی آنکھوں کے سامنے نمایاں ہوگئی۔

تمہارے بعد جو گزری ہے مجھ پر
کہانی مختصر ہے اور میں ہوں
ادھر چاہت مری تنہا ہے مضطر
اُدھر سارا شہر ہے اور میں ہوں

ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے ہر عروج کو زوال ہے۔ ہر چڑھتا ہوا سورج غروب ہوتا ہے۔ ہر دن کا اختتام شام اور ہر رات کا آغاز ایک نئی صبح ہوتی ہے۔

سو طوفان آیا اور بظاہر گزر بھی گیا لیکن اپنے ساتھ کیا کچھ جڑ سے اکھاڑ لے گیا، کیا کچھ بہا کر لے گیا، کیا کچھ اڑا کر لے گیا۔ اس کا اندازہ وہاں موجود کسی شخص کو تو کیا ہونا تھا شاید فرزان کو بھی نہیں ہوا۔ جب وہ بولا تو اس کے جملے کچھ یوں تھے۔

"امی جان! میں بہت بدقسمت ہوں۔۔۔ لیکن نہیں میں بدقسمت نہیں شاید میں بہت ظالم ہوں۔۔۔ میں نے اپنے سے جڑے کسی بھی رشتے کے بارے میں کبھی بھی نہیں سوچا۔۔۔ یہ کبھی نہیں سوچا کہ کون مجھ سے کتنا پیار کرتا ہے۔ مجھے کس کے لیے کیا کرنا چاہیے، مجھے کبھی اس کا احساس ہی نہیں ہوا اور جب احساس ہوا تو وقت بہت آگے بڑھ چکا تھا اور میں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

میں یہاں سے بھاگا تھا دامن چھڑا کے بھاگا تھا۔

یہاں سے چلا گیا تھا۔۔۔ دور۔۔۔ بہت دور۔ ایک نئی دنیا کی کھوج میں۔ ایک نئے جہان کی تلاش میں اور میں نے اس جہان کو حاصل کرلیا وہ نئی دنیا میں نے دریافت کرلی تھی امی جان! لیکن جب ہوش آیا تو احساس ہوا یہ دنیا میری دریافت ضرور ہے لیکن یہ دنیا میری دنیا تو نہیں ہے۔ میں اس دنیا کا باسی تو نہیں، میں یہاں کا باشندہ نہیں تھا۔

لیکن جب یہ احساس ہوا تو بڑی دیر ہوچکی تھی لیکن بہر حال ماں یہ بڑی بات ہے مجھے احساس تو ہوا۔

سو میں نے وہ سب کچھ چھوڑ دیا۔ وہ دنیا جن لوگوں کی تھی میں نے ان کے حوالے کر دی اور وہاں سے فرار ہوگیا اور یہ فرار اختیار کرنے کے بعد میں واپس اپنی دنیا میں لوٹ آیا۔ ان سارے رشتوں کی تلاش میں ماں میں واپس آیا تھا۔ جو میرے اپنے تھے لیکن لگتا ہے کہ وہ دنیا میری منزل نہیں تھی تو شاید یہ دنیا بھی میری منزل نہیں ہے۔

میں اس قابل ہی نہیں تھا کہ میں ان لوگوں کے درمیان رہتا جنہوں نے میرے لیے سب کچھ کیا اور میں اس قابل بھی نہیں ہوں کہ ان لوگوں کے درمیان رہوں جنہوں نے مجھے پالا پوسا ہر ضرورت کو پورا کیا، مجھے

پڑھایا، لکھایا لیکن بدلے میں میں نے انہیں کیا دیا۔۔۔؟ کچھ بھی تو نہیں۔۔۔ شاید۔۔۔ شاید میں اس قابل ہی نہیں ہوں کہ میں آپ لوگوں کے درمیان رہ سکوں۔

شاید میں اس قابل ہی نہیں تھا۔۔۔ شاید میں اس قابل ہی نہیں ہوں کہ کہیں بھی رہ سکوں۔۔۔ میں انسانوں کی بستی کا باسی ہی نہیں ہوں۔ میں ایک جنگلی انسان ہوں، جنگلی جانور ہوں، میں کوئی اور ہی مخلوق ہوں۔ میری کوئی اور ہی دنیا ہے۔۔۔ میں یہاں نہیں رہ سکتا امی جان! میں آپ سے دامن پھیلا کر صرف ایک سوال کرتا ہوں۔ صرف ایک چیز مانگتا ہوں امی جان۔۔۔ معافی۔۔۔ آپ کو اپنی اس محبت کا واسطہ، اپنی اس ممتا کا واسطہ جس کے سہارے آپ نے مجھے پال پوس کر جوان کیا۔ مجھے معاف کر دیجیے۔۔۔ میں کل بھی اندھیرے میں تھا میں آج بھی اندھیرے میں ہوں۔

رنگ برنگی روشنیوں سے سجا یہ گھر میری منزل نہیں۔۔۔ ہو بھی نہیں سکتا۔ مجھے تو اندھیرے اچھے لگتے تھے، اندھیرے پسند ہیں اور میں اندھیروں کا حصہ ہی بن جانا چاہتا ہوں۔۔۔

میں آپ کے حقوق پورے نہیں کر سکتا۔ میں کسی کا بھی حق ادا نہیں کر سکا۔ امی۔۔۔! مجھے معاف کر دیں اور مجھے اجازت دیں اور دعا کریں۔ کہتے ہیں ماں کی دعا میں بہت اثر ہوتا ہے۔ میں آپ کی اولاد ہوں جہاں کہیں بھی رہوں گا آپ کو یہ احساس ضرور ہوگا کہ میرا بیٹا زندہ ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں اس دنیا میں موجود ہے لیکن میں آپ کے ساتھ نہیں رہوں گا بس یہ دعا کریں کہ مجھے میری منزل مل جائے۔

اچھا امی جان! میں چلتا ہوں۔۔۔ میری گزارش ہے کہ مجھے معاف ضرور کر دیجیے گا۔"

پھر وہ کچن کے دروازے سے باہر نکلا اور دیوانوں کی طرح آگے بڑھتا چلا گیا۔ کچن کے ارد گرد کھڑا ہوا مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا اور وہ ان کے درمیان سے نکلتا ہوا سیدھا بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ ٹھیک اسی وقت ایک آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"فرزان۔۔۔! زارا نہیں رہی لیکن اور بہت سے لوگ ہیں جو تمہارے منتظر تھے کہ تم واپس آؤ گے، ان میں میں بھی تھی۔ کیا باقی سب کی محبتیں تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتیں؟ مت جاؤ فرزان۔۔۔!"

اور یہ سسکتی ہوئی آواز نیلم کے علاوہ اور کسی کی نہ تھی لیکن فرزان تو شاید بہرا ہو چکا تھا۔ اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ تو ہوش و خرد سے بےگانہ ہو گیا تھا۔

وہ بیرونی دروازے تک پہنچا تو اسے یہ احساس تک نہیں ہوا کہ دروازہ بند ہے۔ وہ دھاڑ سے دروازے سے ٹکرایا تو اسے اندازہ ہوا کہ دروازہ بند ہے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کی چٹخنی کھولی، دروازہ کھلا اور وہ بھاگتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ نیلم لپکتی ہوئی دروازے تک پہنچی لیکن اتنی دیر میں فرزان گلی کا موڑ مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

اب یہ سوچوں تو بھنور ذہن میں پڑ جاتے ہیں
کیسے چہرے ہیں جو ملتے ہی بچھڑ جاتے ہیں
کیوں ترے درد کو دیں تہمت ویرانی دل؟
زلزلوں میں تو بھرے شہر اجڑ جاتے ہیں
موسم زرد میں اک دل کو بچاؤں کیسے؟
ایسی رت میں تو گھنے پیڑ بھی جھڑ جاتے ہیں
اب کوئی کیا مرے قدموں کے نشاں ڈھونڈے گا
تیز آندھی میں تو خیمے بھی اجڑ جاتے ہیں

☆☆☆

کس کے بس میں تھا ہوا کی وحشتوں کو روکنا
برگ گل کو خاک، شعلے کو دھواں ہونا ہی تھا
جب کوئی سمت سفر طے تھی نہ حد راہ گزر
اے میرے راہ رو سفر تو رائیگاں ہونا ہی تھا
مجھ کو رکنا تھا، اسے جانا تھا اگلے موڑ تک
فیصلہ یہ اس کے میرے درمیاں ہونا ہی تھا
اپنی آنکھیں دفن کرنا تھیں غبار خاک میں
یہ ستم بھی ہم پہ زیر آسماں ہونا ہی تھا

جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کے رہتا ہے، جو لکھا گیا ہوتا ہے، جو لوح تقدیر میں محفوظ ہوتا ہے، آخرش وہی ہوتا ہے۔

فرزان کو واپس آنا تھا لیکن واپس آ کر پھر چلے جانا تھا سو وہ چلا گیا تھا کہ شاید لکھنے والے نے ایسا ہی لکھا تھا لیکن نیلم۔۔۔ نیلم کو اپنے دل پر اختیار ہی کب تھا۔ وہ بیچاری تو سدا کی تہی دست تھی۔ سرابوں کا تعاقب کبھی کچھ نہیں دیتا اور نیلم شاید سراب کا تعاقب کر رہی تھی اور سرابوں کا تعاقب ایسا اندھا سفر ہوتا ہے کہ انسان ہمیشہ بھٹکتا ہی رہتا ہے۔

اس کی موٹی موٹی خوب صورت آنکھوں سے اشکوں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں اور نیلم ہی کیا گھر میں موجود ہر شخص آبدیدہ تھا ادھر ذکیہ بیگم جو ساکت و جامد اپنی جگہ کھڑی تھیں، فرزان کے جانے کے بعد ان کو بھی جیسے الیکٹرک شاک لگا ہو وہ بجلی کی سی تیزی سے اس کے پیچھے لپکیں لیکن فرزان کا باہر نکلنا، نیلم کا تڑپ کر اس کے پیچھے جانا، نیلم کے جملے یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد ان کے قدم جیسے سکت کھو بیٹھے اور صحن کے وسط میں خاموش کھڑی ہو گئیں۔

ٹھیک اسی وقت بیرونی دروازے سے اذان گھر میں داخل ہوا اور حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگا نیلم کا اشک بار چہرہ، ذکیہ بیگم کی بھیگی ہوئی آنکھیں اور سبھی اپنی جگہ خاموش، ساکت، گھر کی یہ ماتمی فضا اذان کی سمجھ میں نہ آئی تو وہ سیدھا ذکیہ بیگم کے قریب پہنچا اور پھر اس کی آنکھوں میں مچلتا ہوا سوال اس کے ہونٹوں پر آ گیا۔

"امی جان! خیریت تو ہے؟ یہ سب لوگ روتے ہوئے کیوں دکھائی دے رہے ہیں؟ خدانخواستہ کچھ غلط ہو گیا کیا؟ کوئی پریشانی کی بات ہے؟ کچھ مجھے بھی تو بتائیں۔"

ذکیہ بیگم نے بیٹے کے سوال کو سنا لیکن فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکیں، چند لمحوں تک یہ خاموشی پورے گھر پر طاری رہی اور اذان خاموشی کی اس زبان کو سمجھ نہ پایا۔ بیٹے کی بےچینی اور بےبسی کو دیکھتے ہوئے ذکیہ بیگم نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر گویا ہوئیں۔

"فرزان آیا تھا۔۔۔"

"اچھا۔۔۔ کب۔۔۔ کہاں ہے؟ اگر آیا تھا تو پھر کہاں گیا؟" اذان نے بےچینی سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"بیٹا! خالی ہاتھ گیا تھا۔۔۔ خالی ہاتھ لوٹ گیا۔ یہاں آنے کے بعد بھی میرے پاس اسے دینے کے لیے کچھ تھا نہیں۔۔۔ اور شاید ہمیشہ کے لیے تہی دست ہونا اس کو پسند نہیں آیا۔۔۔ وہ واپس چلا گیا۔"

"واپس چلا گیا؟ کہاں واپس چلا گیا۔۔۔ اتنے عرصے کے بعد واپس لوٹا تھا اور پھر اب میری شادی کا موقع تھا وہ کیوں چلا گیا؟"

اذان نے حیرت سے دریافت کیا۔

"بیٹا! سب کچھ ٹھیک تھا تمہاری شادی کے بارے میں جان کر وہ خوش بھی ہوا لیکن سب سے خطرناک سوال جو اس کے ہونٹوں پر آیا وہ تم بھی جانتے ہو۔۔۔ میں بھی جانتی ہوں۔۔۔ اور اس گھر میں موجود۔۔۔ بلکہ میں یہ کہوں گی کہ اس وقت اس گھر میں موجود تمام لوگوں کو معلوم تھا، معلوم ہے کہ وہ سوال کیا ہو سکتا تھا۔

وہی ایک سوال کا کہ جس کا جواب یہاں پر کسی کے پاس نہیں تھا کہ زارا کہاں ہے۔

حقیقتیں بڑی زہریلی ہوا کرتی ہیں اور یہ زہر پی جانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ہر کوئی سقراط نہیں ہوتا بیٹا۔۔۔ یہ سچائی اس سے برداشت نہیں ہوئی اور یہ تو وہ دکھ ہے جو ہم برداشت نہیں کر سکے۔ صبر کا مرہم تو رکھ دیا لیکن زخم بھرا تو نہیں۔ ابھی بھی کسک اٹھتی ہے۔ ابھی بھی ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ اس کے لیے تو یہ نئی بات تھی اور تازہ سانحہ، تازہ درد برداشت نہیں ہوا کرتا۔

وہ رویا، چلایا اپنی بےبسی پر، اپنی تہی دامنی پر اور پھر چلا گیا۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے امی جان؟" اذان نے بےچینی سے کہا۔

"میں دیکھتا ہوں اسے، میں ڈھونڈ کے لاتا ہوں، ایسے کیسے جا سکتا ہے وہ۔"

اذان تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف لپکا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ تیز قدموں سے چلتا ہوا سڑک پر پہنچا اور پھر سوچنے لگا کہ دائیں طرف جاؤں یا بائیں طرف لیکن صرف ایک لمحے کے لیے۔۔۔ پھر ایک فیصلہ کر کے وہ سیدھا بس اسٹینڈ کی جانب دوڑا۔ دوڑتے

دوڑتے وہ سیدھا بس اسٹینڈ پر پہنچا تو بے چینی سے اردگرد دیکھنے لگا۔ اسٹینڈ پر لگی ہوئی بس میں جھانکا۔۔۔ لیکن بے سود۔ فرزان کہیں دکھائی نہیں دیا۔۔۔ پھر وہ وہاں سے واپس پلٹا۔

باہر نکلتے ہوئے ایک رکشا پر نظر پڑی تو اس نے آواز دے۔

"رکشا۔۔۔ ادھر آؤ۔"

رکشا والے نے اس کے قریب پہنچ کر بریک پیڈل دبایا تو وہ جلدی سے سے عقبی نشست پر براجمان ہو گیا اور اسے بولا۔

"تیزی سے ریلوے اسٹیشن کی جانب چلو۔"

اور پھر پانچ سے سات منٹ کے بعد وہ ریلوے اسٹیشن پر موجود تھا لیکن کوئی ٹرین موجود نہیں تھی۔ خالی پلیٹ فارم سائیں سائیں کرتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ معلومات کی کھڑکی کی جانب لپکا اور دریافت کیا۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آخری ٹرین کو گئے ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے۔"

"آخری ٹرین صبح نو بجے گئی ہے اور اب بارہ بج رہے ہیں۔ ابھی تک کوئی ٹرین نہیں گئی۔"

"اچھا اور کوئی آئندہ جانے والی ٹرین کتنے بجے ہے؟"

"جی کراچی جانے کے لیے ٹرین ملے گی تین بجے۔"

اذان سمجھ گیا کہ فرزان نے ریلوے اسٹیشن کا رخ بھی نہیں کیا وہ تیزی سے باہر نکلا تو رکشا ابھی موجود تھا۔ وہ اسی رکشا میں بیٹھ کر ایئرپورٹ کی جانب روانہ ہوا اور پھر پندرہ سے بیس منٹ کے بعد وہ مایوس و نامراد ایئرپورٹ سے بھی واپس آ رہا تھا۔

اس نے ہر ممکن کوشش کر لی تھی شہر سے باہر جانے والے تمام ذریعے تمام راستے اس نے چیک کر لیے لیکن فرزان کا نام و نشان تک نہیں ملا تھا۔ چاروناچار وہ گھر کی جانب واپس پلٹا تو گھر کی فضا قدرے بہتر ہو گئی تھی۔

لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ چند ہی لمحوں میں جو کچھ بھی ہوا تھا اس سب کو بھول بھال کر لڑکیاں دوبارہ سے اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی تھیں۔ گھر میں دوبارہ رونق کے رنگ بکھر گئے تھے۔ ایک جانب ذکیہ بیگم بہت سے کپڑے پھیلائے ان کو تہ کر رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر افسردگی اذان نے دور سے دیکھ لی تھی۔ اذان ان کی جانب لپکا اور بولا۔

"امی جان! میں نے ہر جگہ چیک کیا، ہر جگہ جا کے دیکھ لیا لیکن فرزان کا کہیں کچھ پتا نہیں چلا۔"

ذکیہ بیگم کے ہونٹوں سے ایک سرد آہ برآمد ہوئی اور پھر وہ اذان کے چہرے کی جانب دیکھ کر ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولیں۔

"اذان بیٹا! وہ پہلے بھی بہت دنوں سے یہاں نہیں تھا سمجھو کہ وہ آیا نہیں۔۔۔ ہوتا وہی ہے جو خالق کائنات کو منظور ہوتا ہے۔ شکر ادا کرو کہ وہ زندہ و سلامت ہے۔۔۔ اگر وہ ہمارے ساتھ رہنا پسند کرے گا یا میرے اللہ کو منظور ہو گا تو وہ پھر واپس آئے گا وہ لوٹ آئے گا شاید ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔

تم جاؤ نہا کر کپڑے تبدیل کرو۔۔۔ وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔ مہندی کی رسم ادا کرنی ہے۔ معاملات زندگی تو چلتے ہی رہتے ہیں اور چلنے ہیں۔۔۔ جاؤ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

اذان نے حیرت سے ذکیہ بیگم کی جانب دیکھا لیکن وہ نظریں جھکا کر دوبارہ کپڑوں کو تہ کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ اذان چند لمحے خاموشی سے کھڑا ان کی جانب دیکھتا رہا پھر سر جھٹکتے ہوئے اندرونی کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

دیکھتے دیکھتے بن جاتے ہیں چہرے کتنے
ایک چہرے میں نظر آتے ہیں چہرے کتنے
رت بدلتی ہے تو ہوتی نہیں رونق رخ پر
موسم گل کو تو تڑپاتے ہیں چہرے کتنے
درد چہرے پہ سمٹ آیا ہے دیکھیں اب کے
غمزدہ چہرے کو اپناتے ہیں چہرے کتنے
کچھ پتا چلتا نہیں دن کے گزر جانے تک
اتنے آتے ہیں گزر جاتے ہیں چہرے کتنے

(باقی آئندہ)

بقیہ سروے

میں نہلا دیا۔ جب ان پر کیمیکل ہتھیاروں سے شب خون مارا گیا۔ سیکڑوں معصوم بچوں کے لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ چند روز قبل بنگلہ دیش میں جماعت اسلامی کے رہنما ملا عبدالقادر کو صرف پاکستان سے وابستگی کے اظہار کے جرم میں ضعیف العمری میں سزائے موت دی گئی۔ جس کو بنگلہ دیش کا اندرونی معاملہ گردانتے ہوئے پاکستان کی حکومت نے اپنی جان چھڑائی۔ اس طرح ہزاروں جمہوریت پسندوں کے قتل عام پر پاکستانی میڈیا کی مجرمانہ خاموشی ایک اور سانحہ ہے۔

4 ۔ زندگی کا اصول ہے کہ لوگ ملتے ہیں، بچھڑ جاتے ہیں۔ دنیا کی ہر شے فانی ہے۔ موت کو دوام ہے۔ وہ جو ایک بہت اپنا، جان سے پیارا میرا شہزادہ بیٹا غم جدائی دے کر گیا تو اس کے زیر اثر میرا پورا سال اداسی میں گزرا۔۔۔ جبکہ اللہ اپنے بندوں کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑتا۔ معیز اکرم کے بچھڑنے کے بعد بہت سارے محبت کرنے والے، خیال رکھنے والے، فکر اور دعا کرنے والے لوگوں کی محبت مجھے ملی۔ بہت سے لوگ میرے بہت قریب آ گئے۔ جنہوں نے مجھے جینے کا حوصلہ دیا اور جن کے وجود سے مجھے ڈھارس ملی اور زندگی، زندگی بن کر مجھ پر منکشف ہوئی۔

5 ۔ جنوری کے امیدوں بھرے موسم میں زندگی سے بھرپور پیغام۔ وہ لوگ جو مجھے اپنا مانتے اور مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ وہ اس سال اپنی نعمت بھری زندگی اور صحت کو غنیمت جانتے ہوئے اپنے آپ کو دین سے جوڑ دیں۔ اپنی زندگی کا زیادہ وقت اللہ کے بتائے ہوئے احکامات کے لیے وقف کریں۔ ان لوگوں کے کام آئیں جو ہماری زیر نگرانی ہیں۔ اپنے مال میں سے راہ خدا میں بھی کچھ حصہ نکالیں۔ اپنے مقصد حیات کو سمجھیں اور اللہ اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کو مقصد حیات بنالیں۔ زندگی کے ہر معاملے میں اللہ سے ڈریں اور اللہ کے فضل و کرم کی امید رکھیں۔ اللہ ہم سب کو دائمی زندگی میں سکون عطا فرمائے۔ (آمین) اللہ پاک آپ کی عزت و توقیر میں اضافہ فرمائے اور زندگی کی آزمائشوں سے بچائے۔ (آمین)

امبر گل۔۔۔ ٹھنڈو (سندھ)

1 ۔ انسان بے چارے نے کیا پلان بنانے ہیں، پلاننگ تو سب وہ کرتا ہے جو اوپر آسمانوں پر بیٹھا ہے اور ساری دنیا کو چلا رہا ہے۔ تو جب بھی اب کچھ سالوں سے نئے سال کا آغاز ہوتا ہے تو میں کسی بھی قسم کی کوئی پلاننگ نہیں کرتی۔ البتہ امی کے فوت ہونے سے پہلے تو بہت ساری پلاننگز ہوا کرتی تھیں۔ ہاں ایک سوچ جو کہ کچھ عرصے سے دل و دماغ پر حاوی ہوتی جا رہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ بس ایک بار اپنے پیارے نبی ﷺ کے گھر کو دیکھ آؤں۔

2 ۔ کیوں نہیں جی اگر دیکھا جائے تو ہندسے بھی اہم ہوتے ہیں اور انسان بھی جس سال ہمیں اگر خوشیاں ملتی ہیں تو وہ سال اور اس سال کے ہندسے اچھے لگتے ہیں اور جس سال میں اگر کوئی دکھ ملیں تو وہ ہی ہندسے کچھ لوگوں کی نظر میں تو منحوس بھی ہو جاتے ہیں۔ (جو کم عقل ہوتے ہیں) جیسے 2009ء کے دسمبر میں مجھ سے ثوبیہ جہانگیر بچھڑی، فروری 2010ء میں میرے عزیز از جان ماموں مجھے چھوڑ گئے۔ 2011ء میں امی مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئیں تو ہر سال ایک اپنا پیارا دنیا سے جاتا رہا تو اب دل میں اتنے خوف اور اوہام بھر گئے ہیں کہ ہر وقت دل ڈرتا رہتا ہے کہ اس سال میں کوئی اور اپنا پیارا مجھ سے جدا نہ ہو جائے، ہر گھڑی ہر آن دل کو عجیب سے دھڑکے لگے رہتے ہیں، سو زندگی پر طاری یہ جمود ٹوٹتے بھی رہتے ہیں جب کبھی کوئی اچھی یا بری خبریں ملتی ہیں۔

3۔ نیلسن منڈیلا کی موت کا واقعی بہت دکھ ہوا تھا کہ اس نے واقعی انسانیت کے لیے بہت کام کیا تھا اور ایک اور خبر بھی جس کو دیکھ اور سن کر بہت شدید دکھ ہوا تھا کہ ہمارے پیارے قائد کی ریذیڈنسی کے ساتھ

جو سلوک کیا گیا۔۔۔ وہ یادگار جو ہمارے لیے ہمارے قائد کا اک اثاثہ تھی کیا وہ اس سلوک کی مستحق تھی بھلا۔ ہم اگر اور کچھ بنا نہیں سکتے تو کیا جو چیزیں پہلے کی بنی ہوئی ہیں ان کی ہم حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔ ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو جب اتنی سیکورٹی مل سکتی ہے ان کی رہائش گاہوں کی حفاظتیں ہو سکتی ہیں تو کیا ان کی نہیں ہو سکتی تھی۔ آخر کب ہمارے حکمران اپنے ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر ملک و قوم کے لیے کچھ سوچیں گے یا عمل کریں گے' آخر کب؟

4۔ بے شک گزرے سال میں کوئی اپنا دنیا سے نہیں گیا ہے۔ مگر جب سے بہت سے اپنے گئے ہیں تب سے مجھے تو ہر جانے والا شخص اپنا ہی لگتا ہے پھر چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ البتہ میری زندگی میں جب سے محمد ثمامہ آیا ہے تب سے بہت حد تک میری زندگی میں بھی اور میری ذات میں بھی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ بس میرے لیے اس کے دم قدم سے زندگی کی سب رونقیں ہیں' کیونکہ جب وہ خوش ہوتا ہے تو میری ایک اور بہت پیاری اور محترم ہستی یعنی میرے ابو جی خوش ہوتے ہیں اور جب وہ دونوں خوش ہوتے ہیں تو مجھے اپنی زندگی رعنائیوں سے بھرپور لگتی ہے۔ (اللہ ہماری محبت کو نظر بد سے بچائے۔ آمین)

5۔ جنوری کے امیدوں بھرے موسم میں پہلے تو ممتاز بانو کی طرح مجھے بھی اس بات کی سب سے زیادہ خوشی ہے کہ نہ گرمی ہوتی ہے اور نہ ہی لوڈشیڈنگ' واک کرنا بھی بہت اچھا لگتا ہے ان ٹھنڈے مہینوں میں مجھے رات کو اور خاص پیغام پھر اپنے بھتیجے محمد ثمامہ کے نام ہی ہے کہ 29 جنوری کو تمہیں اپنی سالگرہ کی بہت بہت مبارک باد۔ ماشاء اللہ سے تم پورے 6 سال کے ہو جاؤ گے۔ تمہارے لیے میری طرف سے ایک چھوٹی سی دعا۔

بھرا رہے تیری خوشبو سے تیرا صحن چمن
بس اک موسم عنبر فشاں گزرتا رہے
خدا کرے تیری آنکھیں ہمیشہ ہنستی رہیں
دیار وقت سے تو شادماں گزرتا رہے

اور چھوٹا سا ایک اور پیغام اپنی دوست صبا محسن کے نام "ڈیئر صبا آج مجھے تم سے یہ کہنا ہے کہ تم میری بہت اچھی دوست ہو اور مجھے تمہاری دوستی پر بھی بہت مان ہے۔ 3 فروری کو تمہاری بیٹی عروہ محسن کی پہلی سالگرہ ہے سو تمہیں اور محسن بھائی دونوں کو بہت بہت مبارک ہو۔

☼ ☼

مقابل ہے آئینہ

حرا قریشی

ادارہ

س : آپ کا پورا نام' گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں ؟

ج : "شمیم آرا" قلمی نام "حرا قریشی" بہت محبت' بہت پیار سے سب حرا کہہ کر بلاتے ہیں بڑی آپی عزیزم فہمیدہ پیار سے "حرا چھوٹے" کہتی ہیں۔ (کوئی اتنے پیار سے آپ کو پکارے اور کوئی کام کہے تو کہاں انکار کی گنجائش نکلتی ہے ؟) اسی وجہ سے اس اسم خاص سے انسیت بہت ہے۔

س : کبھی آپ نے آئینے یا آئینے نے آپ سے کچھ کہا؟

ج : کیا پوچھ لیا عزیز من ۔۔۔؟ صاحب آئینہ بڑی حیرت سے آنکھیں میچ لیتا ہے' پھر کچھ توقف کے بعد بہت سے کھوتا ہے ۔۔۔ مت پوچھیے ؟ کیا کہتا ہے ؟ (چند اچھے کام کر لیتے ہیں سو عطائے نور خداوند ہے رخ خاص پر) بقول جناب کے۔۔۔

آئینہ کچھ بھیگا' مغموم سا
تھا اک چہرہ' معصوم سا!

بقول پروین شاکر کے۔۔۔

بن عکس یہ کیسی جگمگاہٹ
شیشے سے جھلک رہی ہے اب تک!

س : اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں؟

ج : خود کو ایک چٹیل میدان میں تنہا کھڑے پایا جب والدہ اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ سبک رفتار سسکیوں کا ایک تلاطم برپا تھا۔ ہر بندہ عدو معلوم ہوتا تھا' کیا بتائیں ناقابل بیاں سی حالت زار تھی۔ زار' زار بکھرا تھا جسد خاکی' یوں لگا تھا منجنیق سر پر دھر دی گئی ہو' قوت سامعہ مفلوج ہو گئی ہو' بہت سی باتیں ان کہی رہ گئیں ۔۔۔ بہت سی ساعتیں ویران ہو گئیں ۔۔۔ گویا قیمتی سامان لٹ گیا۔ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح تھے۔ قدم بوسی کی بھی مہلت عطا نہ ہوئی زیادہ عرصے ۔۔۔

کبھی کبھی کچھ ایسے لمحات آتے ہیں کہ راستے سب مسدود دکھائی دیتے ہیں اس وقت بہت بے بسی محسوس ہوتی ہے۔ یہ وقت' یہ لمحے' کسی محتاج کی طرح چشم نم کی پتلیوں میں گھس کر بیٹھ جاتے ہیں اور رخسار کو آنسوؤں کی تہہ میں ملفوف کر دیتے ہیں۔

کچھ لمحے بنجر زمینوں کی طرح لپٹ جاتے ہیں
بانجھ کر دیتے ہیں' سانس بھی لینے نہیں دیتے ۔۔۔!

س : آپ کے لیے محبت کیا ہے؟

ج : "محبت" ایک لفظ میں "قلزم" (نہایت گہرا سمندر) "محبت" ایک جملے میں "وہ تخیلاتی سرزمین جس پر ققنس حیات بعد الموت کا پیغام دیتا ہے۔"

س : مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ' جس پر عمل کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہو؟

ج : یونیک پوئیٹ' فلاسفر اور رائٹر بننا مزید ایک بہترین ٹیوٹر' کمپیوٹر پروگرامر اور' اور' اور ایک بہترین بیوی ۔۔۔ (ہاہاہا) کچھ بن جانے کے بعد یا جب وہ خالق دارین کن فیکون کہہ دے حج کعبہ کی سعادت حاصل کرنا۔

س : پچھلے سال کی بڑی کامیابی' جس نے آپ کو مسرور و مطمئن کیا ہو؟

ج : دی براق اسکول کا بورڈ اور یف کا شاندار رزلٹ (میرے لیے بہترین کامیابی اس لیے کہ امید کے برعکس رزلٹ آیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ ہم بھی اچھا پڑھاتے ہیں۔)

س : آپ اپنے گزرے کل' آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟

ج : "توکل علی اللہ" "ایمان کامل"

س : اپنے آپ کو بیان کریں؟

ج : میں...؟ "کچھ بھی تو نہیں۔"

اندر سے سراپا آگ ہوں میں
باہر سے مگر جمی ہوئی برف....!

س : ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے پنجے آپ میں گاڑے ہوئے ہیں؟

ج : کبھی جب کمسن ہوا کرتے تھے تو کہیں بھی والدہ چلی جائیں ایک ڈر' خوف کا خیمہ قلبی خانوں میں خود بخود تعمیر ہو جاتا تھا۔ سو سب سے چھپ کر روتے روتے دعائیں مانگا کرتے تھے کہ "ماں" جہاں بھی ہو جلدی سے آجائے اور اب وہ خوف کا خیمہ طوفانی بھنور کی زد میں بھی آگیا بس اب بابا کہیں چلے جائیں تو دعا ہوتی ہے جہاں بھی ہوں بخیر و عافیت ہوں اور خیر سے گھر آجائیں۔

س : آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟

ج : "میرے بابا' میری بکس' مری شاعری' ڈائری اور احباب جاں" (ابھی تک تو یہی ہیں آگے دیکھیے ہو گا کیا۔)

س : آپ کی کمزوری اور طاقت کیا ہے؟

ج : "بابا' ذہین لوگ' مسکراتے بچے' ادب (کمزوری) علم' ذہانت' قرب الٰہی (طاقت)

س : آپ خوشگوار لمحات کیسے گزارتی ہیں؟

ج : "اچھی تخلیقات پڑھ کر لکھ کر' خوب صورت یادیں اپنوں سے شیئر کر کے۔"

س : آپ کے نزدیک دولت کی اہمیت؟

ج : یہاں واصف علی واصف کی بات دہراؤں گی استعداد سے زیادہ کی تمنا ہلاکت ہے اور استعداد سے کم خواہش آسودگی ہے۔" اس لیے اتنی دولت ضروری ہے کہ جس سے با آسانی ضروریات زیست پوری ہو سکیں۔

س : گھر آپ کی نظر میں؟

ج : "جنت' حفاظتی حصار' امن کا خیمہ۔"

س : کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کر دیتی ہیں؟

ج : اس معاملے میں "بہت گندی گرل" ہوں۔ بھول نہیں پاتی لفظ ازبر ہو جاتے ہیں۔ معاف کرنے کی سعی ضرور کرتی ہوں۔ دعا ہے خدا درگزر' صبر و قناعت جیسی خوبیوں سے نواز دے آمین!

س : اپنی کامیابیوں میں کسے حصہ دار ٹھہراتی ہیں؟

ج : ماں کی دعاؤں کو' بابا اور بھائیوں کی محنت کو بہنوں کے متاع خلوص کو' احباب' اساتذہ کی بے غرض "محبت اور مدد۔"

س : سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر کے کاہل کر دیا یا واقعی یہ ترقی ہے؟

ج : سائنسی ترقی نے نت نئی ایجادات کر کے بلاشبہ ایک انقلاب برپا کیا ہے لیکن ستم بالائے ستم کے مصداق سستی اور کاہلی جن کی فطرت میں ہو یا وراثت میں ملی ہو یا جنہیں عادت ہی آرام کرنے کی ہو ایسے عادی مجرموں جیسے افراد کے لیے جتنی بھی سہولتیں پیدا کر دی جائیں انہوں نے بچھو کی طرح اپنی فطرت سے باز نہیں آنا۔ ضرورت بس اس بات کی ہے کہ اس ترقی کو منافع بخش عزائم میں بروئے کار لایا جائے۔

س : کوئی عجیب خواہش / خواب؟

ج : ہے نا! "شدت سے خواہش کہ اس دور میں جاؤں جب صحابہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بصد احترام بیٹھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنا کرتے تھے۔ اے کاش! کہ ایسا ہو! خواب میں قائداعظم سے ملاقات کا شرف حاصل ہو تو ملک جو تنزلی کی طرف جا رہا ہے' اس سلسلے میں بیش بہا تجاویز کا خزانہ حاصل کروں' علامہ اقبال مل جائیں تو ان سے شاعری کے تمام اسرار و رموز سیکھوں۔"

س : "برکھا رت" کو کیسے انجوائے کرتی ہیں؟

ج : بابا کی فرمائش پر لذیذ قسم کے پکوڑے بناتی ہوں۔ بارش کے حوالے سے کوئی شعر' مزے دار ایات میسج میں فرینڈز کو سینڈ کرتی ہوں۔ خنک ہواؤں کو دور دور سے تاڑتے ہیں۔

س : آپ جو ہیں؟ وہ نہ ہوتی تو کیا ہوتیں؟

ج : ایسا سوچنے کی جسارت بھی نہیں کرتے۔ رب تعالیٰ نے خداداد صلاحیتوں سے نوازا ہے۔

س : آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب؟

ج : نصف شب ساقی ازل سے گفتگو ہو' جب میرے طالب علم مجھے سلام کرتے ہیں' سراہتے ہیں' جب بابا پیار سے گلے لگاتے ہیں بھائی سر پر ہاتھ رکھ کر تحفظ کا احساس دلاتے ہیں' جب میرے بھانجا' بھانجی' بھتیجا' بھتیجی چہکتے ہوئے پاپیا کہہ کر میرے گرد گھومتے ہیں' لیلۃ القدر پر تو نثار ہونے کا دل چاہتا ہے (دھواں اٹھ رہا ہے کہیں سے... کوئی بات نہیں) جب میری تحریر چھپتی ہے' جب دوست میری صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہیں' جب اساتذہ خوبیوں کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ (زیادہ ہو گیا...؟)

س : کامیابی کیا ہے' آپ کے لیے؟

ج : "کیمیا۔"

س : مطالعہ کی اہمیت آپ کی زندگی میں؟

ج : خلوت میں بہترین رفیق... اچھا مطالعہ روح کے لیے کشت زعفران۔

س : آپ کی پسندیدہ شخصیت؟

ج : خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

س : متاثر کن کتاب' مصنف' مووی؟

ج : متاثر کن کتابیں اور مصنفین تو بہت سے ہیں مگر یہاں ایک کا ذکر کروں گی۔ "قرآن پاک" عمیرہ احمد۔ مووی کوئی نہیں۔ (دل چاہتا ہے عمیرہ احمد کا ایک ایک لفظ' جملہ' ناولز' ایک متاع قیمتی کی طرح موجود ہو)

س : آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟

ج : ذہانت' خدا سے بشر کا تعلق۔

س : کیا آپ نے اپنی زندگی میں وہ سب پا لیا جو پانا چاہتی تھیں؟

ج : شکر' سکون' قناعت جب دل اس دولت سے مالا مال ہو تو جو پاس ہے وہ بھی اوقات سے بڑھ کر لگتا ہے۔

س : آپ کا غرور؟

ج : توبہ کریں جی' خدا بچائے اس بلا سے کہ غرور متکبر کو بیخ و بن سے مارتا ہے۔

س : کوئی ایسی شخصیت جو آج بھی آپ کو اداس کر دیتی ہے؟

ج : "ماں جی" جن کی یادیں اور بوقت آخری کیفیت اکثر رُلا دیتی ہے۔

س : آپ کے نزدیک زندگی کی فلاسفی کیا ہے جو آپ اپنے علم' تجربہ اور مہارت میں استعمال کرتی ہیں؟

ج : زندگی کی فلاسفی میرے نزدیک "صبح کاذب اور غروب سورج" ہے۔ بقول واصف کے "زندگی صرف نیوٹن ہی نہیں' زندگی ملٹن بھی ہے۔"

س : کیا آپ مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں یا خوفزدہ ہو جاتی ہیں؟

ج : مقابلے سے احتراز نہ صرف صحت بلکہ دل و دماغ کے لیے بھی اچھا ٹانک ہے۔

☼ ☼

شعاع عزیر

انکساری و عاجزی اختیار کرو

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اے عائشہ! اگر میں چاہوں (تو) سونے کے پہاڑ میرے ساتھ چلیں۔ ایک فرشتہ میرے پاس آیا۔ اس کی کمر کعبہ کے برابر تھی۔ اس نے کہا آپ کا رب آپ کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ آپ چاہیں تو بندہ نبی ہونا پسند کرلیں اور یا بادشاہ پیغمبر۔ میں نے جبرئیل کی طرف دیکھا انہوں نے میری طرف اشارہ کیا کہ تواضع (انکساری) اختیار کرو۔" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کی غرض سے جبرئیل کی طرف دیکھا تو انہوں نے کہا کہ تواضع اختیار کرو۔ میں نے کہا میں بندہ نبی ہونا پسند کرتا ہوں۔" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ لگا کر کھانا نہیں کھاتے تھے (اور) فرماتے کہ میں اس طرح کھاتا ہوں جس طرح غلام کھاتا ہے اور میں اس طرح بیٹھتا ہوں جس طرح غلام بیٹھتا ہے۔ (مشکوۃ شریف)

قوم ثمود

ثمود حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کا نام ہے۔ یہ عرب کی قدیم ترین اقوام میں سے دوسری قوم ہے جو قوم عاد کے بعد سب سے زیادہ مشہور و معروف ہے۔ اس قوم کے قصے نزول قرآن کے وقت زبان زد عام تھے۔ زمانہ جاہلیت کے اشعار اور تحریروں میں بھی اس قوم کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔ اسکندریہ اور روم کے قدیم مورخین اور جغرافیہ نگاروں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی ولادت سے کچھ عرصے پہلے تک اس قوم کے کچھ آثار موجود تھے۔ رومی مورخین کے مطابق یہ لوگ رومن افواج میں بھرتی ہوئے اور قبطیوں کے خلاف لڑے جوان کے دشمن تھے۔ قوم ثمود کا وطن شمال مغربی عرب کا وہ علاقہ تھا جو آج بھی "الحجر" کے نام سے موسوم ہے۔ موجودہ زمانے میں مدینے اور تبوک کے درمیانی راستے میں ایک مقام آتا ہے جو "مدائن صالح" کے نام سے موسوم ہے۔ یہی ثمود کا صدر مقام تھا اور زمانہ قدیم میں الحجر کہلاتا تھا۔ اب بھی وہاں ہزاروں ایکڑ رقبے میں وہ عمارتیں موجود ہیں، جنہیں اہل ثمود نے پہاڑوں میں تراش کر بنایا تھا۔

رخسانہ... ایبٹ آباد

ظلم

کسی ظالم کا کوئی عمل اس وقت تک ظلم نہیں کہلائے گا، جب تک مظلوم اس عمل سے پریشان نہ ہو۔ ظالم کا سب سے بڑا ظلم یہی ہے کہ وہ مظلوم کو ظلم سہنے کی تعلیم دے چکا ہوتا ہے۔

☆ غریب کی بیماری امیر ڈاکٹر کے لیے نوید بہار ہے۔ غریب لاعلم ہے۔

☆ راہنما کرسیوں کے کھیل میں غریب کی عافیت سے کھیلتے ہیں اور مظلوم کو احساس تک نہیں۔

☆ خطرناک ظالم زندگی میں دوست بن کر آتا ہے۔ کام لیتا ہے، کام نکالتا ہے اور ایک نامعلوم موڑ پر شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ دغا دے جاتا ہے۔ اس ظلم کا بیان کس سے کریں۔

☆ کسی انسان سے اس کے معاوضے سے زیادہ کام لینا بھی ظلم ہے۔ معاوضہ، دینے والے کی شان کے مطابق ہونا چاہیے۔ سب سے بڑا ظلم کسی کی محنت کو رائیگاں کرنا ہے۔

☆ کسی انسان کے دل میں وسوسہ پیدا کرنا بھی ظلم ہے۔ قوم کو تذبذب میں گرفتار کرنا ظلم عظیم ہے۔

☆ کسی مسافر کو سفر کے دوران اس کی مسافرت سے بے زار کرنا ظلم ہے۔

☆ کسی غریب کی عزت نفس کو غریب سمجھنا ظلم ہے معاشرے میں معافی مانگنے اور معاف کرنے، خود پسندی ترک کرنے اور انا کو پس پشت ڈالنے سے ظلم کا سفر رک جاتا ہے۔ دوسروں پر احسان کرنے سے ظلم کی یاد ختم ہوجاتی ہے۔ حق دار کا حق ادا کرو بلکہ اسے حق سے ماسوا دو۔ بس اتنے سے عمل سے ظلم ختم ہوجاتا ہے۔ جس معاشرے میں مظلوم اور محروم نہ ہوں، وہی معاشرہ فلاحی ہے۔ (واصف علی واصف)

فرزانہ عقیل..... اسلام آباد

کفایت

"اللہ تمہیں ہر مہینے لاکھوں روپے اس لیے دیتا تھا کہ تم ان میں سے تذیر مالی کو پندرہ سو دے سکو۔ تم نے اسے اپنے رزق کے کھاتے سے خارج کردیا اللہ نے تمہارا کھاتا ہی بند کردیا۔" ہم سب گارڈین ہیں، کیئر ٹیکر ہیں۔ ہمارے دفتروں، گھروں میں ایسے بے شمار لوگ ہوتے ہیں جو دو، تین ہزار روپے کے لیے ہماری خدمت کرتے ہیں۔ ان کا رزق ہمارے رزق سے منسلک ہوتا ہے۔ یہ لوگ اللہ کے صابر بندے ہوتے ہیں۔ اللہ ہمیں رزق عنایت کرتا ہے تاکہ ہم ان لوگوں کا حصہ ان تک پہنچا سکیں۔ ہمیں معلوم ہی نہیں ہوتا ہمیں کس مالی، چپڑاسی، ڈرائیور، خانساماں، چوکیدار کے صدقے یہ ساری نعمتیں، آسائشیں مل رہی ہیں۔ وہ کون ہے جس کا شکر ہمارے رزق کو وسعت دے رہا ہے۔ مگر پھر ہمارا غرور، نخوت، تکبر ہمیں ڈنک مارتا ہے اور کسی کمزور لمحے ہم اس ذریعے کو اپنی زندگی سے خارج کردیتے ہیں۔ پھر ان ساری آسائشوں نعمتوں کا سورج بھی اس شخص کے ساتھ ہمارے صحنوں سے رخصت ہوجاتا ہے۔ (جاوید چوہدری)

عائشہ... کراچی

بانجھ موسموں کی راگنی

بسنت بھی نہیں کہ حرف رنگ لوں
پیلے پیلے رنگ میں
بہار بھی نہیں کہ پھول ٹانک لوں
کسی نئی امنگ میں
خزاں بھی وہ نہیں کہ خشک پتیاں
اوس میں بھگو سکوں
سماں بھی وہ نہیں کہ جس کی تلخیاں
سرور میں ڈبو سکوں
گنگ اپنے ساز کی
ایک ایک جھانجھ ہے
کس طرح بشارتوں کا ہو جنم
جب دلہن ہی موسموں کی بانجھ ہے

نیلم... لاہور

"محبت، دل اور جسم"

"محبت پانے والا کبھی اس بات پر مطمئن نہیں ہوتا کہ اسے ایک دن کے لیے مکمل طور پر محبت حاصل ہوئی تھی، محبت تو ہر دن کے ساتھ اعادہ چاہتی ہے۔ روز سورج نہ چڑھے تو دن نہیں ہوتا جس روز محبت کا آفتاب طلوع نہ ہو، رات رہتی ہے۔ یہ دل اور جسم بڑے بیری ہیں ایک دوسرے کے۔ جسم روندا جائے تو یہ دل کو پنپنے نہیں دیتا دل کی مٹھی بند رہے تو یہ جسم کی نگری تباہ کردیتا ہے۔ ان دونوں کو کبھی آزادی نصیب نہیں ہوتی۔ (از راجا گدھ، بانو قدسیہ)

امبر گل... جھڈو سندھ

الجھن کا حل

ایک صاحب نے ٹریفک کنٹرولر صاحب کو درخواست میں لکھا۔ جناب عالی! میں نے "ہائی وے کوڈ بک" کا بغور مطالعہ کیا ہے' اس میں لکھا ہے کہ ڈرائیونگ سے پہلے اطمینان کر لینا چاہیے کہ ہارن بج رہا ہے؟ لیکن ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ رہائشی علاقے میں ہارن نہیں بجانا چاہیے جس کا مطلب ہے کہ میں روانہ ہونے سے پہلے ہارن بجا کر اطمینان نہیں کر سکتا کہ وہ بج رہا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ میں ایک رہائشی علاقے میں رہ رہا ہوں۔

"کوڈ بک" میں یہ ہدایات بھی درج ہیں کہ ڈرائیونگ سے پہلے اطمینان کر لینا چاہیے کہ بریک اور اسٹیئرنگ صحیح حالت میں ہیں' اسپیڈ میٹر کام کر رہا ہے' سائیلنسر بند نہیں ہے۔ گاڑی شور نہیں کر رہی ہے' دھواں نہیں چھوڑ رہی ہے؟ جناب والا! ان تمام باتوں کا اطمینان کرنے کے لیے ڈرائیونگ ضروری ہے جبکہ کتاب میں لکھا ہے کہ ان تمام باتوں کا اطمینان کیے بغیر گاڑی نہ چلائی جائے۔ اس الجھن کا کیا حل ہے؟ جواب سے جلد از جلد مطلع فرمائیں کیونکہ میں اپنے گیرج میں گاڑی کے اندر ہی بیٹھا ہوا ہوں۔

فقط..... ایک قانون پسند شہری۔

نبیلہ نعیم..... کراچی

اُسے

مجھ کو بھی شوق تھا نئے چہروں کی دید کا
رستہ بدل کر چلنے کی عادت اسے بھی تھی
وہ مجھ سے بڑھ کر ضبط کا عادی تھا جی گیا
ورنہ ایک سانس قیامت اسے بھی تھی

فوزیہ ثمر بٹ..... گجرات

الف اللہ

اللہ کا نام اعلا طریقہ پر لیا جائے یا ادنیٰ طور پر اپنا اثر ضرور رکھتا ہے۔ دنیا میں بعض اشیاء ایسی ہیں کہ ان کا نام لینے سے ہی منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کا نام لیا جائے اس میں اثر نہ ہو۔ خالی نام میں بھی برکت ہے خواہ پوری توجہ سے لیا جائے یا کم توجہ سے۔ (اقتباس شہاب نامہ)

صابرہ..... اسلام آباد

غم مسافر تھا

خواب اب یوں ہیں کہ جیسے کوئی ضدی بالک
آگ کو پھول سے ہاتھوں میں پکڑنا چاہے
سر کی چادر بھی ہوا میں نہ سنبھالی جائے
اور گھٹا ہے کہ برسنے کو بہانا چاہے
شاخ گل آئی ہے یوں میرے دریچے کے قریب
زندگی جیسے کوئی قرض چکانا چاہے
جانے کیا بات تھی اس روز کوئی در نہ کھلا
غم مسافر تھا اور ایسا کہ ٹھکانا چاہے
(ادا جعفری)

فرزانہ علی احمد..... کراچی

افکار

○ اللہ عدل کرے تو بڑے بڑے جاندار اور جہانگیر لوگ اس کے آگے کانپتے رہیں گے۔
○ ہر چیز کو عزت کے ساتھ رہنے دیا جائے تو اپنی عزت بھی قائم رہتی ہے۔
○ جس انسان نے ماں باپ کو پرورش کرتے ہوئے دیکھا اور انہیں نہ مانا' اس نے اللہ کو دیکھے بغیر کیا جانا ہے؟
○ وہ ملک ترقی کرتے ہیں جہاں اداروں کے سربراہ نیک فطرت لوگ ہوں۔
○ انسان مجبوری توڑنا چاہتا ہے اور فطرت اسے مجبور رکھنا چاہتی ہے' دونوں اپنے اپنے راستوں پر مجبور ہیں۔
○ مجبور ہونا کوئی بری بات نہیں اور سچ پوچھو تو مجبور ہونا کوئی اچھی بات بھی نہیں۔

تانی چوہدری..... آکسفورڈ یو کے۔

بُشریٰ محمود

یاسمین حنفی، کی ڈائری میں تحریر
محسن نقوی کی غزل

میں دل پہ جبر کروں گا تجھے بھلا دوں گا
مروں گا خود بھی تجھے بھی کڑی سزا دوں گا

دغا کروں گا کسی سوگوار چہرے سے
پرانی قبر پہ کتبہ نیا سجا دوں گا

اسی خیال میں گزری ہے شام درد اکثر
کہ درد حد سے بڑھے گا تو مسکرا دوں گا

تو آسماں کی صورت ہے گر پڑے گا کبھی
زمیں ہوں میں بھی مگر تجھ کو آسرا دوں گا

بڑھا رہی ہے میرے دکھ نشانیاں تیری
میں تیرے خط تیری تصویر تک جلا دوں گا

یہ تیرگی مرے گھر کا ہی کیوں مقدر ہو
میں تیرے شہر کے سارے دیے بجھا دوں گا

بہت دنوں سے میرا دل اداس ہے محسن
اس آئینے کو کوئی عکس اب نیا دوں گا

ابرگل، کی ڈائری میں تحریر
خلیل اللہ فاروقی کی نظم

محبت جن سے ہوتی ہے،

محبت جن سے ہوتی ہے
انہیں کھونے کا ڈر ہر وقت دامن گیر رہتا ہے
یقیں کی آخری منزل پہ آ کر بھی
کوئی خدشہ، کوئی شک، کوئی اندیشہ بہت بے چین رکھتا ہے
محبت جن سے ہوتی ہے

انہیں کھونے کا ڈر ہر وقت دامن گیر رہتا ہے
کہیں یہ وصل کے لمحے، بدل جائیں نہ فرقت میں
کہیں یہ قرب کی گھڑیاں، جدائی میں نہ ڈھل جائیں
کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی اس کو بدگماں کر دے
کہیں ایسا نہ ہو کہ جس کو ہم حاصل عمر رواں سمجھے
جھٹک کر ہاتھ وہ بے درد سب کچھ رائیگاں کر دے
کہیں ایسا نہ ہو! وہ مہرباں آنکھیں بدل جائیں
کہیں ایسا نہ ہو! یہ گرم جوشی سرد پڑ جائے
تپاک جاں سے ملنے کی روش یخ بستہ ہو جائے
ادائے دلبرانہ بے رخی کا روپ دھارے' اور دل کا درد بن جائے
محبت جن سے ہوتی ہے
انہیں کھونے کا ڈر ہر وقت دامن گیر رہتا ہے
کبھی محفل میں سب کے سامنے وہ احتیاطاً بھی
اگر نظریں چرا جائے تو دل پر چوٹ لگتی ہے
آنسوؤں کا مینہ برستا ہے
کبھی مصروفیت میں، محویت میں
فون کی گھنٹی کا وہ نوٹس نہ لے
اور رابطے کا سلسلہ موقوف ہو جائے

دھڑک اٹھتا ہے دل، کیا جانیے کیا ہو گیا اس کو
توجہ میں کمی کیوں آ گئی
کیوں اس کی جانب اک سناٹا سا چھا گیا
جو اپنا اس قدر اپنا تھا
آخر کیوں پرایا ہے
محبت جن سے ہوتی ہے
انہیں کھونے کا ڈر ہر وقت دامن گیر رہتا ہے

عذرا، اقصیٰ ناصر، کی ڈائری میں تحریر
شبنم شکیل کی غزل

موسم کئی بدلے ہیں، مقدر نہیں بدلا
ویسا ہی شکستہ ہے مرا گھر نہیں بدلا

شوریدہ سری آنکھ کے دریا کی وہی ہے
اور ساحل دریا پہ بھی منظر نہیں بدلا

اس سے بھی مرے شوق تنوع کو گلہ ہے
ہمزد تھا میرا تو وہ کیونکر نہیں بدلا

گردش تو زمانے کی بہت میں نے سہی ہے
پر اس سے مری سوچ کا محور نہیں بدلا

الفاظ نئے ہیں مگر افکار پرانے
دستار تو بدلی ہے مگر سر نہیں بدلا

سچا تھا سو بیچے پہ رہا اپنے وہ قائم
رخ بدلا ہوا کا تو سخنور نہیں بدلا

فوزیہ ثمریٹ، کی ڈائری میں تحریر
فاطمہ حسن کی غزل

کس سے بچھڑی کون ملا بھول گئی
کون برا تھا، کون تھا اچھا بھول گئی

کتنی باتیں جھوٹی تھیں اور کتنی سچ
جتنے بھی الفاظ کو پرکھا، بھول گئی

چاروں اور تھے دھندلے دھندلے چہرے سے
خواب کی صورت جو بھی دیکھا بھول گئی

سنتی رہی میں سب کے دکھ خاموشی سے
کس کا دکھ تھا میرے جیسا بھول گئی

بھول گئی ہوں کس سے میرا ناتا تھا
اور یہ ناتا کیسے ٹوٹا بھول گئی

فائزہ قریشی، کی ڈائری میں تحریر
اکبر الہ آبادی کا کلام

کہوں کس سے قصۂ درد و غم، کوئی ہم نشیں ہے نہ یار ہے
جو انیس ہے تری یاد ہے، جو شفیق ہے دل زار ہے

نہ نوید اوروں کو جا سنا، کہ ہم اسیر دام ہیں اے صبا
ہمیں کیا، چمن ہے جو رنگ پر، ہمیں کیا جو فصل بہار ہے

جسے دور چرخ میں ہو خوشی تو مزد ہے اسے رنج بھی
شب ہجر میں ہے جو درد سر، مئے وصل کا یہ خمار ہے

وہ نظر جو مجھ سے ملا گئے، تو اندر آفتیں ڈھا گئے
کہ حواس و ہوش خرد ہے اب، نہ شکیب و صبر و قرار ہے

مجھے رحم آتا ہے دیکھ کر ترا حال اکبر نوحہ گر
تجھے وہ بھی چاہے خدا کرے کہ تو جس کا عاشق زار ہے

رانی، کی ڈائری میں تحریر
بمل کرشن اشک کی نظم

کسی کا ہاتھ،

جب میں اس سے ملنے جاتا ہوں، اکیلے راستے پر
ان گنت آنکھیں ستاروں، سنگریزوں، پتیوں کی
میرے قدموں پر جمی ہوتی ہیں
میرے سر پر ساتھ ہوتا ہے کسی کا

جب میرے کپڑوں کے گہرے زخم، بے آواز جیبیں
بھر نہیں سکتے، تمنائیں سر مژگان عزت
میرے دل میں پھوٹ کر روتی ہیں لیکن
میرے سر پر ہاتھ ہوتا ہے کسی کا

گر تصور کے بیابانک جنگلوں میں، دن دہاڑے
ان گنت غم کی چڑیلیں، زہر کی گھمسان کھیتی
دامن احساس پر ہوتی ہیں لیکن
میرے سر پر ہاتھ ہوتا ہے کسی کا

عنبر بن منفی، کی ڈائری میں تحریر
ظفر اقبال کی غزل

باہر بھی گرد امید کی اڑتی تھی دور دور
اندر بھی چاروں سمت غبار انتظار تھا

کچھ شوق سے کیا تو کبھی بے دلی سے بھی
بیگار تھی کہیں، کہیں کام انتظار تھا

بزم صدا میں طرۂ خاموش تھی امید
باغ ہوا میں طرز خرام انتظار تھا

آنکھوں میں اس کی عکس غبار آب و تاب تھی
چہرے پہ اس کے گرد ملال انتظار تھا

خوشبو سی اس کے آنے کی جس دم اڑی خبر
حیران تھی امید تو دنگ انتظار تھا

پھیلا ہوا جو ظلمت تصور تھا سامنے
کتنا کشادگی میں بھی تنگ انتظار تھا

آنکھوں میں اک خلیج خلا انتظار تھی
سینوں میں کوئی راز رسول انتظار تھا

وہ قصر خواب جس میں بٹھایا گیا مجھے
اس میں ستوں بہ ستوں انتظار تھا

اتنا طویل عرصہ جو میں چپ رہا ظفر
سچ پوچھیے تو مجھ کو زبان انتظار تھا

شگفتہ سلیمان

امبر گل ——— جھڈو (سندھ)

محبت کا سفر ہے اور میں ہوں
اک الجھی راہ گزر ہے اور میں ہوں
کہاں لے جاؤں اپنے خواب سارے
پتھر کا نگر ہے اور میں ہوں

نمرہ، اقرأ ——— کراچی

پھول لمحوں کے مسافر خوشبو میں خانہ بدوش
وقت کا دست ستم یوں مجھ کو تنہا کر گیا

عذرا اقصیٰ ناصر ——— کراچی

ویرانۂ وجود میں چلنا پڑا ہمیں
اپنے لہو کی آگ میں جلنا پڑا ہمیں
امجد کسی طرف بھی سہارا نہ تھا کوئی
جب بھی گرے تو خود ہی سنبھلنا پڑا ہمیں

سلامہ ——— کراچی

یوں تیری باتیں سنبھالی ہیں
عیدی ہو میرے بچپن کی

آسیہ جاوید ——— ٹی ٹوبہ ٹیک سنگھ

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا ——— نہ دیا ہو شراب میں

ندا، فضہ ——— فیصل آباد

شاید ابھی نہ پہنچی ہو باب قبول تک
ساقی ذرا سی اور کہ تو بہ سفر میں ہے

زاریہ طاہر ——— کراچی

آج آخری سطروں میں کہیں نام ہے اس کا
احباب کی فہرست میں جو پہلا تھا ایک شخص

عابدہ نشاد ——— کراچی

تمام عمر عذابوں کا سلسلہ تو رہا
یہ کم نہیں ہمیں جینے کا حوصلہ تو رہا

کرن، بیتش ——— کراچی

لے کے چٹکی میں نمک آنکھ میں بھر کے آنسو
اس پہ مچلے ہیں کہ ہم زخم جگر دیکھیں گے

علینہ خرم ——— خوشاب

زندگی پھیلی ہوئی تھی شام ہجراں کی طرح
کس کو اتنا حوصلہ تھا کون جی کر دیکھتا

عائشہ ——— گوجرہ

بلند حوصلہ ہم ہیں شکست کیوں مانیں
یہ ممکنات کی دنیا ہے راستے ہیں ہزار

صائمہ جیمی ——— کراچی

اب دل میں حوصلہ، نہ سکت بازوؤں میں ہے
اب کے مقابلے پہ میرے یار آ گئے

نازیہ قیس ——— نواب شاہ

دلوں کے حوصلے بڑھ کر گھٹا نہیں کرتے
پہاڑ اپنی جگہ سے ہلا نہیں کرتے
قتیل ایسے چراغوں میں ہم نہیں شامل
جو آندھیوں کے مقابل ڈٹا نہیں کرتے

عظمیٰ ——— کراچی

گرفتہ دل تھے مگر حوصلہ نہ ہارا تھا
گرفتہ دل ہیں مگر حوصلے بھی اب کے گئے

فوزیہ ثمرین ——— گجرات

اچھا تمہارے شہر کا دستور ہو گیا
جس کو گلے لگا لیا وہ دور ہو گیا
دادی سے کہتا کہ اس کی کہانی سنائیے
جو بادشاہ عشق میں مزدور ہو گیا

امبر عارف ——— حیدرآباد

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد اب معلوم
کہ تو نہیں تھا ترے ساتھ ایک دنیا تھی

حافظ سمیرا ——— 157، این بی

ہزار چہروں میں ملیں مجھے مشابہتیں اس کی
پر دل کی یہ ضد وہ نہیں تو "اس" جیسا بھی نہیں

ثمینہ اکرم ——— کراچی

ہزار خضر پیدا کر چکی ہے نسل انسانی
یہ سب تسلیم لیکن آدمی اب تک بھٹکتا ہے

یاسمین شفیق ——— دبئی

اے ساقیٔ گل فام برا ہو ترا، تو نے
باتوں میں لبھا کر ہمیں وہ جام پلایا
یہ حال ہے سو سال غلامی میں بسر کی
اور ہوش ہمیں اب بھی مکمل نہیں آیا

صائمہ سلیم سندھو ——— گوجرہ

ساقی مجھے نہ جام نہ پیمانہ چاہیے
تیری نگاہ مست کا نذرانہ چاہیے
مرہم ندامتوں کا یہاں لگ چکا بہت
اے زخم بے حسی مجھے بھر جانا چاہیے

پرنسز علوی اکرم ——— کراچی

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے

کشور غفار اوڈ ——— عبدالحکیم

کیسی کیسی بے ثمر یادوں کے ہالوں میں رہے ہیں
ہم بھی اتنی زندگی کیسے وبالوں میں رہے ہیں
اک نظر بندی کا عالم تھا نگر کی زندگی
قید میں رہتے تھے جب تک شہر والوں میں رہے ہیں

مریم شہباز ——— کراچی

بزم میں عشاق کی ساقی نے کر دی خود تمیز
جام بھر کے کہہ دیا تیرا، تمہارا، آپ کا

مدیحہ یوسف ——— گوجرہ

اب اس کے بعد کوئی رابطہ نہیں رکھنا
یہ بات طے ہوئی لیکن سوال درد کا ہے
یہ دل، یہ اجڑی ہوئی چشم نم، یہ تنہائی
ہمارے پاس تو جو بھی ہے مال درد کا ہے

رابعہ ——— کراچی

غم کے سانچے میں ڈھل سکو تو چلو
تم مرے ساتھ چل سکو تو چلو
دور تک تیرگی میں چلنا ہے
صورت شمع جل سکو تو چلو

تحریم ——— فیصل آباد

ٹوٹ جاتا ہے ذرا سی جو تیز ہوا چلے
تیرا وعدہ بھی تو خوشبو کا بدن ہو جیسے

فرزانہ علی احمد ——— کراچی

میں اپنے خواب سے کٹ کر جیوں تو میرا خدا
اجاڑ دے مری مٹی کو در بدر کر دے
مری زمین مری آخری حوالہ ہے
سو میں رہوں نہ رہوں اس کو بارور کر دے

حمیرہ حمید ——— کراچی

ہم بے در لٹے گھر لوگوں کی ایک دعا بس ایک دعا
مالک شہر گلاب سلامت، ہم پر جو بھی آئے عذاب

ام سودبان ——— عبدالحکیم

خدا کرے مری ارض پاک پر اترے
وہ فصل گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
خدا کرے مرے اک بھی ہم وطن کے لیے
حیات جرم نہ ہو زندگی وبال نہ ہو

سانحہ ارتحال

ہماری ایک قاری بہن نائلہ گل زمان ایک حادثے کا شکار ہو کر رضائے الٰہی سے وفات پا گئی ہیں۔ قاری بہنوں سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ نائلہ گل زمان کے درجات بلند کرتے ہوئے انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے۔ (آمین) اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

حسن و صحت

ادارہ

حسین نظر آنا ہر عورت کی خواہش بھی ہوتی ہے اور حق بھی۔ خواتین خوب صورت نظر آنے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتی ہیں۔ لیکن سب سے بہتر اور آزمودہ وہ دیسی ٹوٹکے ہیں جو صدیوں سے استعمال ہوتے آرہے ہیں۔

کیل مہاسے 'جھریاں' سیاہ دھبے دور :

اکثر لڑکیاں کیل مہاسوں کی وجہ سے پریشان رہتی ہیں۔ اس کے لیے سب سے بہتر نسخہ ہے کہ تازہ گاجریں کش کرلیں اور اس میں تھوڑا سا عرق گلاب اور ایک چائے کا چمچہ خالص شہد ملا کر ہلکا سا مل کر پندرہ سے بیس منٹ کے لیے چھوڑ دیں اور صاف ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔ مہاسے ختم کرنے کے لیے گھیکوار کے رس یا یا گودے میں سیب کا گودا' کھیرے کا پانی اور لیموں کا رس ملا کر یہ لیپ چہرے پر ہلکا ملنے کے بعد اسے پندرہ سے بیس منٹ لگا رہنے دیں پھر چہرہ نیم گرم پانی سے دھولیں۔ جلد شفاف اور کیل مہاسوں سے نجات مل جائے گی۔

چہرے کی جلد پر بہت جلدی بڑھتی عمر کے آثار نمودار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ جھریوں سے آج کل خواتین زیادہ پریشان رہتی ہیں۔ گھیکوار اس کا بہترین علاج ہے اس کا گودا یا رس چہرے پر روزانہ لگائیں۔

گالوں کے سیاہ دھبے دور کرنے کے لیے کھیرے کے جوس اور بادام کے پوڈر کو ملا کر پیسٹ بنالیں اور چہرے پر لگائیں۔ بیس منٹ کے بعد ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھولیں کچھ ہی دنوں میں سیاہ دھبے دور ہو جائیں گے۔

سیاہ حلقے دور کرنے کے لیے کچا آلو چھیل کر کش کرلیں پھر اس میں سوکھا دودھ ملا کر پیسٹ بنالیں۔ اس پیسٹ کو آنکھوں کے نیچے لگائیں' دس منٹ بعد دھولیں۔

دانتوں کی پیلاہٹ سے نجات :

دانت ہماری شخصیت کا سب سے اہم جزو ہیں۔ اگر دانت پیلے پڑجائیں تو اس کے لیے لیموں کے چھلکے

سکھا کر پیس لیں۔ اس میں نمک اور تھوڑا سا مشک کافور ملا کر رکھ لیں۔ دانتوں پر ملنے سے تمام میل اور پیلاہٹ دور ہو جائے گی اور دانت صاف شفاف ہو جائیں گے۔ دانتوں سے خون آئے تو پھٹکری' نمک اور کالی مرچ تینوں کو پیس کر دانتوں پر ملیں۔ بیس منٹ بعد گرم پانی سے کلی کریں۔ چند دن میں خون آنا بند ہو جائے گا۔

مسوڑھوں پر ورم کے لیے مشک کافور اور نوشادر دونوں کو خوب باریک پیس کر مسوڑھوں پر ملنے سے چند یوم میں آرام آجائے گا۔

پاؤں کی پھٹی ایڑیوں سے جان چھڑائیں :

اگر آپ کے پاؤں کی ایڑیاں پھٹی ہوئی ہیں تو اس کے لیے ویزلین اور لیموں برابر مقدار میں ملا کر پیروں کے لیے استعمال کریں۔ خشک اور کھردری جلد پر دس منٹ تک پکا کیلا چھیل کر چپکایئے اور پھر صاف پانی سے پیر دھو کر خشک کریں۔

گلیسرین اور عرق گلاب کو ملا کر بھی پھٹی ایڑیوں کے لیے ایک قدیمی نسخہ تیار کیا جاسکتا ہے۔

موم اور چربی برابر مقدار میں آگ میں پگھلانے کے بعد ٹھنڈی ہونے سے پہلے ایڑیوں پر لگا کر جرابیں پہن لیں صبح سب اتار لیں۔ چند دنوں میں پھٹی ایڑیاں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ روغن زیتون اور نمک نیم گرم پانی میں ملا کر تقریباً" بیس منٹ کے لیے پاؤں اسی پانی میں رکھیں۔ پھر اچھی طرح صاف کریں۔

لمبے گھنے چمکدار بالوں کے لیے :

بال لمبے اور گھنے کرنے کے لیے ایک انڈے کی زردی میں دو چمچہ سرسوں کا تیل ملالیں اور خوب پھینٹ لیں۔ بالوں کی جڑوں میں اچھی طرح انگلیوں کی پوروں سے لگائیں تین گھنٹے بعد سر دھولیں۔ بال لمبے اور نرم ہوں گے۔ سرسوں کی کھلی کو پانی میں بھگو دیں جب پھول کر نرم ہو جائے تو اس سے سر دھولیں بال لمبے اور گھنے ہو جائیں گے۔

تازہ ناریل سے نکلنے والا کچا پانی کسی بوتل میں محفوظ کرلیں اور روزانہ صبح اٹھنے کے بعد آہستہ آہستہ بالوں میں لگائیں۔ بال چند دن میں گرنا بند ہو جائیں گے لمبے اور مضبوط ہوں گے۔

ناریل کے تیل میں برگد کے درخت کی جڑیں تھوڑی مقدار میں باریک کاٹ لیں۔ پندرہ دن تک تیل کو روزانہ دھوپ لگوائیں اور جڑیں تیل میں رہنے دیں۔ یہ نسخہ بالوں کو گھنا اور لمبا کرنے کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ کالی چھلکے والی دال پیس لیں۔ روزانہ رات کو مٹھی بھر دال کسی برتن میں بھگو دیں اور صبح اس دال سے سر دھوئیں۔ بال خوب صورت اور چمکدار ہو جائیں گے۔ اگر آپ کے سر کے بال سفید ہو رہے ہیں تو سکاکائی' آملہ اور بال جھڑ لے کر کوٹ لیں اور رات کو لوہے کے برتن میں بھگو دیں۔ صبح یہ سب چیزیں پیس کر پندرہ منٹ کے لیے بالوں میں لگائیں اور پھر سر دھولیں۔

☼ ☼

سانحہ ارتحال

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے دیرینہ ساتھی غلام حسین صاحب 'کاتب امین صاحب کی والدہ' آئی ٹی مینجر زبیر صاحب کے سسر قضائے الٰہی سے وفات پاگئے ہیں۔ قاری بہنوں سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالٰی مرحومین کے درجات بلند کرتے ہوئے انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا کرے آمین' ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

کرن کا دسترخوان

خالدہ جیلانی

اسپیگٹیز ود فش بالز

اجزا :

مچھلی کا قیمہ	آدھا کلو
اسپیگٹی (ابلی ہوئی)	چار سو پچاس گرام
پاستا ساس	دو پیالی
لہسن (چوپ کیا ہوا)	ایک چمچہ
انڈہ	ایک عدد
پیاز (چوپ کی ہوئی)	ایک عدد
ہرا دھنیا (چوپ کی ہوئی)	آدھی پیالی
ہری مرچیں	چھ عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	ایک چوتھائی پیالی
مکھن	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :
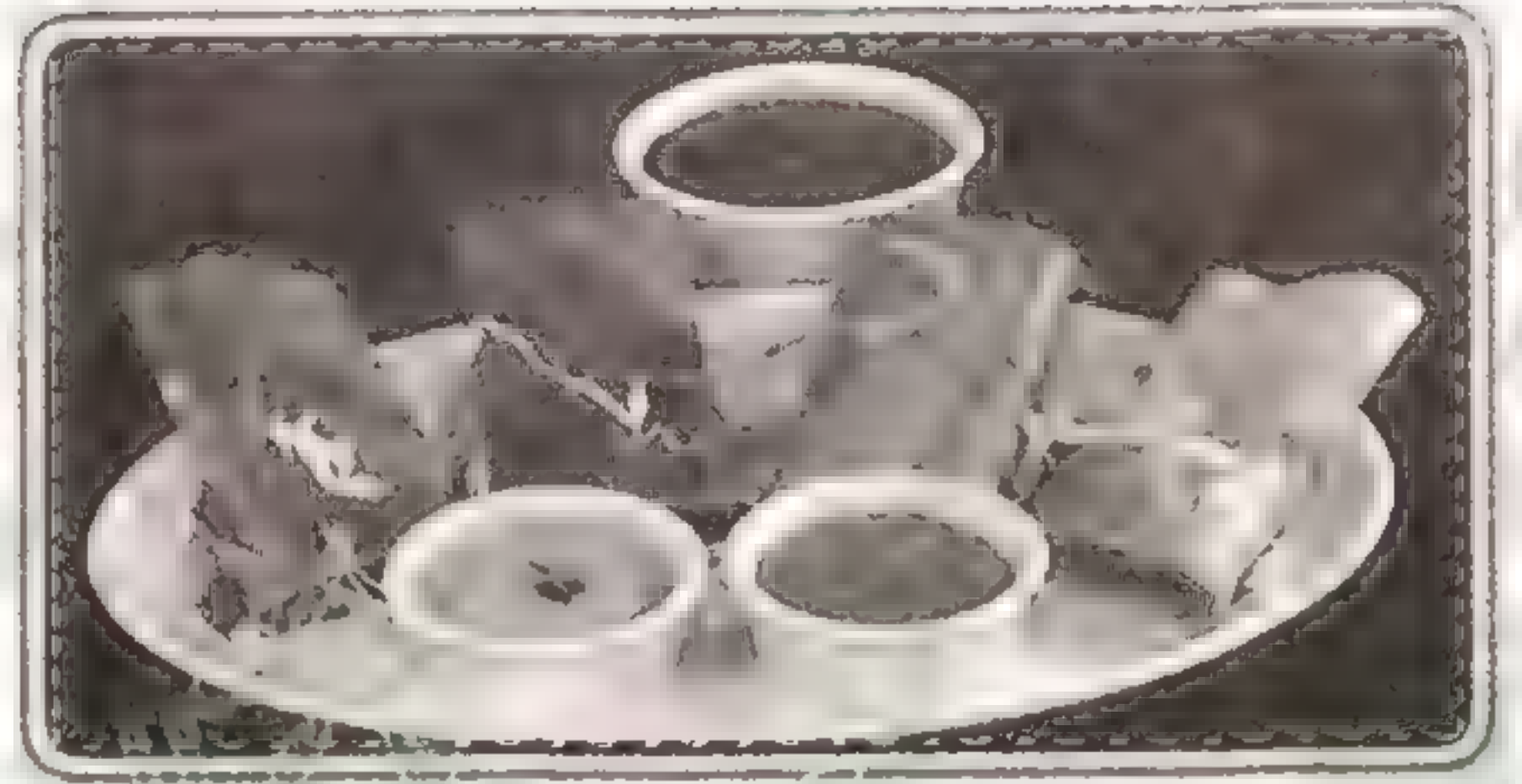
مچھلی کے قیمے میں انڈہ' پیاز' ہری مرچیں' ہرا دھنیا اور نمک ملا کر چھوٹے چھوٹے کوفتے تیار کرلیں' دیگچی میں تیل گرم کر کے لہسن کو سنہری کریں۔ اس میں پاستا ساس ملا کر چند سیکنڈ پکائیں۔ پھر کوفتے ڈالیں اور ڈھکن ڈھانک کر ہلکی آنچ پر پانچ منٹ تک پکائیں' سرونگ ڈش میں اسپیگٹیز سجائیں اس پر کوفتے رکھیں' مکھن ڈالیں اور ہرے دھنیے سے سجا کر پیش کریں۔

چکن ملائی تکہ

اجزا :

مرغی	آدھا کلو
دہی	دو کھانے کے چمچے
کاجو پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
لیموں کا رس	ایک چوتھائی پیالی
ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت
ٹوتھ پکس	چند

ترکیب :

تمام اجزا کو اچھی طرح مکس کرلیں اور مرغی کی بوٹیوں پر لگا کر کم از کم دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ گرل پین کو گرم کرلیں اور برش سے تھوڑا تیل لگائیں۔ بوٹیوں کو گرل پر رکھ کر اتنی دیر پکائیں کہ گوشت نرم ہو جائے اور اس پر گرل کے نشان بن جائیں۔ بوٹیوں کو پین سے اٹھا کر پلیٹ میں رکھیں اور ہر بوٹی میں ٹوتھ پک لگا کر پیش کریں۔

تندوری دم گوبھی

اجزا :

پھول گوبھی	ایک کلو
تندوری مسالا	تین کھانے کے چمچے
دہی	آدھی پیالی
پیاز (چوپ کیا ہوا)	ایک پیالی
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
تلی ہوئی پیاز	ایک پیالی
تیل	آدھی پیالی
بادام	سجاوٹ کے لیے
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

پھول گوبھی کے پھول الگ کرلیں۔ ان پر دہی میں مکس تندوری مسالا لگا کر دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ ایک پین میں تیل گرم کریں اور پیاز کو سنہرا کرلیں۔ لہسن ادرک پیسٹ ڈالنے کے بعد مسالا لگی پھول گوبھی شامل کرلیں۔ پین کو ڈھک کر ہلکی آنچ پر پھول گوبھی نرم ہو جانے تک پکائیں۔ آخر میں لیموں کا رس اور تلی ہوئی پیاز مکس کریں اور بادام سے سجا کر گرم نان کے ساتھ پیش کریں۔

اسپرنگ ڈوسا

اجزا :

ملی جلی سبزیاں	باریک کٹی ہوئی
پیاز	ایک عدد
ٹماٹر	آدھا پیالی
کٹی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
پسا زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
لہسن ادرک پیسٹ	حسب ضرورت
تیل	حسب ضرورت
ماش دال پیسٹ	آدھی پیالی
چاول پیسٹ	آدھی پیالی
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

دال اور چاول پیسٹ میں نمک اور پانی ملا کر پتلا آمیزہ بنالیں اور چھ سے سات گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ گرم توے پر تھوڑا سا تیل لگا کر دال چاول کے آمیزے سے بہت سارے باریک' سنہرے اور کرکرے ڈوسا بنالیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں اور پیاز سنہری کرلیں۔ لہسن ادرک پیسٹ' ٹماٹر' لال مرچ' پسا ہوا زیرہ ڈال کر چند منٹ تک بھونیں۔ باریک کٹی سبزیاں اور نمک ڈال کر ہلکی آنچ پر نرم ہونے تک پکائیں۔ جب سبزیاں تیار ہو جائیں تو ہرا دھنیا چھڑک کر مکس سبزی کو ڈوسا پر رکھ کر پیش کریں۔

☼ ☼

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

بڑا۔وہ ہوتا ہے۔ اگر آپ کو بلائیں گے تو آئیں گے نا

ج:۔ مئی جون میں کراچی کا موسم بھی بڑا۔وہ ہوتا ہے آپ کراچی آئیں ہمیں یقین ہے کہ بڑا وہ قسم کا موسم آپ کو ضرور پسند آئے گا اور ہاں صفیہ جی آپ کے مزید دو سوال نہایت ذاتی تھے۔ ان کے جواب ہمارے پاس محفوظ ہیں۔

فوزیہ بیگم۔۔۔۔ کراچی

س:۔ نین جی ذرا جلدی سے "ملن" کا نام بتایئے؟

ج:۔ جنت بی بی۔ کیوں ہے نا آئیڈیل قسم کا نام۔

مسرت جبیں قادری۔۔۔۔ پیروالا

س:۔ یکم اپریل کو میری سالگرہ تھی۔ آپ کو دعوت نامہ نہ بھیج سکی۔ معذرت طلب ہوں؟

ج:۔ مبارک ہو۔ ہائی اپریل فول بھیجی۔ معذرت قبول کی جاتی ہے۔

حکیمہ جبیں۔۔۔۔ کوئٹہ سید آباد

س : کس موسم میں محبت سستی ہوتی ہے؟

ج : گرمی کے موسم میں۔

س : عورت کے پاس سب سے قیمتی چیز کون سی ہے؟

ج : حیا۔

عاکفہ صدیقی۔۔۔۔ کراچی

س : کیا بات ہے آخر آپ ہماری بھابھی کو سمجھتے کیا ہیں ہاں نہیں تو؟

ج : میں آپ کی بھابھی کو سمجھنے والا کون؟

توحید صدیقی۔۔۔۔ کراچی

س : سنا ہے محبت اندھی ہوتی ہے۔ بہری اور گونگی وغیرہ بھی ہوتی ہے کیا یہ ٹھیک ہے؟

ج : سنی سنائی باتوں پر اچھے بچے کان نہیں دھرتے۔

نجمہ رفیع۔۔۔۔ کراچی

س:۔ آپ اپنا نام بدل دیں۔ یہ تو لڑکیوں کا نام ہوتا ہے ذوالقرنین؟

ج:۔ نہیں بدلتے کوئی زبردستی ہے۔ ہوتا رہے لڑکیوں کا نام۔

عابدہ پروین۔۔۔۔ کراچی

س:۔ دنیا گول نہ ہوتی تو؟

ج:۔ تو کیا دنیا چوکور ہوتی۔

صفیہ سلطان۔۔۔۔ جیکب آباد

س:۔ نین صاحب! مئی جون میں جیکب آباد کا موسم

افہام و تفہیم

ایک چھوٹی سی بچی نے اپنی ٹیچر کو بتایا۔ "رات کو میں ڈیڈی کے ساتھ سویا تھا" ٹیچر نے اس کی اصلاح کے خیال سے فقرے کو درست کرکے دہرایا۔ "رات کو میں ڈیڈی کے ساتھ سوئی تھی"۔ بچی یہ فقرہ سن کر کچھ سوچنے لگی' پھر بولی "یہ اس وقت ہوا ہو گا جب میں سو چکا تھا"۔

امبر گل۔۔۔۔ سندھ

بے نیازی

نئے نئے دولت مند ہونے والے میاں بیوی یورپ کی سیر کو چلے گئے۔ واپسی پر ان کے دوست احباب بے چینی سے ان کے سفر کا حال سننے کے منتظر تھے۔ ان کے اعزاز میں دی گئی ایک دعوت میں ایک خاتون نے نو دولت مند کی بیگم سے پوچھا۔ "آپ نے روم کو بھی اپنے دورے میں شامل رکھا تھا یا نہیں؟"

"مجھے تو معلوم نہیں۔" بیگم نے بے نیازی سے کندھے اچکا کر کہا۔ "ٹکٹ ہمیشہ میرے شوہر خرید کر لاتے تھے۔"

ریحانہ۔۔۔۔ جہلم

اصل خطرہ

بیٹے کی درخواست پر باپ نے اسے خود حفاظتی کے سارے گر سکھا دیے۔۔۔ مکے بازی کی ہفتہ بھر کی مشق کے بعد باپ نے بیٹے سے کہا۔ "اب تم اسکول میں کسی لڑکے سے دب کر نہیں رہو گے۔"

"مجھے لڑکوں کا ڈر ہی کب تھا ابا؟" بیٹے نے جواب دیا۔ "دراصل مجھے تو ماسٹر صاحب سے خطرہ تھا۔"

سفینہ صباح۔۔۔۔ فیصل آباد

صفائی پسند

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔ "میری بیوی تو روپے پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھتی ہے۔"

دوست نے حیران ہو کر پوچھا۔ "اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے؟"

دوست نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "پریشانی کی بات یہ ہے کہ وہ انتہائی صفائی پسند ہے۔"

رخسانہ خان۔۔۔۔ بہاولنگر

ضمیر

میاں بن ایک ماہر نفسیات کے پاس پہنچے اور بولے۔

"میں نے اپنے بزنس پارٹنر کو دھوکا دیا ہے جس کی وجہ سے میرا ضمیر مجھے مسلسل ملامت کر رہا ہے۔"

"اچھا اچھا!" ماہر نفسیات نے کہا۔ "تو آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی قوت ارادی کو مضبوط کردوں تاکہ آپ اپنے بزنس پارٹنر سے معذرت کر سکیں اور غلطی کی تلافی؟"

"نہیں' نہیں۔" میاں بن جلدی سے بولے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ضمیر کو کمزور کر دیں۔"

ثمرین خان۔۔۔۔ کمالیہ سٹی

ہم سا ہو تو۔۔۔۔!

لڑکی "آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

لڑکا "میں ایک نیوز نیٹ ورک میں برانڈ

ایمبیسڈر کے طور پر جاب کر رہا تھا۔ لیکن اب میں نے جاب چھوڑ دی ہے۔"

لڑکی "لیکن آپ نے جاب کیوں چھوڑ دی؟"

لڑکا "اب کون سردیوں میں صبح صبح اخبار پھینکنے جائے۔"

اروی معطر بیگ۔۔۔ گجرات

بے چارگی

ایک خاتون ہر وقت اپنے شوہر سے لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔ اس کی چیخ و پکار سے پڑوسیوں کی زندگی عذاب بنی ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ ایک صاحب ان کے ایک پڑوسی کے پاس گئے اور ان سے کہا۔ "آپ کے پڑوس میں رہنے والی خاتون کس قدر بدتمیز اور جھگڑالو ہے' ہر وقت شور شرابہ کرتی رہتی ہے' آپ اسے سمجھاتے کیوں نہیں۔"

"کیا آپ ان کے پڑوسی ہیں؟" پڑوسی نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ میں اس کا شوہر ہوں۔" ان صاحب نے جواب دیا۔

اجالا۔۔۔ ٹنڈو الہ یار

اصل دلچسپی

شہر سے جانے والے فٹ بال کے ایک کھلاڑی اپنے گاؤں کے چند نوجوانوں کو جمع کر کے فٹ بال کھیلنا سکھا رہے تھے۔ کھیل کے قواعد بیان کرنے کے بعد بولے۔ "اب میں آپ کو قانونی اصولوں سے ہٹ کر راز کی ایک بات بتاؤں۔۔۔ اگر آپ کسی موقع پر فٹ بال کو کک نہ لگا سکیں تو کم از کم مخالف ٹیم کے کسی کھلاڑی کو ایک کک ضرور لگا دیں۔"

پھر انہوں نے کہا۔ "چلو اب کھیل شروع کرتے ہیں' فٹ بال کہاں ہے؟"

ایک نوجوان جوش سے بولا۔ "فٹ بال کو گولی ماریں جی۔۔۔ بس کھیل شروع کریں۔"

عظمیٰ شکور۔۔۔ میانہ گوندل

ڈراپ سین

لڑکی نے کافی اصرار کر کے لڑکے کو آمادہ کیا کہ وہ اس کے باپ سے مل کر شادی کی بات کرے۔ لڑکا گویا بڑی ہمت کر کے لڑکی کے باپ سے ملنے گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کا منہ لٹکا ہوا اور کندھے جھکے ہوئے تھے۔

"کیا ہوا۔۔۔؟ کیا ابو تمہاری بات سن کر ناراض ہو گئے اور انہوں نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا؟" لڑکی نے تشویش سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔" لڑکے نے مردہ سی آواز میں جواب دیا۔

"تو پھر تم ایسے اداس اور پریشان کیوں نظر آ رہے ہو۔۔۔ یہ تو خوشی کی بات ہے کہ ڈیڈی نے تمہیں قبول کر لیا۔" لڑکی نے کہا۔

"مجھے اس کی کچھ زیادہ خوشی نہیں ہے۔ پہلے تو وہ میری بات ہی نہیں سن رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میری حیثیت ایسی نہیں ہے کہ میں ان کی بیٹی سے شادی کر سکوں۔" لڑکے نے بتایا۔

"تو تم انہیں بتا دیتے ناکہ تمہارے بینک اکاؤنٹ میں پچاس لاکھ روپے موجود ہیں۔۔۔ اور تم کوئی ایسے گئے گزرے نوجوان نہیں ہو۔" لڑکی بولی۔

"جب وہ کسی اور طرح قائل نہیں ہوئے تو آخر کار میں نے یہ بات انہیں بتا دی۔" لڑکے نے کراہنے کے سے انداز میں کہا۔

"تو پھر تم اتنے مایوس اور پریشان کیوں نظر آ رہے ہو؟" لڑکی نے قدرے خفگی سے پوچھا۔

"انہوں نے وہ پچاس لاکھ روپے ادھار مانگ لیے ہیں۔" لڑکے نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا۔

نوشین سلیم۔۔۔ کوشنگ بلیدہ

پیشن گوئی

پانچ سالہ وکی اپنی ہم عمر کزن کو بتا رہا تھا۔ "تمہارے گھر میں ایک ننھا بھائی آنے والا ہے۔"

"تمہیں کیسے یقین ہے کہ بھائی ہی آئے گا۔" اس کی کزن نے پوچھا۔

"پچھلی مرتبہ امی بیمار ہو کر اسپتال گئی تھیں تو ہمارے گھر میں ننھی سی بہن آئی تھی۔ اس مرتبہ ابو بیمار ہو کر اسپتال گئے ہیں' اس لیے ضرور ننھا سا بھائی آنے والا ہے۔"

فضہ ملک' ڈی جی خان

الزام

ایک آدمی نے دوسرے سے پوچھا۔

"مردوں کے جھوٹ بولنے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟" دوسرے نے جواب دیا۔

"عورتوں پر۔"

"وہ کیسے؟" پہلے آدمی نے حیرانی سے کہا۔

"وہ اتنے زیادہ سوالات کیوں کرتی ہیں۔" دوسرے شخص نے جواب دیا۔

افشاں شریف' کراچی

نسخہ

تم اپنی بیوی کے ساتھ اس قدر صلح صفائی سے کس طرح رہتے ہو؟"

"نہایت آسان نسخہ ہے۔ آدھا دن جو اس کے جی میں آئے' وہ کرتی ہے۔"

"اور باقی آدھا دن؟"

"باقی آدھا دن میں ہر وہ کام کرتا ہوں جو وہ کہتی ہے۔"

رباب علی' کھلابٹ کالونی

خط

ایک شخص نے پردیس سے اپنی محبوبہ کو خط لکھا۔ جس میں اس کے آخری الفاظ یہ تھے۔ "میں تمہیں اور بھی بہت سی باتیں لکھنا چاہتا تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ سنسر آفس خطوط کھول لیتا ہے۔"

تیسرے دن اس شخص کو سنسر آفس کی طرف سے ایک خط ملا جس میں لکھا تھا۔

"ہم خط نہیں کھولا کرتے۔ یہ ہم پر غلط الزام ہے۔"

ظرافت نامہ

ایک شخص اپنے دفتر میں بیٹھا مسلسل کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کا دوست اسے ملنے آیا' تب بھی وہ اپنے حساب میں غرق رہا۔ دوست نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ کیا لکھ رہے ہو بھئی؟"

"کچھ نہیں یار! دراصل میری بیوی آج کل ڈائٹنگ کر رہی ہے۔ اس کا وزن ہفتے میں چار پونڈ کے حساب سے گھٹ رہا ہے۔ اس کا پورا وزن ایک سو اڑسٹھ پونڈ ہے۔ میں حساب لگا رہا ہوں کہ اگر چودہ ماہ تک اس طرح گھٹتا رہا تو بیوی سے نجات مل جائے گی۔"

سیدہ غزالہ عالم' گانڈھی

دکھائے کیا شوق جنوں

ایک صاحب کو پوسٹر پڑھنے کا بہت شوق تھا ایک دفعہ وہ کہیں سے گزر رہے تھے کہ ایک کھمبے پر ایک پوسٹر لگا ہوا تھا حسب عادت اسے پڑھنے کے لیے اوپر چڑھے' لکھا تھا۔

"کھمبا گیلا ہے' ہاتھ مت لگائیں۔"

سدرہ۔۔۔ لاہور

☼

☼

مدیرہ کرن

فرحی ارمان ٗطیبہ مسکان۔۔۔ گجرات

آل ریڈرز السلام علیکم! یہ "کرن" میں میرا پہلا خط ہے۔ ارادہ تو کئی مرتبہ کیا خط لکھنے کا مگر ازلی سستی آڑے آگئی۔ "شعاع" میں فرح ناز کے نام سے شرکت کرچکی ہوں۔ جنوری کا کرن 15 کو ملا۔ ٹائٹل گرل کی مہندی بہت پسند آئی۔ میں ڈائجسٹ پہلے صفحے سے پڑھنا شروع کرتی ہوں۔ سب سے پہلے اداریہ پڑھا اگر اس پر تبصرہ کروں تو کام لمبا ہوجائے گا۔ حمد و نعت سے دل کو منور کرکے آگے بڑھے تو اس صفحہ پر اپنے انشا جی ایستادہ تھے۔ سرسری سا دیکھا۔ (خط لکھنے کی جلدی جو تھی۔)

کہانیوں میں صرف ابھی "در دل" اور "دست کوزہ گر" پڑھیں۔ علیزے بچ گئی اور جیزی مسلمان ہوگیا۔ مین پوائنٹ تھے دل آور شاہ ایک ایسی گتھی ہے جسے علیزے ہی سلجھا سکتی ہے۔ (ذاتی خیال) "دست کوزہ گر" میں مجھے کوئی اتنا انٹرسٹ نہیں لیکن فوزیہ آپ کی تصحیح کرنا اپنا فرض سمجھوں گی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں جو کافر بادشاہ "نمرود" تھا مچھر اس کی ناک میں گھسا تھا۔ فرعون تو دریا میں ڈوب کر تباہ ہوا تھا۔ "کرن کرن خوشبو" میں ساریہ چوہدری کا انتخاب پسند آیا۔ "مجھے شعر پسند ہے" میں صدف عمران (کے ڈی اے) کا شعر پسند آیا۔ لبنیٰ مشتاق کی پسند آئی بینک (احمد فراز) چھا گئی۔ "کرن کا دستر خوان" میٹھا میٹھا تھا۔ ٹرائی کروں گی۔ امبر گل کا تبصرہ پسند آیا۔ اس دفعہ تو ہر سلسلے میں (گجراتیے) چھائے رہے۔ ساریہ ٗ ثمینہ اور آنسہ ڈوگہ سے آپ لوگ تو ہمسائی ہوئیں۔ ثمرٹ میری بھابھی کا نام بھی طیبہ ہے۔ میک می فرینڈ؟ اچھا جی یہ میرا پہلا خط ہے۔ (کیا کہا؟ بتا چکی ہوں! اوہ سوری) اسے ضرور شامل کیجیے گا ورنہ میں پھر خط نہیں لکھوں گی ٗ اللہ نگہبان۔

مشعل حرا۔۔۔ لاہور

السلام علیکم! جنوری کا کرن بالکل نئے سال کی پہلی صبح کی روشن سنہری کرنوں جیسا لگا۔ میرے خط لکھنے کی سب سے بڑی وجہ اس بار کرن میں شامل حمد ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ خاص طور پر کس شعر کا ذکر کرکے اس کی تعریف کروں۔ ہر ہر لفظ شفاف شیشے جیسے پانی کے قطروں جیسا ٹھنڈا اور سکون بخش لگا۔ نعمان فاروق صاحب کو اتنی پیاری دعائیہ حمد یا حمدیہ دعا لکھنے پر مبارک باد اور آپ کو اسے منتخب کرکے ہم تک پہنچانے کے لیے شکریہ۔ "گزر گئے برس" میں سب کے جوابات بہت جامع تھے۔ "دل دھیان کی سیڑھیاں" کالم میں ادارے کی جانب سے جو لکھا گیا اسے میں نے کئی بار پڑھا واقعی امید پر دنیا قائم ہے۔

باقی تمام ناولز ناولٹ اور افسانے بھی اچھے تھے۔ البتہ "میرے ہمنوا کو خبر کرو" نے کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔ وجہ اس کی سست رفتاری ہے۔ پلیز پلیز اسے جلد اختتام تک پہنچائیں۔ سلسلہ وار کہانیوں کے معاملے میں کرن یکسانیت کا شکار ہوگیا ہے۔ "دردل" "دست کوزہ گر" کو دیکھ دیکھ کر آنکھیں تھک گئیں۔ ہاں "وہ اک پری ہے" میں شاعری زبردست ہوتی ہے۔ آخر میں یہ دعا ہے کہ

خدا کرے میری ارض پاک پر اترے
وہ فصل گل جسے اندیشہ زوال نہ ہو (آمین)

مہر خان۔۔۔ اٹک

السلام علیکم! امید کرتی ہوں آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ کرن کو پڑھتے ہوئے ابھی 9 ماہ ہوئے ہیں۔ میں نے کرن کو پڑھنا اپنے میٹرک کے پیپرز کے بعد شروع کیا ہے۔ آج پہلی بار میں خط لکھ رہی ہوں۔ پلیز ضرور شامل کیجیے گا۔ سلسلہ وار ناول "در دل" اور "دست کوزہ گر" دونوں ہی بہت اچھے ہیں۔ مکمل ناول میں "میرے ہمنوا کو خبر کرو" اچھا ہے۔ لیکن فاخرہ جی اس میں تیزی لائیں بہت آہستہ چل رہا ہے۔ "محبت کا شجر" بھی اچھا ناول تھا اور باقی کچھ نہیں پڑھا۔ ہاں "یادوں کے دریچے" میں فوزیہ ثمرٹ کی نظم بہت اچھی لگی۔ فوزیہ جی میں آپ سے بہت متاثر ہوں اور اچھے اشعار بھیجا کریں۔ اس دفعہ آپ کا کوئی بھی شعر نہیں تھا جو کہ اچھا نہیں لگا۔ سب کے لیے ڈھیروں دعائیں اپنا خیال رکھیے گا۔ اگر خط شامل ہوا تو پھر حاضری دوں گی۔ ان شاء اللہ

عائشہ خان۔۔۔ ٹنڈو محمد خان

آپ سب کیسے ہیں؟ میری طبیعت تو کراچی آمد کے ساتھ ہی ٹھیک ہوگئی کیوں نہ ہو پورے ایک سال کے بعد اپنے میکے آئی ہوں۔ ٹائٹل دیکھا بس ٹھیک لگا کیونکہ پہلے بھی دیکھ چکے ہیں مگر مہندی میری دونوں بہنوں فرزانہ اور ندا کو بہت اچھا لگی۔ ابھی تو صرف "در دل" پڑھا ہے۔ زبردست قسط تھی مگر ایک بات سمجھ نہیں آئی دل آور کو علیزے سے اتنی شدید محبت کیسے ہوگئی؟ تھوڑا اوور ری ایکٹ لگا۔ اب اتنی۔۔۔ بے تابی بھی نہیں دکھانی چاہیے تھی اور جب اسپتال لے کر آیا تو بعد میں خیال آیا کہ میں جلد بازی میں اسی اسپتال لے آیا جس میں زری ہے یہ بھی عجیب لگا۔ اگر بے خیالی میں لے بھی آیا تھا تو بعد میں کیوں سوچا۔

"دست کوزہ گر" زبردست قسط تھی۔ خرم کا سمیر کی مدد کرنا ٗ نمل کا خرم سے اظہار اچھا لگا۔ ریاض صاحب آہی گئے تھے تو اختر صاحب کو ان سے مل لینا چاہیے تھا۔ اب ایسی بھی کیا بے رخی اور زونیہ کہاں ہے؟ مجھے تو لگ رہا ہے کہ فوزیہ یاسمین کی خود سمجھ نہیں آرہا۔ زونیہ کو اب کہاں سے برآمد کریں۔ عظمت خلیل کے ساتھ اچھا ہوا۔ ایسے بہروپیے کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ اب آگے دیکھتے ہیں کہ کیا ہوگا۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے" میں سے صائمہ سندھو ٗ مہوش سہیل ٗ رخسانہ اقبال ٗ رخسانہ خان ٗ فری ــــ ٗ حنا ٗ مینا بخاری ٗ صبا نوشاہی اور نمرہ اقراء کے شعر پسند آئے۔ میمونہ صدف "ہوم سویٹ ہوم" شروع کیا تو اچھا لگا مگر جب ماریہ نے اپنے پرائیویٹ اسکول ٹیچر سے گاڑی کی فرمائش کی تو کہانی میں جھول سا لگا۔ بھلا ایک اتنی کم آمدنی والا شوہر کیسے گاڑی لے سکتا ہے۔ فرمائش غلط تھی مگر پھر آگے کہانی زبردست ہوگئی۔ جب اریع نے قربانیاں دیں۔ ایک جگہ اور جھول تھا۔ جب فاکہہ باجی (نند) کو ہر کھانے کے بعد لازمی آئس کریم چاہیے ہوتی۔ اگر میرا اعتراض غلط ہے تو معذرت چاہتی ہوں۔ بہرحال ان دو باتوں کی وجہ سے پوری کہانی کو برا نہیں کہہ سکتے۔ "طمانچہ" آسیہ ریاض کی اچھی کوشش تھی مگر پختگی نہیں تھی۔ ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں جلدی جلدی سب کچھ ہوتا گیا اور ختم۔ آسیہ آئندہ بھی کوشش کرتی رہیے گا۔ ان شاء اللہ کامیاب ہوجائیں گی "میری بھی سنیے" کو ہم نے مکمل نہیں سنا۔ فرصت ملے تو پڑھوں گی۔ "دل دھیان کی سیڑھیاں" میں ممتاز بانو کراچی کے جوابات پسند آئے۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ فرصت نہیں نا ٗ بھائی جان اور بھابھی عمرے پر گئے ہوئے ہیں اور ان کے تینوں بچے میرے پاس ہیں ٗ بلکہ میں ان کے پاس ہوں۔ (ہاہاہا)

رخسانہ ملک اختر۔۔۔ ملتان

پیارے قارئین مصنفین کو میرا محبتوں اور چاہتوں بھرا سلام قبول ہو ٗ پیاری آپی آپ کا بہت شکریہ کہ میرا خط شائع کرکے آپ نے مجھے بہت بڑی خوشی دی ہے۔ میں کرن کو پانچ سال سے پڑھ رہی ہوں اور مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میری تربیت میں کرن اور خواتین کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ میرا کوئی بہن بھائی نہیں ہے لیکن آپ کے رسالوں نے یہ کمی پوری کردی ہے۔ آپ کے رسالے مجھے بڑی بہنوں کی طرح گائیڈ کرتے ہیں۔ اس بار کرن 12 تاریخ کو مل گیا۔ ماڈل بہت پیاری تھی۔ خاص کر جیولری اور مہندی ٗ نبیلہ آپی کا "دردل" سب سے پہلے پڑھا۔ ناول اپنے بہترین موڑ پر ہے۔ آپی فوزیہ کا ناول بہت ہٹ جارہا ہے۔ عظمت خلیل جیسے انسان کا یہی انجام ہونا چاہیے جس نے معصوم اور بے بس لوگوں کی زندگی برباد کردی لیکن خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ نجانے ہم لوگ کیوں یہ بات بھول جاتے ہیں۔

"زوح اندر دریچہ" کچھ خاص سمجھ میں نہیں آیا۔ اس لیے دوبارہ پڑھنا پڑے گا۔ سعدیہ آپی بہت عرصے بعد کرن

کی بزم میں واپس آئی ہیں۔ "محبت کا شجر" آصفہ آپی بہت اچھا لکھا ہے آپ نے۔ سعدون نام اور عنایا مجھے بہت پسند آئے ہیں۔ "میرے ہمنوا کو خبر کرو" میں ندرت ہمنوا سے مل ہی نہیں پائی۔ بہت دکھ ہوا ہے یہ جان کر "وہ اک پری ہے" میں ریحانہ آپی بہت خوب صورتی سے الجھی گتھی سلجھا رہی ہیں۔ افسانوں میں "سویٹ ہوم" بازی لے گیا۔ بہت اچھا لکھا ہے۔ حیا آپی نے "مسکراتی جنوری" میں عافین کو اس کی محبت لوٹا دی بہت اچھا لگا۔ باقی افسانے بھی بہت اچھے تھے۔ یہ کیا "مقابل ہے آئینہ" اس ماہ شامل ہی نہیں تھا۔ خیر ہم بھی آئینے کے مقابل آنے کے لیے بے چین ہیں۔ جانے کب آپ ہماری بے چینی کو سکون میں بدلتی ہیں۔ کرن کرن خوشبو میں فوزیہ آپی کی خوشبو بہت اچھی لگی۔ "یادوں کے دریچے" سے میں فوزیہ آپی کی یاد اچھی لگی ہے۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے" میں اقصیٰ کا شعر پسند آیا ہے۔ مسکراتی کرنوں میں ہری مرچیں اور مقصد پسند آیا ہے۔ "نہلے پہ دہلا" میں انیلا آپی کا سوال مجھے بہت پسند آیا ہے۔ آپی آپ 103 ایف ایم کے آر جے حسنین رضا اور بہار حسنین کا انٹرویو کریں پلیز۔ "نامے میرے نام" میں امبر گل اور فوزیہ ثمر آپی کا خط اچھا لگا مجھے۔ میں سب سے پہلے فوزیہ ثمر اور انیقہ انا کو پڑھتی ہوں۔ کیا آپ دونوں میری بہنیں بن سکتی ہیں' جواب ضرور دینا' میرا خط بہت لمبا ہو گیا ہے آپی شائع لازمی کرنا۔
(خدا حافظ)

فوزیہ ثمر بٹ۔۔۔ گجرات

السلام علیکم! میری پیاری مدیرہ کرن' قارئین اور بہت پیاری رائٹرز صاحبہ امید ہیں آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ اللہ پاک مجھ سمیت آپ سب کو اپنی عافیت و رحمت میں رکھے۔ (آمین) سال نو کا کرن شمارہ مسرت میں مبتلا کر گیا۔ بھئی بارہ تاریخ کو ہی مل گیا۔ بڑی خوشی ہوئی کرن کو دیکھ کر۔ ٹائٹل میں برائیڈل ماڈل جلوہ افروز تھیں۔ سرخ کلر میں خوب صورت ماڈل اچھی لگ رہی تھیں۔ ماڈل کی جیولری' مہندی خصوصاً" بیٹھنے کا انداز سب کچھ پرفیکٹ تھا۔

اداریہ سب سے پہلے پڑھا۔ مدیرہ کے ساتھ ساتھ میرے دل نے بھی بے اختیار کہا۔ (آمین) ہمارے ملک کو اچھے حکمرانوں اور دعاؤں کی بے حد ضرورت ہے۔ یہاں ہر ایک کو خضر راہ خود بننا ہے۔ اپنی سوچوں کو مثبت راہ پر لانا ہے۔ حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول ﷺ سے ذہن و دل کو معطر و منور کیا۔ چاند نگر کے انشاجی ناقابل فراموش ہستی تھیں۔ خدائے پاک اپنی خاص رحمتوں میں رکھے۔ (آمین)

"گزر گئے برس" سکینہ سموں بہترین آرٹسٹ ہیں۔ اسیر زادی میں' کمال کی اداکاری کر رہی ہیں صائمہ اکرم چوہدری کو دیکھنے کا مجھے شوق تھا۔ سال نو کے سروے کے جوابات سب نے اچھے دیے۔ اب کچھ ناول پہ بات ہو جائے۔ "میرے ہمنوا کو خبر کرو" اس بار تحریر کافی دلچسپ تھی۔ زرمین کے انکشاف پہ تو میں بھی حیران رہ گئی۔ کیا ندرت اور میران کی شادی ہونے والی ہے۔ زرمین کا کردار تو پہلے ہی مشکوک لگتا تھا۔ چلو حقیقت تو ظاہر ہوئی۔ میرے خیال میں اگلی قسط میں یہ راز بھی سامنے آجائے گا۔ شاہ زین اور حیدر شاہ کا آپس میں کیا رشتہ ہے۔ امل اور مہربانو کی جوڑی زبردست تھی۔ اب یہ رحمٰن شاہ کہاں سے ٹپک پڑا ہے۔ اس بار اس تحریر کو پڑھ کر واقعی اچھا لگا۔ پچھلی تمام بوریت ختم ہو گئی اور میرا یقین ہے اگلے ماہ لازمی طور پر فاخرہ گل بہت سے انکشاف کریں گی۔ جو کہ ہمیں اس تحریر میں باوجود دھیان سے پڑھنے سے بھی نہیں مل رہے۔

مکمل ناول "روح اندر دریچہ" سعدیہ عزیز کی ——— احساس کے رشتوں سے جڑی تحریر دل کو چھو گئی۔ شمس جیسے نایاب لوگ' سچ ہے ہیرے کو کوئی ماہر جوہری پہچان سکتا ہے۔ شمس فرشتہ نما انسان جیسے لوگ ہیں تو دنیا قائم ہے۔ شہناز اور اس کے باپ کی باتیں آنکھیں بھگو گئیں۔ گڈی کے کردار میں ایک سبق تھا۔ "محبت کا شجر" کہانی کو تو بڑے فلسفیانہ انداز میں شروع ہوئی تھی لگ رہا تھا بہت مزے کی ہو گی مگر آصفہ جی نے مایوس کر دیا۔ ذرا بھی اچھی نہیں لگی۔ "کانچ کا سودا" اچھی تھی۔ ہانیہ کا کردار اچھا تھا۔ بے چاری کو کیا ملا محبت پا کر۔ کچھ لوگوں کو محبت راس نہیں آتی یا پھر وہ اس کے حق دار نہیں ہوتے پھر بھی ان کی جھولی میں ڈال دی جاتی ہے اور وہ اس کی ناقدری کرتے ہیں۔ ذیشان نے بھی یہی کچھ کیا۔ ہانیہ کا فیصلہ اچھا تھا۔ اب ایک شخص کی بے وفائی سے زندگی کو روگ تو نہیں بنانا

چاہیے۔ آخر کو دنیا اچھے لوگ سے بھی بھری پڑی ہے۔

افسانے بس ٹھیک ہی تھے۔ ہاں بس "ہوم سویٹ ہوم" کچھ کچھ اچھا لگا مگر جو کچھ رائٹر صاحبہ نے لکھا ہے بہت صبر آزما تھا۔ مستقل سلسلے بس اچھے تھے۔ سال نو کے حوالے سے پھیکے لگے۔ "کرن کرن خوشبو" اقوال زریں سب اچھے لگے۔ "کرن کا دستر خوان" مکس فروٹ خرما اچھی ڈش ہے ضرور ٹرائی کروں گی۔ "نامے میرے نام" جو کہ میں سب سے پہلے پڑھتی ہوں مگر اس کا تذکرہ آخر میں کر رہی ہوں۔ تمام قارئین بہنوں نے کہانیوں پہ اچھا تبصرہ کیا۔ ہر ماہ میری کوئی نہ کوئی بہن فرمائش کرتی ہے کہ مجھ سے دوستی کر لیں۔ مجھے آپ سب سے محبت ہے۔ ہم سب کرن کی وجہ سے ایک دوسرے کی دوست ہی ہیں۔ مجھے اچھا لگتا ہے آپ سب میرے بارے میں لکھتی ہیں۔ شمع مسکان' عائشہ خان' سارہ چوہدری' سائرہ پروا علی' امبر گل اور بہنوں شہر کی سویرا قریشی آپ سب کو میرا سلام خوش رہیں بہت دعاؤں کے ساتھ۔

فائزہ بھٹی۔۔۔ گجرات

ٹھٹھرتی سرمئی سی شام کو کرن نے اپنی جھلک دکھائی۔ ٹائٹل بہت خوب صورت تھی۔ اگر شان دار کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ مہندی' چوڑیاں' میک اپ' جیولری' ڈریس ہر چیز پرفیکٹ تھی۔ ٹائٹل کے بعد فہرست پر سرسری سی نظر ڈالی۔ دونوں سلسلہ وار ناولز کو موجود پا کر ایک سکون کی سانس خارج کی۔ سعدیہ عزیز کا ناول دیکھ کر خوشی ہوئی مگر اتنی لمبی فہرست میں سے صرف سلسلہ وار ناولز ہی پڑھ سکی کیونکہ ان ناولز کے بعد رسالہ مختلف ہاتھوں میں سفر کرتا ہے۔ سب سے پہلے بات کی جائے "دردل" نبیلہ عزیز نے تو نہ جانے کیا سوچ رکھا ہے۔ ہر قسط میں دو' تین جھٹکے تو لازمی لگاتی ہیں۔ نبیلہ سے درخواست ہے کہ کہانی کو بے جا طوالت کا شکار نہ کریں ہماری دلچسپی ختم ہوتی جا رہی ہے۔

اب بات ہو جائے "دست کوزہ گر" کی کمل کا خرم کے لیے پریشان ہونا اچھا لگا۔ خرم نے انسانیت کے ناتے کسی کی زندگی بچا کر ——— اچھا کیا۔ اب کی بار رومیلہ پر ذرا بھی نہیں لکھا' کیوں؟ عظمت عقیل جیسے لوگ نہ جانے کیوں اللہ کی طرف سے عذاب کے منتظر رہتے ہیں۔ دوسرے ناولز پر بات نہیں کر سکتی' کیونکہ ابھی انہیں پڑھنے میں بہت وقت ہے۔ "یادوں کے دریچے میں" ظل ہما' صابرہ یار محمد' فوزیہ ثمر بٹ کی شاعری پسند آئی۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے" نوشابہ منظور' عظمیٰ غلام نبی نے اچھا لکھا۔ "نامے میرے نام" سب نے ہی اچھا لکھا۔ شمع مسکان اس ماہ پھر غائب ہو' کہاں ہو بھئی۔ پھر کہو گی کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ تم مانو یا نہ مانو تمہاری کمی ہر جگہ محسوس ہوتی ہے۔ اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔ خدا پاک اس ملک پر اور اس کے رہنے والوں پر رحمت نازل فرمائے۔ (آمین)

انعم نور۔۔۔ لاہور

السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ سب مصنفین اور قارئین اللہ کے فضل و کرم سے ٹھیک ٹھاک اور ہشاش بشاش ہوں گے اور ٹھنڈے ٹھنڈے موسم سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ لاہور میں تو آج کل دھند کا راج ہے۔ کراچی میں کیسا موسم ہے اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتے۔ اس ماہ کا کرن ملا تو ٹائٹل کے صفحے پر نظریں جھکائیں۔ سرخ رنگ کا جوڑا پہنے پیاری سی مہندی لگائے اور بناؤ سنگھار کیے ہوئے دلہن بہت اچھی لگی۔ خاص طور پر اس کا نظریں جھکانا بہت پسند آیا۔ دلہن کے ایک ایک انداز کو غور سے دیکھنے کے بعد ہم نے سب سے پہلے "دردل" کو پڑھا۔ نبیلہ عزیز بہت اچھا لکھ رہی ہیں' لیکن نبیلہ جی بس ذرا جلدی جلدی لکھیں اور اس کہانی کا اینڈ اچھا کیجیے گا' پلیز اور ذرا زیادہ صفحے ہونے چاہئیں ——— پڑھتے ہوئے پتا بھی نہیں چلتا جلدی سے ختم ہو جاتی ہے کہانی۔

"میرے ہمنوا کو خبر کرو" اچھی جا رہی ہے۔ بس ذرا سست لگتی ہے۔ اسے ذرا فاسٹ کریں۔ مہربانو کا لفٹ میں پھنسنا اس کے لیے مشکلات لائے گا۔ مگر کیا یہ تو اب آگے ہی پتا چلے گا۔ فاخرہ گل آپی پلیز شاہ زین اور ندرت کو ملا دیجیے اور کتنا تڑپائیں گی ان دونوں کو اور ندرت کی شادی میران سے نہ ہو پائے۔ بس اب ان کو جلدی جلدی ملا دیں۔ مکمل ناول "محبت کا شجر" کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ "ہوم سویٹ ہوم" اچھی کہانی تھی ایک عورت کے صبر' خلوص اور شکر کو بہت اچھے انداز میں بتایا۔ ایک نصیحت آموز کہانی تھی۔

"مسکراتی جنوری" بھی ایک اچھی تحریر

آخری فیصلہ اپنے گھر لوٹ کر آنے کا بہت پسند آیا اور عافین کا اسے کھلے دل سے خوش آمدید کہنا بھی۔ عافین نے اس سے کوئی شکوہ' شکایت' طنز کچھ بھی نہ کیا بلکہ آنے والے کل کو مزید اچھا اور خوب صورت بنایا پچھلے کل اور پچھلی باتیں بھلا کر جو کہ شاید ایک اچھے مرد ہونے کی نشانی ہے۔ ورنہ تو مرد جب تک طنز کے تیر اور اپنے دل کی بھڑاس نہ نکال لے اسے شاید سکون نہیں ملتا۔ باقی کہانیاں بھی اچھی ہوں گی مگر وہ میں پڑھ نہیں پائی۔ ہمیشہ خوش رہیں اور دوسروں کو بھی خوشیاں دیں۔ ان شاء اللہ اگلی بار پھر اپنے خط کے ساتھ حاضر ہوں گے۔ اللہ آپ کو خوشیاں دے۔

حمیرا تعبیر۔۔۔ نامعلوم

ڈیئر کرن قارئین ۔۔۔ السلام علیکم! کیسے ہیں آپ سب۔ میں کلاس 5th سے کرن کی خاموش قاری ہوں اور اب مجھے خاموشی توڑنے پر مجبور کیا ہے "دردل" نے۔ کرن کی تو میں کیا تعریف کروں۔ کرن سارے کا سارا بیسٹ ہے۔ کرن کا کوئی بھی سلسلہ خواہ کوئی بھی ہو اپنی مثال آپ ہے۔ کرن کی ساری رائٹرز اچھا لکھ رہی ہیں۔ فوزیہ آپی کی بات ہی کیا ہے لیکن آپی سسپنس ذرا کم کردیں فاخرہ گل تو بس گزارہ ہے اور نبیلہ میری موسٹ فیورٹ رائٹر ہے اور ان کا "دردل" بھی میرا فیورٹ ہے۔ لیکن معذرت کے ساتھ آپی اب آپ کی یہ اسٹوری بالکل بکواس اور بورنگ ہو چکی ہے۔ اسٹوری کا آپ نے بیڑہ غرق کردیا ہے۔ زری سے تو آپ نے پتا نہیں کن محرومیوں کا بدلہ لیا ہے۔ آپ نے بھی اور وہ قارئین بہنیں جنہوں نے کہا کہ علیزے کو کچھ نہیں ہونا چاہیے تو انہوں نے زری کی محبت کی توہین کی ہے۔ اس نے دل آور سے محبت نہیں عقیدت کی تھی اس کی پوجا کی تھی۔ آپ نے اس کی محبت اور عقیدت کو سمجھا ہی نہیں' میں نے تو آپ کا علیزے نامہ پڑھنا ہی بند کردیا ہے اور کرن بھی جتنے آنسو زری نے بہائے ہیں اس سے زیادہ میرے نکلے ہیں۔ زری نے اگر دل آور سے عشق کیا ہے تو میں نے زری سے کیا ہے۔ بہت رلایا ہے اور ہاں ایک اور بات اصل ہیروئن کو تو آپ نے نظر انداز کردیا ہے۔ اس کا تو ذکر ہی نہیں آتا۔ دل آور کو دل کرتا ہے گولی مار دوں۔ آیا بڑا انصاف پسند' اچھا جناب اجازت دیں باقی کرن میں نے پڑھا نہیں اور میرا خط ضرور **شائع کریں** ورنہ میں....

ثریا علی۔۔۔ راجپوت نامعلوم

مجھے ڈائجسٹ پڑھنے کا بہت شوق ہے اور اس شوق کے پیچھے میں نے بہت ڈانٹ بھی کھائی' کیونکہ میری امی چاہتی ہیں کہ میں اپنا سارا وقت پڑھائی پر صرف کروں۔ کرن پڑھنا میں نے دو سال پہلے شروع کیا جب میں ایف اے پارٹ ٹو میں تھی اور اب تو ماشاء اللہ میرا بی اے بھی کلیئر ہو گیا ہے۔ کرن کا ہر شمارہ میرے اندر چھپی اک اچھی رائٹر کو بیدار کردیتا ہے۔ جس کو بڑی مشکل سے تھپک کر سلاتی ہوں۔ (بھئی امی کی ڈانٹ مرچ مسالے کے بغیر نہیں ہوتی ۔۔۔) خیر رائٹر تو میں نے ان شاء اللہ بننا ہی ہے۔ کرن کی ساری کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ سب رائٹرز اچھا لکھ رہی ہیں۔ پلیز میرا یہ لیٹر شامل کرلینا' مجھے بہت خوشی ہوگی۔ والسلام

شبنم انعام۔۔۔ راولپنڈی

السلام علیکم! امید ہے آپ بالکل ٹھیک ہوں گی۔ بہت عرصے بعد خط لکھ رہی ہوں۔ وجہ مصروفیت تھی۔ کرن ماشاء اللہ آپ کی محنت سے دن دگنی' رات چوگنی ترقی کررہا ہے۔ تمام کہانیاں بہترین ہیں۔ کرن کو میں بجا طور پر رائٹرز کی ٹریننگ اکیڈمی کہوں گی۔ کرن میں لکھے جانے والے شہرہ آفاق ناول "شہر تمنا" کو اب تک قارئین بھول نہیں پائے ہوں گے اور اب یہ ناول ایک ۔۔۔ چینل سے بھی دکھایا جارہا ہے۔

بہت سی رائٹرز جو کرن میں لکھتی تھیں اب مختلف چینلز پر لکھ رہی ہیں۔ مگر ان سب کو نام اور پہچان کرن سے ہی ملی۔ اسی لیے ان رائٹرز کو کرن بھولنا نہیں چاہیے۔ سائرہ عارف سے درخواست ہے کہ "شہر تمنا" جیسا کوئی خوب صورت ناول دوبارہ لکھیں۔ T.V کی مصروفیت سے وقت نکال کر سالگرہ نمبر کا شدت سے انتظار ہے۔ سرورق پر موسم کی مناسبت سے ماڈلز کے ملبوسات ہوں تو کیا کہنے۔ ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ والسلام۔